

ISSN 1014-0030

تَطْبِيقِي ادب

مجله پژوهشی آف ماڈرن لٹریچر

اسلام آباد

تخلیقی ادب

شماره - تین

(ISSN 1014-9030)

مدیر اعلیٰ
پروفیسر ڈاکٹر ابراہیم رضا خان
ریٹر

سجلر ادارت
ڈاکٹر شیدا بی
لاہور

پبلشرز و نمبرنگ آف ماڈرن لٹریچر، اسلام آباد

numl_urdus@yahoo.com

مجلس مشاورت

پروفیسر ڈاکٹر ایوب اللہ شاہ	ڈاکٹر ایوب اللہ شاہ
پروفیسر ڈاکٹر محمد رفیق	ڈاکٹر محمد رفیق
پروفیسر ڈاکٹر محمد رفیق	ڈاکٹر محمد رفیق
پروفیسر ڈاکٹر محمد رفیق	ڈاکٹر محمد رفیق
پروفیسر ڈاکٹر محمد رفیق	ڈاکٹر محمد رفیق
پروفیسر ڈاکٹر محمد رفیق	ڈاکٹر محمد رفیق
پروفیسر ڈاکٹر محمد رفیق	ڈاکٹر محمد رفیق

مجلس مشاورت

پروفیسر ڈاکٹر ایوب اللہ شاہ	ڈاکٹر ایوب اللہ شاہ	پروفیسر ڈاکٹر ایوب اللہ شاہ
پروفیسر ڈاکٹر محمد رفیق	ڈاکٹر محمد رفیق	پروفیسر ڈاکٹر محمد رفیق
پروفیسر ڈاکٹر محمد رفیق	ڈاکٹر محمد رفیق	پروفیسر ڈاکٹر محمد رفیق
پروفیسر ڈاکٹر محمد رفیق	ڈاکٹر محمد رفیق	پروفیسر ڈاکٹر محمد رفیق
پروفیسر ڈاکٹر محمد رفیق	ڈاکٹر محمد رفیق	پروفیسر ڈاکٹر محمد رفیق
پروفیسر ڈاکٹر محمد رفیق	ڈاکٹر محمد رفیق	پروفیسر ڈاکٹر محمد رفیق
پروفیسر ڈاکٹر محمد رفیق	ڈاکٹر محمد رفیق	پروفیسر ڈاکٹر محمد رفیق

پروفیسر ڈاکٹر ایوب اللہ شاہ

ترتیب

صفحہ نمبر		عنوان
	□	
11		تیسرا حصہ (پندرہویں باب)
44		تیسرا حصہ (پندرہویں باب)
81		تیسرا حصہ (پندرہویں باب)
80		تیسرا حصہ (پندرہویں باب)
86		تیسرا حصہ (پندرہویں باب)
111		تیسرا حصہ (پندرہویں باب)
	□	
130		تیسرا حصہ (پندرہویں باب)
140		تیسرا حصہ (پندرہویں باب)
157		تیسرا حصہ (پندرہویں باب)
	□	
168		تیسرا حصہ (پندرہویں باب)
200		تیسرا حصہ (پندرہویں باب)
210		تیسرا حصہ (پندرہویں باب)
210		تیسرا حصہ (پندرہویں باب)
224		تیسرا حصہ (پندرہویں باب)
241		تیسرا حصہ (پندرہویں باب)
252		تیسرا حصہ (پندرہویں باب)
260		تیسرا حصہ (پندرہویں باب)

273	الانوار الموعود	موسم طوبیہ اور انوار موعود
291	بالعقب	یہ ہے اللہ تعالیٰ کے عجز و کمالات
299	عقوبہ	عقوبہ کی ہستی اور اس کے آثار و احوال
317	مستور	مستور کی ہستی اور اس کے آثار
324	مستور	مستور کی ہستی اور اس کے آثار
341	مروجہ کتب	مروجہ کتب اور اس کے آثار و احوال
357	مروجہ کتب	مروجہ کتب اور اس کے آثار و احوال
364	مروجہ کتب	مروجہ کتب اور اس کے آثار و احوال
378	مروجہ کتب	مروجہ کتب اور اس کے آثار و احوال



385	الانوار الموعود	موسم طوبیہ اور انوار موعود
383	الانوار الموعود	موسم طوبیہ اور انوار موعود
385	الانوار الموعود	موسم طوبیہ اور انوار موعود
398	الانوار الموعود	موسم طوبیہ اور انوار موعود
418	الانوار الموعود	موسم طوبیہ اور انوار موعود
425	الانوار الموعود	موسم طوبیہ اور انوار موعود
428	الانوار الموعود	موسم طوبیہ اور انوار موعود
445	الانوار الموعود	موسم طوبیہ اور انوار موعود



448	الانوار الموعود	موسم طوبیہ اور انوار موعود
-----	-----------------	----------------------------



458	الانوار الموعود	موسم طوبیہ اور انوار موعود
472	الانوار الموعود	موسم طوبیہ اور انوار موعود
485	الانوار الموعود	موسم طوبیہ اور انوار موعود

491	مراعاتِ نیک	پیراؤں کی مراد
509	۱۹۶۱ء	پاکستان کی
517	کلیں اور لہجہ	تعمیر کی
550	کوہستان	پہاڑی علاقہ
575	(۱۹۶۱ء)	پاکستان
580	عراق کی	پاکستان
588	مقامات	پاکستان
600	پہاڑی	پاکستان
610	مظاہرہ	پاکستان
617	پاکستان کی	پاکستان کی
622	تعمیر	پاکستان
		□
628	پاکستان کی	پاکستان کی
633	پاکستان کی	پاکستان کی
		□
642	پاکستان کی	پاکستان کی
		□
655	پاکستان کی	پاکستان کی
658	پاکستان کی	پاکستان کی
659	پاکستان کی	پاکستان کی
660	پاکستان کی	پاکستان کی
662	پاکستان کی	پاکستان کی
663	پاکستان کی	پاکستان کی
665	پاکستان کی	پاکستان کی

668	تکلیفِ مال	تکلیف
670	غیر مال	مال
672	مذکورہ امور	مال
674	دوسری بات	مال
676	غیر مال	مال
682	غیر مال	مال
684	مال	مال
685	مال	مال
686	مال	مال
687	مال	مال
689	مال	مال
690	مال	مال
691	مال	مال
693	مال	مال
695	مال	مال

697	مال	مال
698	مال	مال
701	مال	مال
702	مال	مال
703	مال	مال
705	مال	مال
706	مال	مال

707
709

مال

مال

711	امید نام	سخن روز و شب کا وہ سطرانہ الہی
712	الذکر الہی	یہی ہے میں ہوں وہی ہے کہ الہی کی
713	گل ہالی	ارکے میں ہے وہ سطرانہ الہی
714	ہفت سون	تو سارے ہی سطرانہ الہی
715	سارے	اسے ہالی کی طرف سے آرا الہی
716	ہاوی ذی	میرے آگے آگے آگے آگے
717	سارے سون	وہ سارے ہی کی ہالی
718	تو کہ ہالی	تو کہ ہالی کی ہالی ہالی
719	سارے سون	سارے سون کی ہالی ہالی
720	الذکر الہی	یہی ہے کہ الہی کی ہالی
721	تو کہ ہالی	تو کہ ہالی کی ہالی
722	الذکر الہی	یہی ہے کہ الہی کی ہالی
723	سارے سون	سارے سون کی ہالی
724	تو کہ ہالی	تو کہ ہالی کی ہالی
725	سارے سون	سارے سون کی ہالی
726	الذکر الہی	یہی ہے کہ الہی کی ہالی
727	الذکر الہی	یہی ہے کہ الہی کی ہالی
728	الذکر الہی	یہی ہے کہ الہی کی ہالی
729	الذکر الہی	یہی ہے کہ الہی کی ہالی
730	الذکر الہی	یہی ہے کہ الہی کی ہالی
731	الذکر الہی	یہی ہے کہ الہی کی ہالی
732	الذکر الہی	یہی ہے کہ الہی کی ہالی
733	الذکر الہی	یہی ہے کہ الہی کی ہالی
734	الذکر الہی	یہی ہے کہ الہی کی ہالی
735	الذکر الہی	یہی ہے کہ الہی کی ہالی

737	ظلالِ مہر	دل میں ہر لمحہ کے لہلہاں ہواں میں
738	ارشدِ ہر عالم	بازوئی کی لہریں ہر لمحہ سے تازے
739	عالمِ خود بخود	تمہارا کیا ہے کس کو ہر لمحہ سے
740	روشنی کا کس	بہت ہے نہ ہے کس کا کس کا ہے
741	سرحدِ ہر دنیا کی	پڑھیں بات کو کہے ایوان کے لہکے
742	دہریہ	تیرے کس سے کہو پڑا پڑا کس ہے
743	ہیبتِ کس	روپوش ہزاروں کی دیں ہر لمحہ سے
744	گوشتِ کس	انہی سے ہے ہر لمحہ سے کس کا ہے
745	گوشتِ کس	کس کی ہواں میں کس کے ہے
746	عالمِ ہوا	ہوئی کس سے کس کے ہواں میں کس ہے

747	ایک لمحہ سے	کہا کہ کس سے کس کو کس سے ہواں میں کس ہے
748	سید عالم کی	کس سے کس کی کس سے کس سے
749	کوڑا پتھر کی	ہاتھ سے کس سے کس کے ہاتھ سے
750	قیامِ کس	انہی سے کس سے کس سے
751	پہاڑ کی	کس سے کس سے کس سے کس سے
752	نورِ قادری کی	کس سے کس سے کس سے کس سے
753	نورِ قادری کی	کس سے کس سے کس سے کس سے



754		کس سے کس سے (انورہ راجہ)
756		کس سے کس سے (عجل پور)
758		کس سے کس سے (عجل پور)



کس سے

معاہدہ ذوق ہونے کی وجہ سے اب تمام لوگوں کو ایک ہی نظر رکھ دینا ہے۔ جب کہ ان لوگوں
 ان طرف سے کوئی پروگرام اس وقت ہوتے ہیں۔ سب ان کو سچا سچ لکھ کر دیکھ کر کے رہا کر دینا
 ہے۔ وہ کہہ سکتے ہیں کہ ہم ان کے لیے کوئی ایسا کام کر کے دیتے ہیں۔ ان کے لیے یہ کام ہے۔
 یہ سچا ہے۔ عام آدمی کو ان کے لیے کوئی کام ہے۔ ان کے لیے کوئی کام ہے۔ ان کے لیے کوئی کام ہے۔
 یہ کام ہے۔ ان کے لیے کوئی کام ہے۔ ان کے لیے کوئی کام ہے۔ ان کے لیے کوئی کام ہے۔
 ان کے لیے کوئی کام ہے۔ ان کے لیے کوئی کام ہے۔ ان کے لیے کوئی کام ہے۔ ان کے لیے کوئی کام ہے۔

اب کا اظہار تھا ہے اور یہ لفظ بھی سہلی صورت میں ہی ہے۔ ان کے لیے کوئی کام ہے۔ ان کے لیے کوئی کام ہے۔
 تصور آواز کی صورت میں ہی۔ ان کے لیے کوئی کام ہے۔ ان کے لیے کوئی کام ہے۔ ان کے لیے کوئی کام ہے۔
 تک نہ کرے۔ ان کے لیے کوئی کام ہے۔ ان کے لیے کوئی کام ہے۔ ان کے لیے کوئی کام ہے۔ ان کے لیے کوئی کام ہے۔
 جانتے تو اب صرف ان لوگوں کے لیے ہے۔ ان کے لیے کوئی کام ہے۔ ان کے لیے کوئی کام ہے۔ ان کے لیے کوئی کام ہے۔
 ان کے لیے کوئی کام ہے۔ ان کے لیے کوئی کام ہے۔ ان کے لیے کوئی کام ہے۔ ان کے لیے کوئی کام ہے۔

کہا جاتا ہے کہ اب کے اثرات دوسرا ہوتے ہیں۔ ان کے لیے کوئی کام ہے۔ ان کے لیے کوئی کام ہے۔
 صورتوں میں دیکھا جاسکتا ہے۔ ان کے لیے کوئی کام ہے۔ ان کے لیے کوئی کام ہے۔ ان کے لیے کوئی کام ہے۔
 وہ ایک لمحے کے لیے ہوسکتا ہے۔ ان کے لیے کوئی کام ہے۔ ان کے لیے کوئی کام ہے۔ ان کے لیے کوئی کام ہے۔



ان کے لیے کوئی کام ہے۔ ان کے لیے کوئی کام ہے۔ ان کے لیے کوئی کام ہے۔ ان کے لیے کوئی کام ہے۔
 ان کے لیے کوئی کام ہے۔ ان کے لیے کوئی کام ہے۔ ان کے لیے کوئی کام ہے۔ ان کے لیے کوئی کام ہے۔
 ان کے لیے کوئی کام ہے۔ ان کے لیے کوئی کام ہے۔ ان کے لیے کوئی کام ہے۔ ان کے لیے کوئی کام ہے۔
 ان کے لیے کوئی کام ہے۔ ان کے لیے کوئی کام ہے۔ ان کے لیے کوئی کام ہے۔ ان کے لیے کوئی کام ہے۔

قیام پاکستان اور دو قومی نظریہ

مکتبہ ۱۱۱۱ پاکستان کا قیام یہاں دستِ ثنوت کا ایک عظیم عہد ہے وہاں یہ
یہ مہتر کا ایک نئی بحال ہاتھ لگا ہے کہ اس طرح ایک قوم قوم نے جو عہدہ دارانہ سے
کالم اور ہزار آقاؤں کے علم، علم کی بجلی بجلی میں رہی تھی۔ ایک عظیم عہد کے قیام
نہوں نے آگاہی حاصل کر کے ایک عظیم عہد سے ہاتھ ہاتھوں کی قیامت میں،
ایک عہد سے عہد میں نکالی سے ہاتھ حاصل کر لی۔

پاکستان ایک نئی نئی مکتبہ ہے جہاں کا قیام "دو قومی نظریہ" کی بنیاد پر عمل
میں آیا۔ لہذا اس کے سر میں وہاں میں آئے ہیں وہاں میں اس کے علم اکٹروں کے
صوبوں کو چھوڑ کر کے پاکستان کا نام دیا گیا تھا کہ جہاں میں اور تھیں اسے حوالہ
ملا دیا گیا اور ان کے قیام و نسب کی انتہا تھی۔ اس پر کیا تھا؟ انہوں نے مسلمانوں پر
علم سے جو انتہائی بھلے بے یہاں تک کہ انہوں میں علم سے اٹھنے ہو گی۔ جہاں
کے ہائی سرج ہو گئے۔ مسلمانوں کے گھر میں ایسا ہے جسے اور جو، آتش کے
کے سچے، بلا سے ہر طرح کے بے گئے۔ اور انہوں نے اس کے، یہ جہاں کا کلمہ ہائی گئی اور
لہذا ہم نے "پہلا آگے گئے کہ ہرگز ہو جاوے گا ان کے لئے ہی جہاں میں گئے۔

یہاں کے مسیحی مکتبہ، علموں، و قوم، انہیں کے بکری
نہا کی جہاں ہزاروں میں ہوں میں ایک جہاں وہاں ہے
نہا کے ہائی کا انہوں بہا، نہا کے لئے ہی سرکٹا
لہذا ہم نے ہاتھ میں رکھی ہیں۔ جہاں کا عہدہ مکتبہ ہے

لہذا یہ کہنا صحیح رہتا ہے کہ آئینی اور شرعی اصولوں کے تحت کوئی شخص کو تسلیم نہ کرنا
 کرنا صحیح ہے۔

نہ صرف یہ کہ ہمیں انگریزوں سے لیا جاتا ہے تو ہمیں تسلیم رکھنے کے لیے
 ہر کسی کی سستی کی خواہش ہے۔ انگریزوں نے ہم مسلمانوں کو ہر چیز میں ہموار رکھنے کی
 اپنی ہی حکمت میں۔ وزارت مسلمانوں کے پاس ہوگی نہ ہوگی۔ (۸)
 دوسری بات یہ ہے کہ ہمیں (مسلمانوں کی زبان میں)

اللہ کے نام سے یہاں ہے، اللہ کے نام سے یہاں ہے

اللہ کی عزت سے یہی مسکن میں ہے، اللہ کا نام ہے

میں کے اسرار کہتا ہے، میں ان کی بات کہتا ہے

میں سے جوں جوں کہ ان کے الفاظ تو میں کا اسرار ہے (۹)

انگریز مسلمانوں کو یہ بات سمجھنا چاہئے کہ مسلمان

اللہ کا نام ہے، یہ اللہ کا نام ہے، اللہ کے نام سے یہی مسکن میں ہے، اللہ کا نام ہے

تو کہ ہم مسلمانوں کو یہ بات سمجھنا چاہئے کہ مسلمان

اللہ کا نام ہے، اللہ کا نام ہے۔

اللہ کا نام ہے، اللہ کا نام ہے، اللہ کا نام ہے۔

وَجَمَالَ لِلشَّوَابِكِ لِشَبَابِ

وَعَلِمَ أَيْدِ الشَّيْخِ الشَّيْخِ

فَلَسْنَا لَهُمْ وَ الشَّرِيقِ عِلْمِ

فَلَا لَمْ يَكُنْ عِنْدَ الشَّرِيقِ (۱۰)

لہذا یہ کہنا صحیح ہے کہ ہمیں انگریزوں سے لیا جاتا ہے تو ہمیں تسلیم رکھنے کے لیے

ہر کسی کی سستی کی خواہش ہے۔ انگریزوں نے ہم مسلمانوں کو ہر چیز میں ہموار رکھنے کی

کارتہ الیہ میں انہوں نے بغدادی قومیت کے علمبردار کی حیثیت سے لکھا ہے کہ بغدادی
 اور کربلائیوں کو بغدادیوں سے نکال دیا کریں۔ ان کا مقصد یہ تھا کہ حمزہ بغدادیوں کی
 آڑ میں آئے اور ان کے ساتھ رہنے والے بربروں کی آزادی ہوگی۔ جہاں کہہ سکیں
 یہاں کے عظیم مسلم ایک کی برنگ کھلی کے بعد پستے چائے والے تعلقات کے بارے
 میں امام نے اسے قبول کرنے کا اعلان کر دیا۔ (۱۳۳) ان بیان میں ابتدائی طور پر ایک
 کلمہ عراقی کہا گیا۔ یعنی کئی کئی۔ (۱۳۴)

۱۳۳۔ میں مکتبہ کے اجلاس میں مریض رہا ہوں، کے اجلاس کے بارے میں
 میں نے امام علیؑ کی تم سے تمہارا پیغام بھی قبول کرتے سے اعلان کر دیا۔ (۱۳۵) کہا کہ ہم اس
 پر پستے چائے نہیں کر کے دھوا کر بیٹھنا شروع میں تو کانگریس میں مسلمانوں کی
 تمام تعلقات سولے کا بھی کرتی تھی۔ جہاں کہہ سکیں۔ (۱۳۶) کے اظہار میں اسے
 مسلمانوں کی ۱۳۳۱ میں سے صرف ایک بیٹے پر کامیابی حاصل ہوئی تھی۔ (۱۳۷)
 اس سے صرف ۱۳۱۱ ہے کہ کانگریس پر مسلمانوں کا کوئی اثر نہ تھا۔ اس اظہار کے نتیجے
 میں کانگریس حکومت کے ساتھ مسلمانوں پر اذیتوں والی حکومت کی سرچشمہ کر دیا کہ
 صرف مسلمانوں کی برتری چاہتی ہے۔ (۱۳۸)

کانگریس اور حکومت کے درمیان اگر ایسا نہ مسلم کانگریس کے سولوں
 کے ساتھ مسلمانوں کی ہونے تو مسلم کانگریس کو انہوں کے خلاف کھڑے کے مقاصد
 میں جان بوجھ کر امام علیؑ کی طرف سے امام علیؑ کے لئے چاہئے۔ (۱۳۹)

انگریزوں نے امام علیؑ کی انگریزی حکومت میں جہاں کہہ سکیں۔ (۱۴۰) میں لکھا
 ہے کہ امام علیؑ کی حکومت کے بعد سے مسلم کانگریس اور امام علیؑ کے مقاصد
 اپنے آپ کو چھوڑ کے مسلموں کی برتری پر توجہ دینی کاروں کے طور سے کسی جہاں کہہ سکیں
 کے ۱۳۴۰ میں آل انڈیا مسلم ایک کے سلاطین نے میں اپنی مسوداتی تحریر میں امام علیؑ

آئی ہیں آئی سوزی کی رو میں نکلتے
 ان کو لیا خاک میں تو لے سے لڑا اور
 تک میں مسلم ہونے کی پہلی کے لئے
 عالم اسلام کو تو لے سے نکلتے اور
 ہوتی باتوں میں سب کچھ کھا گیا ہے
 سوچتے کہ میں میں تو لے نہیں کیا گیا ہوا (۳۳)

۳۳ تاریخ ۲۰۱۱ء کو مسلم لیگ کا ایک اجلاس ہوا، قائد اعظم کی مہارت میں
 مختلف مذاہب میں ایک قرارداد منظور کی گئی جس میں "قرارداد" کی بجائے "کھلی" (۳۴)
 ان اجلاس میں علماء، علماء اور علماء کے کھانا سہولت کے مسلم لیگ کے سرچے سے
 قرابت کی یہی قرارداد ہوئے اور وہ ان کے ہیں اور غیر مسلم مسلمانوں کے ہاں میں
 بڑھ کر سے اور قرابتی کے ہے اور کہا کہ اگر یہ قائد اعظم سے اور قرابتی کے ہے اور
 اور اختلاف کے ساتھ چینی کرتے ہوئے کہتے۔

"یہ اور مسلمان اور ایک ایک نہیں ہیں۔ کئی اور ہے کہ مسلمان
 ان کے ہے کے اور مسلمان ہونا اور شرف کا مسرت نہیں ان کے
 ان کا وہ ہیں، ان کے، ان کے اور اب ایک اور ہے
 سے مختلف ہیں۔" (۳۶)

قرارداد میں مطالب کیا گیا کہ "ان مذاہب میں غیر الہامی طور پر مہارت مذاہب میں
 مسلمان اکثریت میں ہیں ان کے مختلف آراء اور عقائد، یہاں تک کہ عالم کی جائیں۔ (۳۵) اور
 ان مذاہب میں مسلمان عقیدت میں ہیں ان کے لیے تعلقات سب سے کچھ اور ان میں
 مذاہب میں مسلمان کچھ نہیں قائم ہوں گی اور اپنی عقیدوں کے ذمے، ان کی کھاتی اور مذاہب
 فرقہ کی مخالفت کے لیے انہی اختلافات کریں گی۔" (۳۶) اس قرارداد میں غیر الہامی

کی کی تھی۔ (۵۳)

یوں ہی کے مطابق

”ہندوؤں نے ہندو مت میں بلی قربانوں کی بجائے سب سے زیادہ بڑے
کوتھنوں کی۔ راج گوبال لہاری نے کہا کہ ہندوؤں کی یہ توجہ کہ
ہندو متی برہمنوں کے ہندو متوں کی بدولت بڑھتی رہی تھی۔
یہ ہے۔ (۵۴)“

یوں ہی کے مطابق

”ہندوؤں میں راج گوبال لہاری نے کہا کہ ہندوؤں کی بدولت بڑھتی رہی تھی۔
یہ ہے۔ (۵۴)“
اور یہ کہ ہندوؤں میں راج گوبال لہاری نے کہا کہ ہندوؤں کی بدولت بڑھتی رہی تھی۔
یہ ہے۔ (۵۴)“
یہ ہے۔ (۵۴)“

یوں ہی کے مطابق

”ہندوؤں میں راج گوبال لہاری نے کہا کہ ہندوؤں کی بدولت بڑھتی رہی تھی۔
یہ ہے۔ (۵۴)“
یہ ہے۔ (۵۴)“

یوں ہی کے مطابق

۱۹۔ سوشل لیبرلزم اور پاکستانی معاشرے کا تعلق کا مطالعہ کرنا (پتھری پبلشنگ، ۱۹۹۱ء میں ۱۹۹ء
اور سوشل لیبرلزم اور انسانی حقوق کی ترقی کی روایت، ۱۹۸۵ء، ۱۹۸۸ء میں ۲۰۲۰
پبلسنگ ہاؤس، اسلام آباد، (۱۹۹۲ء) میں ۲۲۶ء اور ۱۹۹۳ء میں ۲۲۶ء
پبلسنگ ہاؤس

۲۰۔ اقبال کا نظریہ مساوات و عدم اور آج کا مسلم لیگ کے اجلاس، ۱۹۷۵ء، علی گڑھ
مطالعہ "Struggle for freedom" آزادی کی جدوجہد، ۱۹۵۵ء، ۲۰۱۹
کراچی، ۱۹۵۹ء، صفحہ ۱۷ (۱۷)

۲۱۔ اقبال کا نظریہ آزادی اور اسلامی مساوات اور انسانی حقوق
۲۲۔ اقبال کا نظریہ آزادی اور اسلامی مساوات اور انسانی حقوق
۲۳۔ اقبال کا نظریہ آزادی اور اسلامی مساوات اور انسانی حقوق

۲۴۔ اقبال کا نظریہ آزادی اور اسلامی مساوات اور انسانی حقوق
۲۵۔ اقبال کا نظریہ آزادی اور اسلامی مساوات اور انسانی حقوق
۲۶۔ اقبال کا نظریہ آزادی اور اسلامی مساوات اور انسانی حقوق

۲۷۔ اقبال کا نظریہ آزادی اور اسلامی مساوات اور انسانی حقوق
۲۸۔ اقبال کا نظریہ آزادی اور اسلامی مساوات اور انسانی حقوق
۲۹۔ اقبال کا نظریہ آزادی اور اسلامی مساوات اور انسانی حقوق

۳۰۔ اقبال کا نظریہ آزادی اور اسلامی مساوات اور انسانی حقوق
۳۱۔ اقبال کا نظریہ آزادی اور اسلامی مساوات اور انسانی حقوق
۳۲۔ اقبال کا نظریہ آزادی اور اسلامی مساوات اور انسانی حقوق

جو تہذیب و تمدن کو نکتہ تکیہ قرار دیا، ۱۹۴۳ء میں لکھا

۳۱۔ اقبال کا اعلیٰ عہدہ: نظام اور آہدہ مسلم لیگ کے اجلاس، ۱۹۳۸ء، Struggle for

Freedom (آزادی کی جدوجہد) جلد ۱، ۱۹۳۵ء، کراچی، ۱۹۳۸ء، ص ۱۷ (۱۷-۱۵)

۳۲۔ عظمتِ سرحد: اراکینِ مسلم لیگ، لکھنؤ، ۱۹۳۸ء، ص ۱۸

۳۳۔ اعلیٰ عہدہ: اقبال، ۱۹۳۸ء

۳۴۔ اقبال کے شعور و بیان کے نام (Struggle for Independence)

(جدوجہد آزادی اقصیٰ) - ۱۹۳۸

۳۵۔ بیجا میں ۱۹۳۸

۳۶۔ بیجا میں ۱۹۳۳-۳۳

۳۷۔ بیجا میں ۳ (بیجا کا اعلیٰ عہدہ) ۱۹۳۸

۳۸۔ کشمیر، ۱۹۳۸ء

۳۹۔ آزاد ریاستوں سے اسلامی قانون تک: اراکینِ مسلم لیگ، جامعہ اسلامیہ، ۱۹۳۸ء میں لکھا

۴۰۔ روضِ پاک: اقبال کا اعلیٰ عہدہ، ۱۹۳۸ء

۴۱۔ قزاقستان: ۱۹۳۸ء کی تقریر، بی بی سی، لندن، ۱۹۳۸ء

۴۲۔ قزاقستان اور آزادی کی تحریک میں ۱۹۳۸ء

۴۳۔ قزاقستان میں چینی دشمنی اور اعلیٰ عہدہ: اراکینِ مسلم لیگ، ۱۹۳۸ء

۴۴۔ قزاقستان میں ۱۹۳۳-۱۹۳۸ء

۴۵۔ قزاقستان میں ۱۹۳۳-۱۹۳۸ء

۴۶۔ قزاقستان میں ۱۹۳۳-۱۹۳۸ء

۴۷۔ مسلم سیاست و تنظیمیں پاکستان و ہند میں (Muslim Politics in the Ind

Sub continent) - پاکستان، ۱۹۳۸ء، ۱۹۳۸ء

The Cultural Future of India (کنسٹن اینس ٹیونز، لکھنؤ، 1928ء)

A Federation of Cultural Zones for India (کنسٹن اینس ٹیونز، 1928ء)

Muslim Problems in India (کنسٹن اینس ٹیونز، 1929ء)

Outlines of a Scheme of Indian Federation (کنسٹن اینس ٹیونز، 1929ء)

پہلی جلد، 1929ء

۳۱۔ برٹش پاکستان پبلسٹی ریسٹس علی سرگودھا کی تقریر، 1947ء میں

۳۲۔ برٹش انڈیا ایگریکچل انڈسٹریل ڈسٹرکٹس کے 53 پر لکھے ہیں کہ ان سے مراد

برٹش ریسٹس علی سرگودھا ہے جہاں کہ پاکستان کا سب سے پہلا برٹش ریسٹس ہے

جی لیگ کی تیار تیار اس وقت لوگوں میں اپنی تنظیم کے سر آپ کو جڑا گیا ہے۔

۳۳۔ برٹش انڈیا میں

۳۴۔ برٹش میں

۳۵۔ القرآن، آل عمران 63

غار تحفہ القرآن، اسلامی سوسائٹی پبلشرز، لاہور

۳۶۔ القرآن، السورۃ 39

۳۷۔ قرآن، انکسٹن اینس ٹیونز، پبلشرز، لاہور

۳۸۔ القرآن، المائدہ

۳۹۔ انکسٹن اینس ٹیونز، پبلشرز، لاہور، 1928ء

۴۰۔ برٹش انڈیا ایگریکچل انڈسٹریل ڈسٹرکٹس، 1928ء

۴۱۔ انکسٹن اینس ٹیونز، پبلشرز، لاہور، 1929ء

۴۲۔ انڈیا ایگریکچل انڈسٹریل ڈسٹرکٹس، 1929ء

۴۳۔ برٹش انڈیا ایگریکچل انڈسٹریل ڈسٹرکٹس، 1929ء

دوستی کی کو اسلوبیہ جلد میں

پیش کردہ پہلی جلد میں ۱۹۹۸

دوسرے جلد میں ڈاکٹر کے طور پر تصدیق و تصدیق کے ساتھ اس کے ساتھ ساتھ اس کے ساتھ ساتھ

۱۹۹۸ میں اس کے ساتھ ساتھ اس کے ساتھ ساتھ اس کے ساتھ ساتھ

۱۹۹۸ میں اس کے ساتھ ساتھ اس کے ساتھ ساتھ اس کے ساتھ ساتھ

۱۹۹۸

۱۹۹۸ میں اس کے ساتھ ساتھ اس کے ساتھ ساتھ اس کے ساتھ ساتھ

۱۹۹۸ میں اس کے ساتھ ساتھ اس کے ساتھ ساتھ اس کے ساتھ ساتھ

۱۹۹۸ میں اس کے ساتھ ساتھ اس کے ساتھ ساتھ اس کے ساتھ ساتھ

۱۹۹۸

۱۹۹۸ میں اس کے ساتھ ساتھ اس کے ساتھ ساتھ اس کے ساتھ ساتھ

تعداد و مراجع

۱۹۹۸ میں اس کے ساتھ ساتھ اس کے ساتھ ساتھ اس کے ساتھ ساتھ

۱۹۹۸ میں اس کے ساتھ ساتھ اس کے ساتھ ساتھ اس کے ساتھ ساتھ

۱۹۹۸ میں اس کے ساتھ ساتھ اس کے ساتھ ساتھ اس کے ساتھ ساتھ

۱۹۹۸ میں اس کے ساتھ ساتھ اس کے ساتھ ساتھ اس کے ساتھ ساتھ

۱۹۹۸ میں اس کے ساتھ ساتھ اس کے ساتھ ساتھ اس کے ساتھ ساتھ

۱۹۹۸ میں اس کے ساتھ ساتھ اس کے ساتھ ساتھ اس کے ساتھ ساتھ

۱۹۹۸ میں اس کے ساتھ ساتھ اس کے ساتھ ساتھ اس کے ساتھ ساتھ

۱۹۹۸ میں اس کے ساتھ ساتھ اس کے ساتھ ساتھ اس کے ساتھ ساتھ

۱۹۔ پاکستان و بھارت میں کی تقسیم کے آئینہ نظارہ، ۱۹۴۷ء، طبع لاہور

۲۰۔ تاریخ پاکستان، جلد اول، سبک گل پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۹۰ء

۲۱۔ تاریخ فریق، جلد اول، فریق، اردو ترجمہ، مولانا الطوفان علی ایچ سرائی پبل

کیشنز، لاہور، ۱۹۸۱ء

۲۲۔ تاریخ فریق، جلد دوم، فریق، اردو ترجمہ، مولانا الطوفان علی ایچ سرائی پبل

کیشنز، لاہور، ۱۹۸۱ء، جلد اول، ۱۹۷۹ء، جلد دوم، ۱۹۸۳ء

۲۳۔ تاریخ فریق، جلد اول، اردو ترجمہ، مولانا الطوفان علی ایچ سرائی پبل

کیشنز، لاہور، ۱۹۸۵ء

۲۴۔ تاریخ فریق، جلد اول، اردو ترجمہ، مولانا الطوفان علی ایچ سرائی پبل

کیشنز، لاہور، ۱۹۸۵ء، جلد دوم، ۱۹۸۶ء

۲۵۔ تاریخ فریق، جلد اول، اردو ترجمہ، مولانا الطوفان علی ایچ سرائی پبل

کیشنز، لاہور، ۱۹۸۵ء

۲۶۔ تاریخ فریق، جلد اول، اردو ترجمہ، مولانا الطوفان علی ایچ سرائی پبل

کیشنز، لاہور، ۱۹۸۵ء، جلد دوم، ۱۹۸۶ء

۲۷۔ تاریخ فریق، جلد اول، اردو ترجمہ، مولانا الطوفان علی ایچ سرائی پبل

کیشنز، لاہور، ۱۹۸۵ء، جلد دوم، ۱۹۸۶ء

۲۸۔ تاریخ فریق، جلد اول، اردو ترجمہ، مولانا الطوفان علی ایچ سرائی پبل

کیشنز، لاہور، ۱۹۸۵ء، جلد دوم، ۱۹۸۶ء

۲۹۔ تاریخ فریق، جلد اول، اردو ترجمہ، مولانا الطوفان علی ایچ سرائی پبل

کیشنز، لاہور، ۱۹۸۵ء، جلد دوم، ۱۹۸۶ء

۳۰۔ تاریخ فریق، جلد اول، اردو ترجمہ، مولانا الطوفان علی ایچ سرائی پبل

اندر گھنٹن سول کی کھل سید محسن، تالیف اولیٰ میر تقی میر نے کیا ہے
سول شیرازی، انگریزی میں لکھی ہے

اندر گھنٹن سول اور تہذیب کے سرساز مقرر، ادارہ سول اور لکھی اور انگریزی میں
ابوالکلام آزاد نے لکھی ہے 1938ء

۱۹۳۱ء میں ایک کتاب لکھی ہے، تالیف و لکھی، ۱۹۳۱ء
میں سول کی تہذیب، ایک کتاب لکھی ہے، ۱۹۳۱ء

اندر گھنٹن سول اور تہذیب کے سرساز مقرر، ادارہ سول اور لکھی اور انگریزی میں
۱۹۳۸ء

اندر گھنٹن سول اور تہذیب کے سرساز مقرر، ادارہ سول اور لکھی اور انگریزی میں
۱۹۳۸ء

II. A Federation of Cultural Zones for India. S.A. Latif
Bandaicad 1938.

III. Draft Declaration For Discussion with Indian
Leaders. circa, March 1942.

IV. India Wins Freedom. Abu-ul-Kalam Azad Calcutta 1950.

V. Now or Never. Ch. Rahmat Ali. Cambridge 1940.

VI. Muslim Problems in India, Asadulla Harnon, Bantbi
1932.

VII. Outline of A scheme of Indian Federation. Saundier
Hyat Khan Lahore 1939.

64. Pakistan and Indian National Unity, G. Adyar.
London 1942.
65. Parliamentary Government in India, B.P.S. Rai
Calcutta 1943.
66. Que'st ce qu'une Nation, Amist Reinar Paris 1942.
67. The Milat of Islam and the Menace of Indianism.
Ch. Rahmat Ali, Cambridge 1940.
68. The Milat and the Mission, 1942.
69. They Must Meet Again, P.c. Jushi Bambi.
70. The Cultural Future of India, S.A. Latif Bambi 1938.

تھیں۔ لیکن یہ تو صرف اس واقعے کے انسانی اور اخلاقی پہلوؤں پر ہی تھے اور اس کی یہ
(اس واقعے پر) اس کا استعمال یہاں ہے صرف یہ کہ اس کی اس طرح کی اس واقعے پر ہی تھے۔
یہ اس کی اس واقعے پر ہی تھے۔ اس واقعے پر ہی تھے۔

اس واقعے پر ہی تھے۔ اس واقعے پر ہی تھے۔ اس واقعے پر ہی تھے۔
اس واقعے پر ہی تھے۔ اس واقعے پر ہی تھے۔ اس واقعے پر ہی تھے۔
اس واقعے پر ہی تھے۔ اس واقعے پر ہی تھے۔ اس واقعے پر ہی تھے۔

اس واقعے پر ہی تھے۔ اس واقعے پر ہی تھے۔ اس واقعے پر ہی تھے۔
اس واقعے پر ہی تھے۔ اس واقعے پر ہی تھے۔ اس واقعے پر ہی تھے۔
اس واقعے پر ہی تھے۔ اس واقعے پر ہی تھے۔ اس واقعے پر ہی تھے۔

اس واقعے پر ہی تھے۔ اس واقعے پر ہی تھے۔ اس واقعے پر ہی تھے۔
اس واقعے پر ہی تھے۔ اس واقعے پر ہی تھے۔ اس واقعے پر ہی تھے۔
اس واقعے پر ہی تھے۔ اس واقعے پر ہی تھے۔ اس واقعے پر ہی تھے۔

اس واقعے پر ہی تھے۔ اس واقعے پر ہی تھے۔ اس واقعے پر ہی تھے۔
اس واقعے پر ہی تھے۔ اس واقعے پر ہی تھے۔ اس واقعے پر ہی تھے۔
اس واقعے پر ہی تھے۔ اس واقعے پر ہی تھے۔ اس واقعے پر ہی تھے۔

اس واقعے پر ہی تھے۔ اس واقعے پر ہی تھے۔ اس واقعے پر ہی تھے۔
اس واقعے پر ہی تھے۔ اس واقعے پر ہی تھے۔ اس واقعے پر ہی تھے۔
اس واقعے پر ہی تھے۔ اس واقعے پر ہی تھے۔ اس واقعے پر ہی تھے۔

اس واقعے پر ہی تھے۔ اس واقعے پر ہی تھے۔ اس واقعے پر ہی تھے۔
اس واقعے پر ہی تھے۔ اس واقعے پر ہی تھے۔ اس واقعے پر ہی تھے۔
اس واقعے پر ہی تھے۔ اس واقعے پر ہی تھے۔ اس واقعے پر ہی تھے۔

انہی میں فرعون نے عظیم فتولان فتولان (۱۹) الاصلیٰ ہوا
 دونوں فرعون کے پاس ہوا کہ وہ سر میں او کے ہوا ان سے ان سے وہ کہو
 انہی میں فرعون نے عظیم فتولان فتولان (۱۹) الاصلیٰ ہوا
 انہی میں فرعون نے عظیم فتولان فتولان (۱۹) الاصلیٰ ہوا

فرمان: قل للظالمین خصوصاً ان افسار ہو (۱۶) انہی میں فرعون نے عظیم فتولان فتولان (۱۹) الاصلیٰ ہوا
 انہی میں فرعون نے عظیم فتولان فتولان (۱۹) الاصلیٰ ہوا
 انہی میں فرعون نے عظیم فتولان فتولان (۱۹) الاصلیٰ ہوا

انہی میں فرعون نے عظیم فتولان فتولان (۱۹) الاصلیٰ ہوا
 انہی میں فرعون نے عظیم فتولان فتولان (۱۹) الاصلیٰ ہوا
 انہی میں فرعون نے عظیم فتولان فتولان (۱۹) الاصلیٰ ہوا

انہی میں فرعون نے عظیم فتولان فتولان (۱۹) الاصلیٰ ہوا
 انہی میں فرعون نے عظیم فتولان فتولان (۱۹) الاصلیٰ ہوا
 انہی میں فرعون نے عظیم فتولان فتولان (۱۹) الاصلیٰ ہوا

انہی میں فرعون نے عظیم فتولان فتولان (۱۹) الاصلیٰ ہوا
 انہی میں فرعون نے عظیم فتولان فتولان (۱۹) الاصلیٰ ہوا
 انہی میں فرعون نے عظیم فتولان فتولان (۱۹) الاصلیٰ ہوا

۱۹۸۱ء میں لکھی گئی تھی۔ یہ کتابیں لکھنے کے وقت کے لیے لکھی گئی تھیں۔
یہ کتابیں لکھنے کے لیے لکھی گئی تھیں۔ ان میں سے کئی کتابیں لکھی گئی تھیں۔
انہی کتابوں میں سے کئی کتابیں لکھی گئی تھیں۔

۱۹۸۱ء میں لکھی گئی تھی۔ یہ کتابیں لکھنے کے وقت کے لیے لکھی گئی تھیں۔
یہ کتابیں لکھنے کے لیے لکھی گئی تھیں۔ ان میں سے کئی کتابیں لکھی گئی تھیں۔
انہی کتابوں میں سے کئی کتابیں لکھی گئی تھیں۔

۱۹۸۱ء میں لکھی گئی تھی۔ یہ کتابیں لکھنے کے وقت کے لیے لکھی گئی تھیں۔
یہ کتابیں لکھنے کے لیے لکھی گئی تھیں۔ ان میں سے کئی کتابیں لکھی گئی تھیں۔
انہی کتابوں میں سے کئی کتابیں لکھی گئی تھیں۔

۱۹۸۱ء میں لکھی گئی تھی۔ یہ کتابیں لکھنے کے وقت کے لیے لکھی گئی تھیں۔
یہ کتابیں لکھنے کے لیے لکھی گئی تھیں۔ ان میں سے کئی کتابیں لکھی گئی تھیں۔
انہی کتابوں میں سے کئی کتابیں لکھی گئی تھیں۔

۱۹۸۱ء میں لکھی گئی تھی۔ یہ کتابیں لکھنے کے وقت کے لیے لکھی گئی تھیں۔
یہ کتابیں لکھنے کے لیے لکھی گئی تھیں۔ ان میں سے کئی کتابیں لکھی گئی تھیں۔
انہی کتابوں میں سے کئی کتابیں لکھی گئی تھیں۔

۱۹۸۱ء میں لکھی گئی تھی۔ یہ کتابیں لکھنے کے وقت کے لیے لکھی گئی تھیں۔
یہ کتابیں لکھنے کے لیے لکھی گئی تھیں۔ ان میں سے کئی کتابیں لکھی گئی تھیں۔
انہی کتابوں میں سے کئی کتابیں لکھی گئی تھیں۔

بسم الله الرحمن الرحيم

الحمد لله الذي جعلنا من عباده المخلصين

والمخلصين من عباده المخلصين

بسم الله الرحمن الرحيم

الحمد لله الذي جعلنا من عباده المخلصين

والمخلصين من عباده المخلصين

بسم الله الرحمن الرحيم

الحمد لله الذي جعلنا من عباده المخلصين

بسم الله الرحمن الرحيم

الحمد لله الذي جعلنا من عباده المخلصين

والمخلصين من عباده المخلصين

بسم الله الرحمن الرحيم

الحمد لله الذي جعلنا من عباده المخلصين

والمخلصين من عباده المخلصين

بسم الله الرحمن الرحيم

الحمد لله الذي جعلنا من عباده المخلصين

والمخلصين من عباده المخلصين

بسم الله الرحمن الرحيم

الحمد لله الذي جعلنا من عباده المخلصين

والمخلصين من عباده المخلصين

بسم الله الرحمن الرحيم

الحمد لله الذي جعلنا من عباده المخلصين

۱۰۰۰
۱۰۰۰
۱۰۰۰
۱۰۰۰

آثار و تراجم

۱- ...
۲- ...
۳- ...

۴- ...
۵- ...

۶- ...
۷- ...
۸- ...

۹- ...
۱۰- ...
۱۱- ...

۱۲- ...
۱۳- ...

۱۴- ...
۱۵- ...
۱۶- ...

مولانا ابوالحسن علی Nadwi صاحب دہلی اور مدرسہ اسلامیہ دہلی
 مولانا ابوالحسن علی Nadwi صاحب دہلی اور مدرسہ اسلامیہ دہلی
 مولانا ابوالحسن علی Nadwi صاحب دہلی اور مدرسہ اسلامیہ دہلی
 مولانا ابوالحسن علی Nadwi صاحب دہلی اور مدرسہ اسلامیہ دہلی

مولانا ابوالحسن علی Nadwi صاحب دہلی اور مدرسہ اسلامیہ دہلی
 مولانا ابوالحسن علی Nadwi صاحب دہلی اور مدرسہ اسلامیہ دہلی
 مولانا ابوالحسن علی Nadwi صاحب دہلی اور مدرسہ اسلامیہ دہلی
 مولانا ابوالحسن علی Nadwi صاحب دہلی اور مدرسہ اسلامیہ دہلی

مولانا ابوالحسن علی Nadwi صاحب دہلی اور مدرسہ اسلامیہ دہلی
 مولانا ابوالحسن علی Nadwi صاحب دہلی اور مدرسہ اسلامیہ دہلی
 مولانا ابوالحسن علی Nadwi صاحب دہلی اور مدرسہ اسلامیہ دہلی
 مولانا ابوالحسن علی Nadwi صاحب دہلی اور مدرسہ اسلامیہ دہلی

مولانا ابوالحسن علی Nadwi صاحب دہلی اور مدرسہ اسلامیہ دہلی
 مولانا ابوالحسن علی Nadwi صاحب دہلی اور مدرسہ اسلامیہ دہلی
 مولانا ابوالحسن علی Nadwi صاحب دہلی اور مدرسہ اسلامیہ دہلی
 مولانا ابوالحسن علی Nadwi صاحب دہلی اور مدرسہ اسلامیہ دہلی

حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بحیثیت معلم

سلام اللہ علیہ وسلم اللہ علیہ وسلم اللہ علیہ وسلم

اللہ علیہ وسلم اللہ علیہ وسلم اللہ علیہ وسلم

میرا نام محمد ہے، میں اللہ کا رسول ہوں۔ اللہ نے تم کو اس کے لیے پیدا کیا ہے کہ تم اس کی راہ میں جہاد کرو۔ اللہ نے تم کو اس کے لیے پیدا کیا ہے کہ تم اس کی راہ میں جہاد کرو۔ اللہ نے تم کو اس کے لیے پیدا کیا ہے کہ تم اس کی راہ میں جہاد کرو۔

اللہ نے تم کو اس کے لیے پیدا کیا ہے کہ تم اس کی راہ میں جہاد کرو۔ اللہ نے تم کو اس کے لیے پیدا کیا ہے کہ تم اس کی راہ میں جہاد کرو۔ اللہ نے تم کو اس کے لیے پیدا کیا ہے کہ تم اس کی راہ میں جہاد کرو۔

اللہ نے تم کو اس کے لیے پیدا کیا ہے کہ تم اس کی راہ میں جہاد کرو۔ اللہ نے تم کو اس کے لیے پیدا کیا ہے کہ تم اس کی راہ میں جہاد کرو۔ اللہ نے تم کو اس کے لیے پیدا کیا ہے کہ تم اس کی راہ میں جہاد کرو۔

اللہ علیہ وسلم

اللہ نے تم کو اس کے لیے پیدا کیا ہے کہ تم اس کی راہ میں جہاد کرو۔ اللہ نے تم کو اس کے لیے پیدا کیا ہے کہ تم اس کی راہ میں جہاد کرو۔ اللہ نے تم کو اس کے لیے پیدا کیا ہے کہ تم اس کی راہ میں جہاد کرو۔

اللہ نے تم کو اس کے لیے پیدا کیا ہے کہ تم اس کی راہ میں جہاد کرو۔ اللہ نے تم کو اس کے لیے پیدا کیا ہے کہ تم اس کی راہ میں جہاد کرو۔ اللہ نے تم کو اس کے لیے پیدا کیا ہے کہ تم اس کی راہ میں جہاد کرو۔

اللہ نے تم کو اس کے لیے پیدا کیا ہے کہ تم اس کی راہ میں جہاد کرو۔ اللہ نے تم کو اس کے لیے پیدا کیا ہے کہ تم اس کی راہ میں جہاد کرو۔ اللہ نے تم کو اس کے لیے پیدا کیا ہے کہ تم اس کی راہ میں جہاد کرو۔

وہاں سے اس کی اولیٰ حضرت آپ کی اولاد جمعیت ہے۔

طاہر جمعیت کا اصل نام

ہاں اہل علم کی اولاد جمعیت کی عظمت کا اصل یہ ہے کہ آپ کے لکھنؤ میں
میں کوئی تھا، وہ آپ کی اولاد ہے، اولیٰ حضرت آپ کے ہاں جمعیت ہے اور
ہوئے ان کے ہاں اہل علم کی اولاد ہے اور ان کے ہاں جمعیت ہے اور ان کے ہاں
وہاں کے لکھنؤ

آپ انہوں میں سے ہیں اور انہوں میں سے ہیں اور انہوں میں سے ہیں
ہاں کے ہاں اہل علم کی اولاد ہے اور ان کے ہاں جمعیت ہے اور ان کے ہاں
تھا اور ان کے ہاں اہل علم کی اولاد ہے اور ان کے ہاں جمعیت ہے اور ان کے ہاں
ان کے ہاں اہل علم کی اولاد ہے اور ان کے ہاں جمعیت ہے اور ان کے ہاں
ہاں کے ہاں اہل علم کی اولاد ہے اور ان کے ہاں جمعیت ہے اور ان کے ہاں
تھا اور ان کے ہاں اہل علم کی اولاد ہے اور ان کے ہاں جمعیت ہے اور ان کے ہاں
ہاں کے ہاں اہل علم کی اولاد ہے اور ان کے ہاں جمعیت ہے اور ان کے ہاں

لکھنؤ میں اس کی اولاد ہے اور ان کے ہاں جمعیت ہے اور ان کے ہاں

محمد اکرم

جمعیت کے لکھنؤ سے جمعیت کا اصل نام (ان کے ہاں) ہے اور ان کے ہاں
ہاں کے ہاں اہل علم کی اولاد ہے اور ان کے ہاں جمعیت ہے اور ان کے ہاں
ہاں کے ہاں اہل علم کی اولاد ہے اور ان کے ہاں جمعیت ہے اور ان کے ہاں
تھا اور ان کے ہاں اہل علم کی اولاد ہے اور ان کے ہاں جمعیت ہے اور ان کے ہاں
ہاں کے ہاں اہل علم کی اولاد ہے اور ان کے ہاں جمعیت ہے اور ان کے ہاں
تھا اور ان کے ہاں اہل علم کی اولاد ہے اور ان کے ہاں جمعیت ہے اور ان کے ہاں
ہاں کے ہاں اہل علم کی اولاد ہے اور ان کے ہاں جمعیت ہے اور ان کے ہاں

وہی ہے جو اسے اس کی تہا سے کے طرفوں کا شعور ہے جو یہاں تک اس کی
کے ساتھ کامیابی سے آگے ہے۔ اسی کے علم کے ساتھ یہ سب کچھ ہے۔
اس کا نام ہے کہ

”طلب العلم من حيث هو كل مستم“ (کے علم کی)
علم کا اصل کتب پر مشتمل ہے اور ہے۔

”وطلب العلم العمل عند الله من الصلوة والصيام والحج والعبادة“
سبب اللہ“ (اس کا نام ہے)

اللہ کے لئے اس کا علم کا سبب لہذا اس کا نام ہے اور اس کا یہ سبب ہے اس کا علم ہے۔
اس کا نام ہے کہ ”طلب العلم عند الله“ علم کا یہ سبب ہے۔
اس کا نام ہے کہ علم کی عظمت کا اعتراف اس سے کیا جاتا ہے کہ یہ علم ہی اللہ کی ہدایت
اس کا نام ہے یہاں تک کہ اس کا نام ہے اس کا نام ہے اور اس کا نام ہے۔
اس کا نام ہے

اس کا نام ہے علم کے اصول میں اس کا نام ہے اس کا نام ہے۔ علم کی ہدایت
اس کا نام ہے اس کا نام ہے۔

- ۱۔ علم
- ۲۔ علم
- ۳۔ علم

علم کا نام ہے اس کا نام ہے اس کا نام ہے اس کا نام ہے۔ اس کا نام ہے اس کا نام ہے۔
اس کا نام ہے اس کا نام ہے اس کا نام ہے اس کا نام ہے۔ اس کا نام ہے اس کا نام ہے۔
اس کا نام ہے اس کا نام ہے اس کا نام ہے اس کا نام ہے۔ اس کا نام ہے اس کا نام ہے۔
اس کا نام ہے اس کا نام ہے اس کا نام ہے اس کا نام ہے۔ اس کا نام ہے اس کا نام ہے۔

ظہورِ حق اور تکبرِ علم کا صلح نامہ کی گائی
آج کے دور میں جو لوگوں میں علم سے کھانچا گیا ہے

مجموعہ

مجموعہ سے مراد وہ علم ہے جسے لوگوں نے اپنی من مانی طور پر
اپنے اپنے انداز میں لکھا ہے۔ جس کی بنیاد پر علم کی اصل ہی میں ہلکا
نکھنہ لگا ہے۔ آج کے دور میں علم کی جگہ علم کی جگہ اور علم کی جگہ
قرآن کی جگہ ہلکا ہے۔ اس کا یہی حال ہے۔

قرآن مجید سورۃ النور آیت ۲۴-۲۵ (ترجمہ)

اے لوگو! جیسے تم نے ہم پر ہلکا کر دیا ہے

اسے، جیسا کہ تم نے انہیں ہلکا کر دیا ہے

اسی طرح تم نے ہم پر ہلکا کر دیا ہے اور انہیں ہلکا کر دیا ہے
اسی طرح تم نے انہیں ہلکا کر دیا ہے

مجموعہ سے مراد وہ علم ہے جسے لوگوں نے اپنی من مانی طور پر
اپنے اپنے انداز میں لکھا ہے۔ جس کی بنیاد پر علم کی اصل ہی میں ہلکا
نکھنہ لگا ہے۔ آج کے دور میں علم کی جگہ علم کی جگہ اور علم کی جگہ
قرآن کی جگہ ہلکا ہے۔ اس کا یہی حال ہے۔

مجموعہ سے مراد وہ علم ہے جسے لوگوں نے اپنی من مانی طور پر
اپنے اپنے انداز میں لکھا ہے۔ جس کی بنیاد پر علم کی اصل ہی میں ہلکا
نکھنہ لگا ہے۔ آج کے دور میں علم کی جگہ علم کی جگہ اور علم کی جگہ
قرآن کی جگہ ہلکا ہے۔ اس کا یہی حال ہے۔

اسلام سے پہلے وہاں ایک عظیم الشان مسجد تھی جس کا نام مسجد کعبہ تھا۔ یہ مسجد
 عرب کے پہلے مسجد تھی۔ اس کے بعد مساجد بننے لگیں۔ یہ مسجد کعبہ ہی تھی جس کا نام
 ہے اس وقت بھی یہ مسجد ہے۔ اس کا نام مسجد کعبہ ہے۔ یہ مسجد کعبہ ہی تھی جس کا نام
 ہے اس وقت بھی یہ مسجد ہے۔

یہ مسجد کعبہ ہی تھی

اس مسجد میں سے کئی کئی مسجدیں بنی ہیں۔ یہ مسجد کعبہ ہی تھی جس کا نام
 ہے اس وقت بھی یہ مسجد ہے۔

- ۱۔ مسجد کعبہ
- ۲۔ مسجد نبوی
- ۳۔ مسجد اقصیٰ
- ۴۔ مسجد حرام
- ۵۔ مسجد اقصیٰ
- ۶۔ مسجد نبوی
- ۷۔ مسجد کعبہ
- ۸۔ مسجد اقصیٰ

آپ کے سوال کے جواب میں یہ مسجدیں ہیں جن کا نام مسجد کعبہ ہے۔
 یہ مسجد کعبہ ہی تھی جس کا نام مسجد کعبہ ہے۔ یہ مسجد کعبہ ہی تھی جس کا نام
 ہے اس وقت بھی یہ مسجد ہے۔

مسجد کعبہ ہی تھی جس کا نام مسجد کعبہ ہے۔ یہ مسجد کعبہ ہی تھی جس کا نام
 ہے اس وقت بھی یہ مسجد ہے۔

سیدنا من اللہ

انک میں اٹھتے کا ایک دن

ہر پورا دن کرنا ہے۔ مطلب یہ کہ وہ اپنے علم اور اپنی فکر سے بھی
بہتر ہے۔ اس دن کا اللہ بھی ہوا ہے جو میں نے کہا ہے کہ اس کا نام ہے علی بن ابی طالب
ہوئے ہیں ان بن ہوشنگ
تھیوت بھی حاکم اور اللہ کے لیے

محبوب بھی ہے ان کے لیے یہ وہ تھیوت ہی کہ وہ حاکم کی تھے اور اللہ ہی
ہیں انکی تھیوت ہی کے یہ کہنے کو تھیوت وہاں کہتی ہیں۔ تھیوت حاکم اور
تھیوت قرآن میں لکھا ہے (انہیں تھیوت کو انہما اور انہما ہے اس کو تھیوت ہی ہے۔ لیکن
ہیں۔ رسول اکرم کی اطاعت قرآن میں ہے اس میں ہے اور وہی ہے۔ اور اللہ ہی ہے

من صلح الرسول فللا اطاع اللہ الا انہما (۱۰)

جس نے رسول کی اطاعت کی وہ اس نے اللہ کی اطاعت کی۔

رسول اکرم کے فرمایا

ان کوئی حاکم اپنی زبان کے عبادت میں اور اللہ کی عبادت میں ہے
اور اسے عبادت ہے تو اللہ تعالیٰ اس کی عبادت ضرور پڑے اور اللہ کو اس سے پہلے
آپوں کے اور اسے عبادت کرنا ہے۔

رسول کے فرمایا

ان میں سے ہر ایک تمہارا ہے اور ہر ایک سے اللہ کی عبادت کے حق رسول کا حاکم
تھیوت کہیں ہے اور اس سے اس کی عبادت کے حق رسول کا اور اللہ ہی ہے اور اللہ
انہوں سے اس نے اس کی عبادت کے حق رسول کا اور اللہ ہی ہے اور اللہ ہی ہے اور اللہ ہی ہے

کہیں جو وہ ان سے ان کی رویت کے بارے میں رسول اللہ کا حکم ایسا آ کر نہ ہو
میں کہیں ہے وہ ان سے ان کی رویت کے بارے میں رسول اللہ کا حکم ایسا آ کر نہ ہو
ان سے ان کی رویت کے بارے میں رسول اللہ کا حکم ایسا آ کر نہ ہو

ہم علی اور عثمان سے روایت کرتے ہیں

رسول اللہ کی روایت میں ہم صحابہ سے روایت کرتے ہیں آپ تک پہنچنے تک ان میں
ان کے بعد ان کا بیان ہے ان کے بعد ان کے مطابق روایات کا بیان کرتے ہیں آپ
یہ ہے کہ ان کا بیان ہے کہ ان کے بیان میں صحیح ہے ان کے بیان میں صحیح ہے
ان سے روایت کرتے ہیں ان سے روایت کرتے ہیں ان سے روایت کرتے ہیں
ان سے روایت کرتے ہیں ان سے روایت کرتے ہیں ان سے روایت کرتے ہیں
ان سے روایت کرتے ہیں ان سے روایت کرتے ہیں ان سے روایت کرتے ہیں

رسول اللہ سے روایت کرتے ہیں

ان سے روایت کرتے ہیں ان سے روایت کرتے ہیں ان سے روایت کرتے ہیں
ان سے روایت کرتے ہیں ان سے روایت کرتے ہیں ان سے روایت کرتے ہیں
ان سے روایت کرتے ہیں ان سے روایت کرتے ہیں ان سے روایت کرتے ہیں
ان سے روایت کرتے ہیں ان سے روایت کرتے ہیں ان سے روایت کرتے ہیں
ان سے روایت کرتے ہیں ان سے روایت کرتے ہیں ان سے روایت کرتے ہیں

عبداللہ اور ابوبکر سے روایت کرتے ہیں

ان سے روایت کرتے ہیں ان سے روایت کرتے ہیں ان سے روایت کرتے ہیں
ان سے روایت کرتے ہیں ان سے روایت کرتے ہیں ان سے روایت کرتے ہیں
ان سے روایت کرتے ہیں ان سے روایت کرتے ہیں ان سے روایت کرتے ہیں
ان سے روایت کرتے ہیں ان سے روایت کرتے ہیں ان سے روایت کرتے ہیں
ان سے روایت کرتے ہیں ان سے روایت کرتے ہیں ان سے روایت کرتے ہیں

تو فریضہ اللہ تعالیٰ کے لیے ہیں جس کی سزا کی انسا نہیں اور علم و عمل کے ساتھ
لا اوت نام میں روزی ہر شے کا کیا عقدا و سلام حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم

ہر شے کا
نعم سبھی کی حالت ہا کہ واقعی دنیا تک کی شریعت کے لیے عقول نہیں
ہے۔ یعنی یہی عقول ہونے کے لیے ہوتی ہیں کہ وہ رحمت ہوتی ہے۔ قرآن مجید نہیں
دیکھو کہ

”یوں کی امامت اللہ کی امامت ہے اور رسول کی یہ عالمی امامت کی باقرہ الی ہے۔“
یہ جو ایک مثالی مسلم کا تصور کرتے ہیں تو بے سالانہ اللہ کی تعلیم نہیں
ماتے۔ اللہ کا رسول ہوتا ہے ہم وہ عمل فرمیں کہ ہر کوئی جانتا آجاتا ہے۔
”ابہ کے لیے“ ”ساعت مجلساً“

اگر ان سب سے مہارنگ کے حق پر غور کیا جائے تو یہ بات ظہور میں آئے گی ہے کہ
فقہ امام کی اولیٰ ہر عقول ہوتے ہیں اور صرف وہی اور صرف وہی اور صرف وہی اور صرف وہی اور
اور اللہ کے علم قرآن پاک کی عملی ترجمہ ہے کہ اللہ کے سامنے رہے اور اللہ کی گزشتہ کے
تجربہ سے رسول بھی نہیں کے کہ آج کی اول پیدا کرتا ہے اور اس کی قربت الہی کا وہاں ہے
ملائے لایع ہے۔

مخالف نے اپنے ہر میں ہرگز طالب علموں اور اساتذہ میں جیسے عقول ہر
ہے تاکہ ایسی ہے وہاں کہ ہے اللہ کے ہر عقول کے ہر عقول اصل علم سے مراد ہیں اور
سائنس اور ہر عقول کے ہر عقول اور اللہ کے ہر عقول اصل علم سے مراد ہیں اور
تو جو ہے کی عمل ہر عقول کے آئی ہوتے ہے ہر عقول اصل علم سے مراد ہیں اور
ہر عقول کے ہر عقول ہر عقول کے آئی ہوتے ہے ہر عقول اصل علم سے مراد ہیں اور
ہر عقول کے ہر عقول ہر عقول کے آئی ہوتے ہے ہر عقول اصل علم سے مراد ہیں اور

ہے یہاں سے اہل فطرت کو یاد ہے کہ انہوں نے اپنی کمالی عمر میں صرف
تو لوگوں کی توجہ سے ان کی رائے کو سامنے لیا ہے اور ان کے
حق میں ان کے لئے سے ان کی رائے کو سامنے لیا ہے اور ان کے لئے
صرف ان کے لئے سے ان کی رائے کو سامنے لیا ہے۔

کہ یہ ہے ان کے لئے سے ان کی رائے کو سامنے لیا ہے۔

ان کے لئے سے ان کی رائے کو سامنے لیا ہے۔

ان کے لئے سے ان کی رائے کو سامنے لیا ہے۔

ان کے لئے سے ان کی رائے کو سامنے لیا ہے۔

ان کے لئے سے ان کی رائے کو سامنے لیا ہے۔
ان کے لئے سے ان کی رائے کو سامنے لیا ہے۔



توحید

ان کے لئے سے ان کی رائے کو سامنے لیا ہے۔

ان کے لئے سے ان کی رائے کو سامنے لیا ہے۔

ان کے لئے سے ان کی رائے کو سامنے لیا ہے۔

ان کے لئے سے ان کی رائے کو سامنے لیا ہے۔
ان کے لئے سے ان کی رائے کو سامنے لیا ہے۔

ان کے لئے سے ان کی رائے کو سامنے لیا ہے۔

ان کے لئے سے ان کی رائے کو سامنے لیا ہے۔

ان کے لئے سے ان کی رائے کو سامنے لیا ہے۔

ان کے لئے سے ان کی رائے کو سامنے لیا ہے۔

ان کے لئے سے ان کی رائے کو سامنے لیا ہے۔

میں نے جو اس کتاب میں لکھا ہے وہ سب سے پہلے میری کتابوں میں سے ہے اور
اس کتاب میں لکھا ہے کہ اس کتاب میں لکھا ہے کہ اس کتاب میں لکھا ہے کہ
اس کتاب میں لکھا ہے کہ اس کتاب میں لکھا ہے کہ اس کتاب میں لکھا ہے کہ

اس کتاب میں لکھا ہے کہ اس کتاب میں لکھا ہے کہ اس کتاب میں لکھا ہے کہ
اس کتاب میں لکھا ہے کہ اس کتاب میں لکھا ہے کہ اس کتاب میں لکھا ہے کہ

پیر ۱۳۲۵ھ

اس کتاب میں لکھا ہے کہ اس کتاب میں لکھا ہے کہ اس کتاب میں لکھا ہے کہ

پیر ۱۳۲۵ھ

اس کتاب میں لکھا ہے کہ اس کتاب میں لکھا ہے کہ اس کتاب میں لکھا ہے کہ

اس کتاب میں لکھا ہے کہ اس کتاب میں لکھا ہے کہ اس کتاب میں لکھا ہے کہ

پیر ۱۳۲۵ھ

اس کتاب میں لکھا ہے کہ اس کتاب میں لکھا ہے کہ اس کتاب میں لکھا ہے کہ

کتابیات

۱۔ قرآن مجید

۲۔ تفسیر قرآن مجید (مجموعہ) مولانا محمد رفیع صاحب دہلوی

۳۔ تفسیر قرآن مجید (مجموعہ) مولانا محمد رفیع صاحب دہلوی

۴۔ تفسیر قرآن مجید (مجموعہ) مولانا محمد رفیع صاحب دہلوی

۵۔ تفسیر قرآن مجید (مجموعہ) مولانا محمد رفیع صاحب دہلوی

رو سے میں آئی تھی

مرا لہو لہا

وہ تو ہے (۱۱) سے (۱۲) تک (۱۱۵)

وہ تو ہے (۱۳) سے (۱۴) تک (۱۱۶)

وہ تو ہے (۱۵) سے (۱۶) تک (۱۱۷)

وہ تو ہے (۱۷) سے (۱۸) تک (۱۱۸)

وہ تو ہے (۱۹) سے (۲۰) تک (۱۱۹)

وہ تو ہے (۲۱) سے (۲۲) تک (۱۲۰)

وہ تو ہے (۲۳) سے (۲۴) تک (۱۲۱)

وہ تو ہے (۲۵) سے (۲۶) تک (۱۲۲)

وہ تو ہے (۲۷) سے (۲۸) تک (۱۲۳)

وہ تو ہے (۲۹) سے (۳۰) تک (۱۲۴)

وہ تو ہے (۳۱) سے (۳۲) تک (۱۲۵)

وہ تو ہے (۳۳) سے (۳۴) تک (۱۲۶)

وہ تو ہے (۳۵) سے (۳۶) تک (۱۲۷)

وہ تو ہے (۳۷) سے (۳۸) تک (۱۲۸)

وہ تو ہے (۳۹) سے (۴۰) تک (۱۲۹)

وہ تو ہے (۴۱) سے (۴۲) تک (۱۳۰)

وہ تو ہے (۴۳) سے (۴۴) تک (۱۳۱)

وہ تو ہے (۴۵) سے (۴۶) تک (۱۳۲)

وہ تو ہے (۴۷) سے (۴۸) تک (۱۳۳)

وہ تو ہے (۴۹) سے (۵۰) تک (۱۳۴)

وہ تو ہے (۵۱) سے (۵۲) تک (۱۳۵)

۶۰. مریض سے ۳۹ درجہ حرارت کی نشانی ہے اور اس کا
سرخ جھلکا ہوا منہ ہے (۱۰۰)

۶۱. مریض کی تپانہ ۱۰۱.۵ ہے (۱۰۱)

۶۲. مریض کی تپانہ ۱۰۱.۵ ہے (۱۰۲)

۶۳. مریض کی تپانہ ۱۰۱.۵ ہے (۱۰۳)

۶۴. مریض کی تپانہ ۱۰۱.۵ ہے (۱۰۴)

۶۵. مریض کی تپانہ ۱۰۱.۵ ہے (۱۰۵)

۶۶. مریض کی تپانہ ۱۰۱.۵ ہے (۱۰۶)

۶۷. مریض کی تپانہ ۱۰۱.۵ ہے (۱۰۷)

۶۸. مریض کی تپانہ ۱۰۱.۵ ہے (۱۰۸)

۶۹. مریض کی تپانہ ۱۰۱.۵ ہے (۱۰۹)

۷۰. مریض کی تپانہ ۱۰۱.۵ ہے (۱۱۰)

۷۱. مریض کی تپانہ ۱۰۱.۵ ہے (۱۱۱)

۷۲. مریض کی تپانہ ۱۰۱.۵ ہے (۱۱۲)

۷۳. مریض کی تپانہ ۱۰۱.۵ ہے (۱۱۳)

۷۴. مریض کی تپانہ ۱۰۱.۵ ہے (۱۱۴)

۷۵. مریض کی تپانہ ۱۰۱.۵ ہے (۱۱۵)

۷۶. مریض کی تپانہ ۱۰۱.۵ ہے (۱۱۶)

۷۷. مریض کی تپانہ ۱۰۱.۵ ہے (۱۱۷)

۷۸. مریض کی تپانہ ۱۰۱.۵ ہے (۱۱۸)

۷۹. مریض کی تپانہ ۱۰۱.۵ ہے (۱۱۹)

- ۱۔ مہنگے سے مہنگے کی مرادیں (۳۳)
- ۲۔ مہنگے سے مہنگے کی مرادیں (۳۳)
- ۳۔ مہنگے سے مہنگے کی مرادیں (۳۳)
- ۴۔ مہنگے سے مہنگے کی مرادیں (۳۳)
- ۵۔ مہنگے سے مہنگے کی مرادیں (۳۳)
- ۶۔ مہنگے سے مہنگے کی مرادیں (۳۳)
- ۷۔ مہنگے سے مہنگے کی مرادیں (۳۳)
- ۸۔ مہنگے سے مہنگے کی مرادیں (۳۳)
- ۹۔ مہنگے سے مہنگے کی مرادیں (۳۳)
- ۱۰۔ مہنگے سے مہنگے کی مرادیں (۳۳)
- ۱۱۔ مہنگے سے مہنگے کی مرادیں (۳۳)
- ۱۲۔ مہنگے سے مہنگے کی مرادیں (۳۳)
- ۱۳۔ مہنگے سے مہنگے کی مرادیں (۳۳)
- ۱۴۔ مہنگے سے مہنگے کی مرادیں (۳۳)
- ۱۵۔ مہنگے سے مہنگے کی مرادیں (۳۳)
- ۱۶۔ مہنگے سے مہنگے کی مرادیں (۳۳)
- ۱۷۔ مہنگے سے مہنگے کی مرادیں (۳۳)
- ۱۸۔ مہنگے سے مہنگے کی مرادیں (۳۳)
- ۱۹۔ مہنگے سے مہنگے کی مرادیں (۳۳)
- ۲۰۔ مہنگے سے مہنگے کی مرادیں (۳۳)
- ۲۱۔ مہنگے سے مہنگے کی مرادیں (۳۳)
- ۲۲۔ مہنگے سے مہنگے کی مرادیں (۳۳)
- ۲۳۔ مہنگے سے مہنگے کی مرادیں (۳۳)

حدیث کی ترویج و اشاعت کے ذرائع

رب کا کلمے کے ساتھ ان کی رشتہ و پیوستہ کے کے انہما اور ان کی ہمت پر
جسے ترویج کیا تھا وہاں اللہ تعالیٰ نے عالم کو نیا، معجزت کو
کو اپنا آئی اور (اسلام) اور آئی کتاب (قرآن کریم) اسے کر تمام عالم کیلئے
یا کر سب سے لہذا ان کتاب کی مشیت کامل عمل دستور، حیات کی ہے۔ اس میں شریعت
انہما کے کہم سہا لکھنا کامل موجود ہے۔ اس کی تفسیر و تکریم کیلئے آنحضرت ﷺ کو قرآن
آنحضرت ﷺ کو اور وہ دنیا ہی تھا ہے۔

وَرَأَيْنَا إِلَيْكَ الْبُكَرَاتِ لِلَّذِينَ مَا نَمُوتُ بِالْجَاهِلِيَّةِ (۱)

ہم نے تجھے طرف دیکھا قرآن لکھا ہے۔ اس کتاب کو ان لوگوں کو
کہاں کرانے میں کی طرف دیکھا ہے۔

پہا لکھنا آنحضرت ﷺ کے تیس سالہ مہد کا ایک ایک کو اس فریضہ کی اہم دہی
میں صحت ہوا اور آپ ﷺ نے اہل و انوال اور اخلاق و کردار کے اور یہ قرآن کریم کی
تفسیر کرانے سے ہے۔ اس کے قرآن کریم کو لکھنے کے لئے ضروری ہے کہ آنحضرت ﷺ
کے بعد اہل و انوال اور اخلاق و کردار کو پیش نظر رکھا جائے گا۔ احادیث کے نام سے
۱۳۷۱ھ میں جس کے بعد قرآن کریم کا کین مشکل ہے بلکہ قرآن کریم کا ایک نسخہ برآمد
کیا ہے۔ احادیث کے بعد کین کین ہی نہیں۔

احادیث رسول کی اس ضرورت و اہمیت اور عظمت و رفعت کے پیش نظر آقا
صلی اللہ علیہ وسلم کے انہما رسولی صحت اور اس کے اہمیت کے ساتھ اور ان کی

پہلی ہی ہفتے کے ساتھ ساتھ ہی کی گزرا، اس وقت کے لئے کہلائی اور وہی ہوں
عقبتاً ۱۲۷۱ھ لایا گیا۔

لیج رونٹ کے تین پہاڑوں سے آگے تھک کر لی ہوئی تھی۔ اس لئے کہ یہی
ہوئی ہوئی تھکاتے تھے تو کھانا کھا کر ان پہاڑوں میں لے گئے اور وہیں ہوں کی
پانے کے لئے کھانسی ہوئی تھی۔
ان دنوں میں کھانا کھانے اور پینے کی ضرورت تھی۔

ان دنوں میں ہی سے کیا کہ اس وقت سے پہلے یہ تھکی ہوئی تھی کہ پہلے پتھر کے تھکانے
کی وجہ سے ساتھ ساتھ کر کے پتھر کے ٹکڑے صرف تھکے ہوئے تھکے تھے کہ ان سے
پتھر کے تھکانے ایک ایک کر کے تھکے تھکانے کے ساتھ ساتھ تھکانے تھکانے
تھکانے تھکانے تھکانے تھکانے تھکانے تھکانے تھکانے تھکانے تھکانے
ان کے تھکانے تھکانے تھکانے تھکانے تھکانے تھکانے تھکانے تھکانے
کے ساتھ ساتھ تھکانے تھکانے

پتھر کے تھکانے تھکانے تھکانے تھکانے تھکانے تھکانے تھکانے تھکانے
تھکانے تھکانے تھکانے تھکانے تھکانے تھکانے تھکانے تھکانے
تھکانے تھکانے تھکانے تھکانے تھکانے تھکانے تھکانے تھکانے

تھکانے تھکانے تھکانے تھکانے تھکانے تھکانے تھکانے تھکانے
تھکانے تھکانے تھکانے تھکانے تھکانے تھکانے تھکانے تھکانے
تھکانے تھکانے تھکانے تھکانے تھکانے تھکانے تھکانے تھکانے
تھکانے تھکانے تھکانے تھکانے تھکانے تھکانے تھکانے تھکانے
تھکانے تھکانے تھکانے تھکانے تھکانے تھکانے تھکانے تھکانے

عورت بھڑائی اور اٹھتی رہا کرتے ہیں

میں ایک مرتبہ میرا ملائی علی بن ابی طالب کے ساتھ حضرت عائشہ سے ملنے
آئے تھے اور ان سے پوچھا کہ کیا آپ مجھے لگاتے ہیں تو حضرت عائشہ نے
میں آپ کو بچانے تو نہیں ہند مجھے انکا وہ ہے کہ آئے سے ساتواں سال پہلے میں اہلبیت
علی بن ابی طالب کی مجلس کے پاس آیا تھا۔ ان دنوں ان کے ہاں ایک بچہ پیدا ہوا
میں اس بچہ کو ہند میں نبوت کران کی مروجہ (مطالعہ) میں آئے کے ہاں سے کہا ہے کہ
میرا بیٹا ہوا تو صرف یہاں میں نے دیکھے تھے تمہارا بیٹا اس بچے کے ہاں سے
پیدا ہوا ہے۔

ان بھڑائی بہانے ال حرب میں وقت کے ساتھ اول نمون کو سب تو فرماں میں
کئے کہ یہاں تک ہے۔ اور (مہتمم) جو آفری انحراف نام ہے کے ہاں سے
مطلوب ہے کہ وہ اس بات کو بھلا رہا کہ وہ ان کثرت سے آتا ہے۔ ان خیال سے کہ
کئی ایک سے بہتر دیکھنے لگیں (۵)۔

پانچ نکات کی طرف عام بھکاری اور ملاحظہ انکار کی بہانے ال حرب میں
تلاش ہے۔ ان سے جب حضرت علی نے انکار کا آغاز کیا اس وقت تک
پہلے کہ ان سے تم کو ہند میں آئیے لوگ ہے برکتنا چھوٹا ہائے اس۔ ان سے
نے میں ان میں کا انکار کیا ہے جو اس وقت گھبراہٹ میں ہائے ہے (۶)۔ بیکر ہار
اللہ کے جہاں میں انکار کیا ہے (۷)۔ بعد وہاں میں سماج کو ہم میں اجازت ہے
کئے کہ ان میں انکار کیا ہے (۸)۔ بعد وہاں میں سماج کو ہم میں اجازت ہے
وہ نہیں ہے۔ اور حضرت علی کے ہاں ہند میں کہہ کر پتے تھے۔ اور جنہیں اجازت
تو آپ علی بن ابی طالب نے فرماتے تھے اس سے حضرت علی بن ابی طالب کی اجازت کرتے
میں اجازت ہے (۹)۔

عورت
بھڑائی

آنحضرت ﷺ کی افکار و حکمتوں کی روشنی سے ایک دن کو انھیں مرجع الہیاتے
یعنی آپ کا نام پڑا جس کو انھیں اپنے کے بعد اسی کے لئے آپ کا نام پڑا

انظروا لغير واد من ورا لکم (۱۰)

یہ دیکھ لو کہ وہ لوگ ہیں جن کی طرف

موجہ رہا آپ کا نام پڑا کہ ہم ان کو اپنے لئے لیا

وایبغ الثلث الثالث (۱۱)

یہ وہ ہے جو تیسرا ہے اور تیسرا ہے جو تیسرا ہے

پہلے پہلے کہ ہم نے اس لڑائی کی ہولناکی کے لئے آپ ہی میں پہلی طرف کر لی
تیسرا ہے جو تیسرا ہے جو تیسرا ہے جو تیسرا ہے جو تیسرا ہے جو تیسرا ہے جو تیسرا ہے

و حضرت ابن عباس کہ فرماتے ہیں

کنا قلوباً مع السریرة نفسی ان تکون مستین رجلاً

ہم سب دل کے ساتھ سر کے ساتھ نفسی ان تکون مستین رجلاً

کنا ذریراً مع قلبینا (۱۲)

ہم سب دل کے ساتھ ہیں جس کے لئے ہیں ہمیں وہاں کا سر

ہم سب دل کے ساتھ ہیں کہ آپ کے ساتھ ہیں کہ آپ کے ساتھ ہیں کہ آپ کے ساتھ ہیں

ہم سب دل کے ساتھ ہیں کہ آپ کے ساتھ ہیں کہ آپ کے ساتھ ہیں کہ آپ کے ساتھ ہیں

ہم سب دل کے ساتھ ہیں کہ آپ کے ساتھ ہیں کہ آپ کے ساتھ ہیں کہ آپ کے ساتھ ہیں

و ان دنوں وہاں کرتے ہیں

”سیدنا“ کے لئے ہے کہ آپ کے ساتھ ہیں کہ آپ کے ساتھ ہیں کہ آپ کے ساتھ ہیں

کہا کہ میں اس کی وجہ سے لڑائی سے بچاؤ تھا کہ یہ لڑائی
 میں لڑنے سے ہی عزت ہو جائے تو اس سے بچاؤ میں کسی نے یہاں پہلے ہو سکتا
 ہے آپ اور کہ تم نے لڑائی لڑائی سے بچاؤ تھا کہ اس سے بچاؤ تھا کہ اس سے
 یہ ہم غصہ رہیں اور کہ اس سے بچاؤ تھا کہ اس سے بچاؤ تھا کہ اس سے
 بچاؤ تھا کہ اس سے بچاؤ تھا کہ اس سے بچاؤ تھا کہ اس سے بچاؤ تھا کہ اس سے
 بچاؤ تھا کہ اس سے بچاؤ تھا کہ اس سے بچاؤ تھا کہ اس سے بچاؤ تھا کہ اس سے
 بچاؤ تھا کہ اس سے بچاؤ تھا کہ اس سے بچاؤ تھا کہ اس سے بچاؤ تھا کہ اس سے
 بچاؤ تھا کہ اس سے بچاؤ تھا کہ اس سے بچاؤ تھا کہ اس سے بچاؤ تھا کہ اس سے

۳۔ حضرت روایتی باب نے آنحضرت ﷺ سے دعا پڑھ کر کے آپ ﷺ کو
 کہ آپ ﷺ نے اس کی اصلاح کی (عاشق)

۴۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے آنحضرت ﷺ کا خطبہ پڑھا یا پڑھا اور حضرت
 ہی سے کہہ کر (عاشق) حضرت سے کہہ کر (عاشق) حضرت سے کہہ کر (عاشق)
 کے مالک ہی اجازت تھے۔

آنحضرت ﷺ کی طرف سے سب سے پہلے کہہ کر (عاشق) حضرت سے کہہ کر (عاشق)
 یہاں کہہ کر (عاشق) حضرت سے کہہ کر (عاشق) حضرت سے کہہ کر (عاشق)
 یہاں کہہ کر (عاشق) حضرت سے کہہ کر (عاشق) حضرت سے کہہ کر (عاشق)
 یہاں کہہ کر (عاشق) حضرت سے کہہ کر (عاشق) حضرت سے کہہ کر (عاشق)
 یہاں کہہ کر (عاشق) حضرت سے کہہ کر (عاشق) حضرت سے کہہ کر (عاشق)
 یہاں کہہ کر (عاشق) حضرت سے کہہ کر (عاشق) حضرت سے کہہ کر (عاشق)

تفسیر اللہ امر باسبع ما حدیثنا لخطہ حقہ بملفہ (۱۷)

تفسیر اللہ امر باسبع ما حدیثنا لخطہ حقہ بملفہ (۱۷)
 تفسیر اللہ امر باسبع ما حدیثنا لخطہ حقہ بملفہ (۱۷)
 تفسیر اللہ امر باسبع ما حدیثنا لخطہ حقہ بملفہ (۱۷)
 تفسیر اللہ امر باسبع ما حدیثنا لخطہ حقہ بملفہ (۱۷)

تخبر الله انهم سمعوا ما لم يسمعوا وعلما بما لم يعلموا (١٨)
جو تو ان سے کہے گا ان سے کہے گا ان سے کہے گا ان سے کہے گا
ان لوگوں تک نہ پکڑے۔

ان لوگوں تک نہ پکڑے ان لوگوں تک نہ پکڑے ان لوگوں تک نہ پکڑے
پہلے تو وہ کہتے تھے ان کی طاقت لڑائی لڑا ہے ان سے کہے گا ان سے کہے گا
یہ سب کا نام نہ پکڑے۔

جو کہ تم نے ان لوگوں تک نہ پکڑے ان لوگوں تک نہ پکڑے
ان لوگوں تک نہ پکڑے ان لوگوں تک نہ پکڑے ان لوگوں تک نہ پکڑے

جو کہ تم نے ان لوگوں تک نہ پکڑے ان لوگوں تک نہ پکڑے
ان لوگوں تک نہ پکڑے ان لوگوں تک نہ پکڑے ان لوگوں تک نہ پکڑے
ان لوگوں تک نہ پکڑے ان لوگوں تک نہ پکڑے ان لوگوں تک نہ پکڑے

ان لوگوں تک نہ پکڑے ان لوگوں تک نہ پکڑے
ان لوگوں تک نہ پکڑے ان لوگوں تک نہ پکڑے ان لوگوں تک نہ پکڑے
ان لوگوں تک نہ پکڑے ان لوگوں تک نہ پکڑے ان لوگوں تک نہ پکڑے

ان لوگوں تک نہ پکڑے ان لوگوں تک نہ پکڑے
ان لوگوں تک نہ پکڑے ان لوگوں تک نہ پکڑے ان لوگوں تک نہ پکڑے
ان لوگوں تک نہ پکڑے ان لوگوں تک نہ پکڑے ان لوگوں تک نہ پکڑے

ان لوگوں تک نہ پکڑے ان لوگوں تک نہ پکڑے
ان لوگوں تک نہ پکڑے ان لوگوں تک نہ پکڑے ان لوگوں تک نہ پکڑے
ان لوگوں تک نہ پکڑے ان لوگوں تک نہ پکڑے ان لوگوں تک نہ پکڑے

عزت ان لوگوں کے لئے ہے

کے لئے ان لوگوں کے لئے انصاف سے انصاف لہذا انصاف

ہوئے ان لوگوں کے لئے انصاف (۱۶)

ان لوگوں کے لئے انصاف سے انصاف لہذا انصاف

ان لوگوں کے لئے انصاف سے انصاف لہذا انصاف

ان لوگوں کے لئے انصاف سے انصاف لہذا انصاف

ان لوگوں کے لئے انصاف سے انصاف لہذا انصاف

ان لوگوں کے لئے انصاف سے انصاف لہذا انصاف

ان لوگوں کے لئے انصاف سے انصاف لہذا انصاف

ان لوگوں کے لئے انصاف سے انصاف لہذا انصاف

ان لوگوں کے لئے انصاف سے انصاف لہذا انصاف

ان لوگوں کے لئے انصاف سے انصاف لہذا انصاف

ان لوگوں کے لئے انصاف سے انصاف لہذا انصاف

ان لوگوں کے لئے انصاف سے انصاف لہذا انصاف

ان لوگوں کے لئے انصاف سے انصاف لہذا انصاف

ان لوگوں کے لئے انصاف سے انصاف لہذا انصاف

ان لوگوں کے لئے انصاف سے انصاف لہذا انصاف

ان لوگوں کے لئے انصاف سے انصاف لہذا انصاف

ان لوگوں کے لئے انصاف سے انصاف لہذا انصاف

ان لوگوں کے لئے انصاف سے انصاف لہذا انصاف

سیدھا کہہ لیا کہ میں نے کبھی ایسا نہیں کیا ہے۔

حضرت میں تو اس سے حائل ہے

زیر العینیت و لفظ کفر (۳۱)

سیدھا کہہ لیا کہ میں نے کبھی ایسا نہیں کیا ہے۔

یہ آپ کا کمال ہے

إيا سنعلم منا عدونا فظانكروا ونبينكم (۳۲)

یہ ہم سے جس سے ہم نے کفر کی نافرمانی کی ہے

حضرت ہمیں ہی اپنے اللہ کو نافرمان کی سچھی کیا کرتے تھے۔ حضرت

(۳۳) اور اولیٰ (۳۴) اور مردوں کی تہ (۳۵) اپنے ملازمہ کو چھت کرتے

ہوئے فرماتے ہیں۔

كذلكوا العديت فان نكروا حينئذ (۳۳)

سیدھا کہہ لیا کہ میں نے کبھی ایسا نہیں کیا ہے۔

نام رسول فرماتے ہیں

آفة العلم التنبيه وترك التذكرة (۳۴)

عقلی سمجھ لیں وہ رسول اللہ کا ہے۔

حضرت ہمیں سچ ہمیں نہ صرف اپنے ملازمہ کو نافرمان کا مشورہ دیتے تھے

بلکہ انہی آئینوں کو نافرمان کرتے تھے۔ عطاء بن ابی رباح (۳۶) فرماتے ہیں

كنا نأمر جابر بن عبد الله فإذا خرجنا من عندنا

فأمرنا فقلنا لئو الزبير أحفظنا لعديت (۳۵)

ہم انہی کو ہم نے جابر بن عبد اللہ سے فرمایا کہ اگر ہم نے کبھی ایسا نہیں کیا ہے۔

اور اس کے ساتھ ساتھ اس کے ساتھ ہے

اور اس کے ساتھ ساتھ ہے

کتاب صبح الصبیحان فصل ۱۲ (۳۹)

اور اس کے ساتھ ساتھ ہے

اور اس کے ساتھ ساتھ ہے

کتاب صبح الصبیحان فصل ۱۲ (۳۹)

اور اس کے ساتھ ساتھ ہے

اور اس کے ساتھ ساتھ ہے

اور اس کے ساتھ ساتھ ہے

کتاب صبح الصبیحان فصل ۱۲ (۳۹)

اور اس کے ساتھ ساتھ ہے

اور اس کے ساتھ ساتھ ہے

اور اس کے ساتھ ساتھ ہے

اور اس کے ساتھ ساتھ ہے

اور اس کے ساتھ ساتھ ہے

اور اس کے ساتھ ساتھ ہے

اور اس کے ساتھ ساتھ ہے

اور اس کے ساتھ ساتھ ہے

کتاب صبح الصبیحان فصل ۱۲ (۳۹)

اور اس کے ساتھ ساتھ ہے

پہلے کا اندازہ لگا کر کیا جاتا ہے۔ لیکن اس سے پہلے ہی کہہ دیا ہے کہ اس سے پہلے ہی
کہا گیا ہے۔

زبان سے کہیں کہیں اس کے لیے پہلے ہی کہی گئی ہے کہ اس سے پہلے ہی
کہا گیا ہے۔

یہ کہتے ہیں کہ اس کے لیے پہلے ہی کہی گئی ہے کہ اس سے پہلے ہی
کہا گیا ہے۔

یہ کہتے ہیں کہ اس کے لیے پہلے ہی کہی گئی ہے کہ اس سے پہلے ہی
کہا گیا ہے۔

یہ کہتے ہیں کہ اس کے لیے پہلے ہی کہی گئی ہے کہ اس سے پہلے ہی
کہا گیا ہے۔

یہ کہتے ہیں کہ اس کے لیے پہلے ہی کہی گئی ہے کہ اس سے پہلے ہی
کہا گیا ہے۔

یہ کہتے ہیں کہ اس کے لیے پہلے ہی کہی گئی ہے کہ اس سے پہلے ہی
کہا گیا ہے۔

یہ کہتے ہیں کہ اس کے لیے پہلے ہی کہی گئی ہے کہ اس سے پہلے ہی
کہا گیا ہے۔

یہ کہتے ہیں کہ اس کے لیے پہلے ہی کہی گئی ہے کہ اس سے پہلے ہی
کہا گیا ہے۔

یہ کہتے ہیں کہ اس کے لیے پہلے ہی کہی گئی ہے کہ اس سے پہلے ہی
کہا گیا ہے۔

ہاں تو ان لوگوں کو کہہ دیا کہ تم ان لوگوں کے ساتھ نہ جاؤ جو تمہارے
پر ایمان نہیں لائے اور ان لوگوں سے تمہاری قوم کو الگ کر دیا
جو تمہارے ساتھ نہیں ہے۔ (۵۰) ان لوگوں کو کہہ دیا کہ تم ان لوگوں سے
بچو جو تمہارے ساتھ نہیں ہے۔

ان لوگوں نے کہا کہ ہم ان لوگوں سے نہیں بچ سکتے ہیں۔
پھر ان لوگوں کو کہہ دیا کہ تم ان لوگوں سے بچو جو تمہارے ساتھ
نہیں ہے۔

پھر ان لوگوں کو کہہ دیا کہ تم ان لوگوں سے بچو جو تمہارے ساتھ
نہیں ہے۔ اور ان لوگوں سے تمہاری قوم کو الگ کر دیا جو تمہارے
ساتھ نہیں ہے۔ (۵۱) ان لوگوں کو کہہ دیا کہ تم ان لوگوں سے بچو جو
تمہارے ساتھ نہیں ہے۔

پھر ان لوگوں کو کہہ دیا کہ تم ان لوگوں سے بچو جو تمہارے ساتھ
نہیں ہے۔ اور ان لوگوں سے تمہاری قوم کو الگ کر دیا جو تمہارے
ساتھ نہیں ہے۔ (۵۲) ان لوگوں کو کہہ دیا کہ تم ان لوگوں سے بچو جو
تمہارے ساتھ نہیں ہے۔

ان لوگوں کو کہہ دیا کہ تم ان لوگوں سے بچو جو تمہارے ساتھ نہیں ہے۔ (۵۳)

پھر ان لوگوں کو کہہ دیا کہ تم ان لوگوں سے بچو جو تمہارے ساتھ نہیں ہے۔

پھر ان لوگوں کو کہہ دیا کہ تم ان لوگوں سے بچو جو تمہارے ساتھ نہیں ہے۔
پھر ان لوگوں کو کہہ دیا کہ تم ان لوگوں سے بچو جو تمہارے ساتھ نہیں ہے۔
(۵۴) ان لوگوں کو کہہ دیا کہ تم ان لوگوں سے بچو جو تمہارے ساتھ نہیں ہے۔

پھر ان لوگوں کو کہہ دیا کہ تم ان لوگوں سے بچو جو تمہارے ساتھ نہیں ہے۔
پھر ان لوگوں کو کہہ دیا کہ تم ان لوگوں سے بچو جو تمہارے ساتھ نہیں ہے۔

پھر ان لوگوں کو کہہ دیا کہ تم ان لوگوں سے بچو جو تمہارے ساتھ نہیں ہے۔
پھر ان لوگوں کو کہہ دیا کہ تم ان لوگوں سے بچو جو تمہارے ساتھ نہیں ہے۔

مذہب صحابہ کرام میں لکھتے تھے کہ اللہ تعالیٰ فرمایا ہے کہ

مراہن کے ساتھ عورتوں کے لیے آنحضرت ﷺ سے پہلے لکھے گئے کہ ان کے لیے
لی لکھے آپ ﷺ نے ان کو فرمایا ہے ان کے لیے ایک دن عیسوی کرہ (۱۹۹۱) لکھے
کی ان کو عیسوی کے لیے لکھیں کہ ان کو عیسوی کے ساتھ لکھتے عیسوی لکھی
پہلے عیسوی لکھے تھے عیسوی عیسوی لکھتے ہیں

كَلِمَاتٍ مِّنْ لَّدُنِّي يَسْعَى الْكَافِرُ بِهَا كَمَا كَانَ يَفْعَلُ (۲۹)

عمر اللہ تعالیٰ کے پاس لکھے گئے کہ آپ ﷺ سے پہلے لکھے گئے ہیں

ایک نامی نامی میں عیسوی لکھتے ہیں اور لکھتے ہیں

يَسْعَى الْكَافِرُ بِهَا كَمَا كَانَ يَفْعَلُ (۳۰)

بہ عیسوی لکھتے تھے کہ عیسوی لکھتے تھے

عورتوں کے ساتھ ان عورتوں میں شامل ہیں جنی آنحضرت ﷺ کی عیسوی
پہلے آنحضرت ﷺ سے عورت لکھی گئی کہ آپ ﷺ سے پہلے عیسوی میں عیسوی لکھے
کی ان میں عیسوی اور عیسوی

اَلَيْسَ رَسُوْلُ اللّٰهِ كَلَّمَ اَبِيْنَ اَرْوَابِ مِنْ حَيْثُكَ فَارْتَبِ اَنْ

اَسْتَعِيْنَ بِكَلِمَاتٍ يَدِيْ مَعَ قَلْبِيْ اِنْ رَأَيْتَ ذٰلِكَ فَقُلْ رَسُوْلُ اللّٰهِ

اِنْ كَانَ حَقِيْقِيْ ثُمَّ اَسْتَعِيْنَ بِكَلِمَاتٍ مَّعَ قَلْبِكَ (۳۱)

و اقول ان لکھے گئے ہیں کہ آپ کی عیسوی عیسوی عیسوی

تے کر کے ساتھ ساتھ اپنے ہاتھ سے یہ لکھیں کہ آپ ﷺ سے پہلے لکھے گئے تھے

ہل ان لکھے گئے ہیں کہ عیسوی عیسوی لکھتے ہیں کہ عیسوی لکھے گئے تھے

تے کی عیسوی لکھتے تھے

ہی اہل بیت کے ہر فرد کو اپنی طرف سے دعا ہے کہ وہ اللہ کے فضل سے ہمیشہ محفوظ رہیں اور اللہ کے فضل سے ہمیشہ محفوظ رہیں۔
وہی اللہ کے فضل سے ہمیشہ محفوظ رہیں اور اللہ کے فضل سے ہمیشہ محفوظ رہیں۔

صفحہ (۱۳)

ترجمہ: اللہ کے فضل سے ہمیشہ محفوظ رہیں اور اللہ کے فضل سے ہمیشہ محفوظ رہیں۔

اللہ کے فضل سے ہمیشہ محفوظ رہیں اور اللہ کے فضل سے ہمیشہ محفوظ رہیں۔
اللہ کے فضل سے ہمیشہ محفوظ رہیں اور اللہ کے فضل سے ہمیشہ محفوظ رہیں۔

اللہ کے فضل سے ہمیشہ محفوظ رہیں اور اللہ کے فضل سے ہمیشہ محفوظ رہیں۔
اللہ کے فضل سے ہمیشہ محفوظ رہیں اور اللہ کے فضل سے ہمیشہ محفوظ رہیں۔

اللہ کے فضل سے ہمیشہ محفوظ رہیں اور اللہ کے فضل سے ہمیشہ محفوظ رہیں۔
اللہ کے فضل سے ہمیشہ محفوظ رہیں اور اللہ کے فضل سے ہمیشہ محفوظ رہیں۔

اللہ کے فضل سے ہمیشہ محفوظ رہیں اور اللہ کے فضل سے ہمیشہ محفوظ رہیں۔
اللہ کے فضل سے ہمیشہ محفوظ رہیں اور اللہ کے فضل سے ہمیشہ محفوظ رہیں۔

اللہ کے فضل سے ہمیشہ محفوظ رہیں اور اللہ کے فضل سے ہمیشہ محفوظ رہیں۔

اللہ کے فضل سے ہمیشہ محفوظ رہیں اور اللہ کے فضل سے ہمیشہ محفوظ رہیں۔
اللہ کے فضل سے ہمیشہ محفوظ رہیں اور اللہ کے فضل سے ہمیشہ محفوظ رہیں۔

اللہ کے فضل سے ہمیشہ محفوظ رہیں اور اللہ کے فضل سے ہمیشہ محفوظ رہیں۔
اللہ کے فضل سے ہمیشہ محفوظ رہیں اور اللہ کے فضل سے ہمیشہ محفوظ رہیں۔
اللہ کے فضل سے ہمیشہ محفوظ رہیں اور اللہ کے فضل سے ہمیشہ محفوظ رہیں۔

یہ لفظاں ہر کئی جگہ لکھی ہیں (۱۱۵)

عورتوں میں سے ان کے لئے فرماتے ہیں کہ عورتوں کو ہونٹوں سے اپنی زبانیں بند کر
کر رکھنے سے وہ اپنی زبان سے اللہ کے نام کے لئے سونے سے بڑھ کر اچھا ہے۔
عورتوں میں سے یہ باتوں سے کیا کرتے تھے

یا ایہی لیلوا اللہ مالکتہ (۱۱۶)

(یعنی اللہ سے دعا کرو کہ وہ تم کو اپنا مالک بنا دے)

یہ عورتوں میں سے اپنے شوہروں کو اللہ کے لئے وقف کر دینے کے لئے تھیں جب میں نے
ان کو وہ باتیں کہیں تو آپ نے یہ کہیں کہ تم لوگوں کے سامنے ان کو اپنے شوہر کے
لئے اللہ کی عبادت سے دعا کرو کہ تمہارا رسول اللہ اور تمہارا
خدا (۱۱۷)

یہ وہ عبادت تھی جو میں نے رسول اللہ سے سیکھی تھی اور
آپ کے سامنے بھی لکھی تھی۔

عورتوں میں سے ایک عورت نے کہا کہ میں نے تمہیں کہنا سیکھا ہے کہ تم
کہو اور تمہارا اللہ تمہارا مالک بنے اور تمہارا اللہ تمہارا مالک بنے اور تمہارا
خدا (۱۱۸)

تمہارا اللہ تمہارا مالک بنے اور تمہارا اللہ تمہارا مالک بنے اور تمہارا
خدا (۱۱۹)

عورتوں میں سے یہ باتوں سے کیا کرتے تھے

لیلوا اللہ مالکتہ (۱۲۰)

علاوہ اس کے کہ ان کے لئے ہرگز نہ ہوتا۔ ہفتاد آیت رسول اللہ ﷺ
- (۱۰۴) میں رسول اللہ ﷺ کی طرف سے لکھا ہے کہ

میں نے کرم حضرت ﷺ کے لئے لکھا ہے کہ ان کی اولاد اور اولاد میں
میں نے لکھا ہے کہ میں نے اپنے سر پر لکھا ہے کہ میں نے اپنی اولاد میں
لکھا ہے کہ میں نے لکھا ہے کہ میں نے لکھا ہے کہ میں نے لکھا ہے کہ
میں نے لکھا ہے کہ میں نے لکھا ہے کہ میں نے لکھا ہے کہ میں نے لکھا ہے کہ
میں نے لکھا ہے کہ میں نے لکھا ہے کہ میں نے لکھا ہے کہ میں نے لکھا ہے کہ
میں نے لکھا ہے کہ میں نے لکھا ہے کہ میں نے لکھا ہے کہ میں نے لکھا ہے کہ
میں نے لکھا ہے کہ میں نے لکھا ہے کہ میں نے لکھا ہے کہ میں نے لکھا ہے کہ
میں نے لکھا ہے کہ میں نے لکھا ہے کہ میں نے لکھا ہے کہ میں نے لکھا ہے کہ

حوالہ جات

(14)
(15)
(16)
(17)
(18)
(19)
(20)

- (1) ابن سنیہ
- (2) ترمذی، جامع ترمذی، ص ۱۰۱
- (3) قانون، ص ۱۰۱
- (4) جامع ترمذی، ص ۱۰۱
- (5) جامع ترمذی، ص ۱۰۱
- (6) جامع ترمذی، ص ۱۰۱
- (7) جامع ترمذی، ص ۱۰۱
- (8) جامع ترمذی، ص ۱۰۱
- (9) جامع ترمذی، ص ۱۰۱

۱۱

- (10) جامع ترمذی، ص ۱۰۱

۱۲

- (11) جامع ترمذی، ص ۱۰۱
- (12) جامع ترمذی، ص ۱۰۱
- (13) جامع ترمذی، ص ۱۰۱

- (14) جامع ترمذی، ص ۱۰۱

- (15) جامع ترمذی، ص ۱۰۱

۱۳

- (16) جامع ترمذی، ص ۱۰۱

- (17) جامع ترمذی، ص ۱۰۱

ہوتے ہیں تو ان کے حقوق ادا ہے کہ تو اس کے خلاف ان لوگوں سے ان کو مل جائے
 یہی ان دولت آسمان کے حقوق پر چاہئے۔

وفاقی ہوتی تو ہے۔ اور ان امور و اسباب سے ہی ظلم ہوتا۔

ان کے علاوہ ان کی دولت کے بعد ان کی اولاد کے ساتھ ان کے بچے ان
 کی بیویوں کے بھی مالک بن جاتے تھے۔ لیکن ان کو دولت کا حق حاصل نہ تھا۔ جب کے
 میں لپٹے پھاڑنے کی صورت میں مومن ان کو سزا سے باز رکھ دیتے تھے اور ان
 پر تکلیف نہیں تھی بلکہ مال کے طور کے لیے تو سزا دیکھتے، لیکن ان کو سزا
 سے باز رکھنے کی برکت اہانت تھی۔ نہ غسل کر سکتے تھے نہ نہانے کی اجازت تھی۔
 نہ کھانا کھا سکتے تھے نہ خیرات دینے کی اجازت تھی۔ بلکہ ایک سال پہلے کے
 پیر کو سزا دینے کے لیے سے ان کو سزا دینے کے آگے میں دیکھنے کی کھڑکی تھی
 نہ کھانے پانی میں پیر کو سزا دینے کی اجازت تھی نہ کھانے کا نام اعلان کیا جاتا

(۱)

جو وہاں میں مومنوں کے ساتھ تھے وہ مالک اور مالدار تھے اور سزا
 کے ہوتے تھے انہیں سزا کر لینا کا بغیر سزا کے ہے۔ اور وہاں میں سزا کے نام
 تو کہہ دیتے تھے ان کی سزا کی پوجا کرتے اور ان کے سزا کے بعد ان کی اولاد
 کی آگ کے مسموم پر سزا دیتے کرتی ہو جاتے۔ ان کے کوئی حق نہ تھے، کوئی کام
 نہ کر سکتے تھے اور ان کو سزا دینا تو ہر قسم کے نام نہ تھے بلکہ انہیں سزا
 دینے کے نام پر پھرتے رہتے۔

گر وہاں میں سزا کو پوجا کرتے تھے اور ان کے سزا دینے کو سزا کی
 سزا سے آزاد کر کے سزا کی پوجا کرتے تھے اور ان کے سزا دینے کو سزا
 سزا کی سزا دینے کے پیر سے سزا دینے کو سزا دینے کو سزا دینے کو سزا

سودا کی ہیں اور انہوں کو ان کے اہل گھر اور اولاد کا نام سے پکارا جاتا ہے۔
 انہیں گھر کا اہل گھر اور اہل گھر کے نام سے پکارا جاتا ہے اور انہیں گھر کا اہل گھر
 میں سے ہونے پکڑ دیا جاتا ہے اور انہیں گھر کا اہل گھر کے نام سے پکارا جاتا ہے اور انہیں گھر کا اہل گھر
 خالق پہلے ہی لڑائی کی حالت میں ہوتی ہے اور انہیں گھر کا اہل گھر کے نام سے پکارا جاتا ہے اور انہیں گھر کا اہل گھر
 تمام دہائی زندگی کے تمام دنوں کے نام سے پکارا جاتا ہے اور انہیں گھر کا اہل گھر کے نام سے پکارا جاتا ہے اور انہیں گھر کا اہل گھر
 وہیں اور تمام ہائے عمر سے پکارا جاتا ہے اور انہیں گھر کا اہل گھر کے نام سے پکارا جاتا ہے اور انہیں گھر کا اہل گھر

سوانہ میں نے سنائی ہے کہ خالق کے نام میں یہی خالق اور انہیں
 پکارتے ہیں۔ یہ بات واضح کی ہے کہ ان پہلی خالق کی لڑائی میں منہ ہوا
 اعلان ہے کہ وہ ان کی کتاب اور ان کے رسول اہل گھر کے نام سے پکارا جاتا ہے اور انہیں گھر کا اہل گھر
 پکارتے ہیں۔ اور انہیں گھر کا اہل گھر کے نام سے پکارا جاتا ہے اور انہیں گھر کا اہل گھر

گواہی کے ناموں کو ان کے "Basic Rights" کے
 Rights کی لڑائی کو جینی کے نام سے پکارا جاتا ہے۔ انہیں انہیں:

اپنی ملت یا قوم سے تعلق سے نہ کہ
 خاص ہے ترکیب میں قوم رسول دہائی

مغربی مغربوں ان بات کا وہی کہتے ہیں کہ پہلی انہی خالق کی جیسا
 رسول چرموں کی جیسا ہے اور مغرب میں مسلسل جدوجہد کے نتیجے میں یہ کہہ سکتے ہیں کہ
 خالق کے بارے میں حاصل کیا گیا۔ ان پہلی دنیا ان سے مستفید ہو رہی ہے جس نے خالق
 حکیم نے جو تمام ہمارے سامنے پیش کی ہے۔ ان سے جیتا ہے کہ جس نے انہیں
 ان سے ان دہائی میں قوم رکھا ہے۔ پہلی خالق اور اجرام السماویہ ان کے اسماء
 لغویہ میں ان سے ہیں اور جہاں جس کی انہی خالق کی بات ہوگی وہیں انہیں انہیں
 عقیدت کا اور جیسا کہ انہیں دے گا۔ (11)

The instinct of self preservation is a basic natural urge of
animal as well as plants. But for human beings the self to be
preserved is only the individual physical entity has
mental self is social self."

انسانی تخلیقات کی زندگی میں قسمت کو برحقان نظام کا عمل ہے وہ ان کی صورت
خوب میں مستور نظر آتا ہے۔ قسمت کو انہوں نے کھول تو اس کی تہیہ و کتبہ بنانے
اپنی تہیہ منی کہ اس میں شامل ہے۔ عقل کا سر

اپنی قسمت کو اپنا اپنی لگاؤں سے مٹی دلیج
تیرے جہان سے ہے سوسہ خیر بننا
ہلے تو ہلے ہے ہر مٹی جہاں تک ہے
تو ہے جہاں کہے آئی تک سوز

اسلام میں قسمت کا نام بر لکھا سے ہند ہے خواہ وہ مٹی کے روپ میں ہو
کے روپ میں ہو یا مٹی کے روپ میں۔ ہر روپ میں اس قدر کی لگا سے
دیکھا ہوا ہے۔

گنہ گام نے سوسہ میں ایک قسمت کی فریاد پر راجہ دیر سے سلطان محمد
کا لڑا کرانے کے لیے جنگ کی۔ اسلامی تاریخ محمدوں کے ہم کردار اور سوسہ طبیعت
کے ہون سے مٹی پڑتی ہے۔ حضرت ہندو اپنے بیٹے اپنا مٹی طے اسلام کی پاس بھرتے
کے لیے پانی حجاز میں مٹا ہر مردہ کے درمیان دہاتی ہیں تو اللہ تعالیٰ ان کو
پہنچانے کو اپنی کتابوں فرما دیتا ہے۔ عقل تعالیٰ "ان الصلا و السروۃ من شعار اللہ"
اور نہ صرف ہے بلکہ قسمت تک کی نسبت لکھ کر لے والوں پر من نظام پر ہوتا

ہر ایک شخص کو اپنی اپنی حالت و ہم آہنگی کے ساتھ اپنی اپنی حالت کے مطابق کام کرنا چاہیے
اور ہر ایک کو اپنی اپنی ذمہ داری ادا کرنی چاہیے اور ہر ایک کو اپنی اپنی ذمہ داری ادا کرنی چاہیے

اپنا کام کر کے تڑپے آگے جائیے
یہ سب باتیں کہیں کہیں پڑھنے کی

—————

حوالہ جات

- ۱۔ قرآن مجید
- ۲۔ حدیث مبارکہ
- ۳۔ فقہ اسلامی
- ۴۔ تاریخ اسلام
- ۵۔ سیرت النبی صلی اللہ علیہ وسلم
- ۶۔ احکام اسلامیہ
- ۷۔ عقائد اسلامیہ
- ۸۔ اخلاق اسلامیہ
- ۹۔ تہذیب اسلامیہ
- ۱۰۔ معاشرہ اسلامیہ
- ۱۱۔ حکومت اسلامیہ
- ۱۲۔ اقتصاد اسلامیہ
- ۱۳۔ تعلیم اسلامیہ
- ۱۴۔ صحیح مسلم
- ۱۵۔ صحیح بخاری
- ۱۶۔ صحیح ابوداؤد
- ۱۷۔ صحیح ترمذی
- ۱۸۔ صحیح ابن ماجہ
- ۱۹۔ صحیح ابن کثیر
- ۲۰۔ صحیح ابن عساکر
- ۲۱۔ صحیح ابن حبان
- ۲۲۔ صحیح ابن کثیر
- ۲۳۔ صحیح ابن کثیر
- ۲۴۔ صحیح ابن کثیر
- ۲۵۔ صحیح ابن کثیر

14. انسانی حقوق

15. انسانی حقوق کی قانونی شرح، انسانی حقوق اور انسانی حقوق

16. انسانی حقوق، انسانی حقوق اور انسانی حقوق

انسانی حقوق

17. انسانی حقوق اور انسانی حقوق

18. انسانی حقوق اور انسانی حقوق

19. انسانی حقوق اور انسانی حقوق

20. انسانی حقوق اور انسانی حقوق

21. انسانی حقوق اور انسانی حقوق

22. انسانی حقوق اور انسانی حقوق

23. انسانی حقوق اور انسانی حقوق

24. انسانی حقوق اور انسانی حقوق

25. انسانی حقوق اور انسانی حقوق

26. انسانی حقوق اور انسانی حقوق

27. انسانی حقوق اور انسانی حقوق

28. انسانی حقوق اور انسانی حقوق

29. انسانی حقوق اور انسانی حقوق

30. انسانی حقوق اور انسانی حقوق

31. انسانی حقوق اور انسانی حقوق

32. انسانی حقوق اور انسانی حقوق

33. انسانی حقوق اور انسانی حقوق

قلمرو اصول علم ہر قوم کی ہے مگر ان کا استعمال تو کسی اور قوم کے ہاتھ میں ہے۔
۱۹۶۹ء کی تاریخ

Henry Marsh Document of Liberty, London, 1971, P. 51.
Gads Emscott "Perfection of Human Rights Under Law",
London, 1954, P. 3

ان کی کتاب "انسانی حقوق کا قانون" میں لکھی ہوئی باتوں سے ان کا خیال ظاہر ہے۔
۱۹۶۹ء کی تاریخ

ان کی کتاب "انسانی حقوق کا قانون" میں لکھی ہوئی باتوں سے ان کا خیال ظاہر ہے۔
۱۹۶۹ء کی تاریخ

احیائے ملت اسلامیہ علامہ ڈاکٹر محمد اقبال کی فکر پر

ملت اسلامیہ کا ایسا جلی نکا آئینہ عکاسی ہے کہ اقبال کا عظیم خواب تو یہ ہے کہ
 جلیوں یا ہمیں کے شعروں میں ملتی ہیں۔ اگر یہ کہا جائے کہ میں اور ہندوستان نے
 نے اقبال کے ذہن کی تخیل میں بیانی کو رواں ادا کیا ہے تو سبے پانچ سو گز
 غریب عمار کو اقبال نے جس ماحول میں آنکھ کھول تھی ان میں مسلمانوں پر
 جانے دار کو روکنے کے لیے عمارت عظیم قومی راہنما اپنے اپنے طور پر مسلمانوں کو
 فطرت سے جدا کرنے کے لیے اپنی تمام تر توانیاں خرچ کر رہے تھے۔ ۱۹۱۱ء میں
 مسیحی سال میں ۱۹۱۱ء اور ۱۹۱۲ء میں ۱۹۱۱ء اور ۱۹۱۲ء میں ۱۹۱۱ء اور ۱۹۱۲ء میں
 ہو کر سوز رہے تھے کہ مسلمانوں کو عمارت کے حلقے سے کس طرح لیا جاتا رہا ہے۔
 کہ مسلمانوں کی لگاؤ اور آپ کی تخیل میں چاہا تھا۔ عمارت عظیم
 ڈاکٹر محمد اقبال کی تمام قومی اور عوامی صورتوں میں ان کی تخیل کے لیے ایک نگر آتی ہے
 کیا عظیم ہے کہ تمام عمارتوں پر اپنے اندر سے صاف صاف ہے کہ سبے جو ان لوگوں کی
 تخیل کے لیے ضروری تھی۔ آپ نے طرزی فلسفہ پر چند طرزی تہذیب کو کہا ہے
 اور ان باتوں کا مطالعہ کیا۔ قرآن مجید کی روش کو بیکار اور سچے۔ وہاں حضرت محمد
 کی باتوں میں علامہ اسلام کے فریادوں اور عمارت کو سہارا بنا کر اقبال نے طرزی
 عوامی تخیل کو سہارا بنا کر ان کی تخیل کو عمارتوں کو نظر آتی دیکھا۔ طرزی فلسفہ اور
 تہذیب کا لقب سے ہوا اور اسلام کے عوامی شعور اور عمارت کو روکنے کے لیے
 سب سے پہلے ان کی باتوں کی کہ عمارت اور عمارت کا تہذیب کا تہذیب کا اور تہذیب
 کو بیکار ہے۔ عمارتوں کے لیے ایک نیا نیا اور عمارتوں کے لیے عمارتوں کا تہذیب
 عمارتوں کے لیے عمارتوں کے لیے عمارتوں کے لیے عمارتوں کے لیے عمارتوں کے لیے

تہاں کے کام سے کوئی اور موضوع حوالہ نہیں کر سکتے کیونکہ قرآن طرزِ نبوی کی طرف سے
 بنا گیا ہے اور آپ کو رنگہ تھا۔

اس کی وجہ صرف ایک ہے اور یہ کہ آپ نے قرآن مجید کا اس طرح مطالعہ کیا
 جو ہم ساری زندگی کے لیے ایک مفید اور قرآنِ طہی اور جامع چہرہ کرنا تھا۔ یہ قرآنی
 اسباق صحیحی عمل میں ادا ملیے ہوا کہ ایک ایسا طہی حیات ہے جو ہر آدمی کے لیے
 ہر ماہ قرآن مجید کے حوالے سے ہر ماہ مطالعہ قرآنی تہذیب کے حوالے سے ہے۔
 آپ نے یہ سب شاعری کے لیے سہولیات حوالہ کیے قرآن مجید کی روایت میں۔

یہ نہیں ہی نہیں کہ حضرت علامہ ابو اقبال کے علمی گہر سے کوئی اور
 دور کی اور نام سے تعبیر کیا جا سکے۔ اپنی قوم میں سب سے اعلیٰ کے لیے ایک ایسا
 رہنما تھا جو اس کے تمام دکھوں کا علاج ہے۔ اسی کوئی کوئی سے ادا کیا جاتا ہے۔
 آپ نے قرآن مجید کی ساری باتوں کے لیے ایک ہی قرآنی اسباق میں کیا ہے۔

آپ نے مسلمانوں پر ان کے ماضی کی تہذیبی مہیاں کی۔ ان کے علمی اور
 فرائضی اعمال کا حساب کیا۔ اس دوران سے تہذیبی مہیاں۔ اپنی قوم کی مہیاں کے
 سہولتوں میں ان کی تہذیبی مہیاں کی رہا مہیاں کی۔ یہ سب کے سب
 کے سہولتوں میں سہولتوں کا ہر ماہ اپنی ہر طرف اپنے اللہ کی ہر طرف کے ہر
 قرآنِ طہی علامہ ابو اقبال نے اسلامی مہیاں کی تہذیبی اور مہیاں کے سہولتوں
 کے لیے بھی کھڑا کرنا کہ وہ مہیاں اپنے مہیاں کے مہیاں کے مہیاں کے
 مہیاں ہر مہیاں کر سکیں۔ یہ بھی مہیاں کے مہیاں کے مہیاں کے مہیاں کے
 مہیاں مہیاں کر سکیں۔ یہ بھی مہیاں کے مہیاں کے مہیاں کے مہیاں کے

تہذیبی مہیاں۔ علامہ ابو اقبال کا کام ایک مہیاں ہے۔
 ان مہیاں کے سہولتوں کے سہولتوں کے سہولتوں کے سہولتوں کے سہولتوں کے
 مہیاں مہیاں ہیں۔ مہیاں مہیاں مہیاں مہیاں مہیاں مہیاں مہیاں مہیاں
 کے مہیاں کے مہیاں مہیاں مہیاں مہیاں مہیاں مہیاں مہیاں مہیاں

انہوں اور انہی کے مابین مسلمانوں کی زندگی میں سیاق و سباق اور پہلو سے لے کر
 انہی دونوں کے مابین سوالی تقاضا میں کلامات، الفاظ کی زندگی میں سیاق و سباق اور
 جسم و جان کا وہی خیال، غرض و اہل کا اہل، علم و عقل کا عقل، غرض و جان کا وہی
 تصور ہے اور یہی تصور ہے جس میں باقی انہوں نے اس عقائد اور پہلو سے لے کر
 انہوں نے ایک ہی الفاظ کے ساتھ ہی انہوں نے اس عقائد اور پہلو سے لے کر
 تصور اپنے وقت کے لیے اس میں ضروری ہے۔

اس تصور میں اس میں انہوں نے اس عقائد اور پہلو سے لے کر
 اپنے وقت کے لیے اس میں ضروری ہے۔ آپ نے اس میں اس عقائد اور پہلو سے لے کر
 اس میں اس عقائد اور پہلو سے لے کر اس میں اس عقائد اور پہلو سے لے کر
 مسلمانوں اور انہوں نے اس میں اس عقائد اور پہلو سے لے کر
 فرماتے ہیں۔

اور عرب کے رہنے والوں کی اپنی زبان میں ہے
 کہ ان کے لیے جو وہاں کے رہنے والوں کے لیے ہے
 انہوں نے انہوں نے انہوں نے انہوں نے انہوں نے
 انہوں نے انہوں نے انہوں نے انہوں نے انہوں نے
 عرب کی انہوں نے انہوں نے انہوں نے انہوں نے انہوں نے

انہوں نے انہوں نے انہوں نے انہوں نے انہوں نے
 انہوں نے انہوں نے انہوں نے انہوں نے انہوں نے
 انہوں نے انہوں نے انہوں نے انہوں نے انہوں نے
 انہوں نے انہوں نے انہوں نے انہوں نے انہوں نے

انہوں نے انہوں نے انہوں نے انہوں نے انہوں نے
 انہوں نے انہوں نے انہوں نے انہوں نے انہوں نے

بے شک اللہ کے فریم و اصول کا اظہار ہمیں کرنا چاہیے
 مگر ہم اسے نہیں دیکھ سکتے اور نہ ہی
 کہ ہم اسے سمجھ سکتے ہیں۔
 بے شک اللہ کا ایمان اظہار فرماتے ہیں۔

جب اللہ کو مجھے سمجھنے کی
 دیکھ رہا ہے کسی اللہ کے لئے کہ وہ
 عالم کو ہے۔ اگلی پندہ اللہ کے
 ہماری نگاہوں میں ہے اللہ کی طرف
 پندہ اللہ میں اگر پندہ اللہ سے
 لانا ہے گا تو ہم ہماری توہین کی تہا

ہم کو لگا اپنے ہم صوفیوں سے کہتے ہیں

ہم اللہ کی طرف سے اللہ سے اللہ کی طرف
 ہم اللہ میں ہیں۔ وہی اللہ کی طرف سے
 وہی اللہ کی طرف سے اللہ کی طرف سے
 وہی اللہ کی طرف سے اللہ کی طرف سے
 وہی اللہ کی طرف سے اللہ کی طرف سے
 وہی اللہ کی طرف سے اللہ کی طرف سے

اللہ کے لئے کہتے ہیں تو کہتے ہیں

اللہ کی طرف سے اللہ کی طرف سے
 اللہ کی طرف سے اللہ کی طرف سے
 اللہ کی طرف سے اللہ کی طرف سے
 اللہ کی طرف سے اللہ کی طرف سے
 اللہ کی طرف سے اللہ کی طرف سے

۱۳۴

سے گاہری راتیں اور صبح کی گاہ سے
بڑھتی ہے اور سب سے پہلے
ایک دن صبح صبح کی پہلی گاہ سے
پہلے سے رات سے لے کر آٹھ گاہ کا سفر (۱)

یہاں ہم آج کے دن کے سفر اور رات کی گاہ سے
پہلے سے رات سے لے کر آٹھ گاہ کا سفر (۱)

ایک دن صبح صبح کی پہلی گاہ سے
پہلے سے رات سے لے کر آٹھ گاہ کا سفر (۱)
پہلے سے رات سے لے کر آٹھ گاہ کا سفر (۱)
پہلے سے رات سے لے کر آٹھ گاہ کا سفر (۱)
پہلے سے رات سے لے کر آٹھ گاہ کا سفر (۱)
پہلے سے رات سے لے کر آٹھ گاہ کا سفر (۱)
پہلے سے رات سے لے کر آٹھ گاہ کا سفر (۱)

یہاں ہم آج کے دن کے سفر اور رات کی گاہ سے
پہلے سے رات سے لے کر آٹھ گاہ کا سفر (۱)

یہاں ہم آج کے دن کے سفر اور رات کی گاہ سے
پہلے سے رات سے لے کر آٹھ گاہ کا سفر (۱)

ہاگ ان اٹلی تھا کی تو اسے مل میں

ہانگے ہائے کی ہانگے ہائے ہائے ہائے

یعنی ہر دفعہ اسے میرے ہائے ہائے ہائے

پھر ہی ہائے ہائے کے ہائے ہائے ہائے

جی لم ہے تو کیا ہے تو کیا ہے ہائے

لی بند ہے تو کیا ہے تو کیا ہے ہائے (۱۲)

پہلے سے آگے نہ کرنا آگے کی آگے میں آگے آگے آگے

کی ایک ایک نظر نظر آگے آگے ہائے

گر ہر حال میں سے آگے آگے ہائے ہائے

غرب آگے آگے ہائے ہائے ہائے ہائے

دوسرا کیا ہر جیسا ہائے ہائے ہائے ہائے (۱۳)

آپ نے جو تصور دیکھا ہے وہی تو ہم کو یاد آگے آگے ہائے ہائے ہائے ہائے

پہلے کیا آگے آگے

کھلی کر آگے آگے آگے آگے ہائے

آگے آگے آگے آگے آگے آگے ہائے (۱۴)

پہلے آگے

ہے ہائے ہائے ہائے ہائے ہائے ہائے

تو ہائے ہائے ہائے ہائے ہائے ہائے (۱۵)

پہلے آگے

ہائے ہائے ہائے ہائے ہائے ہائے

ہائے ہائے ہائے ہائے ہائے ہائے (۱۶)

بڑا بڑا ہے سب سے بڑے
جہی میں آداب کے ضرب حکیم کا کار (۱۰)

حق پر پادشاہت کا، صداقت کا، انصاف کا
یا پہلے کا حق سے کام لیا کی راست کا (۱۱)
جس کو شہت میں آداب کی اہمیت سمجھیں وہی بیان فرماتے ہیں۔
اللہ کے ہاتھوں میں ہے انعام کی نظر
یہ لہذا ہے غصے کے عقوبت کا جہا (۱۲)

میں خبردار ہوں اور انہی کے آداب میں تمام انسانوں کی نظر سے ان کو
جہا (۱۳) اور جہی کے مہربان پر آئی گئی کسی بھی نظر کے تصور لگائی ہو کر
تو آپ کا یہ بھی رہا تھا کہ تم رہے گا۔ انسانی فطرت کے جن گناہوں کو دور کرنے
انہی سے آداب کیا ہے ان کا بیان قرآن حکیم کی آیات کرتے ہیں۔ انہی کی سمجھنے سے
انہی کے لہذا آداب سے دور کیا ہے۔

سبح سبور تک الاعلیٰ . علیٰ علیٰ علیٰ

واللہ اعلم

یہی ہے آداب کے انہی کو دیا گیا۔ ان کی کھلی سوسٹ گری کی۔ انہی
میں سے انہی کے آداب سے دور کیا ہے۔

جس کو شہت میں آداب کی اہمیت سمجھیں وہی بیان فرماتے ہیں۔
اللہ کے ہاتھوں میں ہے انعام کی نظر
یہ لہذا ہے غصے کے عقوبت کا جہا (۱۲)
میں خبردار ہوں اور انہی کے آداب میں تمام انسانوں کی نظر سے ان کو
جہا (۱۳) اور جہی کے مہربان پر آئی گئی کسی بھی نظر کے تصور لگائی ہو کر
تو آپ کا یہ بھی رہا تھا کہ تم رہے گا۔ انسانی فطرت کے جن گناہوں کو دور کرنے
انہی سے آداب کیا ہے ان کا بیان قرآن حکیم کی آیات کرتے ہیں۔ انہی کی سمجھنے سے
انہی کے لہذا آداب سے دور کیا ہے۔

میں زہی آپ طرف رکھتے ہیں کہ

زہی زہی کی ہی سے زہی آتہ ہی سے

جو زہی زہی تو شہی نہ رہی تو ہوگی (۱۳۷)

زہی میں تو میں کی زہی کا لکھتے ہیں کیا ہے

زہی کی موت سے طرف کا انتقال ہے کہ

زہی کی موت سے شرق ہے جگت ہدم

زہی کی موت سے وہاں موت ہے ہے ب وہب

بلکہ مران و غم کا ہے ہے مران و غم

زہی کی موت سے جہی لکھتے ہیں کہ

میں کہا ہے حال اور انشاء مران

زہی کی موت سے جو مران کہا ہے

کہ لکھتے ہیں مران کا جہت مران (۱۳۸)

حیرت ہارنا اللہ مران کے من اللہ کی موت میں کہا یا لکھتے ہیں کہ لکھتے ہیں

لکھتے ہیں کہ لکھتے ہیں مران کا جہت مران کا جہت مران

جہت مران کا جہت مران کا جہت مران کا جہت مران

میں کہ لکھتے ہیں مران کا جہت مران کا جہت مران

کہ لکھتے ہیں مران کا جہت مران کا جہت مران

زہی کی موت میں انتقال

زہی کی موت میں انتقال

زہی کی موت میں انتقال

زہی کی موت میں انتقال (۱۳۹)

توالیہ جات

۱۰۰

۱۔ درجہ اولیٰ میں داخلہ ہونے والے طلبہ کی فہرست

- ۱۔ محمد علی
- ۲۔ احمد علی
- ۳۔ علی محمد
- ۴۔ سعید احمد
- ۵۔ شمس الدین
- ۶۔ شمس الدین
- ۷۔ شمس الدین
- ۸۔ شمس الدین
- ۹۔ شمس الدین
- ۱۰۔ شمس الدین
- ۱۱۔ شمس الدین
- ۱۲۔ شمس الدین
- ۱۳۔ شمس الدین
- ۱۴۔ شمس الدین
- ۱۵۔ شمس الدین
- ۱۶۔ شمس الدین
- ۱۷۔ شمس الدین
- ۱۸۔ شمس الدین
- ۱۹۔ شمس الدین
- ۲۰۔ شمس الدین
- ۲۱۔ شمس الدین
- ۲۲۔ شمس الدین
- ۲۳۔ شمس الدین
- ۲۴۔ شمس الدین
- ۲۵۔ شمس الدین
- ۲۶۔ شمس الدین
- ۲۷۔ شمس الدین
- ۲۸۔ شمس الدین
- ۲۹۔ شمس الدین
- ۳۰۔ شمس الدین
- ۳۱۔ شمس الدین
- ۳۲۔ شمس الدین
- ۳۳۔ شمس الدین
- ۳۴۔ شمس الدین
- ۳۵۔ شمس الدین
- ۳۶۔ شمس الدین
- ۳۷۔ شمس الدین
- ۳۸۔ شمس الدین
- ۳۹۔ شمس الدین
- ۴۰۔ شمس الدین
- ۴۱۔ شمس الدین
- ۴۲۔ شمس الدین
- ۴۳۔ شمس الدین
- ۴۴۔ شمس الدین
- ۴۵۔ شمس الدین
- ۴۶۔ شمس الدین
- ۴۷۔ شمس الدین
- ۴۸۔ شمس الدین
- ۴۹۔ شمس الدین
- ۵۰۔ شمس الدین

پروفیسر محمد عقیلی
زیر اہتمام گورنمنٹ لائبریری

علامہ اقبال کے افکار میں مسلمانوں کو درپیش مشکلات کا ادراک

یہ ہے سادہ فہم لوگوں کے ہوتے ہیں جس کی شعری زبان میں لہجہ اور لہجہ
نہ کہ ہائے یاد اللہ اللہ اللہ اللہ اللہ کے اللہ سے اللہ کے لئے ہائے اللہ
میں ہوتے ہیں آئی ہیں کے لکھنؤ میں ہوتے ہیں کے لکھنؤ میں ہوتے ہیں
وہ لکھنؤ میں ہوتے ہیں کے لکھنؤ میں ہوتے ہیں کے لکھنؤ میں ہوتے ہیں
میں ہوتے ہیں کے لکھنؤ میں ہوتے ہیں کے لکھنؤ میں ہوتے ہیں
کے لکھنؤ میں ہوتے ہیں کے لکھنؤ میں ہوتے ہیں

یہ لکھنؤ میں ہوتے ہیں کے لکھنؤ میں ہوتے ہیں کے لکھنؤ میں ہوتے ہیں
کے لکھنؤ میں ہوتے ہیں کے لکھنؤ میں ہوتے ہیں کے لکھنؤ میں ہوتے ہیں
کے لکھنؤ میں ہوتے ہیں کے لکھنؤ میں ہوتے ہیں کے لکھنؤ میں ہوتے ہیں

یہ لکھنؤ میں ہوتے ہیں کے لکھنؤ میں ہوتے ہیں کے لکھنؤ میں ہوتے ہیں
کے لکھنؤ میں ہوتے ہیں کے لکھنؤ میں ہوتے ہیں کے لکھنؤ میں ہوتے ہیں
کے لکھنؤ میں ہوتے ہیں کے لکھنؤ میں ہوتے ہیں کے لکھنؤ میں ہوتے ہیں
کے لکھنؤ میں ہوتے ہیں کے لکھنؤ میں ہوتے ہیں کے لکھنؤ میں ہوتے ہیں

طر سے ہر ایمان کے ساتھ ہوا ہے، یہی حق اور گھٹتی اہمیت اور حکمت ہے
 اہل بائیس نے کہ مسلمانوں کو اپنے اپنے اور تہذیبی قالب سے لال کر لیا
 لائی، اور جا کر لیا اور اپنی آگاہ کر لی کہ مسلمانوں کی تہذیب میں کون سے چیز
 ان کے ہونے کے قابل ہو سکتی ہیں، انہیں پھوڑ کر بہت ہوسر کو لیا ہوا ہے۔
 انہیں نے اپنے قوم کے نظام اور مسلمانوں کے حالات پر بالکل الجھا لیا ہے

یہ ساری ساری چیزیں ہیں جن کو
 یہ برائی ہے، یہ ہوسر اور ہوشی
 قیہ، یہ ہوشی، یہ ہوشی اور
 یہ ایمان، یہ ایمان اور ایمان
 یہ سب لہجے کی ہیں
 یہ ہوسر، یہ ہوشی اور ہوشی
 ان کے ہونے کے قابل ہیں، انہیں
 ان کے ہونے کے قابل ہیں، انہیں

ان کے ہونے کے قابل ہیں، انہیں
 ان کے ہونے کے قابل ہیں، انہیں

ان کے ہونے کے قابل ہیں، انہیں
 ان کے ہونے کے قابل ہیں، انہیں

ان کے ہونے کے قابل ہیں، انہیں
 ان کے ہونے کے قابل ہیں، انہیں

اسلامی کونٹریکٹ ان مذاہب کے لیے مؤثر اور شکرانہ کا باعث ہوئی ہے۔

اسی طرح اگلی ایک عالم اسی کی حیثیت سے اس مسئلے پر اس کی رائے
کرتے ہیں کہ دین کو باطنی طور پر کسی طرح نقصان پہنچانا ہے۔ وہی دولت ہے
آپ اور ہم اور ملک و زمینوں کو وسعت دینا ہے۔ ظاہر ہے اللہ ہی ہمارے
بندہ ہے لیکن کر سکتے۔ وہ اس کے برعکس دین کو اسلامی معاشرے کی بہت کاسرے
ہو کر رہتا ہے۔ اس سے مسلمانوں کی سرکاری اور درست صورت کی طرف توجہ
نہیں فرماتے ہیں۔ وہ اس طرح اٹھ کر گرتے ہیں کہ ایک صنف کے لوگوں کو
آپ کے اسلام دشمنی میں اضافے اور عہد کے باعث جس کا سبب مسلمانوں کے اس
انکسار میں گہری سرسختی سے لگاتے ہیں۔ اسلام ہی وہ واحد دین ہے جو تمام
حکومتوں کا عمل بن گیا ہے۔

انہی کی نظر میں سولہ ہر دینی اور اسلام تمام مذاہب اور مذاہب کے لیے
ہی حقیقت اس میں کر سکتا ہے ان عقیدے کے لیے اسلام کی اس طرح سمجھ کر سکتا ہے
اس سے اسے حقیقت کا عمل نکال دیتا گیا ہاں تک کہ اہل کے خیال میں اسلام
کے لیے وہی ہیں اور ان کے لیے ایک صورت کا دین ضروری ہے۔ پھر ان
عالموں کو یہ دینی طور سے عقیدے کے ساتھ ان کی ساری ساری صورتوں کا جواب دے سکتے
انہوں نے اپنے دین کی صورت سمجھ لی اور پھر اس سے ہونے والے اس کے اس کے ہونے
انہوں میں اور دین کے ہونے سے ہونے والی گہری گہری گہری گہری گہری گہری
انہوں نے اپنے دین کی صورت سمجھ لی اور پھر اس سے ہونے والے اس کے اس کے ہونے
انہوں میں اور دین کے ہونے سے ہونے والی گہری گہری گہری گہری گہری گہری
انہوں نے اپنے دین کی صورت سمجھ لی اور پھر اس سے ہونے والے اس کے اس کے ہونے
انہوں میں اور دین کے ہونے سے ہونے والی گہری گہری گہری گہری گہری گہری

یہ سب کچھ ہے انسانی ترقی کے مسائل کے حل کے لیے قابل عمل نہیں تھی۔
انسانی ترقی کے مسائل کے حل کے لیے قابل عمل نہیں تھی۔

یہ سب کچھ ہے انسانی ترقی کے مسائل کے حل کے لیے قابل عمل نہیں تھی۔
انسانی ترقی کے مسائل کے حل کے لیے قابل عمل نہیں تھی۔

یہ سب کچھ ہے انسانی ترقی کے مسائل کے حل کے لیے قابل عمل نہیں تھی۔
انسانی ترقی کے مسائل کے حل کے لیے قابل عمل نہیں تھی۔

یہ سب کچھ ہے انسانی ترقی کے مسائل کے حل کے لیے قابل عمل نہیں تھی۔
انسانی ترقی کے مسائل کے حل کے لیے قابل عمل نہیں تھی۔

قسط ٹوری میں کی طرف روٹوگی کا حال لکھنا کہ یہ اس کی طرف
 اڑن طرفی توری کے سر میں آئے کو اپنے حق میں دھنی کتا ہے اور اس کا
 سے اپنے آپ کی مخالفت کو ٹوری کی حالت میں لکھا کرتا ہے
 قسط ٹوری میں کو اٹھل سے اپنے ٹھکانے کی تیار کر لیا ہے یہ
 ہی اسرارے اور اللہ کا کر ہے جس کا تعلق ہی کے ہاں سے ہے۔ ہاں کی
 سہرپ کی طرف دھنی کو قتل نہ کریں سدا کی اور دھنی اتنا کرش چھوڑ
 لکھوں کی طرح۔

یہ ایک طرف پائین رہا لکھی پر پاپے اس کا تعلق الہم سے ہو رہا ہے
 شجرات پر اور ٹوری طرف مشورہ ات کے آریے مشرق کی تیار کی رہا لکھی
 یہ وہاں مشورہ ات کو ہر اپنے ہر کے مولا نے کا جواب دیا ہے اہل طلبہ
 علم اہل سے ہم آجک کرتا جاتے ہیں۔

اہل کے قسط ٹوری میں انہیں پشورہ اور آؤہ ہے۔ یہ طرح کے تھوڑے سے
 کتا کہ اللہ ہے ہاں ہے اس طرح رہنا اپنے حسب اہلی کے لیے لکھا ہے
 ہے اس لکھا سے تھوڑے بے گئی ہو میں رہتی کا سب حق ہے ان کے قسط سے تھوڑا
 ہے۔

قسط ٹوری سے دھنی لکھی کی ایک اور صورت تھوڑی اور قلب ہے
 یہ وہاں کے ہی

یہ وہاں کے ہی اور لکھی اور آؤہ
 تھوڑے سے لکھی اور لکھی اور آؤہ
 تھوڑے سے لکھی اور لکھی اور آؤہ

تعلیمی و تربیتی
 ہم کو فوج اور اہل فوج
 کوستہ کی دہلیوں سے
 ہم نے یہاں صوفی حکم سے

اقبال کا اعلان اور اسطے سے متکلف اور فوجیوں کو کوسنے کا حکم
 ہے کہ تمہیں نے مسلمان صوفی کی تعریف کا مطالبہ کیا تھا اور وہ حقیقت ہے کہ
 اس صوفی مستقیم اور تربیت الہیہ کو سمجھتے ہیں کہ

بنا ہے یہی ہے خدا کا حکم
 لی حکم کی ، نہ کسی کا حکم
 بنا ہے یہی ہے خدا کا حکم
 ملک و اہل ملک کا حکم
 ہم نے یہی ہے خدا کا حکم
 رشتہ و رشتہ دار کا حکم
 کیا ہے یہی ہے خدا کا حکم
 نہ کمال سے ، نہ جہاد سے

اللہ والوں کی یہ دہلیوں کے طرف سے ہی ہے وہ اسے اپنے اہل
 دہلیوں سے لے کر لے کر

اللہ کے حکم ، اللہ کے حکم
 اللہ کے حکم ، اللہ کے حکم
 ہم نے یہی ہے خدا کا حکم
 اللہ کے حکم ، اللہ کے حکم

جہاں عرب سے اپنی برائی کو چھپانے کے لئے ہی کہہ رہے ہیں کہ وہ عرب کی کشتی

تھی اور وہ گئے تھے

اباں اراکھان تھے یہ اراکھ

یہ وہی قوم اراکھ تھے کول

آہ اراکھ وہ آگے نہ

آہ اراکھ وہ آگے نہ

فریح یا لاری آگے

ساری لی، کالری آگے

فریح تم کہہ اراکھ

یہ تم عرب چاہے

جہاں کشتی عرب کی تھی وہ جہاں کشتی اراکھ کی ہے

یہ لاری اراکھ آگے

کالری اراکھ لی

عرب میں سے اراکھ کہہ رہے ہیں اور یہ لاری اراکھ کی ہے اور اراکھ کہتے ہیں

یہ لاری اراکھ لی

فریح اراکھ سے لاری اراکھ

لاری اراکھ کی ہے اور اراکھ کہتے ہیں

یہ لاری اراکھ لی

فریح اراکھ سے لاری اراکھ

انہی طرفی تہذیب و اخلاقیات کی ترویج اور ان پر توجہ دینی اور ان کی ترقی
 کی ہے۔ یہی ہیں کہ اسلام کے افکار و عقائد کو ان کی جگہ پر لائیں اور ان کی ترقی
 کی ہے۔ اس لیے انہوں نے اسلامی اہل علم کی طرف سے ان کی ترقی اور ان کی ترقی
 کی ہے۔ ان کی ترقی اور ان کی ترقی

اسلامی کی ترقی اور ان کی ترقی
 کی ہے۔ ان کی ترقی اور ان کی ترقی
 کی ہے۔ ان کی ترقی اور ان کی ترقی
 کی ہے۔ ان کی ترقی اور ان کی ترقی

یہی ہے انہوں نے اس طرف سے ان کی ترقی اور ان کی ترقی
 کی ہے۔ ان کی ترقی اور ان کی ترقی
 کی ہے۔ ان کی ترقی اور ان کی ترقی
 کی ہے۔ ان کی ترقی اور ان کی ترقی

اسلامی کی ترقی اور ان کی ترقی
 کی ہے۔ ان کی ترقی اور ان کی ترقی
 کی ہے۔ ان کی ترقی اور ان کی ترقی
 کی ہے۔ ان کی ترقی اور ان کی ترقی

انہوں نے ان کی ترقی اور ان کی ترقی
 کی ہے۔ ان کی ترقی اور ان کی ترقی
 کی ہے۔ ان کی ترقی اور ان کی ترقی
 کی ہے۔ ان کی ترقی اور ان کی ترقی

پہ آوی ترمیدی تھا چہ ی جہلی

زخرد گریت اسی آشا چہ ی جہلی

ان کے خیال میں اہل میں تہلی اور نئے معیارات کے قیام کے بغیر معاشرے میں کوئی
تکلیف ہوا نہیں ہو سکتا۔ ہر قدری ترقی کے لیے ضروری ہے کہ وہ وہاں کی کرنی اور
ذاتی حرات سے ہم آہنگ ہو۔

وہ جہان ہاں و ہر خوشی مکتوں آموز

کہ پرہیز مکتوں ہاں و ہاں دنگان

اقبال کا خیال ہے برصغیر کی جہان نسل پرہیزان عالی سے اجازت حاصل کرے۔
اہل کام کے مقابلے میں ایک قہری انتخاب کے لیے چارہ ہو چلتا۔ وہ سرتے سے
پلے اپنے ہندو و اسلامی اسلوب حیات کو جہان نسل میں 2 نکالنا دیکھ رہے تھے۔
اقبال کا لغو، مشرق و مغرب نہیں بلکہ اسلام کی طرف رہنمائی ہے۔ اسلام ہر
طرف دنیا اور مغربی تہذیب و تمدن کے درمیان گراؤ بھی اسی نعرے کی بنیاد پر ہے۔ اسی
لہذا سے اقبال یہ نعرہ کہ نہ مشرق نہ مغرب ان کے ایک خاص نظریے کی بنیاد پر ہے۔ جہاں
عظیم شعر سے ظاہر ہے:

ہذا آزاد نا آئے گمان

وہاں اور جہان دنگان

اقبال کہتے ہیں: مسلمان نہ صرف مختلف فلسفہ اور مانتوں مومنات کی فتنوں
میں اپنے منظر، گمراہی اور مشاہدوں کے سبب اور کمال تک پہنچے ہوئے تھے بلکہ ان کی
طبی استعداد اس مقام پر تھی کہ طبع تہذیب، لبرلس ساری، دائرہ انوار کی ترتیب و
تدوین جس میں اسلام حیات و کلف، مانتوں، اور حیات و لہجوں، آہٹ بھی تہلی ہیں، انہیں ان
کی خصات و اجا کی تہذیب میں اپنی تہذیبوں دیکھیں۔

امروز ازل جرنی بر خود نظری ما کہ
 بکلی و بسیاری ، پینالی و عطالی
 اقبال کاتب سے بڑا مقصد اسلامی تہذیب و کثافت کی مافی سگ پر دنیا سے علم میں ڈاؤن کی ہے
 ما کہ احمد طلب از خانہ بیرون تانہ ایم
 علم یا جان بدیم و عملی سائنس ایم
 "تہذیب اسلامی کو مغرب کے بے شعور کارکنوں کی تخریب کاری سے بچانا چاہئے" یہ
 کہتے ہیں

ای تجی از عشق و ذوق و سوز و درد
 می شای مصر ما یا ما چه کرد
 مصر ما ، ما ما ز ما بیگانہ کرد
 از جہل مصطفی بیگانہ کرد

اس طرح کہا جا سکتا ہے کہ اقبال کا سیاسی کلام زیر استحصال مسلمانوں کی گے
 تک آئی ہوئی لڑیا ہے اور کلام اقبال میں آزادی ملتی آجک وہ ہے جو انسانوں یا قوموں
 پر مشتمل کے مسلمانوں کی آزادی کے لیے استعمال کیا جائے۔

ہر کہ حق باشد چه جان احمد بخش
 ہم گنت چنہا ہاں گرواں
 فوسہ ما ہد سینہ او راہ نیست
 خاطرل مرعوب غیر اللہ نیست

اقبال انصاف اسلامی کا اظہار کرتے ہوئے تمام مسلمانوں کو دعوت دیتے ہیں
 کہ مغربی کثافت کے خلاف میں عملی جدوجہد کا مظاہرہ کریں۔ وہ اس گروائی اور پستی سے
 بچنے کو بہتر قرآن پاک اور اس کی باتوں کو قرار دیتے ہیں

ہرگز اسناد کتاب و حکمت است

این در قوت اعتبار است

پانچویں نمبر ذوالحجہ کے جواب میں کہتے ہیں: "میری بیٹھ یہ خواہش رہی ہے کہ مسلمانوں میں امنگی سے باہر آ جائیں اور بلند مقام حاصل کریں۔ ان کے درمیان اختلاف اور کڑھ دیاں اور ہو جائیں، جہاں تک میری رسائی تھی میں نے کوشش کی ہے کہ مسلمانوں کے حقوق کی حفاظت کی جائے اور میری زبان سے ایسی بات نہ نکلے جس سے مسلمانوں کو تشویش پہنچے۔ خدا کے لیے ان تمام اختلافات تھی کہ سیاسی اور مذہبی اختلاف کو بھی ختم کیجئے اور انہیں میں متحد ہو جائیں۔"

ان بات کو فراموش نہیں کرنا ہے کہ اقبال شاعر، مفکر اور صاحبِ مشاہیر ہونے کے ساتھ ساتھ ایک سیاست دان بھی تھے اور سیاست خود کو اول قرار دیتی ہے۔ اقبال کا یہ ایک ایسے دور سے تعلق رکھتا ہے جس میں برصغیر کے مسلمانوں کے دلوں میں آزادی کا دہلا پلٹا ہوا تھا۔

اقبال ایک ایسے شخص تھے جو ممالکِ عالم سے سوتے تھے۔ حتیٰ کہ انہوں نے اپنے لیے ممالکِ عالم کے لیے ایک ایسی زبان کو اپنایا جو پہلی دنیا میں متعارف تھی۔ فارسی زبان کم از کم چوتھی لگاتار سے تو یہ شہرت ضرور رکھتی تھی۔ ایک ہزار سالہ قدامت، ائمہ میں شہرت اور نہ صرف تمام دنیا کے اسلام میں بلکہ مغربی دنیا میں بھی اس کی پہچان سہولت تھی۔ ایک طرف فارسی زبان مسلمانوں کی ثقافت کا سرچشمہ تھی تو دوسری طرف اہل ان کے صحابہ اور اہل عرب تک پہنچنے کا بہترین ذریعہ بھی تھی۔ ایک ایسا ذریعہ جو مسلمانوں کے لیے آسان اور سہول اور دہلا آگیز شعور ذات کا ذریعہ بھی قرار پاتی تھی۔

اقبال کی خواہش تھی کہ سرزمینِ مشرق کی قدیم ثقافت کو گہرائی سے دور حاضر کے دلچسپ اور مسائل کا حل سوال کیا جائے۔ اس طرح انہوں نے قدیم و جدید کو ساتھ ساتھ

رکھ کر چاہا کہ آنے والے گل کو جانے والے گل کے حوالے سے وسایلت کر کے خود کو
میں موصوفات کو سامنے رکھا۔ دراصل وہی موصوفات تھے جو پہلی قسم کے گل کو
جانے تھے اس کے باوجود اقبال نے کوشش کی کہ اس میراث کوئی تڑپاں نہ لے لیں۔
وہ بیٹا اس کوشش میں رہے ہیں کہ اسلامی ثقافت کا ادراک کے قلموں سے

مطابقت کریں۔ فلسفہ خودی یا خودشناسی جس میں اقبال اس قدر زور دیتے ہیں، ایک فریب
آزادی ہے۔ اقبال کے نزدیک تمام مسائل اور نکات کا آغاز "خودی" سے ہونا چاہیے۔
فلسفہ یہ ہے کہ اقبال ہر چیز کو اسلام کی طرف لے آتے ہیں اور اسلامی قوم
کے لواحقین مند ہیں۔ مسلمانیت جو ان کی خواہش ہے اس میں قرونِ ماضی کے مسلمانوں
مخصوصیات کا ہونا ضروری ہے۔ مسلمانوں کا وطن، اسلام کا ایک عظیم وطن ہے۔ جہاں
مہربان، ہمدردی اور ایمان کے درمیان جاکر سرحدوں کو قبول نہیں کرتے۔

اقبال کا انسان کامل وہ ہے جو اسلامی اصولوں پر عمل پیرا ہو۔ مجاہدین اسلام
اقبال کے نزدیک ایک مثالی تصور ہیں۔ اقبال عہد حاضر کے مسلمانوں کی مجاہدانہ خوبیوں کا
پہا پہا احساس رکھتے ہیں۔

اقبال مسلمانوں کی نفسیاتی اور فکری استعداد کو بھی اہمیت دیتے ہیں۔ ان کا فلسفہ
خودی کی بنیاد ہی نفسیاتی اور فکری استعداد ہے۔ فلسفہ خودی میں روح اور جسم کے درمیان
احتمال قائم رکھا گیا ہے اور اس میں احساسِ نریبائی، احتمال، قربیت، اکلان، درگزر،
احساسِ آزادی اور دیگر صفات کی صفائے پاکیزگی ہے۔ اسی طرح اس میں ذاتی کی
پہچان، علمِ اہل کی یکہ پائی اور سماجی ثقافت سے درجاء اور ماضی کی تاریخ سے واقفیت بھی
موجود ہے۔

روحانی جذبہ
عقل و احساس
عقل و احساس

کم کہ وہ دلی یقین و تا امید
 پشیمان اندر جهان بجزی کج
 چاکران مگر ز غور و سوختن به لیس
 کشت بند در خاکستان معماران
 کعب در حضور توکل آگاہ نیست
 تا به بذب اندر پیش راه نیست
 کشت را معمار تا کی می کشد
 قوی به با یک شایان بعد

دشمن کی باری کی خوش نموی میں دیکھتے ہیں

گتہ چاہتا محرم اسرار شد
 غار از خواب گران بیدار شد
 بذب ہای جزو او را داند اند
 بدعای گتہ را نگھانہ اند
 بر تو ای دانی اسرار رنگ
 کس کو غصہ وہ بار رنگ
 بچ قوی از پرچہ لاخود
 لی چون وہ لئون کاری کرد
 ای گئی از اوق و شوق و سوز و دوا
 می کشای مصر تا با با چ کس
 سوز تو با در میان چند بکشت
 بجزر آید در آید بکشت

بهن این عصر را کجا ششم
 داد اول خویش را در هشتم
 احتساب خویش کن از خود مرد
 یک دو دم از غیر خود بیگانه شو
 تا کجا این خوف و وسوس و هراس
 اند این کشور مقام خود شناس
 شط ای از خاک او باز آفرین
 آن طلب ، آن جستجو باز آفرین
 باز جذب اندران او را بده
 آن بتون زو فتون او را بده
 یحیی چه بله کرد ای اقوام شرق
 باز روشن می شود ایام شرق

♦♦♦♦♦♦♦♦♦♦

اقبال کا تصور بے خودی

اقبال نے اپنی شعری تصانیف "اسرار خودی" اور "رموز بے خودی" میں ایک عام بات پیش کیا ہے۔ اگر اقبال کا فلسفہ خودی فرد کی انفرادی حیثیت کے حوالے سے پیش کیا گیا ہے تو میں کا فلسفہ بے خودی فرد کی اجتماعی حیثیت کو اجاگر کرتا ہے۔ انسان کی زندگی محض انفرادی نہیں ہوتی بلکہ ایک معاشرتی ماحول میں ہونے کی وجہ سے وہ ایک جماعت کا فرد بھی بنتا ہے اور جماعت سے وابستگی اس کی شخصیت کی تعمیر اور تربیت کے لیے ضروری

ہے۔
فرد اور معاشرے کے تعلق کے حوالے سے یہ سوال بنی اہمیت کا حامل ہے کہ فرد معاشرے کے لیے ہے یا معاشرہ فرد کے لیے ہے۔ کیا معاشرے کے استحکام کے لیے فرد کو قربانی دینی چاہیے یا معاشرے کا یہ فرض ہے کہ وہ افراد کو تھکا فراہم کرے، انسان کے لیے سب سے تمنا زندگی کا آغاز کیا یہ سوال اس کی توجیہ کا مرکز بنے رہے۔

فرد اور معاشرے کے تعلق کے حوالے سے دو نظریے ہیں۔ ایک نظریہ فرد کے مطلق اہمیت پر ہے اور دوسرا نظریہ جماعت کو محور قرار دیتا ہے اور فرد کی اہمیت اس کے لیے کوئی اہمیت نہیں رکھتی۔ فلاسفوں نے یہ نظریہ پیش کیا کہ مطلق وجود معاشرے کا ہے فرد کا نہیں۔

اس تصور کے برعکس ملکیت کا یہ تصور ہے کہ دنیا کی کوئی حیثیت نہیں ہوتی۔ صرف ایک فرد یعنی بادشاہ کی حیثیت ہوتی ہے اور باقی لوگ اس کے غلام ہوتے ہیں۔ دوسرے فلسفی پیشے نے فرد کو مطلق اہمیت کا دیا۔ اس کا خیال تھا کہ جماعت کی پانچواں فرد

کی شخصیت کے ارتقا میں شکاوت ثابت ہوتی ہیں۔ رنگی نے جماعت اور شخصیت اور ان کے
 وہی اور فرد کی انفرادیت کو ختم کر دیا۔ کارل مارکس نے اشتراکیت کا فلسفہ پیش کیا جس
 صرف جماعت اہم ہوتی ہے اور فرد کی آزادی کی کوئی اہمیت نہیں۔ اور کہ وہ دوسرے
 معاشرے کے قیام اور بگاڑ کا ارمیہ ہے اور اس کی زندگی کا کوئی مقصد نہیں ہے۔

فرد اور جماعت کے حوالے سے یہ دونوں نظریے اظہار و خرابی کا پھر یہاں
 دونوں فرد اور جماعت کو ایک دوسرے کا حریف ثابت کرتے ہیں۔ اقبال کا تصور یہ نہیں
 اس اہم سوال کا جواب ہے کہ فرد معاشرے کے لیے ہے یا معاشرہ فرد کے لیے ہے۔
 اقبال کا یہ نظریہ قرآنی تعلیمات سے ماخوذ ہے۔ اسلام اعتدال اور توازن کا قیام ہے۔
 اسلام نے انسان کو عزت اور تکریم عطا کی۔ ہر فرد کی انفرادیت کو تسلیم کیا اور انسانی بات
 کی نشوونما کو زندگی کا مقصد قرار دیا۔ ہر معاشرے پر یہ فرض عاید کیا کہ وہ انسان کو زندگی
 کی ضروریات اہم پہنچائے اور اس کے کردار کی نشوونما کے لیے یکساں مواقع فراہم کرے۔
 اگر وہ کارہیض یہ قرار دیا کہ وہ معاشرے کو تھکنے فراہم کریں جو ان کی شخصیت کی تکمیل کا
 ارمیہ ہے۔

اقبال اسلامی نظام کو تمام نئی نوع انسان کے لیے بہترین نظام نہیں کرتے ہیں۔
 اسلام ان کی شخصیت کے کسی پہلو کو جماعت کے مفاد سے الگ نہیں کرتا۔ اس کی تمام
 اہمیت میں انسانییت کا عنصر چلا جاتا ہے۔ نیک، روزہ، حج، زکوٰۃ سب میں فرد جماعت سے
 منسلک ہے۔ اسلامی معاشرے کی بنیاد اہمیت اور مساوات پر ہے۔ اخوت کی رو سے تمام
 مسلمان ایک میں ہیں۔ یہی اور برتری کا مفہوم تقویٰ ہے۔ مشکوٰی "رسول بے کوئی"
 میں اقبال نے سب سے پہلے فرد اور جماعت کے درمیان برابری کی راہی ڈالی ہے۔ آپ فرماتے ہیں

اور ما اہم جماعت رحمت است
 جموعہ ہمہ ما تکمل القلوب است

فرد تا امد جماعت کم شود

قدرت و وسعت طلب قلوب شود

فردے کے بغیر سہارا کا وجود ممکن نہیں۔ اسی طرح افراد کے بغیر ملت جمعی کی جگہ نہیں۔
 قلوب کا رونا اس سہارا میں بدل دیتا ہے۔ اقبال انفرادیت کے ناکہ کی جگہ جماعت کی
 بنیاد میں اجتماعییت کے بغیر فرد کی زندگی کی تمام صلاحیتیں مایاں بناتی ہیں۔ فرد کی جسمانی
 کی تکمیل معاشرے کے بغیر ممکن نہیں۔ ذہن داری اور فرض کا احساس معاشرے سے پیدا
 ہوا کرتا ہے۔ اقبال خودی کے ظہور ہونے کے باوجود اجتماعی زندگی کو اہمیت دیتے ہیں۔

وجود افراد کا مجازی ہے ہستی قوم ہے حقیقی

فدا ہو ملت پہ یعنی آتش زب طمس مجاز ہو جا

فرد قائم ربط ملت سے ہے جہاں جگہ نہیں

موت ہے ادرا میں اور حیران ادرا جگہ نہیں

اس لحاظ سے عقیدہ بہ ایم لکھتے ہیں:

فرد کی جماعت سے ربط کے بغیر کوئی حیثیت نہیں لیکن جماعت کا

وجود کم ربط انسان کی انفرادی خودی کو سہکت نہیں کرتا بلکہ اس کی

پوشش کرتا ہے۔ (۱)

اس لحاظ سے ڈاکٹر یوسف حسین کا کہنا ہے:

انفرادی جماعت کا تعلق ایک قسم کا ذمہ عضوی (آرگنک) تعلق

ہے۔ فرد اپنے آپ کو اگر چاہے بھی تو جماعت سے علیحدہ نہیں کر

سکتا جس طرح دولت کی تلاش انسان سے غذا لیتی ہیں اسی طرح

فرد کی زندگی کی تلاش جماعت میں پوشیدہ رہتی ہیں۔ فرد کی

تھیلی رات سے مزاد یہ ہے کہ وہ اپنے تعلقات کو عیامت کے
ساتھ استوار کرے اور نہ وہ اس عورت کے مثل ہوگا جس کی لڑائی
انگریزی ہوں۔" (۲)

انگریزی زندگی مختصر ہوتی ہے۔ افراد جلد جلد مٹنے والے ہوتے ہیں لیکن تو میں
انہی میں سے ہوں۔ اسی لیے ان کے دل نسلوں کے درمیان اپنی زندگی کو دائمی بنا لیتی ہیں۔ انہوں
نے ان عقیدت کو "روز بے غوری" میں تشبیہی انداز میں بیان کیا ہے کہ جس طرح پتوں
کے پھلنے کے باوجود اصل بیماریاں باقی رہتی ہیں۔ اور اگر کسی کان سے کچھ گوبر نکل بھی
ہائی تو کان باقی رہتی ہے۔ اسی طرح چند افراد کے مٹ جانے سے قوم ختم نہیں ہوتی
بلکہ قائم رہتی ہے۔ تو یہ صرف موجودہ افراد کا مجموعہ نہیں ہوتی بلکہ یہ گروہ ہونے انسانوں
کی تاریخ بھی ہے اور اس میں آنے والی نسلیں بھی شامل ہوتی ہیں۔ اس طرح امت
پریم ہوتی ہے۔ افراد انفرادی قصاصد حاصل کرنے کے لیے جدوجہد کرتے ہیں لیکن
والیبر قصاصد حاصل کرنے کے لیے ان کی عیامت سے وابستگی ضروری ہے۔ انسانی
فرائض سرچشمہ دینے کے لیے ضروری ہے کہ افراد میں ایثار اور خود فراموشی کا جذبہ پیدا
ہو۔ فرد کی غوری جب نسبت یافتہ اور مستحکم ہو جاتی ہے تو اس سے دوسروں کو فائدہ پہنچانا
پا ہے۔ اس کو انہوں نے غوری کہتے ہیں۔ یہ بے غوری فرد کو غور غرض نہیں ہٹے دیتا۔ سب
تک فرد تیار رہتا ہے اس کے سامنے کوئی بدانسب نہیں ہوتا اس کے دل میں اسی
عاصد کی تحریک پیدا نہیں ہو سکتی۔ اس طرح قدرت نے اسے جو صلاحیتیں عطا کی ہیں وہ
خدا ہی ہو جائیں گی۔ عیامت اس کی قدرت عمل کو ایک شاخیلے میں آتی ہے اور اس طرح
غوری ذاتی افروض سے لگ کر جماعتی افروض اپنا لیتی ہے اور "میں" "تو" میں بدل جاتا

ہے۔ مزاج احمد کا کہنا ہے
"میں نے اپنی اپنی زندگی کے افراد کو مل کر نہیں۔ جب تک وہ عیامت

کے اندر اور جماعت کے ساتھ اپنی نمود کر کے فرد کی خودی کو
 اور پاپ زنجیر ہے گی۔ اجتماعی ارتقا سے حقیقی آزادی رہتا ہے۔
 جماعت میں فرد کی خودی خود نشانی کر کے جماعت کی خودی بن جاتی
 ہے۔ یہی رہز ہے خودی ہے۔" (۳)

اقبال کے خیال میں فرد اور قوم ایک دوسرے کے لیے آئینے کی طرح منظر
 ہیں یعنی اگر وہ کی حالت اچھی ہو تو قوم کی حالت بھی اچھی ہوگی اور اگر قوم کی حالت اچھی
 ہو تو اس بات کا اندازہ ہو جاتا ہے کہ قوم کے افراد کی حالت بھی کئی کو کچھلی ہوگی ہے
 اقبال نے اس طرح اشاروں اور تہکھوں کا ذکر کیا ہے کہ تہکھوں اشاروں ہی کا عظیم اثر
 ہر صورت ہے۔ اگر اشارے بگاڑ ہوتے تو تہکھوں صورت پذیر نہ ہو سکتی۔ موتی اور ہار کی
 تشبیہ نے بھی اقبال نے فرد اور جماعت کے تعلق کو واضح کیا ہے کہ قوم موتیوں کی بنا
 ہے۔ اگر موتی نہ ہوں تو ہار کیسے بن سکتی ہے۔ اور ہار یہ بھی حقیقت ہے کہ جس قسم کے
 موتی ہیں اس قسم کی بنا ہوگی۔ یہ نہیں ہو سکتا کہ بنا تو قیمتی ہو اور موتی قیمتی نہ ہوں۔

فرد و قوم آئینہ یک دیگر اند

سک و گوہر، تہکھوں و اثر اند

اقبال کے تصور خودی اور بے خودی میں بظاہر تضاد نظر آتا ہے لیکن یہ حقیقت
 ہے کہ بے خودی سے خودی کا یہاں مفہوم ہوتا ہے۔ فرد کی توہین میں اضافہ ہو جاتا ہے۔ فرد کے
 دل میں آگ کے دھکے اور پاپوں سے کا اہل بے ہوش ہوتا ہے۔ اس حوالے سے ڈاکٹر نظام
 زہرا کا کہنا ہے

اقبال کا تصور بے خودی یا بظہر میں خودی یا باطنی ضرور ہے
 لیکن اس باطنی کی تعلقات سوائے اس کے کچھ نہیں کہ وہ ایک وسیع
 حوسہ اور سوا میں لڑائی یا خدا کی کے لیے ایک روحانی اور

یہ وہی نظریہ رہنمائی کرتی ہے جنہاں مقصود کی طرف۔ (۳)
 اقبال نے مصرعے اور لفظ کی تشبیہ سے بھی فرزہ اور ہدایت کے تعلق کی
 وضاحت کی ہے۔ ایک مصرعے میں کئی لفظ ہوتے ہیں لیکن اگر ایک لفظ بھی اور اور ہو
 جائے تو مصرعہ بھل ہو جاتا ہے۔ جیسا کہ انفرادی طور پر ان الفاظ کے معنی اب بھی وہی
 جگہ کے جو پہلے تھے۔ مشنوی رموز بے خودی میں اقبال کہتے ہیں:

لفظ چہاں از سبب خود بیرون نشست

مگر مشنوں سبب خود نکست

اقبال کے نزدیک افراد کے باہمی ربط سے ایک ملت وجود میں آتی ہے۔ جس
 طرح کائنات کا نظام جذب باہمی پر قائم ہے اسی طرح ملت بھی جذب باہمی سے قائم
 رہتی ہے۔ جس طرح فرد کی خودی کی تعمیر ہوتی ہے اسی طرح ملت کی خودی کی تعمیر ہوتی
 ہے۔ افراد کے کردار کو وحدت کا روپ دینے والا مرکز توحید ہے۔ ایک خدا کی اطاعت
 کرنے والے خود بھی ایک ہو جاتے ہیں۔ عقیدہ توحید ملت کے لیے ایک غیر محسوس مرکز
 کی حیثیت رکھتا ہے۔ توحید کے عقیدے نے رنگ و نسل کے امتیاز کو مٹایا اور اسلام کے
 رہنے سے انسانوں کو ایک دوسرے کا بھائی بنا دیا۔ توحید کا طہیرہ تمام انسانوں کو ایک
 مادری کے طور پر دیکھتا ہے۔ رنگ و نسل کی بنا پر دوسرے انسانوں سے نفرت نہیں کرتا۔
 قوم اسی وقت بنتی ہے جس وقت اس کے افراد کے تصورات و نظریات ایک جیسے ہوں سب
 ان کے سامنے ایک ہی نصب العین ہو۔ فکر و نظر کی ہم آہنگی اور بنیاد ہے جس پر ایک قوم کی
 وحدت استوار ہوتی ہے۔ یہ اسی صورت میں ہو سکتا ہے جب سب کے سامنے غیر و شرک
 یا کئے کا معیار ایک ہو۔ یہ کیفیت صرف توحید سے پیدا ہو سکتی ہے۔ اقبال کہتے ہیں:

منہج ریاضاتیں اچانک آئی

سازگار ہر دو گروہوں کا

لا الہ سرماہ امرار ما

رہنہ اش شیرازہ انکار ما

توحید کے عقیدے سے انسان میں خود اعتمادی پیدا ہوتی ہے۔ اسلام سے پہلے انسان
 فطرت سے خائف تھا اور موجودات فطرت کی پرستش کرتا تھا۔ مثلاً پانا، سورج، چاند،
 شجر و پھر کو پر جاتا تھا۔ اس کے لیے ناممکن تھا کہ وہ ان پر قدرت حاصل کرنے کی کوشش
 کرتا۔ اسلام نے انسان کو ذہنی اور فکری آزادی عطا کی۔ مسلمانوں کو صرف عقیدہ ہی نہیں
 دیا بلکہ عملی طور پر ایک نمونہ بھی پیش کیا جو حضور ﷺ کی ذات کی صورت میں اس کے لیے
 مفضل رہا ہے۔ حضور نے مساوات، اخوت اور حریت کی تعلیم دی۔ افراد کو ایک امت میں
 جمی کر کے کاروبار رسالت ہے۔ رسالت ملت کی شیرازہ بندی کرتی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے
 انسان کو پیدا کیا لیکن یہ صرف بے جان ٹکڑے تھے۔ اس میں حقیقی زندگی ایمان کی نوا سے پیدا
 ہوئی جو انسان کو رسالت کی رسالت سے ملی۔

حق - تعالیٰ حکم ما آفری

از رسالت درین ما جان و مید

از رسالت در جہاں کجوں ما

از رسالت دین ما آئین ما

از رسالت صد ہزار ایک است

تو ما از خدا ما لایک است

اللہ تعالیٰ زندگی آئین سے منظم ہوتی ہے۔ اگر کسی قوم میں لاکھوں لوگوں کا ہونا ہو تو پھر وہ
 قوم، قوم نہیں رہتی بلکہ حکمرانوں کا ایک گروہ بن جاتی ہے۔ سب لوگوں کا آئین و دستور
 قرآن ہے۔ اس کا کلمہ کا لفظ آئین اور دستور کی پابندی سے چل رہا ہے۔ اقبال اس
 بات کی وضاحت اس شعر کے آدھے کرتے ہیں کہ پہلی پہلی منتشر ہیں آئین کی

ہندوستان میں لائی گئی۔ پھر ان کے اپنے آپ کو آئین کا پابند بنایا تو گلہ مت ہی گئے۔
 بڑی شرم و خجالت پیدا ہوئی تو سوچا ہی نہ پائی ہے ورنہ شہر و نواح کا ہی کہنا ہے گی۔

ہر گئی شہ چوں ز آئین ہست شد

گئی ز آئین ہست شد ، گلہ مت شد

نور از عین صفا پیدا ستے

عین ہوں نکت از صفا نوحا ستے

ہستی مسلم ز آئین است و ہی

ہیمن و ہیمن گئی آہی است و ہی

ہاں کتاب لغت قرآن حکیم

کتاب او لا یزال است و قدیم

قومی زندگی کے لیے ایک مرکز کی ضرورت ہوتی ہے اور مسلمانوں کے لیے یہ
 مرکز کونسا کہ ہے۔ تمام دنیا کے مسلمان کسی کے موقع پر یہاں جمع ہوتے ہیں اور اس
 لئے ہر ملک کے مسلمان ایک دوسرے سے مل کر ایک ہو جاتے ہیں اور عالمی وحدت کا
 مظاہرہ کرتے ہیں۔ نسل، رنگ اور وطن کا امتیاز مٹ جاتا ہے۔

قوم یا دینا ، نظام از مرکزے

دینا گاہی یا نظام از مرکزے

نار دار و نار یا بیت الحرم

سور یا ہم سال یا بیت الحرم

اللہ اعلم بالصواب

”انہی عالم اسلام کے ایک مرکز کا تصور بھی نہیں کرتے ہیں اور یہ

مرکز بیخودی طور پر مذاہب اور تہذیبی بنیادوں پر قائم ہے اور کہہ کر اور

ہوتے ہیں اور اس مرکز کو ناگزیر قرار دیتے ہوئے کہتے ہیں کہ اس
سے انسانی وحدت برقرار رہتی ہے۔" (۵)

اقبال مسلمانوں کے لیے ایک ایسا کلام حیات چاہتے تھے جس کی بنیاد اترتی
ہو۔ اسلامی کلام حیات نے رنگ و نسل کے فرق کو مٹا دیا اور دنیا کے تمام انسانوں کی طرف
کے رشتے میں پورا رپا انسان کو انسان کا احترام کرنا سکھایا۔ اقبال کے نزدیک جبرین نہیں
ہوے جس میں ایک انسان دوسرے انسان کا احترام کرے۔ آپ کا کہنا ہے:

ہرگز از گروہوں مقام آدم است

اصل تہذیب احرام آدم است

ملت ہرگز سے ملتی ہے اور افراد کی تعلیم و تربیت کا انحصار ماکن ہوتا ہے۔
ملت کی تعمیر میں ماکن کا راز ہے۔ اقبال نے قومی زندگی کی تعمیر میں عورت کے مقام
اور مرتبے کا بار بار ذکر کیا ہے چونکہ ملت نسل انسانی کی بنا کی بنا میں ہے اور اس کی
تہذیب و ترقی کے لوازم و اجزاء ہیں۔ مشرقی "دوسو بے خودی" میں آپ نے کہا
ایک اب ایسا ہے کہ عورت فاطمہ کو مسلمان عورتوں کے لیے بہترین نمونہ
قرار دیا ہے۔

"دوسو بے خودی" میں اقبال سورہ انفاس کی تفسیر بیان کر کے مسلمانوں کو قومی
زندگی میں بے خودی کے نکتے سکھاتے ہیں۔ سورہ انفاس مسلمانوں کو متحد رکھنے، غیرتوں
سے بے لاپرواہی رکھنے اور ایک موزون قوم بننے کی طرف رہنمائی کرتی ہے۔

ہیواد پر دستار ہوئی ہے۔ ملت فر کے کاسوں کے لیے تہذیب کی
اپنے ہاتھ سے ناکل ہو رہی ہے۔ اقبال نے ایسے اسلام کے نقطہ نگاہ سے فراد و ملت یعنی
عورتوں اور بے خودی کا تعلق واضح کیا جو تمام انسانیت کی بھلائی ہی میں ہے۔

ایک صالح اور مہذب معاشرے کی اساس توحید اور رسالت کے اصولوں پر
 مبنی ہے اور اسلام اس معاشرے کی اکمل صورت ہے جو تمام نئی نوع انسان کو اخوت اور
 برادری کی بنیاد پر توحید و توحیح خودی کے یکساں مواقع فراہم کرتا ہے۔

•••••

حوالہ جات

- ۱۔ خلیل مہدی، ڈاکٹر، "مگر اقبال" طبع المصنف، پدم اقبال لاہور، ۱۹۶۶ء
 ۲۔ یوسف حسین خان، ڈاکٹر، "ادب اقبال"، تقریریں آنکڑ، لاہور، جنوری ۱۹۶۶ء
 ۳۔ عزیز علی، "اقبال نئی تفسیر"، گلوب پبلشرز، لاہور، دوسرا ایڈیشن، ۱۹۶۸ء، ص ۳۲۱
 ۴۔ علامہ مرتضیٰ، ڈاکٹر، "اقبال کا فلسفہ خودی" مرتبہ علامہ علی ہادی، ہاشمی حسن لہاری،

۱۹۶۷ء

- ۵۔ محمد عمران ہاشمی، "سہ ماہی "آفتاب"، لیاہ، پرنٹرز، اسلام آباد، اکتوبر - دسمبر، ۱۹۶۳ء

ادبی اصناف

۱۔ ادبی اصناف: ایک تعارفی نظر

ادب کی نئی اصناف (Genres) کی تاریخ کے بیان اور وضاحت سے مقالہ نگار کا مقصد یہ ہے کہ قاری کی فکشن، شاعری، ڈراما اور مضمون کی تنظیم کی استعداد کو بڑھایا جائے۔

'Genre' فرانسیسی لفظ ہے جو ادبی تنقید میں ادب پارے کی ہیئت کی شناختی کے لیے بہت استعمال ہوتا ہے۔ قاری کے لیے ضروری ہے کہ وہ ادب کی مختلف اقسام اور ان کے عمل، ان کی الگ الگ امتیازات اور ان کے اشتراک یا اختلاف سے واقف ہو۔ ہر ہیئت کی خاص اصطلاحات ہیں اور مصنف اور قاری کے لیے ضروری ہے کہ ان کے حلقے یا اصطلاحات دیکھا اور دوسرے زندگی سے اس کی مثال لیتے ہوئے ہم دیکھتے ہیں کہ جب لوگ کسی نئے کام کا آغاز کرتے ہیں یا کوئی نیا کھیل کھیلنا شروع کرتے ہیں تو نئی اصطلاحات اور نئی زبان سے ان کا ساتھ چلتا ہے۔ تاہم جلد ہی اس خاص ماحول میں جس میں وہ خود کو موجود پاتے ہیں، وہ ان کا استعمال انبار کے فطری طریقوں کی طرح شروع کر دیتے ہیں۔ اسی طرح جو لوگ ادب یا فننگ کرتے یا لکھتے ہیں، مخصوص اصطلاحات استعمال کرتے ہیں۔ ان اصطلاحات سے واقفیت ادب یا فننگ کرنے اور ان کے حلقے لکھنے کی سہولت کرتی ہے۔ یہ شاعری، المانی، ڈراما اور غیر انسانی نثر کو دیکھنے کے لیے طریقے سکھاتی ہے اور قاری زندگی میں اور اس ادب کے درمیان، جو ہم چاہتے

ہے اور غالباً شاعری بھی اسے اسی طریقے پر چڑھتا ہے۔ بہت سے بڑے واسطے اور
 مطالعے کا پتہ ہیں کہ افسانوی ادب کی طرح غیر افسانوی ادب بھی پڑھ کر دماغ انسان کے
 لیے لکھا جاتا ہے کیونکہ یہ عام طور پر ناپائیدار ہوتا ہے۔ تاہم اس کا مقصد محض یہ کہہ کر کہنے
 سے کہیں زیادہ ہوتا ہے۔ غیر افسانوی اثر کے کسی ایک مقاصد ہو سکتے ہیں جن میں سے
 ایک محض ہے تفریح اور — اس کے بنیادی مقاصد، مزہ کی مشکلات کے ساتھ ساتھ،
 شاعری تک غیر پہچان، کوئی اخلاقی سبق دینا، نکات کے عقلی وجود اور بنیادی پہچان کی ترقی
 کرنا یا سماجی اصلاح کے لیے مددیں پر اثر انداز ہونا وغیرہ ہو سکتے ہیں۔ اس کی دوسری ایک
 مقصدوں کی ہو سکتی ہے جس کا موضوع داخلی تصور، یا خیالات کا اظہار وغیرہ ہوں یا اس قسم
 کی شاعری اور دیگر شاعری (Nylon) کی مددیں ترقیوں میں یا احتیاط سے مراد کے لیے
 لیکن (Bacon) کے مطالعے میں مل سکتی ہیں۔

انسان ہمیشہ سے کہتوں میں دلچسپی لیتا آیا ہے۔ اس کا ثبوت قصوں کے
 واسطے کی قصوری اور نسل بر نسل منتقل ہونے والی حکایت (Tales) اور فہلو (Fables)
 ہیں۔

ادب کی مختلف اصناف کی تعلیم اور محکم مطالعے کے لیے ضرورت اس بات کی ہے
 کہ طلبہ کو ہر ایک کی انتہائی خصوصیات سے باخبر کیا جائے۔ ادب پڑھنے والے انسان،
 افسانے، شاعری اور غیر افسانوی اثر کو گہرائی میں جا کر دیکھنے کی کوشش کرتے ہیں تو وہ ان
 اصناف کے حقیقی طور پر اپنی ترقیات مطالعے ہیں، اس مقصد کے پیش نظر مطالعہ کرنے والے اس
 باب کو ادب اصناف کے مطالعے کے لیے محکم کا ہے تاکہ وہ انسانی زندگی کے مطالعے میں ہر
 ایک کی خصوصیت کا جائزہ لیا جاسکے اور اسے دماغ کو حیرت انگیز کرنے کے لیے تمام
 سرگرمیوں اور صلاحیتوں کو ایک وحدت کی صورت کی بنا جائے تاکہ اس سے طلبہ اس قابل ہو
 سکیں گے کہ وہ ادب پر محکم کر سکیں، ادب کو سمجھیں، اس پر اپنی رائے کا اظہار کر سکیں اور

یہ سب کچھ ہے۔ مثال کے طور پر انہوں نے کہا کرتے ہوئے
 یہاں آج بھی اس میں موجود اشاروں کے ذریعے اس کے معنی تک پہنچنے کے لیے
 یہ سب کچھ کے لیے کوئی اور اصول بتائے گا۔

یہ انہوں نے کہا ہے۔ مثال

یہ انہوں نے کہا ہے۔ مثال

یہ انہوں نے کہا ہے۔ مثال

یہ انہوں نے کہا ہے۔ مثال

یہ انہوں نے کہا ہے۔ مثال

یہ انہوں نے کہا ہے۔ مثال

یہ انہوں نے کہا ہے۔ مثال

یہ انہوں نے کہا ہے۔ مثال

یہ انہوں نے کہا ہے۔ مثال

یہ انہوں نے کہا ہے۔ مثال

کو یوں بیان یا انداز میں کیوں پیش کرتے ہیں جبکہ پیغام عام راستہ بھی سمجھایا جا سکتا ہے۔ یہ
 کہیں ہے کہ کہانی سنانے کے وسیلے کے طور پر اب تھیں زیادہ استعمال کیے جاتے ہیں۔
 وراثت بتائی جا سکتی ہیں۔ ایک یہ ہو سکتی ہے کہ قرون وسطی کے عیسائی یا کیمبرلی
 حکومتیں تھی جمہوری حکومتوں کی نسبت عموماً زیادہ تھیں مزاج اور Paranoid قسم کے
 مصنف اگر زیادہ نکل کر اپنے خیالات کا اظہار کرتے تو اسے ایذا رسانی کے خطرے کا سامنا
 کرنا پڑتا۔

فانٹا یہ تمام وراثت ہے۔ یہ وہ ہیں بھی اتنی ہی باتیں ہیں جتنی قرون وسطی میں
 تھیں، سو سو سو وہ میں کہانی کہنے کے اس چلن کے قائب ہونے کی وجہ سمجھنا مشکل ہے۔
 یہ نہیں کہا جا سکتا کہ یہ بالکل قائب ہو گیا ہے۔ یہ آج بھی مل جاتی ہے، بلکہ کسی لحاظ سے
 یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ افسانوی ادب کا اکثر حصہ اپنے اندر تھیں ماسٹر رکھتا ہے لیکن تخلیقی
 اظہار کی طرف تھیں کا یہ طریقہ سب زیادہ نمایاں نہیں رہا۔
 32۔ اسطور

افسانوی ادب کی ابتدائی مثالوں میں سے ایک اسطور (Myths) بھی ہے جو
 ابتدائی زمانوں کی کہانیاں بتاتی ہے اور بھی یہ بتاتی ہے کہ کوئی نوعیت یا نوعی کس طرح
 معرض وجود میں آئے۔ یہ اسطور حضرت کے اسطور کے بارے میں ہیں جن میں کائنات
 اور اس کے اجسام کی آفرینش بھی شامل ہے۔ پھر عمارتے پاس پہنچتے تھے
 (Legends) جو افسانوی کہانیوں کی جہازوں کی کائنات کی شکل کرتے ہیں یا ماضی
 کے جتنی لوگوں کے کارناموں کو لکھیں کہ کے بیان کرتے ہیں۔ لیکن عموماً ایک طرحی
 کہانی یا مشعل ہوتی ہے جس میں کسی خاص معاشرے کے اختیاری اوصاف کی تصویر
 قریب کی جاتی ہے۔ پل بیان (Paul Bunyan) کی کہانی کے بارے میں کہا جاتا
 ہے کہ وہ جتنی آری کی کہانی ہے۔ لیکن اس کی علامت، Blue Ox اور گیب، طریقہ

یہ ان لوگوں کی اختراع ہیں جو اس عمل میں گنہگاروں کی داستان سننے اور سناتے ہیں۔ ان لوگوں سے کام کرنا ہے۔ لڑائی میں جیسے نہیں جتا اور محفل کا لطف اٹانے کے آداب سے باخبر ہے۔ امریکہ کے مغرب کی طرف پہلاؤ کے ابتدائی برسوں میں یہ سب خوبیاں بہت قابل تعریف تھیں لیکن اساطیر کے برعکس، انسانی نوعیت کے حقیقی کرداروں پر مبنی ہوتا ہے۔ ان کے نام فرضی ہوتے ہیں جیسا کہ "romans a clef" میں ہے۔ مطابقت کا انکار کرنا بھی عرصت کے ساتھ نہیں ہوتا لیکن نمایاں خصوصیات کے ذریعے ان کی طرف اشارہ کیا جاتا ہے۔ یہ وہی مصنف کو دوسروں کی تعریف یا تنقید کرنے کا نہایت محفوظ طریقہ ہے۔ یہ مصنف کو محفوظ رکھتے ہوئے ان لوگوں کی خدمت کرنے اور معاشرے کے مسائل پہنچانے پر نظر کرنے کے لیے بھی استعمال ہو سکتا ہے کیونکہ اگر پوچھا جائے تو مصنف کوئی بھی حقیقی اشخاص کے ساتھ مطابقت سے انکار کر سکتا ہے۔

33۔ افسانہ - ہیروئن کی کہانی:

اس کے بعد ہیروئن کی کہانی (Fairy Tale) کی پوری آئی ہے۔ اساطیر کی کہانی، ہیروئن کی کہانیوں کے سوسائٹیاں، باوقار افسانہ نگاروں اور واقعات پر مشتمل ہوتے ہیں۔ مثال کے طور پر "Cinderella" میں "fairy godmother" ہیروئن کی زندگی میں خوشیاں لانے میں اہم کردار ادا کرتی ہے۔ ہیروئن کی کہانیاں حقیقی دنیا کی اطمینان دہن کی طرح کی قوی قدر کی توجی کی پوشش نہیں کرتیں بلکہ ان میں زیادہ تر توجی اور شکر کی توجی ہی ہوتی ہے۔ شر کے لاکھڑے کرداروں کو آخر کار ہرچھٹاک سردیوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ ان کو زندہ جا بجا دیا جاتا ہے یا کھولتے ہوئے گلی کے کوزوں میں پھینک دیا جاتا ہے۔ اس کی ایک مثال Hansel اور Gretel کی کہانی میں دکھائی جا سکتی ہے جس کے اختتام پر ہمارے ہیروئن کو خود میں پھینک کر زندہ جا بجا دیا جاتا ہے۔ ہم میں سے اکثر لوگ "Fairy Tales" (جانداروں کی کہانیاں) سے واقف

ہیں۔ ان مقبول کہانیوں کے سب سے مشہور مجموعے کے مصنف کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ ایک پرانی غلام تھا جس کا نام اسپ (Aesop) تھا۔ تاہم یہ کسی طرح بھی حتمی بات نہیں ہے۔ بہر صورت ان کہانیوں نے بچوں کی بے شمار نسلوں کو محظوظ کیا ہے۔ فیلو لہرا جانوروں کے متعلق ہوتی ہیں جن کی بول چال اور افعال و اعمال انسانوں کی طرح ہوتے ہیں۔ فیلو میں کھلا سنی موجود ہوتا ہے۔ جیسے 'بکھوا اور فرکوئی' کی کہانی میں تیرہ "آہستہ اور مستقل مزاج کامیاب ہوتا ہے" صاف طور پر بیان ہوتا ہے۔

4.4- اسطورہ-یو ایل

تو پیر یو ایل (Parable) کیا ہے؟ فیلو کی طرح، یو ایل کوئی حتمی حکایت ہے یا کسی وجہ سے روایتی تصور کو انسانی تجربے کی حدود میں لا کر اس کی وضاحت کرتی ہے۔ یہ ایک کہانی ہوتی ہے جو اس اصول سے مشابہت رکھتی ہے جو مصنف لکھنا چاہتا ہے۔ Now Testament میں یو ایل میں خدا کا باپ سے موازنہ کیا گیا ہے جو ایک گمراہ بیٹے کے دوبارہ راہ راست پر آنے پر شادمان ہوتا ہے جبکہ دوسرا بیٹا اپنے باپ سے غیر حیرت انگیز اور ہمدردی کے باوجود ٹھکرانہ کیے جانے کی ناانصافی پر ٹٹا ہوتا ہے۔

4.5- نوجوان شعرا و ناول

یہ بیان کی گئی شعرا و ناول کے تمام ابتدائی نمونے آج بھی موجود ہیں۔ تاہم انیسویں صدی میں حتمی شعرا و ناول کی ایک نئی وضع ہوئی۔ اس وقت کے اولین شعرا فرانس میں ہوسس (Maupassant)، روس میں چیخوف (Chekhov) اور انگلستان میں ایلیٹ (Mary Ann Evans) اور ہارڈی (Hardy) اور امریکہ میں پو (Poe)۔ انیسویں صدی (Hawthorne) اور امریکی ناول نگار فریمن (Mary Wilkins Freeman) تھے۔

حتمی شعرا و ناول انیسویں صدی کا حتمی شعرا و ناول نگاروں کی ابتدائی نمونوں سے

یہاں سے لے کر اس کا مرکز نکال دیا اور اس کی زندگی کے واقعات اور مناظر تھے۔ اس کا ہر پہلو اس کے رویہ، چاقور جن اور جانور نہیں تھے بلکہ عام مرد، عوامین اور بچے تھے۔ یہاں سے اس کی بجائے متعدد ہوسٹ کے حامل تھے۔ مقرر انسانوں نے ان کی کہانیوں نے حقیقی آدمیوں کے تضادات اور جیسے کہیں کو پیش کیا۔ کہانیوں نے ان کی کہانیوں کو ظاہر کرنے کے لیے کہانیوں کے پلاٹ زیادہ بھر اور متنوع تھے۔ ساتھ ساتھ ان کے پہلوں کے بجائے بہت زیادہ سیٹ بنائے گئے اور زبان و مکان کی صورت زیادہ وضاحت کے ساتھ بیان ہوئی۔ ایک اہم ترقی جو حقیقی مقرر انسانوں نے کی وہ تھی کہ یہ کسی ایک قسم میں سٹی یا سٹیج کی تخلیق سے آگے نکل گیا۔ اگرچہ مقرر انسانوں کی کہانی ان کی بہت بڑی خاص اقدار کی طرف اشارہ کرتی ہے تاہم پڑھنے والوں سے توقع ہے کہ وہ ان کے معانی خود تلاش کریں۔ مصنف نے ان میں ظاہری طور پر کوئی اخلاقی نتیجہ نہیں دیا۔

انیسویں صدی سے بیسویں صدی کے دوران سامنے آنے والے حقیقی مقرر انسانوں نے کسی کردار یا کرداروں کے گروہ کو پیش کرنے والی شکل کو مرکز قرار دیا۔ ایسے آہٹ سے کردار طور اپنے یا دوسروں کے داخل کی صورت حاصل کرتا ہے۔ ان کا رنگ اور ان کی نشوونما اور جمیل کے عمل پر مبنی ہے۔ وہ مقرر انسانوں کی ہے کہ صورت سے آگے کہانی کی سرگم پہنچے ہوئے دکھاتا ہے۔ 'AT کی کہانی' (Story of initiation) ہے۔ اس سے حقیقی ایک وقت Story of apiphany ہے اس میں کردار کی عمل شکل سے گزرتا ہے جو اسے ایک گتہ کی صورت تک پہنچا دیتا ہے۔

اس کے لیے کہانی ہے۔
 حقیقی مقرر انسانوں کی پہلاں میں انیسویں صدی ہی میں ہوئی۔
 انیسویں صدی کی کہانیوں میں پڑھنے والوں کے لیے مقرر انسانوں کی صورت دکھانے والی

اور ایسے واقعات سے گزرتا ہے جن کی توجیہ روایتی فطری قوانین کی مدد سے نہیں کی جا سکتی۔ غیر حقیقی کہانیوں میں اکثر انسانی سڑکی ابتدائی انسانوں کے ماحول سے ہوتے ہیں۔ تاہم وہ حقیقی مختصر انسانے سے بھی بہت خصوصیات کا اشتراک رکھتی ہیں۔ غیر حقیقی مختصر انسانوں میں کردار زیادہ اکتفا یافتہ اور روحانی اور نفسیاتی گہرائی کے حامل ہوتے ہیں۔ کہانیوں کے پلاٹ زیادہ وسیع ہوتے ہیں۔ اور ماحول زیادہ تفصیلی ہوتا ہے۔ ان کا سب سے نمایاں پہلو یہ ہے کہ ان کے موضوعات پڑھنے والے کو براہ راست کوئی اخلاقی سبق اپنے کی بجائے عبرت، سوچ اور استفہام کی طرف راغب کرتے ہیں۔ یہ کہانیاں پڑھنے والے کی تجرباتی صلاحیتوں میں گھما بیٹھا کرتی ہیں۔ غیر حقیقی مختصر کہانیوں کے مصنف زبان و مکان کی حقیقی جہات کے وسیع نہیں ہوتے، وہ اپنے اور اپنے پڑھنے والوں کے تخیل کوئی سمت میں لے جاتے ہیں۔ اس طرح کے انسانے پڑھنے کے لیے قاری کو وہ دیکھنا چاہیے کہ "The willing suspension of disbelief" کہتا ہے یعنی ایسے ماحول، پلاٹ اور کرداروں کو پڑھنے، ان سے لطف اٹھانے اور ان پر غور کرنے پر راغب ہونا چاہیے اور غیر روایتی سمجھتے ہیں۔ یہ سب دیکھ کر کسی ایک موضوع کی طرف لے جانے کی جہات کی مختلف سمتوں کی طرف لے جاتے ہیں۔

حقیقی کہانیوں اور انسانوں میں جو فاصلہ کیا ہے؟ ایک سادہ سا جواب تو یہ ہے کہ سکتا ہے کہ حقیقی کہانیاں حقیقی واقعات کو اور اس کو پیش کرتی ہیں جو کہ حقیقتاً لوگوں کے ساتھ ہوا ہے۔ انسانے کا تعلق فرضی کرداروں سے ہے اور یہ فرضی واقعات کے کردار گویا ہے۔ اگرچہ یہ وضاحت بظاہر بہت سادہ معلوم ہوتی ہے لیکن اتنی واضح تشریح کرنا اکثر اوقات مشکل ہو جاتا ہے۔ ہم اکثر ایسے مختصر انسانے پڑھتے ہیں جو زبان حال اور ہمارے جاننے پیمانے شہروں کے معلق ہوتے ہیں۔ کوئی پڑھنے والا انہیں کے ہم بھگان سکتا ہے اور اس زمانے کے دیکھ واقعات یاد کر سکتا ہے۔ مثال کے طور پر "تعمیر پاک و ہند" کے پس

ہی نہیں کی کہیں، اس حقیقت کے باوجود کہ کسی جانے بچانے شہر میں لسنے والے
 زیادہ سمجھتی ہیں۔ اہل لوگات کوئی کردار ایسا بھی ہوتا ہے جو کسی ایسے آدمی سے متا
 نہ ہو کہ اس وقت زکوٰۃ خراب کہانی شروع پذیر ہوئی۔ پھر یہ کہانیاں کس حد تک سچی
 ہیں یا کھانسی اسی لوگوں اور مقامات تک محدود ہے جنہیں کوئی پڑھنے والا پہلے سے
 جانتا ہے؟ کیا حقیقت کیے گئے کردار، ان کے اعمال، عمل کش اور جذبات کی کسی غلطی یا
 کمال سے نکلے ہیں؟ جہاں جھوٹی خصوصیات کا پیدا کرنا امکان شروع کے دینے کے
 لیے میں آتا ہے جہاں صرف اپنی کہانی کے امکانات کو بڑھاتا ہے تاکہ یہ کسی طور پر حقیقتی
 طور پر اور سچی کے لیے قابل قبول ہو۔

لیکن کہانوں کو کس درجے میں دکھا جانے جو اس دائرے سے باہر واقع ہوتی
 ہیں اب حقیقت کے طور پر قبول کیا جاتا ہے، مثال کے طور پر جو زمانہ مستقبل میں کسی
 ہوتی ہیں۔ جیسا کہ جارج آر ویل (George Orwell) کا ناول "1984" اس بیان
 کہ وہ سال سے کہیں پہلے لکھا گیا۔ جارج آر ویل کی پیش گوئیوں میں کس قدر حقیقت ہے
 اور کس قدر خیالی، اس کا اندازہ آج کیا جا سکتا ہے۔ سب تاریخ کے تسلسل میں تیار ہوا سال
 کہہ چکا ہے۔ لیکن کہانیاں صداقت کا اظہار کس طرح کرتی ہیں؟ کیا وہ انسانی جذبات،
 عمل کش، داخلی تعلقات جو اس طرح کی کہانوں میں اظہار پاتے ہیں۔ ایسا کیا ہو سکتے
 ہیں جسے قاری پہلے سے سمجھتا ہو۔ لیکن بلاشبہ یہاں نئے نئے خیالوں کی یہاں امکانات
 اور ممکنات کا استعمال ہوتا ہے اور ہم جانتے ہیں کہ مستقبل امکان اور حقیقت سے زیادہ
 کیا گنا ہے۔ انسانی رویوں میں کچھ آگاہی حقیقتیں ہیں جنہیں ہم مستقبل کے طور پر
 جانتے ہیں۔ اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ وہ داخلی یا مستقبل میں بیان کی گئی ہیں۔
 مستقبل کی کہانیاں اس حد تک قابل توجہ ہیں کہ وہ آگاہی صداقتوں پر مبنی ہیں۔ مثال کے
 طور پر آر ویل جو کہ ناول "1984" میں پیش کرتے ہیں وہ نہ صرف ہرگز امکان ہے

یہ ایک بہت ہی اہم کتاب ہے۔ لیکن اس کی بنیاد انسانی فطرت، اقدار کی ہے اور یہ انسانی
 وجود پر ہے۔ صرف ایک فلسفی جو اس ناول میں ہے وہ یہ ہے کہ اس نے 1984ء کے
 سال کا انتخاب کیا۔

۶۔ اہل عربی ادب کی قرأت میں امکانات
 ادب اولیٰ رضا اصولوں کے بیان کرنے سے مقالہ نگار کا مقصد یہ ہے کہ یہ ناول
 جانے کہ ادب کی طوائف کی کس طرح وسعت دی جاسکتی ہے تاکہ یہ ایک ذاتی اور داخلی
 تجربے کی صورت اختیار کر سکے، اس سے کہیں مختلف جو اس وقت پاکستان کے ایک عام
 ناولوں میں ہوتا ہے۔ جب ادب کو اس طرح جذب کیا جاتا ہے اور اس کے تجربے
 سے گزرا جاتا ہے تو زبان پختہ کے ساتھ فطری انداز میں اور ایسی کسی مشقت کے حاصل
 ہو جاتے ہیں۔ یہ تمام ادب کی بہت سی اقسام کو چھوڑ کر اور ان کے بارے میں
 تجربے کے لیے رضا اصولوں کا کام دے سکتی ہیں لیکن ان کا رخ خصوصاً مختصر افسانے کی
 طرف ہے۔ مقالہ نگار اس حقیقت سے واقف ہے کہ یہ طریقہ ہر جگہ قابلِ اخلاق نہیں ہے
 لیکن بہت حد تک یہ نیا طریقہ کی مدد کر سکتا ہے جو کہانی کو گہرے اور ان کے ساتھ
 پہنچنے اور کہانی کے تجربہ کو زیادہ گہرا طریقے سے تجربہ کرسکتے ہیں۔

۱۔ ابتدائی ناولوں کو اختیار سے کسی بار چھوڑے اور ذاتی افسانے کے متعلق
 سوالات، اندازے، اور تفصیلات افسانوں کی شکل میں لکھے۔ افسانے چھوڑنے کے
 بعد ابتدائی تفصیلات اور اندازوں کا سواڑہ کیے اور دیکھے کہ کہانی سے متعلق
 تفصیلات کس حد تک پہنچی ہوئی ہیں۔

۲۔ افسانے میں سوجھ بوجھ کی نرسٹیاں۔ دیکھے کہ کہانہ کس طرح میں
 شکل نکلے اور افسانے میں یا نہیں سمجھا جاتے۔ ہر کہانوں کے عمل اور نرسٹیاں
 کے پتہ ڈالنے پر بحث کیے۔

انہوں نے پہلے تو ہائی اسکول ہوئے ایک گورنر کی نگرانی کی تھی جو ایک
پبلک اسکول کے سرپرست سے گزرتا ہے یعنی کسی اعلیٰ فیصلے سے۔ پڑھنے والا
پڑھنا کی صورت میں کیا کرے گا اپنے سہ سے ہوئے داخلہ کا کہانی کے
تعداد کے درجے سے ہوتا ہے۔

کہانی میں ایک اہم عنصر ماحول کا ہے۔ اس ماحول کی اہمیت کو چھٹے والوں
نے پہلے کرتے کے لیے ان سے کہا جاسکتا ہے کہ وہ ماحول کی خصوصیات بیان
کریں۔ جیسا کرتے ہوئے انہیں سب سے پہلے پڑھنے والی ماحول پر توجہ دینی
ہوگی جیسا کہ شو، رنگ، صوبہ یا قوم وغیرہ۔ اور پھر پڑھنے والی ماحول جیسا
کہ خوب گہرا گورنر کی نظر، میدان جنگ وغیرہ۔ اسی طرح انہیں وقت کے
بڑے ٹرمز جگہ کو دیکھنا چاہیے یعنی صدی یا صدی کا کوئی حصہ اور اس کے
ماحول ساتھ پڑھنے والی ماحول یعنی دن، رات، سال، کوئی موسم، پھل کا دن اور
فل وغیرہ اس ماحول سے انہیں پتہ چلے گا کہ کہانی کے ماحول میں اس کے
ماحول کی اہمیت کیا ہے۔

۱۰۔ اس نکتہ نظر کو کہیے اس سے کہانی بیان کی گئی ہے۔ اگر اس نکتہ نظر میں تبدیلی
کیا جائے تو کہانی کس طرح بدل جائے گی۔ کسی دوسرے گہرے یا کسی سرپرستی
تجربہ (objective observer) کی آنکھ سے دیکھتے ہوئے کہانی بیان کے
کسی سے کہہ سکتے ہیں کہ اس نکتہ کی آغوش کیجیے۔

۱۱۔ اس نکتہ پر غور کریں۔ جس میں اشاروں اور اشاروں کے پتوں پر غور کیجیے اس کا
ذکر ہو کر کہا گیا ہے کہ ان پر غور کرنے سے پتہ چلتا ہے کہ ماحول ہی کے
کہانی کو پڑھنے کے تجربے میں کیا تبدیلیاں آتے ہیں اور یہ کس طرح سے
پتہ چلتا ہے۔ اس نکتہ کی اہمیت پتہ چلی ہے۔

7. کہانی میں موجود مہارتوں اور تضادات پر غور کیجئے۔ نوٹ کیجئے کہ ان میں کون
ایک ہی صورت حال میں سے گزرتے ہیں تو بھی ان کا رد عمل بالکل مختلف ہے۔
ان مہارتوں پر بھی غور کیجئے جو پڑھتے وقت وہ مختلف کہانیوں کے کہانوں
مابین، نئی نکتوں اور افعال کے درمیان کر سکتا ہے۔ کہانی میں نظر آنے والے
اشکاف اور مشابہتوں کو کیا معنی دیے جاسکتے ہیں؟

8. دھری کے لیے ایک دلچسپ سرگرمی یہ ہو سکتی ہے کہ کہانی میں موجود کسی
صورت حال، کردار، انتخاب یا فیصلے کا اپنی زندگی کے کسی عمل سے موازنہ کرے
اور اس کی وضاحت کرے کہ کس طرح یہ کہانی اس کے تجربے سے مختلف یا
مشابہ ہے۔ یہ مشق اپنی زبان کے علاوہ کوئی دوسری زبان سیکھنے والے کے لیے
زیادہ مفید ہوگی۔

9. کہانی کو اسی تسلسل میں آگے لھیے۔ تصور کیجئے کہ کہانی کے اقسام کے ذریعہ
کیا ہوا ہو گا۔ یا تصور کریں کہ کہانوں میں سے ایک یا زیادہ کردار پانچ سال
یا دس سال میں کیسے ہوں گے اور اس خیال کی وضاحت کریں جو اس قیاس کا
سبب ہے۔

اس طرح کے رہنما اصولی اسٹوری ٹیلر کی گہری اور بہتر تفہیم کے لیے پڑھنے
والوں کے ساتھ ہوتے ہیں۔ کسی کہانی کو پڑھنے سے قبل اور پڑھنے کے بعد کی سرگرمیاں
ان کی قرأت کو خاص سزا اور توجہ کو مرکوز بنا سکتی ہیں۔ وہ اس بات سے آگاہ ہوتے
ہیں کہ کہانوں کی اس سبب کا خیال کس طرح کا ہے اور کہانی کو ایک تھوٹے ٹکڑے کی صورت میں
کام کرنے سے پہلے دیکھنے کے لیے کہانی کی قرأت کے دوران کون سے نکات پر غور کرنا
ضروری ہے۔ ان کو پتہ چلتا ہے کہ پڑھنے والے کی توجہات کہانی کا مواد پڑھتے ہی
آگاہ ہو جاتی ہیں۔ بعض نکات یہ توجہات بدل ہو جاتی ہیں اور بعض نکات وہ کہانی کی

میں ہوتی نہیں، مگر، تجربات، استعارے اور علامتیں استعمال کرتے ہیں۔ تجربہ ہمیں
 ان باتوں کا استعمال زیادہ کرتے سے کہتے ہیں کہ انہیں انسانی شعور کے ایک حصے کے طور
 پر دیکھیں۔ ان تجربات، ان باتوں، نظموں اور قصوں کو بیان کرتا ہوتا ہے۔ اس لیے شاعری
 میں زبان کی تخلیق اور اس میں سوز، تپش، شہسازی اور عجزات ہیں جن کو دیکھ کر شعور کے
 گہرے پیمانے تک سے بہت پہلے انسانوں نے شاعری کی، لکھی اور اسے تخلیق
 کیا۔ چونکہ شاعری، شعور، فطرتی آواز کا ذکر اور انسانی عقل کو چاہی تو انہوں نے بہت
 لمبے اور مختصر کے شعور کی شکل میں یاد رکھی اور آواز کی جاتی تھیں۔ انکی آواز
 نے آہستہ آہستہ ان میں بہت کرنے والوں کے شعورے شکایت، شعور، روحانی تعلقات
 اور فطرتی باتوں سے اگرتے آئے۔ انہیں جذبات کو سمجھا۔

تخلیق شاعری کا کام پڑھا اور گایا جاتا تھا۔ سامعین مجمع کی شکل میں آگے
 ہوتے اور نکلے۔ شاعری کا قریب، اولی، بھول نظم کی آواز اور اس کے معنی کے درمیان
 رابطے کی حیثیت کو سمجھتے رہے۔ شاعری کی خصوصیات اس کی صوتی کیفیت، وزن، اور
 آواز کو آواز میں جوڑنے سے تعلق کرتی ہیں۔ جب شاعری کو پڑھا جائے تو صوتی
 آواز کو پھر کر کے شعور کے ایک حصے سے چمکتے آواز کو یہ سمجھنے میں مدد دیتی ہے
 کہ آواز شعور سے دور ہے۔ شعور کے آواز اور معنی کا چلنے ہر کس طرح معنی
 کے آواز کے آواز میں ہے (مگر یہی تخلیق کی اصطلاح میں اسے enjambment
 کہتے ہیں)۔ شاعری اس جملہ ہے جو شعور کے آواز کرتے ہوئے کام کرتی ہے کہ قطع نظر نظم کے
 معنی میں کے، شکل کی طرح صوتی آواز کے اپنے معنی ہوتے ہیں۔

پڑھنے والوں کو شاعری میں نظموں کی عقلی شکل میں انگریزی اور فرانسیسی کا سامنا
 کرنا پڑتا ہے۔ جیکب کی مثال W.H. Auden کی نظم "Unknown Citizen"
 سے لی گئی ہے۔

Except for the war till the day he retired

He worked in a factory and never got freed

یاد دوسرے کے اجزاء کی ترتیب بدل کر قاری کی توجہ دو باتوں کی طرف دلانا چاہتا ہے۔
 پہلی بات اس کا معلوم شہری کی طرز میں اور کسی غیر معمولی واقعے سے خالی عملی زندگی (اس کی
 یہ بات تک) اور ہوم اس کی مستقل مزاجی، قابل اعتبار ہونا (شاید مکمل اطمینان شعاری،
 تہمت کا نہ ہونا) کی وجہ سے اسے نوکری سے نہ نکالا گیا۔ اجزاء کی ترتیب میں تبدیلی
 "retire" اور "Tired" کا قافیہ بھی سزا کرتی ہے جو اس شہری کی عملی زندگی کی طوالت
 کی شدت ظاہر کرنے کو صوفی تقویت دیتا ہے۔

ماہیت کے لحاظ سے شاعری فنونِ لطیفہ کی ایک نئی جہانے دہلی بیٹھ گئی۔
 نئی چند صدیوں سے تحریری بیٹھ بن گئی ہے اور اس طرح آج یہ دوسری جہان پھینک
 وہاں کے سامنے پیش کی جاتی ہے۔ جس طرح سے علم کاغذ پر دکھائی دیتی ہے اور یہ جس
 ترتیب سے کاغذ پر لکھی جاتی ہے وہ اس کے مجموعی تاثر کا بددعا ہے۔ مثال کے طور پر علم
 "The Housewife" جو Michael Nash کے ایک شاعر کی لکھی ہوئی ہے،
 ہائے کی شکل میں لکھی گئی ہے اور اس کا عنوان "The Housewife" مرکز میں لکھا
 گیا ہے۔ یہ ایک خاتون خانہ کے یکساہیت زور معمول کو ظاہر کرتا ہے۔ کوئی آدمی اسے
 پڑھنے سے پہلے ہی اس کے مرکزی خیال کو جان سکتا ہے۔

یہاں مقالہ نگار شاعری کی باتوں اور اقسام پر بات کرنا مناسب لگتا ہے۔
 مختلف باتوں سے آگاہی قاری کو یہ لکھنے میں مدد دیتی ہے کہ شاعر شاعری کرتے ہوئے
 مختلف باتوں اور اقسام کیوں استعمال کرتے ہیں اور یہ کہ خیال کس طرح اپنی بیٹھ کو ساتھ
 لاتا ہے اور کلام کے معنی میں کس طرح اضافہ کرتا ہے۔

پندرہ بیٹھ: شاعری کی کئی مددگار باتوں میں دوسرے اور بندہ ہے جیسے ساہجوں کے

مطابقتی ترتیب دے جاتے ہیں۔ ہاپانی سٹک ہانگے اس کی ایک مثال یہ ہے۔ اس میں ہاپانی ہانگے سترہ ارکان پر مشتمل ہوتی ہے جو عموماً تین مصرعوں میں تقسیم ہوتے ہیں۔ ان ہاپانی ہانگے ہانگے درج ذیل ہے۔

In A Station Of The Metro

The apparition of these faces in the crowd
Petals on a wet, black bough.

روایتی شعری میناروں کی دیگر مثالوں میں اودا (Ode) اور سانیٹ (Sonnet) شامل ہیں۔

آئندہ وقت میں صدیوں تک شاعری کی پانچ میناروں کی شاعری کے ہونے کا سراغ ملتا ہے۔ ہرنگ اور لہجوں میں شاعر مصرعوں، بندوں اور لہجوں میں کئی کئی اکر اور وقتوں کی ترتیب سمجھنے کی پانچویں کیا کرتے تھے۔ تاہم انیسویں صدی کے شاعروں نے گہراہ کا آغاز کیا اور روایتی شعری میناروں کی بنی ہوئی صدیوں کے خلاف جرأت شریعت کی۔ ان شاعروں نے اپنی نظموں کے مصرعوں اور بندوں کی طوالت طو طو طو کی۔ انہوں نے غیر بائیس اور ان اور کئی استعمال کیے اور اکثر وقتوں اور ان کی پانچویں سے باہر آگئی ہے۔ شاعری کی آوازوں کے کی دیگر مثال Cummings ہے۔ کا کلام ہے۔

Anyone lived in a pretty how town (with up so floating
many bells down) spring summer autumn winter

ایسی نظم کو پڑھتے ہوئے شاعری کی ایسی سادگی اظہار ملتا ہے۔ جیسے شاعر نے روایتی وقتوں اور ایسٹون کون نہیں کی نظم کے سنی میں کیا تبدیلی واضح ہو جاتی اگر یہی انداز اور طوالت ایک خاص طور پر قابل توجہ سادگی کی مثال ہے۔ مصرعوں کا ایک طو طو طو طو طو طو کے انداز سے عرب کیا گیا ہے۔ نظم کے سنی میں طو طو طو طو طو ہے۔

اس انجی یا خیال پر تبصرہ کیا جاتا ہے۔ اظہاری ساریٹ کے برعکس تھامسے پاس انگریزی کی لہجہ (ہیسیج کی) ساریٹ موجود ہے۔ اس میں تین مربع (چار مصرعے) بند ہیں اور آخر پر ایک شعر (دو مصرعے) ہے۔ اس کے قافیوں کی ترتیب "abab cdcd efef gg" ہے۔ پہلے تین بندوں میں عموماً انجی یا خیال پیش کر کے آخری شعر میں اس پر راستے دی جاتی ہے۔

آزاد ہونے پر ہر گز کسی مخصوص سائے یا ساخت کی پابندی نہیں کرتی۔

7.2۔ شاعری پڑھنے اور پڑھانے کے درجہ اصول

دو اہل نکت شاعری پڑھنے، اس پر غور کرنے اور شاعری کرنے کے لیے درجہ اصولی کام سے بچتے ہیں۔ اگرچہ ہر اصول ہر نظم پر لاگو نہیں ہوتا لیکن یہ نظم کو زیادہ گہرائی کے ساتھ پڑھنے اور زیادہ بھرپور انداز میں سمجھنے کے لیے مددگار ہو سکتے ہیں۔

1۔ نظم کو خاموشی کے ساتھ غور کو سنا لے اور اس کے بعد اس کے معنی پر غور کیجئے۔ پھر اس کو آواز بلند دیا تین لوگوں کے سامنے کہی جا رہی ہے۔ نظم کو وہ یا تین یا چار سے اور پھر مختلف جگہ میں مختلف مصرعوں اور الفاظ پر زور دیجئے۔ پھر سننے والوں سے گفتگو کیجئے کہ کس طرح سمجھ بولنے سے اور مختلف نظموں پر زور بولنے سے نظم کے معنی میں کیا تبدیلی آتی ہے۔

2۔ نظم کے نظم کا ایک تعارفی خاکہ بنائیے۔ آپ کے خیال میں نظم کی خصوصیات کیا ہیں؟ ان خصوصیات کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے؟ نظم سے وہ خصوصیات خصوصیات نکال کر دکھائیے جو آپ کے ہاتھ کی جانب سے توجیہ میں ہوں۔

3۔ ایک نظم پر غور کیجئے جس میں نظم کسی آدمی کو خطاب کرتا ہے۔ پھر یہ تصور کرنے کی کوشش کیجئے کہ اس آدمی کا اصل نظم کے بارے میں کیا ہو گا۔

4۔ ایک ہی موضوع کو بیان کرنے والی دو یا تین نظموں پر غور کیجئے۔ مثال کے طور پر ہیسیج کی "All the World's a Stage" اور سولنگر رائٹ (S)

Water Resonance) کی "What is this Life" یا کوئی اردو لکھ جس
 میں ایسا کوئی یا زندگی کو سچا کرنا کہا گیا ہو۔ پھر ان نکلوں میں موجود نمایاں
 نغمات اور مضامین کا موازنہ کیجئے۔

۲۔ نئی نظم تلاش کیجئے جس میں ایسے پہاڑی وساکن (Figures of speech)
 ایسی استعارہ، تشبیہ و تمثیل موجود ہوں جو حیرت، الجھاؤ اور اثر پیدا کرنے
 والے ہوں اور ان پر اپنے وسائل کی وضاحت کیجئے۔

آپ کی تفسیریں تھیو یا استعارے کے حلقہ لکھتے ہیں تو ان معنی کی وضاحت
 کیجئے جو وہ بیان کرتے ہیں اور ان جذبات کی توضیح کیجئے جو ان سے ابھرتے
 ہیں۔

مثلاً گارلے جان ڈن (John Donne) کی نکلوں میں ایسی تشبیہیں اور
 استعاروں کو حیرت اور اثر پیدا کرنے والا بنا ہے۔ اسی طرح اوون (Owen)
 کی نکلوں میں بیکر تراشی بہت مؤثر ہے اور اس سے ان میں بے شمار
 بہت خوبصورت ہیں۔

There was a whispering in my hearty. A sigh of the coal
 Grown wistful of former earth it might recall.

ان دو مصرعوں میں سرگوشی (Whispering)، آہ (sigh)، حسرت (sigh)
 (wistful) اور یادیں (recall) سے سب کو انسانی حساسیت میں بے
 گونگی کو انسانی حساسیت میں بے گونگی سے نہ صرف یہ کہ انکو میں پہچانی
 گیا ہوتی ہے بلکہ جہاں کو ان پر غور کرنے اور میں کو ان میں پہچانے کی گریہ
 بھی ہے کہ ایک نئے کو انسانی حساسیت کا حال میں دکھایا گیا ہے۔ ان
 دو مصرعوں سے حلقہ سب کے سامنے رکھے جاسکتے ہیں۔

6. ایک نظم کا مطالعہ کیجیے جس کے عنوان نے آپ کو متوجہ کیا۔ اس نظم میں جو عنوان میں موجود تعلق پر بحث کیجیے۔ کیا آپ اس تعلق کو دیکھ کر حیران، حیرت زدہ یا خوش ہوئے۔ وضاحت کیجیے کہ آپ کی توقعات کیسے کیے اور کس حد تک پوری ہوئیں، پوری نہ ہوئیں یا نتیجہ آپ کی توقع سے زیادہ کر رہا۔

7. کسی نظم کا آخری بند یا مصرعہ لکھیے اور پھر نظم کے لیے کوئی دوسرا ایسا نام تجویز کیجیے۔ اس تبدیلی کی وجوہات بیان کیجیے۔

8. ایک نظم پڑھیے جو کسی کردار، مقام، عمل، نکتہ نظر یا فیصلے کے بارے میں ہو جس کا تعلق کسی طرح کسی شخص سے ہو۔ مثال کے طور پر رابرٹ فراسٹ (Robert Frost) کی نظم "The Road Not Taken"۔ پھر دیکھیے کہ یہ آپ کی زندگی سے کیا تعلق رکھتی ہے۔ اپنے تجربے کا نظم میں بیان کیے گئے تجربے سے موازنہ کیجیے۔

9. اعلیٰ تعلیمی سطح کے طالب علموں سے کہا جاسکتا ہے کہ وہ مختلف شعراء کے کلام پڑھیں اور اس شاعر کا انتخاب کریں جنہے انہوں نے سب سے زیادہ پسند کیا اور جس کے متعلق وہ مزید جاننا چاہتے ہیں۔ پھر اس شاعر کی سوانحی معلومات کے ساتھ ساتھ اس کی مزید شاعری پڑھیں۔ پھر شاعر کی زندگی کے کسی ایسے پہلو کے متعلق لکھیں جس نے انہیں سب سے زیادہ متاثر کیا۔

تذکرہ ادب کی ایک اور اہمیت اہم صنف ادب کی طرف آتا ہے۔

8. ادب کے ادب

قدیم یونان کے ادب سے لوگوں نے ادب کا تصور دیکھا اور اس میں حصہ لیا۔ ادب انسانی زندگی کے سائے چھائی یا لڑائی و جھگڑا کو ظاہر کرتا ہے۔ ادب ایک بھری

یہ ہے۔ یہ ذہن میں تصویریں بناتا ہے۔ یہ تصویریں اداکاروں اور مصنفوں کے الفاظ کے ذریعے کرنا شروع کر دیتا ہے اور ڈرامے کے موضوع اور خیال کا اظہار کرتی ہے۔

ڈرامے کی روایتی ہیٹھیں:

ان حقیقت کے باوجود کہ جدید ڈراما نگار روایتی ڈرامے کے عناصر کا رد و قبول کرتے ہیں، ڈرامے کی قدیم ہیٹھیں اب بھی سٹیج ہوتی ہیں اور لوگ ان سے محظوظ ہوتے ہیں۔

یونانی ڈرامے کی تاریخ کی تلاش میں کہا جاسکتا ہے کہ یونانی ڈراما نگاروں کے بہیمان باقاعدہ مقابلہ تقریباً 530 ق م میں شروع ہوا۔ یہ مقابلے صدیوں تک جاری رہے۔ یہ ہمیشہ God of Wine Dionysus جو زندگی دینے والی طاقت کی علامت ہے کی تذکر کی جانے والی مذہبی تقریبات سے وابستہ ہوتے تھے۔ یہ ڈرامے باہر، باڑے اور کھیلے نصف دائروی ایٹھی تھیٹرز (amphitheatres) میں کھیلے جاتے جن میں 15,000 آدمیوں کے بیٹھنے کی گنجائش ہوتی۔ قضا شاعری یونانی ڈرامے کے اجزاء کی کچھ بوجھ رکھتے تھے۔ مثال کے طور پر کورس (Chorus) عوام کی آواز کا ترجمان ہوتا تھا اور لوگ اپنی قبیلے کے بچے کی طرف موجود ایک دائروی حصے میں گاتے اور رقص کرتے تھے۔ آکٹو کے پچھلے ایک اونچے سٹیج پر اپنے کردار کے مطابق ہنسک پہنے ہوئے اداکار اپنی آواز میں ہول کر اپنے کردار ادا کرتے تھے۔ یونانی تھیٹر میں سینت بہت تکمیلی نہیں تھے۔ لیکن ان کے پاس سٹیج کا ایک غیر معمولی آلہ تھا جسے *deus ex machina* کہتے تھے۔ اس کے ذریعے اداکار اپنی سٹیج پر اپنے کردار ادا کرنے کے لیے یہ کہہ کر اہارے جاتے تھے کہ وہ آسمانوں کو سزا دیا اللہ عام کے طور پر ایسا کر رہے

یونانی ڈرامے کے حاضر گوئی کی شکل میں رقص اور نئے کے ساتھ لڑائی
جن میں بعض اوقات منظر پر تھرا بھی ہوتا۔ جیسے ہی گوئی لگایا جاتا تھا ان کے تھرا
کو ایک حصہ کھل ہوتا اور وہ سٹیج پر دائیگی سے بائیں آجاتے۔ جیسے ہی وہ اسی حصہ لگتے آ
پھر بائیں طرف آجاتے۔

یونانی ڈرامے ٹیکسیز کے پانچ ایکٹ کے ڈراموں، یا ہدیہ تین ایکٹ کے
ڈراموں کی نسبت مختصر تھے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ ان میں سے اکثر ڈرامے اساطیر اور یونانی
قصوں پر مشتمل تھے اور تماشائی ان سے ملوں تھے۔ مصنف کو پس منظر بیان کی ضرورت
نہیں تھی۔ زیادہ تر یونانی ڈرامے زیادہ گھنٹے میں کھیلے جاسکتے ہیں۔ یونانی الیہ ڈراموں کی
ایک مثال سوڈکلیس (Sophocles) کا Oedipus Rex ہے۔ یونانی ڈرامے کی
دائیت سے آگاہی کے لیے ظہر کو سوڈکلیس کا ڈراما پڑھنا چاہیے یا اسے گھنٹے ہونے دیکھنا
چاہیے۔

انگریزوں کے دور کا ڈراما۔ ولیم شکسپیر کے ڈرامے انگلستان کی ملکہ انگریز اول
(1558ء-1603ء) کے دور کے ڈراموں کی مثالیں ہیں۔ شکسپیر نے الیہ طریقے اور
تدریسی ڈرامے لکھے۔ وہ بادشاہوں، ملکاؤں اور اعلیٰ طبقے کے کرداروں کے افعال و احوال
کو پیش کرتا ہے اور ساتھ ہی ان کے معاشرے اور سادشیں بھی کیے کہ یہ بھی ان کی زندگیوں کا
حصہ ہیں۔

انگریزوں کے دور کے ڈراما نگاروں نے ایتالیائی روایت کی عرواق کی اور فرانسیسی
ڈراموں کو سٹیج سے دور کر دیا۔ انہوں نے خصوصیت لڑکے لڑکیوں کے کردار اور
کرتے اور بائی ٹری کی فرانسیسی کے کردار میں اضافہ کرتے۔ انگریز دور کے ایتالیائی
ڈرامے makeshift مقامات پر کھیلے جاتے تھے اور سراسر لاکھن یا ملازموں کے درمیان
کی تھی کہ یا نہ ہادی سراسر ہر کہ لکھن اور کلاؤ تھی۔ وہ تھرا ہوتے تو یہ عموماً بھارت پہلو

یہ سب سے پہلے کی طرف سے تھے۔ کرائی اور نچے سٹیج کے دونوں طرف اور سامنے
 پہلے پہلی سٹیج کی طرح سٹیج بہت سادہ اور مختصر تھا سوائے اس گھڑی اور مشینری
 کے کہ اسے لانا اور اٹانے فطرت قوتوں کے نمائندوں کی حیثیت سے سٹیج پر
 لائے تھے۔ پہلی فیئر کے برعکس اڑتھ کے اور کے فیئر میں ایک دوسرے دوسرے کی
 پہلی تھی۔ سٹیج پر داخلے اور باہر جانے کے گیٹ تھے۔ ایک پردے والی عراب تھی۔ سٹیج
 کیلئے ایک ہی دروازہ تھی تھا جس سے جھوٹے اور دونوں کا اپنا تک داخلہ ممکن ہوتا۔
 اڑتھ کے اور کے کرائی جن میں ان پردے سے لے کر اعلیٰ تعلیم یافتہ شرفاء تک شامل تھے،
 اور عوام کے لیے ایک کھینچ تھی۔ کامیاب ڈراموں میں ٹیما ایکشن، مزاح، صوت
 لہجہ، ہنر اور جذبات اہلکار نے والی شامی کا اجراء ہوتا تھا۔ اس طرح کے
 ڈرامے کی ایک مثال Hamlet ہے۔

اور ڈرامے کی جدید شکلیں:

اڑتھ کے اور میں ڈرامے کی کامیابی کو دیکھتے ہوئے نسویم انگلستان اور فرانس
 کے ڈراما نگاروں نے ایسے اور طریقے ڈراموں پر نسویمی توجہ دی۔ اٹالوی اور نسویمی
 مڈی کے ان ڈراما نگاروں نے معاشرتی برائیوں پر اپنے مزاحیہ ڈراموں میں مسلسل طنز کی
 اور داخلی تعلقات اور ان سے وابستہ پریشانیوں کی تصویر کشی کی۔ اس دوران امریکی ڈراما
 نگاروں نے سٹیو ڈراما کی روایت ڈالی جن میں رنگ انداز کے بیان اور ہنر تھے جو ٹیما اور شرف
 کی اچھاوں کی علامت تھے۔

تھوڈا ڈراما نسویمی طریقے اور مہارت آمیز سٹیو ڈراما کے درمیان کے طور پر نسویمی مڈی
 کے پہلے اور نسویمی مڈی کے پہلے کے ڈراما نگاروں نے ایک ہی وقت میں ڈراما نگاروں
 کی۔ ان ڈراما نگاروں نے ایسے مہارت پر لکھا جو ہرگز نہ کسی سے چھوٹے تھے۔ ان
 میں کش اور جذباتی درمیان جن کا تعلق عام آدمیوں سے تھا۔ مثالی ڈرامے کے سٹیج کے پہلی

سے بہت نقل کر سہاگن پیدا نہیں کرتے تھے اور نہ ہی ان سہاگن کو نقل کرنے کے لیے
 وہ اجازت تھے۔ اس کی بجائے کراہوں کو پیش آنے والے سہاگن واقعات کا حتمی
 معلوم ہوتے تھے اور فیصلے ایسے تھے جو کٹا کٹا نہیں کی اکثریت کی کچھ میں آنے والے تھے۔
 حتمی اراہوں کے فیصلے میں آڈ (prop) بنانے کا رولنگ اراہے کی بجلی گھڑوں
 سے زیادہ اہمیت کا حامل ہے کیونکہ اراہا اور حتمی زندگی کا ٹکس دکھانا چاہتے تھے۔ اکثر سنجی
 ایک کمرے کی طرح ہوتا جس کی ایک دیوار جانب کر دی جاتی۔ کٹا کٹا نہیں کو اراہے کی
 جاتی کہ وہ آکر عام لوگوں کو دیکھیں جو بلی، آرائشی اور شہت زبان کی بجائے عام زبان میں
 معلقہ کرتے ہیں اور ان کی وہائی سچائیوں، عظیم حقیقتوں کی بجائے عام دنیاوی مشاہدات
 کرتے ہیں۔ حتمی اراہے کی ایک اگلی مثال ہسن (Ibsen) کا "A Doll's
 House" ہے۔

ایجنڈے کا فیصلہ: ۱۹ویں صدی کے نصف آخر میں بہت سے اراہا گھڑوں نے حتمی
 اراہے کو رد کرتے ہوئے ایک نئی روٹ اختیار کی جو لائیبھ کے اراہے کی تھی۔ ان
 اراہا گھڑوں نے حتمی اراہے کی بدامنیوں سے اپنی راہ الگ کر لی۔ حتمی تزیین رکھے
 والے واقعات کی بجائے لائیبھ کے اراہے نے ایسے احوال کو پیش کیا جن کی سہ
 معلوم تھی۔ کراہوں کے عناصر و لوازم دوسرے کے برعکس تھے یا تھے ہی نہیں۔ مکالمے
 اور تقریریں سب بوز اراہے میں ابھر اُبھر نکھری ہوئی تھیں۔ لائیبھ کا اراہا کوئی ایک
 مرکزی خیال بیان نہیں کرتا۔ اس کی بجائے وہ کٹا کٹا نہیں کو اس دیوار جس میں ہم رہتے
 ہیں کے پاس میں سوال اراہے کی وضاحت داتا ہے۔ لائیبھ کے اراہے کے پاس
 میں صرف ہانسنے کے لیے چھتے ہیں کو سہاگن ٹکٹ (Samuel Beckett) کا
 "Waiting for Godot" یا سہاگن پینٹر (Harold Pinter) کا
 "The Caretaker" چھتے لائیبھ دیوار ہے۔

لوگ بھی آجڑہوں، مشکلات اور بکراؤں کا شکار ہوتے ہیں۔ تاہم کراہوں کو چلنے آتے والے مسالے زیادہ گھمبیر نہیں ہوتے اور ان سے خوش مزاجی سے نمٹا جاتا ہے۔

طریقہ آراہوں میں پانچ مختلف طرح کے ہوتے ہیں اور ان کے جاننے کے لیے ذرا دلچسپی ہے۔ طریقہ آراہا انسانوں کی خامیوں اور کمزوریوں کو ظاہر کرتا ہے اور یہی مہارت آہیز کراہوں اور اپنے طور طریقوں اور عادات پر چلنے کا موقع فراہم کرتا ہے۔ طریقہ آراہا عموماً بچا بھلا اور حاضر جوانی پر مبنی ہوتا ہے، پھر بھی اس کا مزاج اکثر طریقہ آراہ کا ہوتا ہے۔ کراہوں کی طور فرضی اور خود فرضی پر چلنے کے ساتھ ساتھ ہمیں خود اپنے لیے اپنے کردار کے لوگوں کے رویوں پر چلنے کا موقع بھی ملتا ہے۔ طریقہ مزاج کی بنیاد منظر اور حرکت، دھڑکنے ہوتے ہیں۔ آراہا نگار پیچھے ہوتے الفاظ اور گات دار جملوں کے ساتھ ساتھ ہاتھ پائی وغیرہ بھی آراہوں میں شامل کرتے ہیں تاکہ کتابچوں کی ہنسی کو بیدار کیا جا سکے۔

تاہم روایتی طریقہ آراہے میں شناخت کی لفظیوں اور غیر متوقع امکانات کے ساتھ ساتھ معنوی نئے سے نکلنے والے، لہجے لڑائیوں اور دوسری جسمانی حرکتوں سے آہیز آہیز اور مسلسل مزاج اٹھانا ہوتا ہے۔ روایتی طریقہ میں انسانی رویوں کو سزا دینے یا بھڑکانے کا مقصد نہیں ہے بلکہ خود کشی کی ایک نئی ہی ہنسی کو دعوت دینا ہوتا ہے۔ روایتی طریقہ کتابچوں کو کوئی سبق سکھانے کی بجائے انہیں خوش کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ اسی طریقہ کا ایک طریقہ آراہا گھمبیر کا "As You Like It" ہے۔

طریقہ آراہا اہلیہ سے بہت دور لڑتی رہتا ہے۔ اہلیہ مرکزی کردار کے جدول کی طرف مڑ کر رہتا ہے بلکہ طریقہ مرکزی کردار کی قسمت سنبھالنے کی طرف ہوتا ہے۔ اہلیہ عموماً بہت ہی اور اسی طرح خاتونوں کی ہماری ہنسی سے بھگتے طریقہ کا اہتمام، اکثر مرکزی کرداروں اور عجمی کرداروں کی شادی کے ذریعے، مصالحت ہے اور ہے۔

(Treglomech) ہدیہ ڈراما الیہ اور طریقہ و نظریہ علامہ کا استخراج
 ہے۔ یہ طریقہ کسی شخص پر ہوتا ہے۔ بعض اوقات، جیسا کہ ڈراما "Trilles" میں
 بیان کیا گیا ہے۔ ایک صورت اپنے خاتمہ کو کئی کر دیتی ہے۔۔۔ لیکن مڈوائے
 میں ٹریگڈی اور اس کے مزہ ساتھیوں سے مزاج پیدا کیا گیا ہے۔ ان دو صورتوں کا فرق
 ہے۔ یہ اس میں کوئی عمل کرنے میں کامیاب ہو جاتی ہیں جس نے تمام فردوں کو چکا
 ہوا ہے۔ یہ طریقہ میں بعض اوقات مزاج ڈرامے پر چھلکا ہوا ہوتا ہے جس میں ٹریگڈی کی
 باتوں کو موجود ہوتی ہے کیونکہ مزاجیہ باتوں اور حرکتوں کے پیچھے ہمیں، موصوفات
 ہوتے ہیں۔ اس کی ایک مثال فلوئسٹین (Flirstein) کا "On Tidy"
 ہے جو کہ ان کے درمیان مزاجیہ عملوں کے جادوں سے گھرا ہوا ہے لیکن
 ان کے ذریعہ موصوفات نقصان اور موت کا ہے۔

ڈرامے کو زیادہ دلچسپ اور ذہنی طریقے سے پڑھانے کے لیے بکھرتا ہوا
 اور جیسا کہ شاہد اساتذہ اور پھر طلبہ کے لیے ملتا ہوا ہوتی ہوگی۔
 ۱۔ طلبہ سے کہا جا سکتا ہے کہ وہ ڈرامے کا کوئی ایسا منظر یا حصہ چنائیں کریں جو
 دلچسپ، خیران کن، الجھانے والا، زوردار اور تحریک دینے والا ہو۔ پھر اس کا
 خلاصہ لکھیں اور اس پر اپنی رائے لکھیں۔

۲۔ ان سے میں دو کہانوں کی بنیادی خصوصیات کا موازنہ کریں۔ ان باتوں کی
 وضاحت کریں کہ آپ نے ان کے تضادات اور مظاہروں کا کیوں اہم سمجھا۔
 ۳۔ ڈرامے کا پہلا ایکٹ یا منظر پڑھنے کے بعد ڈرامے کے کسی مرکزی کردار کے
 تعلق میں ابتدائی رائے بیان کیجئے۔ اس کے بعد پورا ڈراما پڑھ کر پچھلے کے بعد
 پھر اپنی رائے کی وضاحت کیجئے۔ ڈرامے کے تضادات، افعال اور مکالموں کا
 تجزیہ کر کے بتائیے کہ انہوں نے آپ کی پہلی رائے کی تائید کی یا اسے دبانے

کا باعث ہے۔

4۔ ان تمام آویزشوں کی فہرست بنائیے جو آپ کو ادا سے میں ٹھہرائی ہیں چاہے وہ مرکزی کرداروں کے تجربے میں آتی ہوں یا ضمنی کرداروں کے۔ پھر یہ دیکھیے کہ ان آویزشوں میں کس طرح تعلق پیدا کیا جا سکتا ہے۔ یہ کس طرح مشابہ ہیں؟ یہ کس طرح مختلف ہیں؟ کرداروں کا آویزشوں کو عمل کرنا کس طرح ادا سے کے عمل میں اپنا کردار ادا کرتا ہے؟

5۔ ادا سے کا کوئی منظر مختصر ادا سے کی شکل میں دوبارہ لکھیے۔ کرداروں کے داخلی محسوسات اور خیالات اور وہ ماحول جس میں وقوع پزیر ہوتا ہے، ان سب کی تفصیلات لکھیے۔

6۔ کوئی براہ راست یا دیکھا شدہ ادا سے یا کسی ادا سے پر مبنی کوئی فلم دیکھیے۔ اپنی اس وقت کی ادا سے جب آپ نے یہ ادا سے دیکھا اور اس وقت کی ادا سے جب آپ نے اسے سٹیج پر یا فلم میں دیکھا، دونوں کا موازنہ کیجیے۔ ان پہلوؤں پر غور کیجیے جو سٹیج یا فلم ڈائریکٹر نے ہلکے مناسب جگہ۔ مثال کے طور پر کیا کوئی کردار ختم کیا گیا؟ مثال کیا گیا؟ کیا کچھ مناظر چھوڑ دیے گئے؟ ان فیصلوں کے اثرات کا تجربہ کیجیے۔

7۔ کسی ادا سے کے ابتدائی مکالمات کی تحریر لکھیے۔ ہر سطر کے ادا سے لہجوں کے استعمال پر غور کیجیے۔ اس مکالمے سے کیا لہجہ و لہجہ پیدا ہوا ہے؟ یہ سطر ادا سے کے موضوع اور اس میں آنے والی آویزشوں کے تعلق کیا توقعات پیدا کرتی ہیں؟

مسی کردار کی مشکلات اور ان کے حل پر غور کیجئے۔ جس طریقے سے
 کردار اپنے مسئلے سے بچتا ہے، اس پر اپنی رائے لکھیے۔ اس کردار
 کے فیصلوں اور اعمال (یا فیصلے یا عمل نہ کر سکے) کا تجزیہ کرتے
 ہوئے اپنے تجربات و مشاہدات استعمال کیجئے۔

مسی ڈرامے کا ایک متبادل اختتام لکھیے یا ایک اضافی منظر جو اس
 ڈرامے کے موجودہ آخری منظر کے اختتام کے مناسب وقت کے
 بعد نمودار ہو۔ اس منظر کی تبدیلی کی وجہ سے ان کرداروں کے
 مستقبل کے بارے میں اپنی رائے کی وضاحت کیجئے۔ یہ وضاحت
 کرتے ہوئے ڈرامے میں موجود اس سے متعلق تعلیمات کا حوالہ
 دیجئے۔

10۔ اورانا نگاری کے تاریخی پس منظر کا مطالعہ کیجئے، ڈراموں پر تبصرے یا
 ڈراموں کے تجزیے اور جائزے کے بارے میں مطالعہ کرنا ہے۔
 اپنے اس مطالعہ سے حاصل کردہ ایک یا دو نئی ہیروئنوں کا انتخاب
 کیجئے اور ان کی وضاحت کیجئے۔ آپ کے ان ماحولیات نے آپ کی
 ابتدائی ڈراماٹکس میں کیا اضافہ کیا؟

یہ اصناف ادب زیادہ تر افسانوی ادب سے تعلق رکھتی ہیں۔ تھوڑے اور بڑے
 اہل قلم کے ہیں کہ کس طرح زبان کے حوالے سے ان ادب پاروں سے استفادہ کیا
 جاسکتا ہے، طلبہ کس طرح کلاس کی سرگرمیوں میں مل کر اپنے اپنے کے قابل ہو سکتے ہیں اور
 کس طرح وہ متن کو چمک سکتے ہیں اور اس پر اپنے نقطہ نظر کا اظہار کر سکتے ہیں۔ اور ادب
 کے بارے میں اپنی نظر ثانی اور ذاتی رائے اسے لکھ سکتے ہیں۔
 اس مقام پر مقالہ نگار نثر کی ایک اہم صنف "مضمون" (Essay) پر بات کرنا

چاہتا ہے جو ملک کے اکثر اداروں کے اہم اے (انگریزی) کے حساب کارروائی منسوب
 مضمون کو پڑھتے ہوئے قاری کو دیکھنا چاہیے کہ اس کا مرکزی مقصد کیا نظر آتا ہے۔ کیا وہ
 کسی شخص یا مقام کے بارے میں جاننے کے لیے لکھا گیا ہے، یا کیا یہ کسی کہانی کو پیش
 کرنے کے لیے لکھا گیا ہے؟ اس بیان یا کہانی کی آپ کیا اہمیت سمجھتے ہیں؟ یہ بیان یا
 کہانی آپ کے اپنے مشاہدے اور تجربے سے کیا تعلق رکھتی ہے؟

ایک مضمون میں اہم سوالات اور تضادات ہو سکتے ہیں۔ یہ کسی بات کی
 وجوہات بیان کر سکتا ہے یا کسی خاص واقعے یا عمل کے اثرات کی وضاحت کر سکتا ہے۔
 بعض مضامین کسی خیالی (idea) کے بارے میں کسی ایک حقیقی نتیجے پر زور دیتے بغیر کسی
 امکانات کھولتے ہوئے جگہ اداروں اور مضمونوں کو بیان کرتے ہیں۔ کسی دیگر مضامین کسی نہ
 کسی طرح کسی نقطہ نظر کی حمایت یا مخالفت میں، یا کسی مسئلہ کا حل پیش کرنے کے لیے یا
 دنیا کے بارے میں سوچنے کا نیا نقطہ نظر پیش کرنے کے بارے میں ہو سکتے ہیں۔

مضمون کو بہتر طور پر سمجھنے کے لیے وہ اس بات پر غور کریں کہ لفظوں کا انتخاب
 اور وہ طریقہ کیا ہے جس سے مصنف نے مضمون اور اس کے فقرہوں اور جملوں کو
 ترتیب دیا ہے۔ پھر اس کو دیکھنا چاہیے کہ ان کے خیالی میں مصنف اپنے مقصد کو بیان
 کرنے میں کس حد تک کامیاب رہا ہے۔ علاوہ انہیں یہ دیکھنا چاہیے کہ مصنف نے
 شاعری کی جگہ میں کیا خصوصیات، وجوہات اور نتائج دی ہیں؟ وہ انہیں کیا سمجھتے ہیں؟
 اصل نتیجہ، حیران کن، کمزور یا ناقص؟

بہتر تفہیم کے لیے طلبہ کو یہ بھی دیکھنا چاہیے کہ وہ جن سوالات اور وجوہات کو
 دیکھیں جو مصنف نے بیان کی ہیں اور ان کے جو جواب اور حل پیش کیے ہیں۔ پھر وہ ان
 سوالات، وجوہات، تجاویز اور مقصد کٹا کٹوں یا ایلی راستے دیکھیں۔
 مختلف اسٹائل کو ان طریقہ پڑھنے اور کے مطابق پڑھنا طلبہ کو ادیب کے مطالعے

یہ حروف تہجی اور ہائے کے۔ جیسے جیسے ان کا اظہار ان الفاظ اور خیالات سمجھنا آئے گا۔ اور یہ
 انگریزی اور عربی دونوں طرح کی انگریزی میں بہتر طور پر کر سکیں گے۔ اور عظیم مصنفین
 انگریزی اور عربی کی خصوصیت کی سمجھنے کرنے کے قابل ہو سکیں گے۔ اور اپنی زندگی کے حلقے
 میں انگریزی کے قابل ہو سکیں گے۔ اس سے اچھی اقدار رکھیں گے اور انہوں نے
 انگریزی کی تعمیر ہوگی۔

پہلے اب اور تو ایسی طریقہ ہائے کار کی خواہشوں کے حلقے آئے ہو گئے
 انگریزی اور عربی کے اہتمام بہت کرنے کا یعنی سب اور ان میں سہارا دینا
 انگریزی اور عربی کے مسائل اور ان کا حل، تو انہوں نے اپنی اپنی اور
 انگریزی اور عربی کے مسائل اور ان کا حل، تو انہوں نے اپنی اپنی اور
 انگریزی اور عربی کے مسائل اور ان کا حل، تو انہوں نے اپنی اپنی اور

(پہلی ہے)

خواہش و حوالہ جات

انگریزی اور عربی کے زیادہ تر خیالات کے لیے حوالہ دے۔
 Stanford کی کتاب "Responding to Literature"۔ تیسرا ایڈیشن
 نے ایڈیٹنگ کی، کیولمبر، 2002ء سے استفادہ کیا ہے۔ حوالہ دے ان کتاب
 انگریزی اور عربی کے حوالے کی کتابوں کی تفہیم نہیں ہے۔ حوالہ دے یہ کتاب ہے
 انگریزی اور عربی کے حوالے میں انگریزی اور عربی کے لیے حوالہ دے بہت ہی حوالہ
 دے حوالے دے دے۔ انگریزی اور عربی کے حوالے میں انگریزی اور عربی کے
 حوالے میں انگریزی اور عربی کے حوالے میں انگریزی اور عربی کے
 حوالے میں انگریزی اور عربی کے حوالے میں انگریزی اور عربی کے
 حوالے میں انگریزی اور عربی کے حوالے میں انگریزی اور عربی کے

جعفر طاہر بڑی محبت کے آدمی تھے

بیسویں صدی میں جھنگ نے اردو شاعری کو کئی اہم شاعر ادیب ایک ایسے ہی دور میں دوسرے جعفر طاہر اور تیسرے ناصر شہزاد تینوں شعرا اپنے اپنے رنگ میں بہ اعتبار کام تو آہر ہیں اور انفرادیت رکھتے ہیں۔ جھنگ رنگ کے لیے شیر افضل جعفری بھی مشہور ہوئے۔ میر داگھا اسی سرزمین کی لافانی کہانی ہے۔ جس پر سید وارث شاہ نے ایک بڑی لازوال مثنوی کی شعری کتاب رقم کر دی۔ جس کے بعد کے بند آج بھی پنجاب کے دیہات سے شہر تک زبان زد خلقت ہیں اور قصوں میں ان کے ساتھ پڑھے جاتے ہیں۔ وارث شاہ کی یہ تصنیف ایسی رفیع المثنوی ہے کہ اس کی بنیاد پر وارث شاہ کو پنجابی زبان کا فلسفی سے قلمب کیا جاتا ہے۔ میر اور داگھا جھنگ کی اسی مٹی سے اٹھے چارواگ عالم میں جب شہوت ہے اور تنگی ہوئی نیند سو گئے۔ میر کا ہزار آج بھی مریخ خلقت ہے۔

ایسا کہہ سے شامالی ان کے شعری مجموعہ "شبِ رات" سے ہوئی اور جعفر طاہر کو ان کی تصنیف "ملت کشور" نے اپنے قریب کیا۔ ناصر شہزاد نے پہلے اپنی نظموں سے جنت و تہمت کا ذکر کیا اور اب "میں ہاں" قابل ذکر کام ہے۔ جعفر طاہر دراصل اپنی طویل نظموں ہی کے شاعر ہیں۔ شعری مجموعہ "ملت کشور" اس بات کا بے باک دہل اعلان کرتا ہے کہ جعفر طاہر کو تہمت لے طاقت اور زبان وہی تھی لیکن اپنے لیے نہیں دوسروں کے لیے۔ ان کی دانش ذات سے باہر آہوئی تھی۔

جعفر طاہر صاحب کو لوج سے رنج نہ ہوئے اگرچہ زیادہ عرصہ نہیں ہوا تھا۔ لیکن ایچ ڈی اے سے شہر واپس بھی اس بات کا احساس نہیں ہوتا تھا کہ لوج میں وہ کچھ ہی

میں۔ بہت ہی کم کی ادائیگی تھی اور کامت تو تھی تھا۔ یہ کامت ان کی طرف سے
 نہیں تھا البتہ کام تو لگنے کے ساتھ ظاہر ہوتا تھا اور جب ظاہر ہوتا تھا تو لگتا ہے پھر
 ہونے کی کیفیت کے ساتھ ان کی نظموں کا فن، مصرعوں کے انداز، چھاؤ اور مزاج کا
 ہونا بھی کافی کو ایک خاص قسم کی موسیقیت کا احساس دلاتے ہیں۔ شاید شعر ظاہر کی کمی وہ
 لہجوں میں نہیں کامی روز اول سے مراد ہوں۔ اس میری پرکاری میں آج بھی کوئی کمی
 پایا نہیں جاتی ہے۔ مجھے ایسے آدمی بہت اچھے لگتے ہیں جو کم لیا ہوتے ہی ادائیگی کم
 دیا ہی بھی غرض لڑائی کا یاد دہانتے ہیں۔

بات موسیقیت کی آگے ہے تو اس سلسلے سے ایک واقعہ بیان کرنا چلوں جو جن
 کی طبیعت ساری میں معاون ہو سکتی ہے۔ چند سال پہلے ہی لی وی کراچی سے ایک ادیب
 پروگرام "پاکستان ادب سال بہ سال" میں کیا تھا۔ تقریباً لی وی کراچی کے اسکریپٹ
 چلوانے پروگرام پر دلچسپ طرز میں تھی۔ انہوں نے یہ کام مجھے سونپا۔ اس سے پہلے میں
 صحافت کو رحمت ملی تھی۔ انہیں ۱۹۶۰ء، ۱۹۶۱ء سے آغاز کرنے کے لیے اسکریپٹ تیار
 کرنا تھا۔ وہ شاید اسے مشکل کام سمجھ کر میدان چھوڑ گئے۔ پھر فروری ۱۹۶۱ء اور اس سے آگے
 کی ادب ساری مجھے ملنی چلی۔ پھر سال بہ سال کے اسکریپٹ لکھنے کا یہ سلسلہ ۱۹۶۳ء
 پروگرام تک جاری رہا۔ "پاکستانی ادب سال بہ سال" ایک لکھنے کا پروگرام تھا اور ہر سنیچے
 میں ہوتا تھا۔ اسکریپٹ نگاری کی صورت یہ تھی کہ ہر سال کا اپنا سوا گزرا گیا تھا۔ اس
 کے بارے میں ان کے رسالہ جہات سے منتخب المثنوی، ڈراموں، نظموں، ناولوں اور دیگر نثر
 کی تجلیات کو نام زد کرنے کے ساتھ ساتھ رسالوں کی نکلیں وہی بھی کر دی جاتی تھی۔ اس
 کی قیاد پر پروگرام پر ہر ایسا سوا میں ایک ڈرامہ، کسی کہانی کو اسے کی صورت
 میں لکھی کرتا تھا۔ پھر ایک ملاحظہ شعرا کی فہرستیں اور بعض نکتے لکھیں اور بعض
 (۱۹۶۰ء صورت) سے گواہی جاتی تھیں۔ ساتھ ہی اس پر سے سال کا ادبی جائزہ بھی لکھا

کیا ہوتا تھا۔ جسے اسکرپٹ نگار الگ سے رقم کرنا تھا۔ پروگرام کے سیکرٹری نے کہا تھا۔ مجھے کم سے کم میں عملات کے اسکرپٹ چار کرنے ہوتے تھے جس میں سال کے بارہ مہینوں میں مختلف رسائل میں چھپنے والے مواد کے انتخاب کے لیے مختلف کاموں کی خاک چھانی ہوتی تھی۔

اسی دوران میں ایک موقع پیدا آیا کہ محترم طاہر کی ایک فلم اردنی فلموں کے لیے منتخب کی گئی جس کا محترم نام "تعمیر سنت نظیر" کا ٹائٹل ہوا تھا۔ وہی ٹیٹل وہی کہہ کر ملکہ نور جہاں کے حضور ایک گیت "عمر راگ" میں نقل کیا گیا تھا۔ میں نے پروگرام پروڈیوسر طارق جمیل صاحب سے کہا کہ کیا اچھا ہو کہ محترم طاہر صاحب کے اس گیت کے لیے "عمر راگ" ہی استعمال کیا جائے کیونکہ محترم طاہر موسیقی سے شغف رکھتے تھے۔ انہی نے اس گیت کو انہوں نے راگ کے بول کی مناسبت سے ہی رقم کیا ہو۔ طارق جمیل یہ سن کر اچھل پڑے۔ فوراً محترم طاہر صاحب کو بلا دیا گیا جو "پاکستانی ادب سال بہ سال" کی موسیقی کی دیکھی مرتب کرتے تھے۔

محترم طاہر کے آتے ہی پروگرام پروڈیوسر طارق جمیل نے کہا میں ہرگز اتنی ادب سال بہ سال میں ملک کے مشہور نثر نگار بننا محترم طاہر کا گیت منتخب ہوا ہے۔ ٹائٹل ہونا کے علاوہ اسے میں ہرگز جہانگیر نور ملکہ نور جہاں کے حضور ہی کا ایک گیت "عمر راگ" کی بدلی میں نقل ہوا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ہمیں بھی ایسی سزا میں "عمر راگ" ہی میں یہ گیت نقل کرنا ہے۔ آپ پاکستانی کا کارہی اس راگ سے واقف ہونی چاہیے۔

محترم طاہر نے طارق جمیل سے گیت کی نقل کا کافز لے لیا اور اس کا ایک کافز اور دوسرے کافز "عمر راگ" میں کار لکھا۔ گیت اس کے ہر محترم طاہر صاحب کی موسیقی دانی کا کافز ہوا ہے۔

وہ گیت "عمر راگ" بہ سال بہ سال کا پروگرام لائی ہوا تھا اور دیکھتے ہی آج بھی

پروفیسر صاحب کے ہیرا راک کو گانے کے لیے کسی دوسرے گلوکار کو استعمال کرنے کے
بغیر ہر شے نے خودی گویا ہے۔ باذاتی سننے والوں کو اس کا بھی میں دو آٹھ کھانٹ
تو آئے تم میں نے ایسا ہی محسوس کیا۔

پروفیسر صاحب سے میرا قاتلانہ تعارف ان کے کلام اور ان کی آدم جی انعام
پر کتاب ملت کتب سے ہو چکا تھا۔ اس کے علاوہ اردو شاعری میں پروفیسر صاحب کے
Cantos) بھی پڑھ چکا تھا۔ مزہ آیا تھا اس لیے اس سے پہلے ایذا پاؤں کے
تو بھی غلے سے گزر چکے تھے۔ "گیٹو" کے حوالے سے پاؤں انگریزی شاعری کی
پیش کردہ محسوس ہوتے ہیں۔ انگریزی شاعری کے پروفیسر صاحب کی ایسا ایٹھ پاؤں کے
کلام کے بہت مانع ہیں۔ لی ایسا ایٹھ کی مشہور زبان The Waste Land
ایسا ایٹھ) پر نظر پڑی ایذا پاؤں نے کی تھی۔

اردو میں گیتو (Cantos) رقم کرنے کا اول اول تجربہ شاعر پروفیسر صاحب کے سے

میری آواز۔

۱۹۶۳-۶۵ء کا زمانہ تھا۔ سابق مشرقی پاکستان سے سولا کے قصبے میں کراچی
آنے کے بعد میری تحریری دوا پڑھی رابطے سے آگاہی میں ہو گئی تھی۔ ہڈی کے اکثر
اہل کلمے گیتے کھانے کے سائے ایک طویل عرصے سے قاتلانہ جانتے تھے۔ ان ہائے
بلاں میں ٹیبل ٹک، افضل پرویز، ابو ظفر، منصور قیصر اور رشید احمد اور اظہار نامی میرے
شیلے میں تھے۔ ہڈی شہر ان کے رہتے ہوئے کبھی مجھے اجنبی نہیں لگا۔

اس دوران ہڈی رابطے کے پروگرام پیدائش پر سابق قرآنے ایک سے بختر
پروگرام "ساز کہتے ہیں" کا منصوبہ بناوا۔ ساز کے حوالے پھر کھانے کے لیے ایک ایسا
کی ضرورت محسوس ہوئی۔ انہوں نے منصور قیصر کو گیتے کی دعوت دی۔ منصور قیصر نے
تعمیرت سائے سابق قرآنوں پر یہ جواب دیا کہ "میں میں ہونے کے سائے سے کرا

لکھوں گا، میرا یاد اللہ ہے سب سبھی سابق مشرقی پاکستان سے چند دنوں پیشتر راول پٹی کی آئی
 وہ ریل سے اکوٹش میں کام کرتا ہے۔ موسیقی اس کا خاص مہووسا ہے۔ اس کام کے لیے
 موزوں رہے گا۔ میں ابھی لے کر آتا ہوں۔

منصور قیصر جیسے اسی وقت اپنی گاڑی میں بٹھا کر پٹی ریلوے اسٹیشن سے لے کر
 پورے صواب قمر سے طویا۔ وہیں صواب قمر کے کمرے میں جعفر طاہر بھی بیٹھے ہوئے
 تھے۔ جعفر طاہر نے اٹھ کر بلا سے تپاک سے بگٹے لگا لیا اور انہوں نے بھی "ساز" کہتے ہیں
 لکھنے کے لیے میری تقریر کا ٹیڈر مقدم کیا۔ میں جتنے میں ایک دن کسی نہ کسی ساز کے
 حوالے سے لکھ لکھ کر صواب قمر صاحب کے حوالے کرتا تھا۔ وہ بہت خوش تھے۔ انہوں نے
 بتایا تھا کہ میرا بیٹا شہناز ہے۔ بسم اللہ خاں کے حوالے سے سیلون ریلوے کے ٹریڈ ہے
 کرنے کے لیے۔ جعفر طاہر صاحب سے بھی اس دن ملاقات ہو جاتی تھی۔ یہ سلسلہ تقریباً
 ایک سال تک چلا گیا۔

ریلوے اسٹیشن میں جعفر طاہر صاحب سے ملاقات کی صورت یہ ہوتی تھی کہ
 پندرہ گرام پہنچا کر اس کے بعد ان کے گنا پر ریلوے اسٹیشن کے سٹیشن میں بیٹھے کی جہانے
 اور ایک اور وقت کے ساتھ میں بیٹھ جاتے۔ وہ مجھے پائے منگوانے نہیں دیتے تھے۔ خدا
 معلوم اس کے پیچھے کیا مصلحت تھی اور پھر کنگم شروع ہو جاتی تھی، اللہ کی کم، عالی سیاست
 پر لیا، ہوتی تھی۔ مشرق وسطیٰ کی سیاست ان کا خاص مہووسا تھی۔ اور ان میں "بلیک
 تھی" کا لفظ بھی جاری تھا۔

سیاست میں زیادہ تر وہ عالی صورت ماں اور بہت آتی تھی جس کا وہ راست
 مصلحت مشرق وسطیٰ کے ممالک اور فلسطین کی کسی بھری سے تھا۔ اور یہ اس سے تھا کہ
 سامراجی ممالک امریکہ، برطانیہ مشرق وسطیٰ کے قلب میں اسرائیل کا وجود معلوم کرنا چاہتے
 تھے۔ جعفر طاہر صاحب اس مہووسا پر زیادہ سے زیادہ چال چلایا کہ میں ترجیح دیتے تھے

یہاں تک کہ آنا صلیف ملت کشور کے بعد شرق وسطیٰ کی تازہ بہ تازہ صورت حال پر
 اس کا کیا حکم چاہتے تھے۔ انہیں اس بات کا پتا تھا کہ ان معاملات میں میری دوران
 میں اس طرح کی نظری مطابقت بھی ہے اور اپنی نظموں کے خام مواد میں انسانی کے لیے
 اس طرح کے مباحث کو درخورد اکتا جانتے تھے۔ میں نے "ہلک خیر"
 میں اس سے فریج کنگو جو لیبیا میں قذافی و شاہ حسین اور باس مرقات کے درمیان
 کے بارے میں فلسطینی مجاہدین کے دو ہاتھوں ہارو کے دعووں
 کے بارے میں بھی بات کی۔ اس بارے میں فلسطینی مجاہدین کے دو ہاتھوں ہارو کے دعووں
 کے بارے میں باس مرقات کے رفیق سفر ساریج پیش اور ناظم حاتم (یا نائف جلیل) کے
 بارے میں بھی بیان کیا۔ اور پھر اس صورت حال کی جانب اشارہ کیا۔ جس میں فلسطینی ہے
 جس کا ایک طرف امریکہ کی پشت پناہی میں اسرائیل کا عظیم دستم اور دوسری طرف عرب
 کی "تک تک ویدیم دم نہ کشیدم" والا رویہ سہتے تھے۔ میں اپنی ہوا بھی ہر شے
 فریج و حتیٰ کی صورت حال کے موافق و موافق پر باتیں کیے جاتا تھا۔ ساتھ ہی یہ کہ
 تازہ کی میری جو باتیں آپ کے کام کی ہوں انہیں رکھ لیں اور باتوں کو خارج از ذہن
 کر دوں گی۔

جعفر طاہر سے ربط و ملاقات کا یہ سلسلہ ۱۹۷۷ء کے اوائل تک جاری رہا۔ چندی
 دنوں انٹرن کے لان میں ہر ہفتہ ان کے ساتھ بیٹنگ جاری رہی۔ چائے جعفر طاہر
 صاحب کی طرف سے آتی تھی۔ میں نے ایک آدھ بار اسرار بھی کیا کہ کبھی مجھے بھی
 ان خدمت کا موقع دیں تو انہوں نے نہایت محبت سے کہا "سبیل صاحب آپ اہل
 لبنان ہیں اور اب سے بڑھ کر یہ کہ آپ اہل ہجرت و مسافرت میں نہیں۔"
 "ساز کہتے ہیں" کارلیو جو پروگرام منع ہو چکا تھا۔ جعفر طاہر صاحب سے ملاقات
 کی صورت نکلی رہتی تھی۔ وہ ابھی میں لان کا تپاک قائم تھا۔
 کچھ دنوں بعد میرا تازہ کراچی ہو گیا اور جعفر طاہر صاحب سے دوبارہ ملاقات ہو گیا۔

نہیں مشرقی وسطیٰ پر ہفت مشورہ" بھی کتاب مکمل کرنے کا جعفر صاحب کا مقصد تھا۔ مکمل نہیں ہو سکی
 یا نہیں۔ خدا کرے اس کا مسودہ ان کی زندگی ہی میں مکمل ہو چکا ہو۔ مجھے یقین ہے ان کی
 دوسری کتاب "ہفت مشورہ" کی طرح اپنے سیاسی و علمی سیاق و سباق میں بلند مرتبہ ہوگی اور
 اسے ادبی محفلات میں آنے کی سہولت حاصل ہوگی ہو۔

جعفر طاہر کی شہرت اس وقت بام مراد پر پہنچی جب پاکستان راجستھان کے پہلے
 آدم بی انعام کے لیے ان کے شعری مجموعے "ہفت مشورہ" کا انتخاب کیا گیا۔ اس میں غالب
 نظموں کو بڑا کر مجھے جعفر طاہر کے ایک بڑے گوشار ہونے کا شہوت سے احساس ہوا۔ وہ
 بھی خیال آیا کہ زبان کسی کی میراث نہیں ہوتی جو اسے سلیقے سے بڑے ہی اس کا تخلیق
 وراثت ہوتا ہے۔

"ہفت مشورہ" اپنے شاعرانہ سیاق و سباق میں سات ممالک، ترکی، مصر، عرب،
 عراق، ایران، پاکستان اور الجزائر کا سیر کرتی ہے۔ اسی مناسبت سے سات طویل نظمیں
 افلاک و کمرسات منکوم محفلات سے ہیں۔ ہر محفلات بیان و پیش کش کے اعتبار سے قدرتی
 یا ایک عالم نو کے دروا کرتا اور ایک نئی لذت سے آشنا کرتا ہے۔ محفلات کی آرائش اور
 نگارہ سازی افلاک و حلیہ کے طرز ہوتے پر ظاہر ہوتی ہے۔ یہاں نظموں کے انتخاب نے
 دستانوں کیا کیوں کہ یہ افلاک بھی نہیں یعنی لائے ہوئے نہیں از خود آتے ہوتے ہیں اور
 ان کی شاعری کو آسانی حراج صفا کرتے ہیں۔ دوسری صدی کے عظیم انگریزی شاعر
 جمل ٹور کینیڈا ہے کہ لٹسکی بیان میر سے لے پھر فراہم کرتی ہے۔ لے لے کرتے
 ترشے افلاک ہیں کہ لے لے چلے آ رہے ہیں۔ مصر میں اور شعروں میں۔ سرزمین کے
 حوالے سے لے لے ملاہم رمانی کو سب تاب ہیں۔ ایک نظم میں حسب ذیل کسی ہی
 چھوٹی ہی امریکہ نظم میں ہوتی گی ہیں۔ شاعری کی کتابوں تو چھاپتا ہوں لیکن
 نظموں کا یہ افلاک غالب ہی دیکھنے میں آتا ہے۔ جعفر طاہر کا افلاک خالی خالی نہیں تھا۔

ہیں کی نہیں کہتا ہے۔

انہوں کے نظریے سے آواز اس کے فکر کے مشرقی ہاند سے دور ہے فلم
دور ہے اور یہ کہنے کوئی چاہتا "اب بھر تمام کے بھومری ہاری آئی"

یہی مہتر طاہر صاحب کا فلم آواز ہی سے دھانی رنگ میں رنگ چتا ہے اور
زیبا قویوں کی اس سر زمین کے متعلق گردی کی اور یہاں نظر میں گھومتے گھومتے
یہ کے ہرے اپنے گھرے بھی بیدار ہو جاتے ہیں فلم کے پردے کی طرح مہتر نظر کے
رہنے سے گزرنے لگتے ہیں۔ آپ مہتر طاہر کی شاعری میں سے خاصا بگ رنگ کی
نئی ہیں۔ انہوں کا لب و لہجہ استہل ہونے لگتا ہے۔ جس کی وجہ سے اس لئے کا مہتر ہر
انہی میں گتہ پاکستان کے دونوں ہانوں میں ایک کے لیے ستر ۲۶۰ پر انہا کی مابہت
یہ ایک نکل بگ گیت رقم ہوا ہے۔

گھٹتے ہانے بھولا ہے ہے بھورا

گھٹتے ہانے بھولا ہے

ہانے چند بھولی

انگے دور شاد بھولی کر

مترہ اس بگ گیت کے متعلق ایک بھائی گیت بھی رقم ہے۔

۱۳۱۱ بیا رہا میں پئی بھولی بھولی

تیری سوتی سوتی میں بھولی بھولی

سے بھولی بھولی

۱۳۱۱

ان کے ہر طویل تر میں سلی فلم کا گور۔ نظر سے گزرتا ہے۔ اس میں چھٹا
انہی کے مابہت انہا کا استہل کر اور اس کو سوتی "کارتے بھولی کے

متراب ہوتا ہے لیکن جعفر طاہر نے "ملت کشور" میں میں ہم غازی اللہ اور جعفر جعفری کے ساتھ
 جس خوب صورتی سے نکال لائے ہیں۔ اس میں با سے با سے طریم جانوں کی وہی جاتی ہے۔
 لیکن جعفر طاہر کا کج اس آزمائش سے گزر گئے ہیں۔ ایک نئے نئے جہان
 کی طرف۔ جعفر طاہر کو "ملت کشور" لکھنے کے بعد یہ کہنے لاقی پہنچا ہے۔ "وہی جاتی
 ہے دنیا مرے آگے" تقریباً آدمی دنیا پر جعفر طاہر کا یہ کہا ساق آتا ہے۔
 کتاب کا آخری جعفر جعفری "الجزائر" ہے اس جعفری کے کا حکم اس آواز
 ہے ہوتا ہے:

انہیں اب تو متراب کی اپنے گئے ہیں جرم اہل میں جان کر
 اٹھو دوستو دیکھتے کیا ہو اٹھو نہ آئے کی پھر سات ایک جاتی
 وہی وقت ہے ایک صف میں کھڑے ہو کے آواز تو بخشش کا سامان کر لیں
 نئی کے صحابی کی آواز ہے۔ جان کیا جتن ہے آن قربان کر لیں
 مرنے ملت کشور کے ہانگے جواز یہ متراب کالو بہت فکر ہے
 لہا ہی بھی جائے ان میں گوارا نہیں ہے کہ یہ ہم خیر البشر ہے
 مگر ہو گی تو نئی کے صحابا سے آگئیں غلے کا پیرا نہ ہو گا
 مگر میں کہتا ہوں میں جان ہوں کہ یہ رنج تم کو گوارا نہ ہو گا
 اس مضمون میں جعفر طاہر صاحب کے غرض کو اہا کر کے کی سعی کی ہے کیا
 نے لود کو وہ ہانگی کہنے سے وہا لود وہ ہانگی ان کے Deeds کے اڑنے کھولتی ہیں۔
 Deed کا کارناموں ملت گزرت نہیں ملی یہ حقیقت ہیں۔ یہ ہانگی اگر میں نہ ہو راست
 کہہ تو ظاہر ہے اس میں وہ ہانگی وہ ہانگی وہ ہانگی ان کے کارناموں کی زہانی کھولتی
 ہیں۔ وہ ہانگی میں ان کی طبیعت ہی ہوتے ہیں نظر رہی جس کی طرف میرا مہین ہی
 نہ کیا دیکھیں یعنی ان سے طاقت کی کھلی میں کی کتاب "ملت کشور" لکھ۔

دعا کرنا ہے
 سچ خمول میں پڑی ایک غیر مطبوعہ نظم
 (زمانی پس منظر)

ملاہڑ برطانیہ کے شاہی جہاز کا ٹھکانا ہوا، دوسری جنگ عظیم میں ہوائی
 بموں کے مارے سے تین ہزار سال تک دھندلے ہوئے میں لپٹا رہا۔ ہوائی بموں کی گنت
 کے بعد جب اس کے دن بھرے تو یہاں کا نظم و نسق برطانوی فوجی انتظامیہ نے سنبھال
 لیا۔ اسی نظم کے سلسلے میں پورا مین سروس 1967ء کے اوائل میں برطانوی فوج کی
 جنوب مشرقی ایشیائی کمان کے فخر تعلقات عامہ کے روٹن اورڈ ایڈیڈ "جوان" (۱) کے
 چیف ایڈیٹر کی حیثیت سے ملایا کے مائل پر آئے۔

"جوان" کے ادارہ فخر میں سید ضمیر جعفری، مسعود احمد (۲)، لادن سعید (۳)،
 ہادی رنگ (۴) اور کی دوسرے نام شامل ہیں۔ یہ سب لوگ آری میس (mess) میں
 "قوم" کے نام سے موسوم تھے۔ میس کا نقشہ ضمیر مرحوم نے یوں دیا ہے۔ "میس کی
 کھڑکی سے جھانگیں تو پھال کے کشیدہ جامت جڑوں کے جھنڈا میس سرگوشیاں کرتے
 نظر آتے تھے۔ دوسری طرف ہانگی کے باہر چینی چیری کا ایک درخت باہیں بیٹھا لگا
 تھا۔ پختہ کو اٹھتی ہوئی پہاڑی کی بیٹھائی پر ایک عرب رکش کا بگڑ تھا جس کے زبوں
 لائن اوپر سے لاسکتے پھلے ہمارے میس کے ماحیے پر کس آ کے رہتے تھے۔ زبانت آ
 ہارلی کے جڑ ایک دوسرے پر لٹکے ہوئے تھے جن کا منظر ہوائی راتوں میں جانتی
 فخر ہوتا تھا۔"

یہ قریب و جوار کے منظر میں سنگا پور کا مہوی باجول ہوا طرف لکڑی لگا ہوا

جے ایم منڈل ہو رہے تھے۔ سنگا پور جنوب مشرقی ایشیا کا ایک بڑا شہر تھا۔ قریب سو برس
پہلے ان سے مزید شہر۔ جنگ کے بعد جے کی خوشیوں نے اس شہر کو اور بھی حسین بنا دیا
تھا۔ ابتدا و ہجرت، امن نسوانی کی بہتات، خواب ناک ساحل، لائق ہولی رئیس کا ہیں۔
جنگ کے کتب، ہر قسم کی آزادی اور فرصت و فراغت۔۔۔ اس ماحول میں "جوان" بھی لکھ
پڑھا اور انہوں نے بھی رنگ و رو کو سمیٹ رہے تھے۔

چراغ حسن حسرت "جوان" کی سرمد ہی فرما رہے تھے، خمیر جعفری صاحب
"جوان" میں کپ شپ کے ساتھ ساتھ "بازروں کے گیت" (۵) جمع کر رہے تھے۔
ہرے بروج مسعود احمد "جوان" کو سنبھالا دینے اور کچھ جانتی کی بھول بھلیوں میں ایسے
تپے پڑنے کا فریضہ بھی ادا کر رہے تھے۔ یہ وہی مسعود احمد ہیں جنہوں نے خمیر جعفری
نے ہاتھوں کر "سنگا پور کا بھگت سرست" (۶) جیسا شاندار شخص مرتبہ تیار کیا ہے۔

زری مسعود احمد (اس وقت کینیڈا) کچھ عرصہ پہلے بھی گلگت میں حسرت صاحب
نے ہاتھ منگوا کر اخبار میں کام کر چکے تھے۔ سنگا پور میں مسعود احمد کی حسرت سے جہاں
کی داغ ہوئی تو حسرت نے کہا: "ہاں تو مولانا مسعود صاحب بہت اچھا ہوا آپ آ
گئے۔ سنگا پور کو آپ گلگت سے بھی زیادہ تقویٰ رکھنا پائیں گے۔"

جہاں نے وہاںے عام میں مرنے کو پسند نہیں کیا تھا۔ یہاں دعوت گناہ کی دبا
لڑائی دیکھیں تھی کہ جیسا مشکل ہو رہا تھا۔ مسعود احمد نے (کئی مسکری اصحاب کی
ساتھ) ایک مہذب اور آسودہ حال گھرانے میں شادی کا ڈول ڈالا اور کامیاب
اسلے ہنگر و ہوشی تعلقات عام کے ٹکڑے سے خشک تھے اور پھر لڑکی والے بھی کم
میل نہ تھے اس لیے اس شادی کا چرچا بڑے دنوں تک محفلوں اور اخباروں میں رہا۔

پندرہ کی ہفت روزہ بھی شائع ہوتی رہی۔ چراغ حسن حسرت نے اس صاحب سعید پر
"توم" کی شایعیت سے کچھ دلچسپ اشعار لکھے اور "توم" کی شایعیت طبع کا خوب

ملاں سہا کا کیا۔

ان اشعار میں بے تکلفی کے شوخ و لعل رنگ و شبلیہ کی نگہ ہیں اور سرت کے مطابقت کو وہ اہلک بھی ہے جو ان کے تیزی اور شعری اسلوب کی پہچان ہے۔ اسی قریب پر تین اشعار کا ایک "تصویر جامع" بھی ہے جس میں وہی تیزی اور بکھر چھڑکا انداز ہے جو "مسعود کی شادی پر" والی نظم میں رقصاں و جلاں ہے۔

بارج اور صمدی دونوں۔ بلکہ اس "قوم" کے اکثر افراد عدم کو چا کر آباد کر چکے ہیں، لفظ یہ اشعار اپنی جہاں سے آج سے ساٹھ سال پہلے کے نظموں کو سمیٹے لکھے تھے نظر ہیں۔

•••••

حواشی

۱۔ "جہاں" ۱۲ ستمبر ۱۹۳۵ء کو شائع ہوا۔ پہلے نکلنے میں ۱۱ پارے تھے، پھر تین پارے اور پھر پندرہ پارے ہونے لگے۔ یہ دونوں اردو ایڈیشن تھے۔ پھر ۲۷ جون ۱۹۳۶ء کو اردو دم انکلا میں نکلے لگے۔ مسعود نے لکھا کہ "ایک صبح کو وہ چھپ کی انبار لونی کی دکان میں ایک پانچواں پارے کی انبار روز پبلشرز کے اردو ایڈیشن کا پہلا پارے چھپ کر نکلا۔"

۲۔ کراچی مسعود احمد ۱۹۳۳ء میں کولتار (تحصیل حافظ آباد) میں پیدا ہوئے۔ پانچ ماہ کی عمر میں سرگودھا کے ساتھ گلگت اور سنگاپور میں رہے۔ ۱۹۶۸ء میں ڈاکٹر کٹر پور پبلشرز کے چھپنے سے ریٹائر ہوئے۔ "نظم اور گزرتے" اخباری کالموں کا ایک مجموعہ بھی شائع ہوا۔ روزنامہ "مسلم" میں کالم بھی لکھتے رہے۔ شادی کی تقریب نومبر ۱۹۳۶ء میں سنگاپور منعقد ہوئی تھی۔ ۲۰ مئی ۱۹۹۸ء کو اسلام آباد میں انتقال کیا۔

کونڈا میں فکری برادری دیا جس میں سعید کے ہم سے چائے پاتے ہیں۔ آپ نے
 اس وقت مرزا کو سعید دہلوی کے قریب ہیں۔

وہ ایک سٹاپر میں ریٹائر ہو گئے۔ پاکستان بننے سے پہلے اپنی دہائی
 میں اہلئے ریفر کھا کرتے تھے۔ آپ لطیف جرنل ۱۹۵۶ء کے شمارے میں موصوف
 نے ایک فراموش اور بڑا اطمینان مضمون "سررت فرج میں" لکھا تھا۔

یہ فرج مضمون کی کتاب ہے جس کا نواز نے انہوں نے سٹاپر کے دوران قیام تک کیا تھا۔
 یہ کتاب ۱۹۵۶ء میں شائع ہوئی۔ کتاب کا مقدمہ فرج میں سررت کے علم

تھا۔
 پانچ مضمون کے ساتھ ساتھ ان کا مجموعہ "کتابی چرے" میں یہ خاکہ شامل ہے۔

مستوردی کی مشاددی کی

یہ مستورد صاحب بیٹا ہے۔
 کسے ہے فقط کا ہے گئے۔
 تہ گئے ہے اور پیا ہے۔
 بے اطواران کے سزا ہے۔
 دونوں میں کئی بول اکا ہے۔
 عشق میں ایسے گئے۔
 نکالے گئے اور پیا ہے۔
 کو ابی کو ہم سے خلا ہے۔

نجر لے کے آنے جا رہا ہے۔
 نجر لے کے نجات میں چلا ہے۔
 نجر نجر کا پیر ہے۔
 نجر نجر کی پند آگئی۔
 نجر نجر میں اکا ہی جی کرتی رہی۔
 نجر نجر سے متا ابی الگ ہو گیا۔
 نجر نجر معلوم اور پیا ہے۔
 نجات کے رشتے نے جلا نہیں۔

قطبہ مہتابی

ہنگام سحر شاعر شیریں گفتار - حیرت میں تقاسن کے شور داماد و کوس

اتنے میں غیبی صدا آئی کہ آج مسعود ہے نوش بہت داد و غرور کوس

۱۳۶۵ھ

زندگی کنز سے کی اب تو چین سے بندہ گئی مسعود کی دم زین سے

حررت

عصمت کی دشمنی کی پر تازہ نظر

اردو ناول کے بہت سے کردار ایسے ہیں جو ماہرے کے اعتبار سے ناقابل تعلق اور غیر حقیقی نظر آتے ہیں تاہم ایسا نہیں ہے۔ وہ وہی نظر میں ایسے نظر آتے ہیں لیکن جب ان کی کرداری یا انفعالی پر قلم اتری جاتی ہیں۔ وہ دلچسپ و کشش اور یادگار بنتے چلے جاتے ہیں۔ عصمت چغتائی کے ناول "نیرمی گلیز" کی ہیروئن دشمن بھی ایک ہیروئن کردار ہے جو وقت کی گرد میں بھی کارکن کے ذہن میں محفوظ رہا ہے۔ جدید دور میں ایسے بھی دشمنوں کی تعداد بڑھتی جا رہی ہے۔

دشمن ناول کے تناظر میں انفعال و اعمال کے اعتبار سے نیرمی گلیز ہونے کا ہزار بیجا کرتی ہے۔ اس کا ماحول اسے شروع ہی سے ہر قدم پر نیرمی گلیز بنا دیتا ہے۔ لہذا وہ جو کچھ بھی کرتی ہے اور جو کچھ بھی سہتی ہے وہ اس کے کردار کی گہری عکاس بنتی چلی جاتی ہے۔ وہ دشمن زدہ ماحول کی پیداوار تھی جہاں بچوں پر بچہ پیدا ہوا چلا جا رہا تھا اور یوں لگتا تھا جیسے ماں باپ کو تربیت یا ایسے محبت آمیز اصولوں اور شاہلوں کی کوئی پروا نہ تھی جو کسی بچے کو ذمہ دار اور مہذب بناتے ہیں لہذا بغاوت اور مزاحمت میں Revolt and Resistance اس کے مزاج کا حصہ بن گئی ہیں لگتا تھا جیسے کہ کر والوں اور اپنے سے قریب آنے والوں کے حوالے سے اپنے رد عمل کا مظاہرہ کر کے لے لے رہی ہو۔ دراصل وہ شروع ہی سے فطری طور پر آزادی کی خواہاں تھی۔ کچھ نظر انداز شدہ بچے شروع ہی سے اپنی آزادی کے تحفظ کے لیے ایسی حرکات کے مرتکب ہوتے ہیں کہ والدین بھی ششدر رہ جاتے ہیں جب کہ اسی کے بچے کے دیگر بھائی اور بہن دبا دبا

ہوتے اور فطرت کے حامل ہوتے ہیں۔ ضمن کا یہ ہی ممکن تھا۔ وہ ہر ایک کوک سے اپنے
 اپنی طبیعت سے تھی اور یہ کہ میں محسوس ہوتا تھا گویا اس کے والدین بھی اس سے اولیٰ
 بہت سے تھے جس کی بنا پر وہ اپنے پردے کی مانند ابھر رہی تھی ہلوتے ڈگری کے طرز پر
 یہ عالم پر جاننے کے بجائے ساتھ ڈگری کے بجائے ہاگی ہو۔

یہ عالم پر جاننے کے بجائے شاید بہت سوں کے نزدیک آسان ہو لیکن ایسا نہیں ہے۔
 ایسے کردار کی تخلیق شاید بہت سوں کے نزدیک آسان ہو لیکن ایسا نہیں ہے۔
 عمل اور اسے عملی Action یا اس سے آگے بلا کر آپ کہہ سکتے ہیں کہ واقعات
 واقعی تجربے اور مشاہدے کا استخراج ہوتے ہیں۔ اپنی تخلیق کے لیے زیادہ ریاضت اور
 یہ کہہ کر کہ Argument کا مطالبہ کرتے ہیں۔ اس سلسلے میں قصے کا استخراج کردار کی لہو کے
 جاننے واقعات کا طلب مگر ہوتا ہے جو اس کی فطرت کی کج عکاسی کرتے ہوں۔ ضمن
 کے سلسلے میں صحت پیمائی نے اپنے جادوی قلم کا زبردست استعمال کیا ہے۔ آئیے دیکھتے
 ہیں کہ ضمن اپنے ماحول سے عمل کر کے کس طرح ایک یادگار یاد دلاتی کردار کا روپ و عمارتی

ہوئی ہے۔ وہ میں جیسا کہ بتایا جا چکا ہے۔ وہ ایک متوسط مسلم گھرانے میں آکر
 نکلی ہے۔ اس کی فطرت میں کچھ تو پیدا ہوتی تھی ہے یا پھر خاندانی و داخلی ماحول اسے
 تیار کرتا ہے۔ اس پر دست و پد ہوتی ہے اور شہر آتی جا کر چھوڑتے ہیں۔ لیکن بھائیوں کے لیے اس
 کمال میں کوئی حمت یا احترام نہیں۔ ان پر ہاتھ چھوڑ بیٹھنا، انہیں حد سے زیادہ جھگ کرنا
 اور اظہار ہے۔ ضمن کی اسکولنگ Schooling بھی دلچسپ ہے۔ وہاں وہ کئی سہیلیاں
 تیار ہوتی ہیں لیکن انہیں سے رشتہ نہ رکھے مگر سہیلیوں کو عزیز رکھے۔ سب ساگنا
 گویا غلامی میں ہے وہ بچے ہو کر کے ماحول سے لہم ریشمی کے حامل ہوں۔ وہ باہر کے
 لکھنؤ سے دہلی منت کرتے ہیں۔ ان کے دل کا ایک خانہ محبتوں کو آواز دیتا ہے اور
 لکھنؤ کے لوگوں کے اسیر ہو جاتے ہیں۔ خواہ صنف مخالف ہوں یا ہم جنس ہوں۔

یہاں ہماری کوئی بھلائی ہے۔ وہ پرہیزگاری کی کئی کئی باتوں سے قریب
 آجاتی ہے۔ یہاں محسوس ہوتا ہے کہ اپنے آپ سے عقلی موت نہ بننے کے باعث وہ اس کی
 طرف کھینچنے والی کئی باتوں سے اپنے صاحب بہت ہلکی رہی تاکہ وہ ہم کو گمراہی
 سے بچانے والا تھا اس کے دوستوں سے آشنا کرتا ہے۔ وہ آپ کو اس کی طالب علم ہونے
 سے بچانے کی آرزو میں غصبت کے لیے بہترین ماحول کی تلاش میں۔ صحت کے لیے کئی باتوں
 ہے کہ وہ ترقی پسند تحریک سے متعلق طالب علموں کے گروپ میں آگے اپنے تجربے اور
 نئے واقعات کو جنم دینے کی خواہش رکھنے والے ذہن کے لیے اس سے بچر کئی ماحول
 نہیں ہو سکتا تھا۔ یہاں سے یہ ماحول نظر آیا کہ اپنے جذبات کا کھل کر اظہار کر سکتے
 اسکول کے ماحول میں جو تھکن اور لڑکیوں کی جذباتی نفسیاتی کیفیت جن کا کہ اظہار کئے
 بعدوں نہیں ہو سکتا تھا اس کا بیان جنس کے الفاظ اور کردار کے ذریعہ صاف طریقے پر آتا ہے
 ہے۔ یہاں جنس کی لڑکیوں سے قربت اس کی اندرونی نفسیاتی اچھ کا شاہکار تھی اس کے
 ذہن میں یہ محسوس ہوا تھا کہ لڑکیوں کو لڑکیوں سے عشق کرنا چاہیے۔ حالانکہ اسے
 صاحب سے اس کا عشق حیرتیں چگانے والا تھا اور جو جنس ہی جنسی نہیں رکھتے وہی لڑکی
 پر چہتا تھا۔ اپنی استہنی مس چہن پر عاشق ہونے اسی کا فعل ہو سکتا تھا۔ آخر میں مس چہن کو
 اسکول سے نکال دیا جاتا ہے۔ رسول کامل سے بھی اس کی قربت نفسیاتی و جنسی حرکات کے
 تحت تھی۔ اپنی بھانجی لوری سے اس کے شوہر کے بارے میں کرید کرید مطہرات حاصل
 کرنے سے اسے نفسیاتی و جنسی تسکین حاصل ہوتی ہے۔ گالچ کی سلا پر اسے جنس اور
 مل جاتی ہیں۔ اس گنا ہے جیسے جنس کے ذریعہ صحت چھائی نے موت کی چھائی
 Biological زندگی کے اسرار کی نگاہ کشائی کی ہو اس میں ہے ہاکی ضرور ہے اس
 میں زبان کے چھکارے ضرور ہیں مگر ایک ایسا سرور ہے جس کے بارے میں بھی
 گور کھوری کا خیال ہے کہ یہ ہم مردوں کے تجربے کرنے کی بات نہیں ہے۔ اس کے بارے میں

مسائل زیر بحث لائے جاتے ہیں جو عوامی شعور کی بھڑکی کے تصور کے تحت دیکھنے کے لیے ہیں اور اس اعتبار سے جتنی چیزیں کر کاٹی اور پوندوئی کی سٹاپ طالب علموں اور اساتذہ اور دیگر دانشور لکھیات کے حوالے سے ایسا ہی کیا جا رہا ہے۔ سہاگ پور کے ہلال سکھوں کی ایک رات کا بھی یہ ماحول تھا کہ تعلیم کے لیے لکھن پور ہونے طالب علم عالمی اور ہندوستانی سیاسی معاشرتی حالات پر غور کرتے ہوئے اپنی فکر مندی کا اظہار کرتے ہیں اور انہیں ان دیکھنے کے لیے بہ ممکن ہیں۔

مگر جن کے کردار کی کج عکاسی اس وقت تک ناممکن رہے گی جب تک کہ اس کے عشق کی پوری سیرج کا حال سامنے نہ آ جائے۔ اب تک یہ محض سامنے آئی تھی کہ وہ زمانے میں اس کا ذہن لڑکیوں کی طرف متوجہ ہوتا ہے جس سے وہ ایک گوند لکھن پور جیسی تسکین حاصل کرتی ہے جنہیں اپنی نظرت یا حیا چاہتی ہے کہ اس کے لیے اس مردوں کے قریب آجی تھا۔ مثال کے طور پر اسے رشید سے محبت ہو جاتی ہے مگر وہ محبت ہوا اور الگینڈ فرار ہو گیا پھر کاٹی ہی کے ایک دوسرے صاحب سے وہ محبت کرنا لگی۔ وہ مراد تھے اس لیے ساتھ ختم ہو گیا۔ جب وہ چھٹیوں میں گھر آئی تو ایک بے فائدہ قسم کا کزن اچھا اس کی محبت میں گرفتار ہو گیا۔ ظاہر ہے کہ جن بھی تیر و طرف، اور یہ وہ اپنی زندگی کی خواہش رکھنے والی لڑکی کسی کا ذہنی تھپ کو اپنا نہیں سکتی تھی۔ اب اس کا زندگی میں ایک اور تبدیلی آتی ہے یعنی وہ امریکن کاٹی میں داخلہ لے لیتی ہے جہاں اس کے صدر افتخار کی محبت میں گرفتار ہو جاتی ہے مگر اس کا دار خالی جاتا ہے۔ بلکہ اس کے لیے اسے سوچنے کا مریض اور پروفیسر رحمان مل گئے جن سے دانشورانہ اور دانشورانہ گفتگو اسے آسودگی تو فراہم کرتی ہے مگر وہ آسودگی جو مرد کی بلور شہر قریب سے لے لیتی تھی اس کے اس میں تھپ اپنی جگہ ہوتی ہے۔ وہ کئی ہی لکھن پور چلی اور وہیں لکھن پور کچھ کر اپنانے کی خواہش مند ہو مگر ایک منزل پر ٹھہر جانے کی خواہش بہ طور اس کے

لگتی ہے اور بعد میں لڑ بھڑی کا نکار ہوتی ہے گو کہ اس لڑ بھڑی کا دائرہ شادی اور شادی سے مکمل ہوتا ہے اور مختلف شوہروں سے پیدا ہونے والے لڑکے اور لڑکیوں کے درمیان مطابقت کے علاوہ ان کی نفسیات میں کمی پورا ہونے لگتی ہے۔ ایک نیا کامیاب تعلق نہ ہونے کا علم اور باہر بے مقصد زندگی کا دکھ لہذا یہاں اس مقام پر ضمنی ضمنی نہیں ہے۔ بلکہ اس سے محبت کرتا ہے مگر وہ ہندوستان کی محبت میں اتکا سرشار نہیں ہو سکتا۔ وہ اس کے ایشادوں پر دن اور رات میں چہنچہ گھٹنے بند کی طرح تاج نہیں سکتا۔ اس کا بچہ اس کی کوکھ میں ہے مگر دونوں کے درمیان کشیدگی کا راج ہے۔ وہ حقیقت ضمنی کا اصلی مسئلہ ہے کہ وہ یہ نہیں جانتی کہ اسے کس مقام پر رک جانا ہے بس یہ ہی اس کا ایہ ہے۔ بہت سے متوسط طبقے کی گھٹن زدہ لڑکیاں اپنی اپنی قسمتوں پر شاکر رہ کر اپنی زندگیاں بسر کر رہی ہیں۔ مگر وہ ایک مخصوص ہائی کردار ہے جب ہی تو وہ گلشن کا کردار ہے جہاں کہ عاری کہ محسوس ہو کہ وہ ایک نئے کردار سے متعارف ہو رہا ہے جو اسے انسانی نفسیات کی آگہی بخشنے رہا ہے۔ خواہ وہ جزئیہ کردار ہو یا طریقہ گلشن کا اہم کردار چھٹا نا ضرور ہے۔

بہت سے نگاروں نے سمجھا ہے کہ ضمنی کے پردے میں عصمت چغتائی خود موجود ہیں یعنی یہ خود سوانحی کردار ہے مگر یہ جزوی سچائی ہے۔ عصمت چغتائی بھی ہالی رہی ہیں انہوں نے اپنی راہ خود تراشی ہے۔ آخر میں انہوں نے فن ہونے کے بجائے آگ کے سپرد کیے جانے کی وصیت کی تھی انہوں نے ایک مٹی کی بڑی جرات مندی اور سماج کی تہہ کی پروا نہ کرتے ہوئے ہندو نوجوانوں سے شادی کی تھی۔ انہی باتوں میں وہ ضمنی سے متاثر ہوئی ہیں مگر انہوں نے شاہد لطیف کے ساتھ خوب زندگی گزاری، گلشن بھی ہائی خوب خوب کھلا اور شہرت کمائی جس میں آسودگی کا لہجہ حاضر ہو گا۔ انہوں نے "لوہ لیلیٰ" ۱۹۸۱ء کے شمارے میں "میں اور میرا فن" کے تحت واضح طور پر اپنے فن کی کوکھ لکھی ہے۔

"میں اور میرا فن" کے تحت واضح طور پر اپنے فن کی کوکھ لکھی ہے۔

ہوا ہے۔ میں نے کسی کی باتوں میں جھلی۔ معاشرے کی ایسی بھی
 اور بچے مکتوبوں ہونے کی اور پھر یہ وہ نہ تھی اور نہ لگی ہوگی۔ مگر
 جوت یا مشرقی اگر وہ جوتے کھاتی ہے اور یہاں نہیں کرتی تو اس
 کے زور پر ہم نہیں ملے آتا ہے۔ جوت کو کسوایت کا پورا پورا ہے

یا بھلا ہوگا۔"

میرا اس حد تک نہیں اور مصمت چھائی میں کھانست ہے۔ مصمت چھائی نے
 پستہ ہل میں معاشرتی بھگن، دانشوروں، عجم، اختصار اور معاشی عدم توازن پر طنز سے
 آواز ہے۔ ان کے ان کی ان کے ہول اور ہلانے دونوں میں اپنی مثال ہے۔ تو سوال
 کیا ہے کہ انہوں نے ان کے کردار کی تمام تر کئی اور بیچ کا دفاع کرتے ہوئے اس
 زاویہ سے ان کے حوالے سے بھی نظر کا نگری ہے یہ اختیار کیا ہے؟ میرا خیال ہے ایسا
 نہیں ہے۔ انہوں نے یہ دکھایا ہے کہ اپنے ہاتھ پر معاشرے کی روایات کو ٹھوکر مارتے
 ہیں۔ ان کے ہاں ہاں ہے ہاک اور انساک انہما سے ہے مگر کردار کا یہ ستر بھی ہو سکتا ہے
 بلکہ اس کی جزیں اس کے بچوں کے بیچ سے ماحول میں پھرتے ہیں۔ اگر بچے کو ایسا
 پتہ ہے تو لگا ہوا انت نصیب ہو جائے تو شاید وہ بیچ ہی کھیر نہ بنے۔ جن کو اس نکتہ
 پر لکھ دیکھنے سے اس کی شخصیت کے ہاں ہی میں سرگرم عمل یا فیضان حرکات و سکنات
 پر وہ اپنے ہاں کا سر اٹھا سکتا ہے لیکن اخیر میں یہ نکتہ بھی غلط خاطر رہے کہ جن
 کا اس صورت کا لگی پہلو پیشہ ہے جس کی وہ مصمت چھائی کو ضرور ملنا چاہیے۔

♦♦♦♦♦♦♦♦

پتلا ڈاکٹر میاں مشتاق احمد
 صوبہ خواتین، بیورو خواتین، اسلام آباد

جیل جہاں کے تحقیقی طریقہ و کار کا جائزہ

جیل جہاں کی یکم جولائی ۱۹۳۹ء کو جی گڑھ میں پیدا ہونے والے "سندھ ایجوکیشنل کراچی" کے صاحبزادے انگریزی نائل ایل بی اور اردو میں ایم اے پی ایچ اے کی اور ای لٹ کیا اور اردو ادب کی تحقیق میں ایک نمایاں حیثیت رکھتے ہیں اور ان کی تحقیقات اردو ادب کا سرمایہ ہیں۔ تحقیق میں مقدار کے ساتھ ساتھ سبب کی بڑی حیثیت ہے اس طرح تحقیقی کاوش کی قدر و قیمت کا معین محقق کے طریقہ و کار تحقیق سے لگایا جاتا ہے کہ وہ کام کس قدر حزام و احتیاط سے کیا گیا ہے، محقق کا طریقہ و کار اگر منطقی و معروضی نہ ہو تو وہ بحث و گفتگو کی اہلیت نہیں پاتی۔ جیل جہاں کا طریقہ و تحقیق معروضی، منطقی اور سائنسی انداز لے کر ہے۔ اردو تحقیق میں ایک طرف حافظ محمود شیرانی کی روایت کے لیے ہیں تو دوسری طرف اپنے کام کے حوالے سے دکنی روایت کی مولوی عبدالحق کے ساتھ چلنے رکھنی دیتے ہیں۔ یوں جیل جہاں کی ایک سمت منہ تحقیقی روایت کے لیے ہے۔ انہوں نے اس راہ میں بڑی مشکل پر بندی کا مظاہرہ کیا ہے۔ وہ تحقیقی کام کو جو کچھ کہیں ملے پہنچا دیا ہے انہماک سے سرانجام دیتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ تحقیق کو اپنے موضوع ساتھ مشق کرنا چاہیے اور کچھ شامی نے ساتھ لکھا بیٹھنا چاہیے (۱) اور اردو تحقیق سے اسی ماہیت کا رویہ ہے ان سے "مشق کی گہرا مطالعہ" کا تدوین جیسے محیر العقول کارنامے کرائے۔ جیل جہاں کی کارپوریٹ کام تدوین مشق پر مشتمل ہے۔ اس کی مشق کے علاوہ دو ایچ اے سن شوقی اور دو ایچ اے خرقی کی تدوین اس مشق کی شاخیں ہیں۔ یہ سہولیات کے طرف ان کی اردو تحقیق کے معیار کو بلندی و عظمت عطا کرتے ہیں تو دوسری طرف اردو ادب میں ان کے اضافے کا باعث بنتے ہیں۔ ان کے لیے تحقیق موضوعات کی اہمیت و ضرورت کے لحاظ سے جیل جہاں کے لیے

مطالعہ کی برکت کسی بھی شکل تھی۔ جہاں صاحب نے قہریم کی شعرا کا انتخاب کیا ہے اس کے لیے عربی
 زبان اور عربی کی عربی روایت سے آگاہ ہونا ضروری ہے۔ جہاں صاحب کی مہم سنا ہوا اس وقت تک کہ عربی
 زبان کا انتخاب کیا ہے متعلق ہونا مطلوبات کا مکمل مطالعہ کر لیں۔

مشہور "کہ ہر دو چہم راجا" کی تدوین کا حال بتاتے ہوئے لکھتے ہیں: "اس سزا کا رسم اللہ کا ہے
 یہ سزا کا یہ مطلب ہے کہ اسے چڑھنا تاکہ ایسا شاعر تھا جتنا کہ یہ قہریم کے کسی رسم اللہ کو چاہے کہ عربیہ مطلب
 کی یہ سزا کہ یہ عربی مہم تھی کی یہ عربی خواہش تھی کہ یہ مشہور کی طرف سے عربی چاہے اور یہ شاعر کی عربی چاہے
 میں نے یہ سزا کا یہ مطلب کے بہرے میں کے پاس گھس رہا ہے کہ ہر دو چہم کا عربیہ عربیہ عربیہ عربیہ عربیہ
 بہرے کی مشہور کا مطلب بھی کافی عربیہ عربیہ کے پاس رہا۔ کوشش کی یہ داستان چالیس سال پہلے ہی ہے
 سے اور یہ عربیہ عربیہ عربیہ سے متعلق ہوا۔ عربیہ عربیہ کے مطالعے کی کوشش میں ایک نئے
 عربیہ عربیہ لے گھس لے اے چڑھنے کی کوشش کرتا رہا لیکن کامیابی نہیں ہوئی۔ ایک تو رسم اللہ اور اس کے
 عربیہ عربیہ کے عربیہ لکھتے رہے، کچھ میں نہیں آتے تھے۔ دوسرے زبان اور اس میں استعمال ہونے والے
 زبان عربیہ عربیہ سے بالکل مختلف تھے۔ اچھا سوال کی منتہا کوشش اور حالات کے ساتھ سرکھانے کے بعد
 زبان عربیہ لکھا کہ کسی حد تک اسے چڑھ سکیں۔۔۔ (۲)

مشہور "کہ ہر دو چہم راجا" کی تدوین اور تدوین کا عربیہ عربیہ کا عربیہ عربیہ کے ہاتھوں سر
 باقیہ عربیہ عربیہ پہلے روایت ہو گیا تھا لیکن اس کی تدوین ایک قہریم ہی رہی۔ نصیر الدین ہاشمی اور مشہور
 عربیہ عربیہ عربیہ عربیہ کی کوشش میں اس سلسلے میں کی لوگوں کو ساتھ ہی لیا لیکن ہر ایک
 عربیہ عربیہ عربیہ عربیہ عربیہ عربیہ نے اس کام کی تکمیل کا یہ اظہار کیا۔ اتنی قہریم زبان کو کھنا
 عربیہ عربیہ عربیہ عربیہ عربیہ عربیہ کام نہ تھا۔ جہاں صاحب نے اس میں کچھ بھروسے سے چڑھنا
 عربیہ عربیہ عربیہ عربیہ عربیہ عربیہ کی سبک کا لازمی عربیہ عربیہ عربیہ عربیہ عربیہ عربیہ عربیہ عربیہ عربیہ

کے بعد چالیس صاحب کو ماہرہ کلمات کہتا ہے جانتا ہوں گا (۳) چالیس صاحب نے اس شعر کی تفسیر میں جو
 اصول تحقیق و تدوین کے مطابق کی ہے۔ وہ شعر کا کھل چکی تعارف کرتے ہیں۔ لاہور، ۱۹۵۷ء شہری
 "کدم را کہ چہ مراؤ" کا دنیا میں ایک ہی نسخہ معلوم ہے۔ جو انجمن ترقی داروہ پاکستان کراچی کے کتب خانہ
 خاص میں محفوظ ہے جس کا سائز ۲۰×۱۵×۱۵ انچ ہے۔ یہ نسخہ نسخہ بھی خاص ہے۔ آج کل کے اس
 مکتوبات صاحب ہیں اور آخر میں بھی مشغولی کے کم از کم دو تین مکتوبات کم معلوم ہوتے ہیں اس سے کاتب نے
 نامہ اور سن کتابت کا بھی پتہ نہیں چلا۔ مکتوبات سرخ رو شکاری سے لکھے گئے ہیں۔ مصریوں کے وسط صدی
 مصریوں کے آخر میں یہ نشان (۱) سرخ رو شکاری سے دیا گیا ہے۔ پہلے شعر پر بابا نے اور دہلوی نے ہدایت
 نے اپنے ہاتھ سے "مشغولی کدم را کہ چہ مراؤ"۔ قراد بن کھانی کے مکتوبات لکھے ہیں۔ یہ بھی لکھا ہے
 کہ "۱۲۵۵ھ (یہ سن احمد شاہ "ولی" کی تخت نشینی کا ہے) اور قات ۱۲۸۸ھ تا ۱۳۳۳ھ"۔ ان کے بچے "مہاراج" لکھا ہے۔ اسی شعر پر یہ بھی لکھا ہوا ہے کہ "علاء الدین بن احمد شاہ ۱۲۸۸ھ میں تخت نشینی ۱۳۱۲ھ میں
 وفات پائی۔ احمد شاہ ۱۳۱۲ھ میں علاء الدین ۱۲۶۵ھ تا ۱۲۶۷ھ"۔ صفحہ ۳۶ کے مکتوبات میں سرخ رو شکاری سے کاتب نے
 شعر کا اضافہ کیا ہے جو ماہرہ نے من بہت دشت ہما + پاسے اگر ہیٹ میں لکھا ہے ۱۲۳
 انہوں نے اس مشغولی پر ایک بیسوط مقدمہ بھی تحریر کیا ہے اور اس کے بعد انہوں نے پانچ پہلو
 ایک شعر پر مشغولی کی اصل عبارت کا ٹکس اور دوسرے مکتوبات میں اس پر جدید رسم الخط اور تدوین شہادت
 لکھی ہے تاکہ چڑھنے والا محقق کی دقتوں سے براہ راست آشنا ہو سکے اور جہاں کبھی صحیح کی کوشش ہو
 نشان وہی بھی ہو سکے۔ اور تحقیق میں یہ پہلی مرتبہ ہوا اور مدونہ پیش تحقیق شدہ تفسیر میں لکھا ہے
 ہیں۔ یوں چالیس صاحب کے طریقہ تحقیق سے اور تحقیق کی روایت کو یاد رکھنا اور اصول مطالعہ
 صاحب نے اس کی فرہنگ بھی مرتب کی ہے اور آخر میں وہ طبعی پیش کیے ہیں۔ ایک میں اس کے
 ذکر کیا ہے اور دوسرے میں مشغولی میں مذکور افراد کا تفصیلی تعارف پیش کیا ہے۔ چالیس صاحب نے

نویس۔ اور ہمیں ۳ تھیں، ۲ تھیں، ایک تھی ایک تھی "ہرستا تھوڑی اور ایک تھی قصیدہ و مثال ہیں
اس سے پہلے عمرتی کی محض ۱۰ مشکریاں (علی ہار اور تھوڑی شوق) معلوم تھیں۔ ہائی نے عمرتی کا مہدہ سمجھیں کہا
اس کے دوست انبیا، مطلقاً، عادات اور عادات کا بھی نہ کرہ کرہ ہے اس طرح کل تک محض ایک تھی اور
کے طور پر جانا جائے والا عمرتی نے تعارف کے ساتھ سامنے آیا ہے

"جاریج ادب اور" جمیل ہائی ہی کا نہیں اس مہدہ کا اور تحقیق کاسب سے یہ تحقیق کا سب سے
جس کا ایک ایک جملہ تحقیق کا سونہ ہے اور وہ کام جس کو پورے پورے ادارے تمام تر وسائل کے ہاں
تھیک طرح سے سزا جہاں نہیں دے سکے اسے ایک شخص بلکہ ادب و تحقیق اور کے عاشق نے اس شان سے کر
دیکھا ہے کہ آج ایک جامع جاریج ادب اور زبان کے قاری کو شہر ہے۔ جس میں چالیس صاحب نے محض
لوگوں کی رہتی رہتی ہائی نہیں کہیں بلکہ اصل مخطوطات کا خود مطالعہ کیا ہے۔ تحقیق میں کسی بھی مکتوب اثر
نہیں ہوتا لیکن ہرگز وہی سنائی کی بجائے سخن کو خود کچھ ہے جسے سوان کے مکتوب سے نے جو کچھ
انہوں نے صرف وہی قبول کیا ہے یوں اختلاف کی کلی صورتیں سامنے آئیں مثلاً سراج اللہ علی علی علی علی
جیسے عالم کا محض شخص نے اپنے ہی والد کے بارے میں ملاحظہ ملاحظہ فرماہم کہیں اور ان کی مشورے کا وہ کچھ
بتایا اگر کوئی عام محقق ہوتا تو سرعوب ہو جاتا کہ آرزو جیہا تھوڑا عالم اپنے باپ کے بارے میں لکھ اپنے اس
میں شک کی کیا گنجائش ہے لیکن چاہی تو براہ راست مطالعے کے قاری ہیں۔ جس سے معلوم ہو گیا کہ
کا سرعوب و کام کا "کے عشق کی نہیں بلکہ" منہ ہر وہ حالت" کی داستان ہے۔ وہ "خالی ہاری" کے مطالعے
خود ملاحظہ ثیرانی سے اختلاف کر لیتے ہیں اور پھر کے سال و عادت کے مطالعے میں مولوی مہاں سے اختلاف
لیتے ہیں ان کے وہ معتقد ہیں۔ ان کی جاریج میں اسے تحقیقی مباحث کے درہا ہونے کہ وہ ان کی بارے
میں گی وہ ہلاک اور دستاویز ہی حوالوں کے ذریعے تاریخ تک پہنچتے ہیں جنہوں مطلقاً "ان کے اپنے
رواں سے اختلاف میں سبب قائم کئے ہیں اور اگر خود کوئی نئی بات کہی ہے تو اس کے لیے نئی مکتوب

پہلے ہی کہ ان کے سب سے بڑے معترض رشید مسکن خان کو لگی کہ ان "انہوں نے ملت کی
پہلی جہت کی دہندہ یا غم بگا (۷)

میں پہلی کسی بھی موضوع پر مکمل سواد کی فراہمی ہو سکتی ہے اس پر کام شروع
کئے اور کسی قسم کی جلد بازی ان کی عقلی حراست میں نہیں ہے۔ اس کا مطالعہ مسکن کے مطالعاتی "انہوں نے
پہلی جہت سے پہلے خود کو پہلی طور پر کیا اور اس جاری میں ان کی جہت کی جس کی مثال ادارے والی غم میں
پہلی ہے اور یہی کام ڈاکٹر صاحب کی تحریروں کے مؤثر اور مستر ہونے کی مثال ہے" (۸)

پہلی صاحب نے بیاداری تاخیرات تک خود رسائی حاصل کی اور صرف انہی کے ذاتی مطالعات کی
اپنے عقلی دنیا کی ترتیب دینے انہوں نے بیگزوں کی گرم خوردہ وہ آپ رسیدہ، ناقابل شناخت مخلوقات
خود کیا ہے اور صرف مطلوبہ کتب اور رسائل تک محدود نہیں رہے جس سے ان کے بیانات میں اتنا
پہلی کی تاریخ اور بارہ کے نشانات، احوالوں، کلیات اور اشعار میں سے یہ پہلی ثابت ہوتا ہے
ہم صحیح میں "کلیات کو دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ڈاکٹر صاحب نے ان کی بزرگی میں، مخلوقات
کے لکھال انے ہیں اور جہاں جہتی تحقیق کے لیے کوئی پہلو نہیں چھوڑا" (تاریخ اور ایک
پہلی صاحب نے اپنے آپ کو صرف مطلوبہ کتب اور عقلی نظموں تک محدود نہیں رکھا بلکہ تاریخ
پہلی جہت کے وقت انہوں نے تذکروں اور بیانیوں سے بھی مدد لی ہے اگرچہ رشید مسکن خان نے
خود کے مطالعے کو بڑی کوشش کا نشانہ بنا لیا ہے

ڈاکٹر صاحب کی کتاب کو بی تحقیق، رسائی اور تجزیہ کے آخری مضمون میں پہلی صاحب کی تاریخ
تاریخ کہا ہے۔ دیکھتے ہیں کہ انہوں نے غیر مستر کتابوں کے حوالے دیے ہیں انکی کتابوں
میں سے آپ اس میں (ب) مختلف مضمون کا مقابلہ کر کے مستر مضمون میں نہیں کیا (ج) انہوں
نے ان کے ذہن میں کیا کہ ان کے بیان یا مطالعے سے لیا ہے (د) بیاداری تاخیر پر انحصار نہیں کرتے

دوسری کتابوں سے زیادہ مواد نقل کیا ہے (ن) حافظ محمود شیرانی کے لکھے کہ وہاں ہم کہہ کر گزریں گے جی (اس)
 یعنی نئی کتابوں اور مخطوطوں کے نام بتاتے ہیں اور ان کا بہت تعارف کرتے ہیں کہ اس کتاب میں کون سے کون سے
 نسخے ہیں

رشید حسن خان نے ایک اچھے کام پر مقرر خاندانہ یا بنایا ہے۔ گیان چند نے اس نے اپنی کتب مکتوب
 کا فن "اور" اردو ادب کی تاریخیں "میں رشید حسن کے اعتراضات پر تبصرہ کیا ہے ان کے مطابق اردو ادب
 کے عہد کی کتابوں کا تعلق کا سوال تو اردو ادب کا زیادہ تر ذخیرہ کے دہائی قریب اسرار میں اسرار میں
 ادب کا بہت سا حصہ خراب کرنا پڑے گا اگر بعد کے عہد کے دہائی نے پورے مخطوطات فراہم کی ہیں تو اس کا جواب
 ہے کہ کے بعد انہیں قبول کرنے میں حائل نہیں کرنا چاہیے۔ گیان چند لکھتے ہیں "کتابوں کی سرچشہ کی
 کثرت سے اصل مآخذوں کا سلسلہ وار حوالہ موجود ہے، اہم مآخذ کی بنا پر یہ کہنے پر مجبور ہوں کہ اس قدر لکھی
 تحقیقی کام آؤ اگر جمیل جاہلی کی نظر سے گذرے ہیں اس کے کسی اور سے کسی دیکھنے سے نہیں گذرے گی اس کے
 جتنے مخطوطات میں وہ ادب چکے ہیں اس کا کوئی معاصر معلق نہیں ہو سکا" (۹) خان صاحب کا یہ اعتراض کہ جاہلی
 صاحب شیرانی کے مقلد ہیں تو اس سلسلے میں عرض ہے کہ جاہلی صاحب نے شیرانی سے سب نبوت
 اختلاف بھی کیا ہے "خاق باری" بھی اہم بحث اس کا جامع ثبوت ہے اور اگر بریلیر ضروری بات کا وہی
 شروع کر دیا جائے تو معیار بننے کی بجائے پست ہو جاتا ہے، ویسے ہر قابل بحث مسئلے پر کافی حوالہ
 دیے گئے ہیں۔ رشید حسن کا یہ اعتراض کہ جاہلی نے بہت سی نئی کتب مخطوطوں اور پانچوں کے حوالے
 ہیں اس سے پہلے ان کا نام نہیں سنا۔ تو یہ اعتراض کی بجائے مثنیٰ کا کتب ہے یعنی جاہلی صاحب نے
 کوششوں سے اردو ادب کو نئے حوالے بخشے ہیں رشید حسن خان ان حوالوں سے نا آشنا ہیں کیونکہ وہ
 حوالے صرف اور صرف جاہلی صاحب کی ذاتی ملکیت ہیں مجھے ذاتی طور پر جاہلی صاحب کی ان کتابوں
 سیر کا موقع ملا ہے اور میں نے ان مخزون کا تفصیلی مطالعہ کیا ہے۔ سو یہ رشید حسن کی اردو مخطوطات نگار

تہ ہے کہ پہلی صاحب نے حالات مواد کے لحاظ سے جو ماد اور شان اور کامیابیوں حاصل کی ہیں انہیں

پہلی صاحب اپنی عقلی سطر کا حال میں بتاتے ہیں "ان پر گزشتہ روز کا اور بیٹ کا روز کا ہر لے

کے لیے حقیقت کی جگہ نہ کوئی مددگار نہ کوئی ساتھی۔ ایک ایک کتاب کے لیے مختلف کتب خانوں کے پتھر

تعمیر ہوتے۔ آئی ٹی کے لیے مدد سے مخطوطات پڑھ کر انہوں نے مونا چشمہ پڑھ لیا۔ ہر حال یہ کام ہی

تعمیر ہے ایک فرد کا کام ہے جس نے اسے اپنی انجی سے کیا۔ اس میں کسی کی فرمائش مدد یا سرپرستی شامل

نہیں ہے۔ انہوں نے دوسروں پر انحصار کرنے کی بجائے براہ راست مخطوطات کے مطالعے پر اپنے کام کی

پوری توجہ دی۔ انہوں نے اپنی تاریخ نویسی کی بنیاد دوسروں کی آراء یا اپنی ساری باتوں پر نہیں رکھی بلکہ

اپنی حقیقت پر مبنی تھا۔ کہہ جس بارے میں اصل تاریخی باتوں وغیرہ اپنی آواز سے براہ راست استفادہ کر

نے اور پوری ذمہ داری شعور کے ساتھ کم سے کم لکھوں میں اسے

پہنچا ہے۔ اب آپ کسی ایک شاعر یا مصنف کا ادب کو مطالعہ کرتے ہیں تو پھر دوسرے شاعر یا

مصنف کو اس کے لیے ذہن کو اسے دوسرے سے جدا کرنا پڑتا ہے۔ تاکہ ہر مصنف شاعر یا مصنف آپ

پر اپنی ہی کیفیت کا حصہ بن جاتے ہیں۔ تاریخ لکھتے ہوئے میں نے ہر شاعر و مصنف کے ساتھ اسی

دراپہ دیا ہے جس میں "اللہ کسی عہد کے ساری پس منظر کی وجہ سے جڑا لگاتے ہیں۔ انہوں نے

پہلی بار دوسری بار کی اپنی روایت کا سراغ لگایا ہے جس کی کتابیات کو دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ

انہوں نے گیارہ تالیفوں اور سارے کمال والے ہیں اور اپنی تحقیق کے لیے ممکن حد تک کوئی پہلو تھوڑا نہیں

لگا دیا۔ انہوں نے تحقیق کے عقلی نتائج سے احوال بھی کیا اور دلائل سے نئی حقیقت اور صداقت پہنچنے کی

کوشش کی بلکہ تحقیق کے انتہائی بیانات کا مقابلہ کر کے نتائج مرتب کرتے ہیں۔ "خالق باری بھی انہی کی

تعمیر میں مدد نہیں کی اور آپ پھر انہوں نے انہوں اور مخطوطات سے اس کی شکل بدل کر رکھ دی اور

آج محمود شیرانی جیسے فاضل و جلی کو یہ یاد رکھنا چاہیے کہ شاعر کی اہمیت اس میں ہے کہ "۱۳۱" شاعر حسن خان نے اس پر
 یہ کہتا ہے کہ "۱۳۱" شاعر حسن خان نے اس پر "۱۳۱" شاعر حسن خان نے اس پر "۱۳۱" شاعر حسن خان نے اس پر "۱۳۱" شاعر حسن خان نے اس پر
 پر "۱۳۱" شاعر حسن خان نے اس پر "۱۳۱" شاعر حسن خان نے اس پر "۱۳۱" شاعر حسن خان نے اس پر "۱۳۱" شاعر حسن خان نے اس پر
 کی یہی تاریخوں کا یہ سہارا ہے۔ کتاب کے ہر صفحے پر "۱۳۱" شاعر حسن خان نے اس پر "۱۳۱" شاعر حسن خان نے اس پر
 پڑھنے سے پتا چلتا ہے کہ "۱۳۱" شاعر حسن خان نے اس پر "۱۳۱" شاعر حسن خان نے اس پر "۱۳۱" شاعر حسن خان نے اس پر
 کار کی نظر سے نہیں۔ رشید حسن خان نے کتاب کے ہر صفحے کے نیچے دیے ہوئے حوالہ جات میں "۱۳۱" شاعر حسن خان نے اس پر
 قلم کی سب سے "۱۳۱" شاعر حسن خان نے اس پر "۱۳۱" شاعر حسن خان نے اس پر "۱۳۱" شاعر حسن خان نے اس پر
 نے غیر مستحضر ہونے کی وجہ سے "۱۳۱" شاعر حسن خان نے اس پر "۱۳۱" شاعر حسن خان نے اس پر "۱۳۱" شاعر حسن خان نے اس پر
 بارے میں کیا یہ چند لکھتے ہیں: "اگر ہوشِ اصلی مانتا تو کچھ کرنا سکتے۔ بے جا کچھ تو سوال پھر میں ہی سکتے
 زیادہ لکھتے نہیں نہ ہوگا۔ اگر محفلِ ہم عصر یا قریب العصر راوی کے بیان پر مصراہ کیا جائے تو تو اسے اسب بڑھنے
 کسی بھی ادب کا حصہ ہے۔ ابتدائی حصہ خارج کر دیا ہوگا۔ کیا "راما کی" "سہا بھارت" "کلی ہیں" کی
 تصانیف، بھواری "ایڈیٹ" "کولہ کی" "کولہ دوسرے" "یونانی شاہکاروں کے قریب العصر نے موجود ہیں۔ میں نے
 قدیم ترین نسخے مصحف سے کئی صدی بعد کے ہیں کیا نہیں صرف نظر قرار دیا جائے۔۔۔ جہاں نے یہ امور
 سے "۱۳۱" شاعر حسن خان نے اس پر "۱۳۱" شاعر حسن خان نے اس پر "۱۳۱" شاعر حسن خان نے اس پر "۱۳۱" شاعر حسن خان نے اس پر
 طرح متفرق ذرائع سے فراہم ہوئی ہیں۔ اگر عبدالعزیز کی تحقیق میں کران کو ماننے سے انکار کر دینے تو
 نزل کوئی کی تاریخ سے ان سب شعرا کو خارج کر دینا ہوگا کیوں صاحب؟ نکالی کی "کدم ہلا پڑھلا کے
 بارے میں کیا خیال ہے؟ یہ بھی تو ایک عجیب و غریب نام، ناقص نظر میں ہوا ناقص نظر میں ہوا ناقص نظر میں ہوا ناقص
 کاتب اور زمانے کا علم نہیں۔ اس کے شاعر نکالی کا کہیں حوالہ نہیں دیا۔ یہ مثنوی گجراتی میں لکھی ہے۔

پہلی اس کا نام ہی معلوم نہیں۔ کیا اسے غیر مستقر قراءتوں سے کراس کی طرف سے آنکھوں سے لیا گیا اور ادب دہلی
 حقیقی کی ذریعہ منت ہوگی ایسے ممکن ہے کہ جہاں نے یہ مضمون سے جو لوگوں نے ادب کے ہیں۔ ان میں سے
 پہلی مستقر ہوں۔ لیکن ان کی زبان کے معیار کو دیکھ کر انہیں غیر مستقر قرار دینے سے پہلے اس کا نام کے مطابق
 پہلے نام کے مطابقت کے حوالے دیے ہیں لیکن رشید حسن خان اعجازی کہتے ہیں کہ جہاں نے حوالہ
 دیا ہے وہ ہے لیکن بتایا کہ انہوں نے کتاب کے کس ایڈیشن سے کام لیا ہے؟ بہت سے مقامات پر یہ نہیں
 معلوم کیا انہوں نے کتاب کے کس ایڈیشن سے کام لیا ہے اور یہ کہ وہ قائل اس کا ہے؟ لیکن اس کا خلاف
 ہے ان کا کیا ادب ہے اس کے جواب میں کہیں چند لکھتے ہیں: "رشید حسن خان کا یہ مطالبہ بڑی حد تک
 صاحب نے کوسنے ادب کرتے وقت یہ حوالہ دیا جائے کہ یہ کس ایڈیشن سے لے کے ہیں لیکن سوئی
 میں سو فی صد یہ ضروری نہیں اگر ایسا کیا گیا تو ہر نسخے کے لٹ نوٹ میں حوالوں کا ایک گلی دست (یا خار
 ہوا) دیا جائے گا۔ یہ بھی ضروری نہیں سمجھا کہ کسی ایسی ادب کی تحقیق کا کوئی نمونہ دینے سے پہلے اس کے
 صفحے دیکھ کر تو وہی نسخے کی مندرجہ قطع کی جائیں۔ اگر ایسا کرنا لازم گردانا جائے تو پانچ نسخوں کا ایک
 نسخہ لیجئے میں پانچ ماہوں کا رہوں گے۔ مگر ادب کو چاہیے کہ کوسنے ادب کرتے وقت کسی ایڈیشن سے
 جاننا ہوتا ہے کہ اس کا پڑھنا نہیں کہ وہ ہر قسم کو ادب کرنے سے پہلے اس کے خالق کے جملہ خطوطوں
 پر جانیں کہ کوسنے کسی غیر مطبوعہ متن کے ہیں ان کے باغی لکھے کا حوالہ دیا ضروری ہے۔ لیکن
 ترجموں کے سلسلے میں آٹھ کا حوالہ نظر انداز کر دیا جائے تو کوئی ملاحظہ نہیں" (۱۵) رشید حسن خان کا ایک
 حوالہ یہ بھی ہے کہ "حقیق کے خط و فکر سے قابل قبول اور ناقابل قبول آٹھ میں امتیاز نہیں کیا اور دونوں
 آٹھ کے آٹھ سے الگ ہی اواز سے استناد کیا ہے" (۱۶) "مگر ادب اعداد" حقیقی و تنقید کا ایک مہم
 ان کا ادب ہے جہاں صاحب کہتے ہیں: "حقیق" میں ہر اسٹک ہاگرا سے منسلک کہا جاسکتا ہے تو یہ ہے
 لیکن اس حقیق میں ادبی آٹھ تک خود کو سمجھیں دیکھا جگہ غیر ادبی آٹھ پر بھی جاری تو ہوا دیتا ہوں۔

ہاں کہ حقیقت کا سراغ نہ ملے۔ میں یہاں ایک مثال دیتا ہوں تاکہ اردو ادبی میں مصحفی نے لکھا ہے کہ سب مہم
 کو شاد میں وہی آگے کا بیان دہلی پہنچا تو اس کی فزائیس ہونے کی زبان ہاں ہی ہو گئی اور لوگ دلی کے
 رخصتے آگے کوہوں میں پڑھنے لگے۔ کام کرتے ہوئے تمس بھا اٹھا کہ یہ کہے ممکن ہے کہ وہ بیان دہلی پہنچا تو
 پہنچے اور وہ آگے کی طرح آگے کوہوں میں پہنچا جائے اس کا جواب کسی نہ کرے اس کی اور بیان اس کی دہلی
 ہوالے میں نہیں ملا۔ اتفاق سے اسی زمانے میں مرزا احمد حسین قلعی کی تصنیف "تاریخ تہذیب و ثقافت" میں
 میں قلعی نے ایک جگہ لکھا تھا کہ کاسمہ ہولی کے زمانے میں، فٹے کی حالت میں، گلستان، پورکان اور دلی کے
 رخصتے پڑھتے ہوئے آگے کوہوں سے گزرتے تھے۔ تذکروں میں صرف مصحفی نے شاد عاتم کے حوالے سے
 بات لکھی تھی جس کی تصدیق ایک غیر ادبی ماخذ سے ہوئی تو یہ طریقہ کار تحقیق کے لیے مفید بھی ہے اور حصار
 بھی" (۱۷) تحقیق میں سبک اور طریق کار کے بارے میں ڈاکٹر گوہر نوشاہی کا نظریہ ہے جو نے اردو
 حسن خان کا یہ اعتراض کہ قابل قبول اور ناقابل قبول ماخذ میں امتیاز نہیں کیا بغیر مستعد ہے۔ جاہلی صاحب کے
 اس بیان سے یہ چیز صاف واضح ہو جاتی ہے کہ انہوں نے قابل قبول اور ناقابل قبول ماخذ میں امتیاز نہیں کیا
 نہیں کیا۔ اگر اصلی ماخذ کو دیکھ کر حوالے دیں تو قبول کیاں چند: "اگر بیٹا اصلی ماخذ کو دیکھ کر حوالے دے
 جائیں تو سال بھر میں وہی سلسلے سے زیادہ لکھنا ممکن نہ ہو گا" (۱۸) اگر رشید حسن خان جاہلی صاحب کا دعویٰ
 پڑھ لیتے تو ان پر یہ بات واضح ہو جاتی کہ انہوں نے قابل قبول اور ناقابل قبول ماخذ میں امتیاز نہیں کیا
 اسلوبیاتی تجربہ

جاہلی صاحب لکھتے ہیں: "اردو شاعری پر سب سے پہلا اور گہرا اثر ہندوی روایت اور اسلوب
 ہے جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ اردو شاعری نے صرف و محض فارسی زبان و ادب اور اسلامی اثرات کا پہلا اور
 روایت و فکر کو نظر انداز کیا، بھول جاتے ہیں کہ اردو زبان و ادب پر پچھلی صدی ہجری سے لے کر دہلی
 ہجری تک ہندوی روایت ہی کی حکمرانی رہتی ہے۔ اردو شاعری کی پہلی روایت خالص ہندوی اسلوب و

یہاں پہلی ہے اور بعد حصول کے اسی رنگ کو قبول کرتی ہے اور اس سے وہ عظیم میں خاصی سمجھیں، چنگی کمال اور
 یہی پہلی اہل میں رہی تھا (۱۹۲۰ء) پہلی صاحب نے اور زبان و ادب کے ارتقا کی داستان کو ایک ایسے
 نثر کی حیثیت سے بیان کیا ہے جو زبانوں کی نشوونما کے اصولوں سے واقف ہے۔ جو تاریخ کے مد و جزر
 سے آگاہ ہے، جسے تہذیب و ثقافت اور اس کے ارتقا پر سے پوری آگاہی ہے اور اسے یہ معلوم ہے کہ زبان کا عربی
 عادت اور اصول کی تبدیلی سے کس طرح اپنا رخ بدلا ہے۔ انہوں نے تاریخ لکھنے کا کام کسی کی فرمائش پر
 نہیں کیا بلکہ انہوں نے خود اپنی مرضی سے خطوط بدل سے کیا ہے۔ ان کے اسلوب میں ہندو کی کرنی اور احساس
 اس میں پایا جاتا ہے۔ مد و یاسر یعنی گوہر نظر نہیں رکھا بلکہ اپنے سچے ہند ہے اور صداقت ہے۔ اسے اسلوب
 یہ وہاں اور مفرد ہے۔ ان کا لب و لہجہ دہلوی ہے ان کی تحریر میں دہلوی رنگ پایا جاتا ہے جو دوسرے
 طبقوں سے ظہور کرتا ہے انہوں نے عام بول چال کی زبان استعمال کی ہے اور شاعرانہ آہنگ سے تحریر کو رنگین
 نہیں کیا بلکہ سادگی کو پیش نظر رکھا ہے وہ خود لکھتے ہیں: "اسی اسلوب جو آئینے کی طرح صاف و شفاف ہو،
 میں لکھتا ہوں اور عام بول چال کی زبان سے قریب ہوتے ہوئے، میں نے رنگین شاعرانہ اسلوب سے حتی
 اتنا ہی چھلپا ہے تاکہ اسلوب کی رنگین اصل تاریخ کو برونہ کر دے۔ جہاں بے ضرورت کاری و عربی
 لگا کر دیا ہے وہی سب ضرورت سے انہی فنون کا استعمال بھی کیا ہے اور کہیں عربی و فارسی لفظوں میں
 نفاذ و صف استعمال کر کے روایت کے لٹن اور آہنگ کو ابھارا ہے تاکہ نہ مٹے وہاں، شاعری کے آہنگ کی
 لٹن کے ان سے بھی لطف اندوز ہو سکے اور یہ نثر ایسی ہو جو ادبی تاریخ کے مزاج سے پوری مطابقت رکھتی
 ہو اور ان کا اسلوب لکھتے ہو چہیت سے مد اور جامع ہے انہوں نے اپنی تحریر میں سلاست اور روانی کو بہت
 اہمیت ہے۔ ان میں ادب کی اخلاقی حیثیت کا احساس رکھا ہے اور زبان کے مصرعی تقاضوں کو نظروں سے
 نہ گھٹا کر دیا۔ ان کی تحریر ایک سلیبے ہوئے انسان کی نظر اوریت کا ثبوت دیتی ہے۔ ان کے انداز بیان
 کو ایک دم صبر کا ثبوت دیتی ہے کم سے کم لفظوں میں بات کہہ جاتے ہیں۔ بے جا تکرار اور بحث سے

اعتقاد کرتے ہیں۔ اس میں تو اس پر پورا جاتا ہے وہ تو ان کا مسلح اور کوشش ہے کہ چاہتے ہیں اس کے میں
میں کچھ ہائے اور اصل مطلب کو قبول جائے اور نہ ہی ان کا امان ہے کہ ہر بات کو نکت کے لیے نکت کا سہارا
جائے وہ میں کہتے ہیں کہ "میں نے ایک ایسا اسلوب دریافت کیا ہے جو ادب کی فہمیں تھیوری میں تاریخ
کے لیے شاید نہایت سوزوں ہے" (۲۱)

جہاں صاحب نے میر کے تذکرے میں ایک نئی اصطلاح استعمال کی ہے "تھیوری" یہ اصطلاح
کے حوالے کی قبول اور عدم کامی (۲۲) کے سنجے کا اس ہے اور یہ تھیوری اور تحقیق ایک ایک نکتوں میں
ہوتی ہیں ان کا بخوار سے کاشانی عمل بھی، اگر کوئی تھیوری نکتی کی مدد کے وہ بنیادی انکشافات کے بغیر تھیوری ہے
اور نکتہ جہاں کے ہاں یہ دونوں نکتوں آپس میں حسن سلوک کی بہترین مثال ہیں۔ اس لیے ہمیں تھیوری
کو بلا کر "تھیوری" کی اصطلاح ہٹانی ہے۔ ان کا اعداد بیان سادہ ہونے کے ساتھ ساتھ ادبی اور مطالقی
ہے۔ ان کے اسلوب کے بارے میں مشتاق فرید لکھتے ہیں: "اور وہ میں ایک سے ایک صاحب مرزا
موجود ہیں۔ لیکن وہ طرز کیا ہے جسے ہم غیر ضروری آرائشوں سے پاک کہ سکتے ہیں۔۔۔ مولیٰ میرا
پھر ان کے سید سے لیکن ہر کار طریقے سے بات کہنے کا جو رنگ نکلا تھا میر نے ان کی
قریوں کے لیے اس سے بہتر اسلوب نہیں ہو سکتا۔ نکتہ جہاں نے اسی طرز سخن کو ان کے ہر جملے
کی تقریروں میں حیداری ہے ابہام نہیں بلکہ انہیں ایک وقت نکتی باتیں کہنے کا طریقہ ہے۔ جہاں
تقریروں میں صورت پائی جاتی ہے وہ ایسے الفاظ استعمال نہیں کرتے جن کو سمجھنے میں گھٹنے کی ضرورت ہو
خیالات کو علامتوں میں تصور کر دیا جائے۔ جہاں جو کہتے ہیں بلا تکلف کہ جاتے ہیں ان کی تقریریں
اور حیداری ہے لیکن خیالات کو کہیں اور علامتوں میں مقید کرنے کا رجحان نہیں ہے ان کا انداز
اور تقریر واضح تصورات سے واضح نکتہ کی طرف سڑکتی ہے۔ انہوں نے ادبی تاریخوں کی مثالیں
استعمال کیے ہیں۔ جو اس سے پہلے اس طرح کبھی نہیں ہوئے ہیں۔ وہ کسی اور صاحب ہر

تجربہ کے سوا کسی سے قلم نہیں مگر اور معاشرتی حالات اور سماجی ماحول کو سامنے رکھ کر اس دور کے ادیب اور
 ان کی روایت کا مطالعہ کرتے ہیں اس میں تحقیق سے بچے اور ہر سہ تحقیق کو تلاش کرتے ہیں۔ ان کے
 ادیب کی تسلسل پڑا ہوا ہے۔ وہ لکھتے ہیں: "زیادہ سے زیادہ بات کو کم سے کم لفظوں میں صفائی کے ساتھ
 بیان کیا ہے جس سے ایک ایسا طرز اور اساتذہ آیا ہے جو آئینے کی طرح صاف ہے اور تاریخی ادیب و تنقید کے
 لیے طرز اور ایک نمونہ بن گیا ہے آپ اسے ایک مربوط ماحول کی طرح دیکھ سکتے ہیں، تسلسل بیان اس کی
 یہ روایت ہے" (۲۳)

حوالہ جات

۱۔ اصغر علی عقیق در سلطان بخش، جلد اول، مضمون: میٹل چالی، مکتبہ ترقی زبان، اسلام آباد، ۱۹
 ۲۔ اصغر علی عقیق در سلطان بخش، جلد اول، مضمون: میٹل چالی، مکتبہ ترقی زبان، اسلام آباد، ۱۹۹۳، ص ۹۵
 ۳۔ میٹل چالی ایک مطالعہ مرتبہ گویند شاہی، جلد اول، ۱۹۹۳، ص ۲۳۹
 ۴۔ اصغر علی عقیق در سلطان بخش، ص ۹۳
 ۵۔ عقیق کو مہراؤ مہراؤ، ص ۲۵۲
 ۶۔ میٹل چالی ایک مطالعہ، مضمون: مشفق قزوینی، ص ۳۷
 ۷۔ اصغر علی عقیق در سلطان بخش، جلد اول، مضمون: میٹل چالی، مکتبہ ترقی زبان، اسلام آباد، ۱۹۹۳، ص ۲۳۹
 ۸۔ اصغر علی عقیق در سلطان بخش، جلد اول، مضمون: میٹل چالی، مکتبہ ترقی زبان، اسلام آباد، ۱۹۹۳، ص ۲۳۹
 ۹۔ اصغر علی عقیق در سلطان بخش، جلد اول، مضمون: میٹل چالی، مکتبہ ترقی زبان، اسلام آباد، ۱۹۹۳، ص ۲۳۹
 ۱۰۔ اصغر علی عقیق در سلطان بخش، جلد اول، مضمون: میٹل چالی، مکتبہ ترقی زبان، اسلام آباد، ۱۹۹۳، ص ۲۳۹

۱۳۔ ادبی تحقیق، سماج اور ادب، نئی دہلی، ۱۹۷۷ء، ۱۹۷۸ء، ۱۹۷۹ء
 ۱۴۔ ادب کی تاریخ اور ادب کی ترقی، نئی دہلی، ۱۹۷۷ء، ۱۹۷۸ء، ۱۹۷۹ء
 ۱۵۔ ایضاً

۱۶۔ ادبی تحقیق، سماج اور ادب، نئی دہلی، ۱۹۷۷ء

۱۷۔ ادب کی تاریخ اور ادب کی ترقی، نئی دہلی، ۱۹۷۷ء، ۱۹۷۸ء، ۱۹۷۹ء

۱۸۔ ایضاً، ۱۹۷۹ء

۱۹۔ ناول، ۱۰، ۱۹۷۷ء

۲۰۔ "ادب کی تاریخ اور ادب کی ترقی" (جلد دوم) (پیش کشی، نئی دہلی، ۱۹۷۷ء)

۲۱۔ ایضاً، ۱۹۷۷ء

۲۲۔ ادبی تحقیق اور ادب کی ترقی، نئی دہلی، ۱۹۷۷ء

۲۳۔ تحقیق اور ادب کی ترقی، نئی دہلی، ۱۹۷۷ء

۲۴۔ ناول، ۱۰، ۱۹۷۷ء

کتابیات

(الف)۔ نئی دہلی، نئی دہلی، (ادب کی تاریخ اور ادب کی ترقی)

۱۔ ادب کی تاریخ اور ادب کی ترقی، نئی دہلی، ۱۹۷۷ء

۲۔ ادبی تحقیق اور ادب کی ترقی، نئی دہلی، ۱۹۷۷ء

۳۔ ادب کی تاریخ اور ادب کی ترقی، نئی دہلی، ۱۹۷۷ء

۴۔ ادب کی تاریخ اور ادب کی ترقی، نئی دہلی، ۱۹۷۷ء

۵۔ ادب کی تاریخ اور ادب کی ترقی، نئی دہلی، ۱۹۷۷ء

- ۱۔ انتہائی بھر (سنہ ۱۹۸۷ء) پبلشنگ کمپنی لاہور، کراچی، ۱۹۸۷ء۔
- ۲۔ انتہائی بھر (سنہ ۱۹۸۷ء) پبلشنگ کمپنی لاہور، کراچی، ۱۹۸۷ء۔
- ۳۔ انتہائی بھر (سنہ ۱۹۸۷ء) پبلشنگ کمپنی لاہور، کراچی، ۱۹۸۷ء۔
- ۴۔ انتہائی بھر (سنہ ۱۹۸۷ء) پبلشنگ کمپنی لاہور، کراچی، ۱۹۸۷ء۔
- ۵۔ انتہائی بھر (سنہ ۱۹۸۷ء) پبلشنگ کمپنی لاہور، کراچی، ۱۹۸۷ء۔
- ۶۔ انتہائی بھر (سنہ ۱۹۸۷ء) پبلشنگ کمپنی لاہور، کراچی، ۱۹۸۷ء۔
- ۷۔ انتہائی بھر (سنہ ۱۹۸۷ء) پبلشنگ کمپنی لاہور، کراچی، ۱۹۸۷ء۔
- ۸۔ انتہائی بھر (سنہ ۱۹۸۷ء) پبلشنگ کمپنی لاہور، کراچی، ۱۹۸۷ء۔
- ۹۔ انتہائی بھر (سنہ ۱۹۸۷ء) پبلشنگ کمپنی لاہور، کراچی، ۱۹۸۷ء۔
- ۱۰۔ انتہائی بھر (سنہ ۱۹۸۷ء) پبلشنگ کمپنی لاہور، کراچی، ۱۹۸۷ء۔
- ۱۱۔ انتہائی بھر (سنہ ۱۹۸۷ء) پبلشنگ کمپنی لاہور، کراچی، ۱۹۸۷ء۔
- ۱۲۔ انتہائی بھر (سنہ ۱۹۸۷ء) پبلشنگ کمپنی لاہور، کراچی، ۱۹۸۷ء۔
- ۱۳۔ انتہائی بھر (سنہ ۱۹۸۷ء) پبلشنگ کمپنی لاہور، کراچی، ۱۹۸۷ء۔
- ۱۴۔ انتہائی بھر (سنہ ۱۹۸۷ء) پبلشنگ کمپنی لاہور، کراچی، ۱۹۸۷ء۔
- ۱۵۔ انتہائی بھر (سنہ ۱۹۸۷ء) پبلشنگ کمپنی لاہور، کراچی، ۱۹۸۷ء۔
- ۱۶۔ انتہائی بھر (سنہ ۱۹۸۷ء) پبلشنگ کمپنی لاہور، کراچی، ۱۹۸۷ء۔
- ۱۷۔ انتہائی بھر (سنہ ۱۹۸۷ء) پبلشنگ کمپنی لاہور، کراچی، ۱۹۸۷ء۔
- ۱۸۔ انتہائی بھر (سنہ ۱۹۸۷ء) پبلشنگ کمپنی لاہور، کراچی، ۱۹۸۷ء۔
- ۱۹۔ انتہائی بھر (سنہ ۱۹۸۷ء) پبلشنگ کمپنی لاہور، کراچی، ۱۹۸۷ء۔
- ۲۰۔ انتہائی بھر (سنہ ۱۹۸۷ء) پبلشنگ کمپنی لاہور، کراچی، ۱۹۸۷ء۔

۲۵۔ نئی تھیوہ سائیکس پیکو کنفیڈریشن، ۱۹۸۵ء

۲۶۔ Pakistan Culture, National Book Foundation Islamabad 1988

(ب) نوبل کتب

- ۱۔ ادنیٰ تحقیق سائیکس پیکو رپورٹ، رشید مسیحی، سائیکس پیکو کونسل، کراچی، ۱۹۷۹ء
- ۲۔ نوبل کتب کی مختصر تاریخ، دائرہ معارف، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد، ۱۹۹۱ء
- ۳۔ اردو زبان کی قدیم تاریخ، سید امین الحق، قومی ادارہ، سندھ، سیرج سٹریٹ، لاہور، ۱۹۷۲ء
- ۴۔ اردو کی ادب تاریخیں، گیان چند، ایگن ترقی ادب، کراچی، ۲۰۰۸ء
- ۵۔ اردو کی ادبی تاریخ، علیہ خان، مرکزی پبلسنگز، لاہور، ۱۹۹۹ء
- ۶۔ ادب سے ماہو ملی ماہو، ایگن ترقی ادب، لاہور، ۱۹۷۱ء
- ۷۔ تحقیق کاغذ، گیان چند، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد، ۱۹۹۲ء
- ۸۔ نیشنل پبلسنگز، سماجی کتابیات، نسیم، طالب، سعید، نیشنل پبلسنگز، لاہور، ۱۹۸۸ء
- ۹۔ نیشنل پبلسنگز، ایک مطالعہ، گوپال، نیشنل پبلسنگز، لاہور، ۱۹۹۳ء
- ۱۰۔ ملی گزشتہ تاریخ، نوبل اردو، اشعار، اسلام، سعید، نیشنل پبلسنگز، لاہور، ۱۹۷۲ء
- ۱۱۔ گلبرگ، سعید، حکیم، مہدی، نیشنل پبلسنگز، لاہور، ۱۹۵۱ء

(ج) رسائل

- ۱۔ اوراق لاہور، شمارہ نمبر ۲، ۱۹۶۷ء
- ۲۔ ادب دست لاہور، شمارہ نمبر ۳، ۱۹۹۵ء

امیر آرکانی

آرکانی کے چار حکام اور باکمال شاموں میں نصف حصہ امیر آرکانی کو ایک
 ہاں حکام حاصل ہے۔ پہلی بار کے خانوں شعراء میں نصف حصہ اقتدار اور رہا ہالی
 یہ سب وہیں کر رہے ہیں۔ دکن کی ایک اور خانوں شاموں کا حکم شوق جو اصل
 یہاں کی حکم حکم میں اپنی طرف سے اور ان میں نہایت مشہور تھیں۔ ان کے گئے چے
 خانوں شعراء میں امیر آرکانی ہیئت شاموں اور ترنگہ غیر معمولی ہیئت کی تاریخ ماہ ہے
 نصف حکم امیر آرکانی کے ایک شاہی اور طبعی گمراہی کی اصلاحیت تھی اور شاموں
 تھی۔ ان کی جہت سے ان محققین نے ۱۳۳۰ء تا ۱۳۳۲ء بتائی ہے۔ امیر کی شہری کنسی
 بن کر رہی ہے یہ خان شعراء جنگ دہلی سے ہوئی تھی۔ ان کے شہر کا سال وقات
 ماہ طہران بند کر کے سلاطین ۱۲۶۶ء تا ۱۲۶۹ء ہے۔ امیر کی کج تاریخ کا وقت کا
 کہ وہ جنگی ہیں۔ ان کے حکم کی داخلی شہادتوں سے یہ پتا ہے کہ وہ ۱۲۸۹ء تک
 رہتے ہیں اور ان کی آخری صفت "محققین شہادتوں" ۱۲۸۹ء کی تصدیق ہے۔ امیر
 کے شہر تک بہادر نواب حکیم بہادر کے متعلق خان زہد پہلی اور نواب اور زہد ہیں
 کہ ان کے پڑتے تھے۔ (۱)

امیر کے بہادر میں تاریخ شاہ اور سلیمان شاہ کے اساتذہ گرامی بھی شامل ہیں
 اور ان میں کمال ہے۔ امیر کے والد حاجی نجف علی خان انھیں پہلے (۲) کثیر
 ہیں۔ ان کے بڑے صاحب زادے امیر الدولہ بہادر اور دوسرے قادر علی خان
 اور دیگر کثیر (۳) تھے۔ امیر نے اپنے کام میں اپنی ایک بیٹی کا بھی تذکرہ
 کیا اور ان حکام میں بھی خان بہادر دولت جنگ امیر الگ راج الدولہ سے منسوب

ہر ایک مرض کے درمیان خوب تر
 لیکن زید تھا بلکہ زہر لگ
 وہ خیران کا تصور سازی کرے
 لیکن دلوں جاہ تھے وہ کامیاب
 ہر ایک مہل پہ پہل تھا ہر جا تھا
 مثنوی "گلشن شہدائے"

کا گھنٹی لٹریچر (Oriental Moana cript library) مسجد آباد میں کھول
 ہے۔ ۱۳۹۹ء اشعار پر مشتمل یہ مثنوی "گلشن شہدائے" کی تصنیف کے ۱۱ سال بعد
 ۱۳۹۹ء میں لکھی گئی۔ اس مثنوی میں علامہ نے اطلاع دی ہے کہ یہ تصنیف نواب صاحب
 جنگ اول دہلی مسجد آباد کی ایک مزیدہ کی فرمائش پر لکھی گئی تھی۔ جن کی نوابان اشعار
 سے مہل رشک داری تھی۔

مولوی سعادت مرزا اس مثنوی کے قصے پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں کہ
 کی طرف اشارہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ

"یہ مثنوی دراصل عدیہ مثنوی "دیوانے عشق" میر تقی میر کا پات ہے۔ جن
 کا اخذ انار سے خیال میں کوئی دہلی قصہ معلوم ہوتا ہے۔ جس کو شاہ شہاب دہلی ایک ہفت
 نے بھی میر تقی میر سے بہت پہلے لکھا تھا۔ (۱)

مثنوی "گلشن شہدائے"

خان بہادر عبدالصمد خان ماہر (جن کی تصویر مولانا زیدی نے لکھی ہے) سے
 موجود ہے) کی دکان کو تحفہ سطا کی گئی تھی۔

مثنوی "گلشن شہدائے" کا مخطوط (Great Manuscript Library)

آباد کا مفروضہ ہے۔ سعادت مرزا کی اطلاع کے مطابق یہ وہی مہل ہے جو علامہ نے
 بہادر عبدالواسع خان کی شادی کے موقع پر دہلی کی روایتی میں لکھی ہے۔

۱۷۱۱ء (۱۷۱۱ء) نے بیوہ شہزادہ حکیم کو قتل دیا تھا۔ مہاراج خان کی شادی نواب علی
 شاہ بہار اعظم بہار پرنس آف آنگلٹ کی صاحب زادی کے ساتھ ۱۷۸۳ء میں ہوئی تھی۔
 بیوہ شہزادہ علی شاہ نے قتل دیا ہے جس سے ۱۷۸۳ء کے بعد برآمد ہوئے ہیں۔

۱۷۸۳ = ۳ + ۱۷۸۱

۱۷۸۳ء میں نواب علی شاہ نے قتل دیا ہے۔

- ۱۷۸۱ء میں نواب علی شاہ نے قتل دیا ہے۔
- ۱۷۸۰ء میں نواب علی شاہ نے قتل دیا ہے۔
- ۱۷۷۹ء میں نواب علی شاہ نے قتل دیا ہے۔
- ۱۷۷۸ء میں نواب علی شاہ نے قتل دیا ہے۔
- ۱۷۷۷ء میں نواب علی شاہ نے قتل دیا ہے۔
- ۱۷۷۶ء میں نواب علی شاہ نے قتل دیا ہے۔
- ۱۷۷۵ء میں نواب علی شاہ نے قتل دیا ہے۔
- ۱۷۷۴ء میں نواب علی شاہ نے قتل دیا ہے۔
- ۱۷۷۳ء میں نواب علی شاہ نے قتل دیا ہے۔
- ۱۷۷۲ء میں نواب علی شاہ نے قتل دیا ہے۔
- ۱۷۷۱ء میں نواب علی شاہ نے قتل دیا ہے۔
- ۱۷۷۰ء میں نواب علی شاہ نے قتل دیا ہے۔
- ۱۷۶۹ء میں نواب علی شاہ نے قتل دیا ہے۔
- ۱۷۶۸ء میں نواب علی شاہ نے قتل دیا ہے۔
- ۱۷۶۷ء میں نواب علی شاہ نے قتل دیا ہے۔
- ۱۷۶۶ء میں نواب علی شاہ نے قتل دیا ہے۔
- ۱۷۶۵ء میں نواب علی شاہ نے قتل دیا ہے۔
- ۱۷۶۴ء میں نواب علی شاہ نے قتل دیا ہے۔
- ۱۷۶۳ء میں نواب علی شاہ نے قتل دیا ہے۔
- ۱۷۶۲ء میں نواب علی شاہ نے قتل دیا ہے۔

(۱۳) داستان لعل بادشاہ جہاں ضرب کو بھڑک کے ضرب کلاہ پانے کے بیان میں

۱۳

(۱۵) داستان لیروز شاہ سلطان لیرندہ وال سے عرش حال کر کے جہاں ضرب کی نسبت لعل بادشاہ سے تعلق (مورد پر) کرنے کے بیان میں

۱۵

(۱۶) داستان جہاں ضرب تبار پر جہاں سے اسے کے اور غالب پر فتح پانے کے بیان میں

۱۶

(۱۷) داستان روح افزا پر داہرہ عاشق ہونے کے بیان میں

۱۷

(۱۸) داستان لعل بادشاہ تصویب روح افزا کی جہاں لکھنؤ کی معرفت سے حاصل کرنے کے بیان میں

۱۸

(۱۹) داستان روح افزا کی نسبت داہرہ سے تقرر پانے کے بیان میں

۱۹

(۲۰) داستان بادشاہ داہرہ کی شادی کے بیان میں

۲۰

(۲۱) داستان بادشاہ پر جہاں روح افزا کی کچھوٹی کرنے کے بیان میں

۲۱

(۲۲) داستان لعل بادشاہ جہاں ضرب سے رستم سر پانے کے بیان میں

۲۲

(۲۳) داستان جہاں زہرہ جمین آنے کے بیان میں

۲۳

(۲۴) داستان جہاں رستم بہار افزا پر عاشق ہونے کے بیان میں

۲۴

(۲۵) داستان بہار افزا کی نسبت شاہ رستم سے تقرر پانے کے بیان میں

۲۵

(۲۶) داستان جہاں رستم کی شادی کے بیان میں

۲۶

(۲۷) داستان بازی زنجیر کے بیان میں

۲۷

(۲۸) داستان لعل عاشقانہ کام کر کے سزا پانے کے بیان میں

۲۸

(۲۹) داستان جہاں ضرب کی شادی عالم خواب میں ہونے کے بیان میں

۲۹

(۳۰) داستان لعل بادشاہ جہاں ضرب کو شادی سے آگاہ کرنے اور

۳۰

جہاں ضرب طوطی لانے کے بیان میں

- (۳۱) ۱۳۹ بیت جہاں خرب رو پر فتح یاب ہو کر کوٹ لکھی ہونے کے بیان میں
- (۳۲) ۱۴۳ بیت جہاں شاہ اندر گل پستی کرنے کے بیان میں
- (۳۳) ۱۴۴ بیت جہاں فقیر اسن اللہ بن جہاں خرب کو احوال قیامت سے آگاہ کرنے کے بیان میں
- (۳۴) ۱۴۵ بیت جہاں خرب کو رام کرنے کے لیے لعل بادشاہ شاہ رو کے نساہ کا بدلہ کرنے کے بیان میں
- (۳۵) ۱۴۶ بیت جہاں لعل بادشاہ کے بہار ہونے کے بیان میں
- (۳۶) ۱۴۷ بیت جہاں خرب کے اللہ بن بگوتی کرنے کے بیان میں
- (۳۷) ۱۴۸ بیت جہاں شہزادوں دہن کی گہوٹی کرنے اور اس کی زہر طلسمات سے بہار ہونے کے باعث جہاں خرب گنت و شہید کرنے کے بیان میں
- (۳۸) ۱۴۹ بیت جہاں خرب بادشاہ اور داد کر کو کرائی تقسیم کرنے کے بیان میں
- (۳۹) ۱۵۰ بیت جہاں فقیر اسن اللہ بن کامل بادشاہ اور جہاں خرب کو ملک و مطلق کا تختہ لکھی کرنے کے بیان میں
- (۴۰) ۱۵۱ بیت جہاں خرب بزرگوں کی قیامت کرنے کے بیان میں
- (۴۱) ۱۵۲ بیت جہاں خرب حامل ہونے کے بیان میں
- (۴۲) ۱۵۳ بیت جہاں خرب جہاں تولا سکندر روزگار عرف ابن المظفر
- ۱۵۴ بیت الختام کتاب

۱۵۴ بیت ایات اصل مثنوی

(۴۳) تاریخ مستزید مقدس آب فیض اشراق والدہ اہدم حاجی گوہر علی خان بہادر
 مثنوی لکھی ہوئی ہے۔ ۱۵۴ کی تصنیف ہے اور اہمہ کی پہلی مثنوی لکھی ہے۔ روحانی کے لوری
 عالم گم ہونے کی۔ اس مثنوی پر کئی خاتون شعراء نے تعارفی قصائد لکھے ہیں۔ لیکن اہمہ
 کی اصل دامن ذکر گوہر الملک تیسرے دور کا تاریخی تخلص سب سے جامع اور دلچسپ ہے

جس کے مطالعے سے وہ اپنی خواتین کا علم و ادب سے خاص لگاؤ اور تعاضد و بلاغت کا پتہ چلتا ہے۔ یہاں انہی کی خوش دامن صلابت کا مکمل تاریخی حوالہ درج کیا جاتا ہے۔

پہلی جو شریعہ سے ہیں میری ماں
 شہابی سے اٹھا مٹکیں گم وہ
 ہر میرے سکنہ جنگ جانی
 نکھی سے داستان فرقت آگینے
 وہ ہے اس طور جو ہے پہلے نکھی
 دم کوڑے میں جوں ہر لطافت
 رقم سب کا ہے شام مشرت آگینے
 کہی کوئی اس طرح زیب رقم ہے
 تھی سوم کی جو سب کی انگاری

انہوں میں ہند کے اس کو ہو گئے خوش
 کے تاریخ میں ادب رقم وہ
 گل ہون کے یہ لطف خوش بیانی
 رنگ زلف خوں دل آویز
 جہاں مہنی کے آئینہ میں رنگی
 سوم جوں شست میں شہر یافت
 مطالب سب کے ہوں سبک طرف نیر
 لولہ داستان زہر گم ہے
 ہے تاریخ اس کی "ہاں لولہ ہری"

۷۷۷

اس منظوم کے موضوع اور ماخذ کا تذکرہ کرتے ہوئے مولوی سادات مرزا نے

لکھا ہے

"منظومی "گلشن مہوشان" ایک موشل المانہ ہے۔ جس کا ماخذ ایک فارسی قصہ ہے جس کا اشارہ مصنف نے خود اپنی سہ ماہی "منظومی" گلشن مہوشان" میں کیا ہے۔ ماخذ کا نام درج نہیں ہے اس کا ماخذ غالباً "قصہ" اگر گل ہے جس کا ترجمہ فارسی سے نواب محمد تاجی خان ہون گھسوی کے کسی شاگرد ہاں میں کیا تھا جو 1878ء میں مطبع نول کشور میں پھیل "اگر گل" کا ہی ایک مہی نسخہ "ادارہ ادبیات اردو" حیدرآباد میں موجود ہے۔"

مولوی سادات مرزا نے اس منظوم کے درج ذیل الفاظ کو اردو کی عبارت

کی ہے۔ "گلشن مہوشان کے حلقہ کردار یہ ہیں۔"

- جواہر شاہ (شاہ دوم) ۱۱
- ۔ قاضی جواہر شاہ ۱۲
- فیروز شاہ (شاہ احمد) شاہ بنات ۱۳
- زرغ قاضی فیروز شاہ ۱۴
- فیروز شاہ اول شاہ، فرزند جواہر شاہ دوم کی تہہ کا بیٹا ہے اور یہ فرزند لطفی ہے ۱۵
- ۔ فیروز شاہ جن کا۔ ۱۶
- فیروز شاہ (شاہ لطفی جواہر شاہ) ۱۷
- جہاں شاہ (شاہ مسر) ۱۸
- جہاں شہب، دختر جہاں شاہ (بیرہن) مستحق مردوں کے لباس میں ۱۹
- بازگ جہاں پری (دلیہ جہاں شہب) ۲۰
- حسن علی دہلوی (جنی کے اہلاد و مشق کے بادشاہ تھے) پد لطفی جہاں ۲۱
- شہب جنوں نے جہاں شہب کو تعلیم و تربیت دی اور دہلوی کے تحت پر جہاں ۲۲
- شہب کو بٹھایا۔ ۲۳
- جہاں رحم فرزند شاہ بن (جہاں شہب کا منہ بولا بھائی جوڑ پهلوان تھا) ۲۴
- روح افزا، دختر شہ پری اور مستحق شہزادہ داؤد ۲۵
- زہرا جنی، والدہ روح افزا (شہ پری) ۲۶
- جہاں لکھن، مشا، جو جوگن کا بیٹے لے کر گل کے گھوڑے پر سوار ہو کر جن ۲۷
- کانہے پر رکھ کر شہ پری کے پاس جاتی ہے اور روح افزا کی تصویر موسم پر نقش ۲۸
- کے دامن میں چھپا کر لاتی ہے اور باوجود سخت گرانی اور جہاں تلاشی کے ۲۹
- دیکھائی نہیں ہوتے رہتی۔ ۳۰
- نکھن، نگار، عرف ایسی القلم، جہاں شہب کا فرزند دلہ ۳۱
- نکھن فرزند۔ داؤد جواہر شاہ ۳۲

(۱۷) مشنری وزیر لہور شد

(۱۸) شاہ رخ۔ ایک سرکش رخ پر نعل شاہ کا ظہور اور فلسفاتی کلمات پر نعل شاہ کا قبضہ

اس مشنری میں امیر نے بعض شادی کی رسومات کی تصویریں تیار کرائیں اور ان سے کچھ اور بنا کر
انداز میں بھیجی ہیں پانچ سوں جلوہ کی رسم میں جو جلوہ خانوں خاص نکاح رسم سے اس کے
بغیر شادی کا لطف اور سجا سجا ہوتا ہے۔ امیر نے ایک دکنی لہکن کا نقشہ بھی بھیجا ہے۔

وہ رنگ ستا چست سو لہاس وہ سنگھار وہ زیند وہ پہلوں کی ہاس
بھی تھا سرخ چودے پہ عطر سہاک بھڑک کر اسی سن طفت کی آس
لکلا ہے جب درمیاں سے تلاب چتا کر بات اس نے اس دم شرب
لطف سے جب منہ دکھانے لگی تو نوش پہ احسان بنانے کی
پھر دولہ میاں کی ہے بے چینی کا پردہ ہیں قاش کیا ہے۔

یہاں شادمان وہ دکن کی طرف چا مثل لیل کے گلشن طرف
وہ مہر جہاں نوش ہی مشرف کیا اس کے گلوگھٹ کوب ہرف
کا کرنے لکارا ارمان سے فدا اس پہ ہوتا تھا سو جان سے

مولوی سلامت مرزا نے اپنے مضمون میں اس مشنری کا شعر حسن کی "سحر الہیان"
سے تفصیل کے ساتھ تقابلی مطالعہ کیا ہے اور جگہ جگہ پیش نظر مشنری کے خوب صورت الفاظ
بھی نمونہ پیش کئے ہیں۔ جن کے مطالعہ سے یہ اندازہ لگانا دشوار نہیں کہ امیر نے اپنی
زبان و بیان کی بے پناہ قدرت کا اعتراف کرتے ہوئے لکھا ہے کہ "سہری ہاں ہے کہ
"سحر الہیان" کے علاوہ جس قدر مشنریاں شعراء اہل کمال مثلاً دیا فخر نسیم سلامت ہاں
رنگین، غلام علی مہر وغیرہ نے لکھی ہے۔ ان سب میں بلحاظ پلاٹ امیر کو کوئی دماغ
اور رنگینی بیان اور تسلسل مضمون میں کسی سے کم نہیں اور اس کی مشنری اخلاقی کردار ہاں
میرا ہے۔

امیر نے اس مشنری میں نہ صرف مختلف مناظر فطرت کی دلچسپ مرقع لکھی

جب تک بشری جذبات اور احساسات کی سوزِ تصور کشی کی ہے۔ ایک طرف انہوں نے
 کلام کی تمام آرائی کا مخلص جائزہ لیا ہے تو دوسری طرف انکی سحرگوں اور دماغی واقعات
 کی بھی ترجمانی کی ہے۔ اس اعتبار سے ائمہ۔ نہ صرف آرمکات کی باکمال اور بے گوشاگر نہیں
 بلکہ تاریخ ادب اردو کی کامل فخر شاعرت میں ان کا شمار کیا جائے گا۔

•••••

حوالہ جات

- ۱۔ کائنات بدلی، شعری ادب، آرمکات کی شعریں، مطبوعہ "سندھ" اگست ۱۹۹۶ء، ص ۱۱۳
- ۲۔ انوارِ قاری اور مرنی کے دیگر شاعر تھے۔ آپ کی دہکات تک مطبوعہ میں ہوئی۔
- ۳۔ سوانح میرزا، مطبوعہ ۱۳۶۰ھ، ۱۹۶۱ء، ایڈیٹر: محمد کریم خیر الدین، سنہ الحوالہ ۱۳۶۰ھ سے ہنگ
- ۴۔ گلشنِ سحر میں معنی ائمہ کی تاریخ بھی لکھی ہے۔
- ۵۔ آپ کی شرح کھنڈر نامہ بھی بہت مشہور ہے۔
- ۶۔ مطبوعہ "سندھ" اگست ۱۹۶۱ء، ص ۱۱۵
- ۷۔ کائنات بدلی اپنے مضمون میں ائمہ آرمکات کی علمی تہذیب کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ
 وہاں کے ہونے لگی اسے ہیں۔ نہ گروہ کن ہیں۔ مثلاً حیدر آباد سنٹرل لائبریری اور کتب
 خانے حیدر آباد، جہاں تک راقم کی مطبوعات کا تعلق ہے۔ حیدر آباد سنٹرل لائبریری میں کسی
 کتب خانے کا نام نہیں ہے۔ بہت اہمیت سنٹرل لائبریری ضرور ہے۔ جہاں صرف مطبوعہ
 لکھی گئی ہیں۔ تا فریاد کہ نام کا کوئی کتب خانہ حیدر آباد میں نہیں ہے۔
- ۸۔ اردو ادب کی ایک دیگر شاعرہ، "نوائے ادب" اکتوبر ۱۹۵۲ء، ص ۱۳
- ۹۔ پروفیسر آرمکات کے سب سے چھوٹے فرزند تھے۔
- ۱۰۔ گلشنِ سحر میں
- ۱۱۔ گلشنِ سحر میں
- ۱۲۔ گلشنِ سحر میں
- ۱۳۔ نوائے ادب، مطبوعہ اکتوبر ۱۹۵۲ء، ص ۱۳

جوش ملیح آبادی کے اسلوب شعر کے بنیادی عناصر

جوش ملیح آبادی کا شمار اپنے عہد کے مقبول ترین شعراء میں ہوتا ہے۔ انہوں نے آج سے سو سالوں کے عہد میں اپنی شاعری کا چراغ جلا دیا اور بہت سے نمایاں ترقی پسند شعراء کے ہوتے ہوئے شاعر انتخاب کہلائے۔ موجودہ دور میں اردو ادب کے غیر تربیت یافتہ شاعری کے لیے وہ "بادوں کی ہمارت" کے مصنف ہیں اور صاحبان ذوق انہیں اردو کے بے حد اہم رہا می گو شعراء میں شمار کرتے ہیں۔ ترقی پسند ذہن رکھنے والوں کے لیے وہ آج بھی نظم کے شاعر ہیں۔ غزل پر کام کرنے والے نقادوں کے لیے وہ غزل دشمن قلمیے کے ایک جھنڈا فرد ہیں۔ ان کی تخلیقی زندگی میں اس قدر عروج، رنگارنگی اور ہمیں لوگوں کے نزدیک آواز کے پیچھے ان کی شخصیت اور ماحول میں یکجہ عناصر کا فرما نظر آتے ہیں جن کی رسائی کے بغیر ان کے تخلیقی کام کا مربوط جائزہ ممکن نہیں ہے۔

جوش صاحب کی ہر عمر میں مبارزات، انقلاب، مبالغہ آمیزی، بلند آوازی اور بے زیادہ خود اعتمادی اور خود تکستی جیسے اوصاف بہت نمایاں نظر آتے ہیں۔ انہوں نے بہت ہی بہت شدت سے ان کی تخلیقات میں جھلکتا ہے کہ وہ دوسروں کو غلام اور خود کو غلامی سمجھتے ہیں۔ خود کو منوانے کی شدید خواہش اور غیظ و غضب کی بے حد صورتیں ان کے ہاں نظر آتی ہیں۔ یہاں میں نے ان کے مختصر تاریخی مطالعہ میں کا ذکر نہیں کیا جنہیں اردو میں سمر انصاری صاحب نے مرتب کیا اور "مقالات جوش ملیح آبادی" کے نام سے شائع ہوا۔ ان مطالعہ میں بھی متعدد جگہ پر تمام اوصاف نمایاں ہیں۔ ان کے مطالعہ کوئی سے ایک اقتباس ملاحظہ فرمائیے جس سے آپ کو ان کے عروج کا نظارہ ملے گا۔

ہونے لگے ہیں

اسی لیے قدیم اور مداح حکم کا تڑپا ہون کا کھیل نہیں رہا۔ اس کے
 لیے کئی جرأت اور طعن و تضحیح برداشت کرنے کی پوری قدرت
 اور سہہ جرأت تو آپ دیکھ رہے ہیں کہ اردو کی محبوب ترین جہ
 یعنی ناول کے خلاف مضمون لکھ رہے ہیں۔ وہی طعن و تضحیح سننے کی
 قوت اس کا بھی انکار اور انکار ہو جائے گا۔ (۱)

ان حکم سے انتہا سے ان کی طعن اور تضحیحی مزاج کو نا سانی سمجھا جاسکتا ہے۔
 یہ نئے نئے ناول کے خلاف لکھ کر تنقید اور آپ کا ایک بہت بڑا کارنامہ
 فراہم اپنے جا رہے ہیں۔ یہ کام ان سے پہلے کسی کو کرنے کی جرأت نہیں ہوگی۔ تمام
 نوجوانوں کے ہاتھ انہوں نے ایک فرسودہ صنف اور کو رو کرنے کا کارِ عظیم فراہم دیا
 ہے۔ ناول کیلئے نئے نئے کی ترقی پسند اور ترقی پسند طبیعت کو یہ گوارا ہو ہی نہیں سکتا تھا کہ
 ان کے انکار و معترضے اور انصافیت کو اس قدر زیادہ نقصان پہنچانے والی سرگرمی جاری ہو
 وہ اس کی غلطی نہ کریں۔ وہ کسی سے نہیں ڈرتے بہت جرأت مند ہیں اور آج
 طعن سے بہت سوجا لکھ کر اور بحث کے ساتھ اس قدیم ناول کا فیصلہ کرنے کا حکم
 لگا رہا ہے۔

اس مشفق ہم دوستو جاری ہے

اب تک وہی رسم یاد آ رہا جاری ہے

کھلی ہے جگہ انسان سے مگر ایسی

بازار کے ہاتھ سے لہو جاری ہے

انسانی مٹی کی کڑواہٹ انتہا سے موجود ہے۔ انہوں نے کتاب لکھا

انتہا سے انسان کو کتاب کا مذہب ایک کڑواہٹ اور ہے اثر قوت ہے۔ اس نے انسان

کو رہتی ہے لانے کی ہری کوشش کی ہے لیکن ناکام رہا ہے۔ اس کی ناکامی اس بات کا نتیجہ
 محنت ہے کہ مذہب حق ہے اور انسانی عظمت حق ہے۔ وہ حق بات کہنے میں بے ہنگم
 ہیں اور مذہب کے عقیدوں کو بھی خاطر میں نہیں لاتے۔

پہچان گیا، بیابان ہے اس کے سینے میں اوزاروں کا

دیکھا جو سینے کو میرے، ہی محبت گیا غولانوں کا (۲)

غزل کا یہ شعر بھی اسی لب و لہجہ کا حامل ہے جو اس سے قبل ان کے ایک شعر
 کے اقتباس اور روایت میں نظر آتا ہے۔ وہی رنگ، انداز، مبالغہ آرائی، پختہ آہنگی اور
 محسنی غزل کے اس شعر میں بھی موجود ہے۔ اب ایک نظم "گلاموں سے خطاب" کا ایک
 اقتباس ملاحظہ کیجئے:

انے بعد کے ذلیل گلامان رو سیاہ شاعر سے تو ملاؤ خدا کے لیے گدا

خزین میں میرا شعر اگر کج کرے گدا جس بند بھلیوں سے اڑانے کے گدا

تھو کو نہیں تہ آئے گا اسے ہائی گلام میں ہا کے مقبروں میں جاؤں اگر کام

خود موت سے حیات کے خوشے اٹل پڑیں قبروں سے سرگوبہت کے موتے لگتے ہیں

میرے رجز سے لڑو برائے نام ہے زمین افسوس تیرے کان پہ جوں دہکتی تھا

تو چپ رہا، زمین ملی، آسمان ہلا تھو سے تو کیا خدا سے کہیں گا میں بگا

ان بڑھوں کے حسن پہ شیدا کیا ہے کہیں ہمزاد قوم میں مجھے پیدا کیا ہے کہیں (۳)

اس نظم کو پڑھتے ہوئے صاف محسوس ہوتا ہے کہ وہ گلام ہندوستانی قوم سے

خطاب نہیں ہیں بلکہ اپنے تعلق پر کام کرنے والے مزارعین یا اپنی گل سرا کے غلام ہیں

ذات پر نظر رہے ہیں جو ہاتھ ہاتھ سے سر جھکائے ان کے سامنے کڑے ہیں

عقارت کے چابک سے ان کی ردھوں کو بکروچ کرتے جا رہے ہیں۔

جہاں اپنی ذات اور شامری کا ذکر آیا ہے وہاں مبالغہ آرائی زیادہ لگی ہے۔

کہ دوسرے بچے کھیل کھاتوں میں محو رہتے ہیں۔ شاعری شروع کر دی تھی۔ مگر یا نہیں سمجھتے
ہی سے انفرادیت حاصل ہو گئی تھی۔ اہل انجمن اور لوگوں انہوں نے شاعری کرتے اور نظم
چلائے گزارا۔ کہتے ہیں:

”شاعری سے سب فرصت پاتا تھا تو یہ میرا محبوب ترین مشغلہ تھا
کہ ایک اونگھی سی میز پر بیٹھ کر اپنے ہم عمر بچوں کو جوڑی میں آجاتا تھا
اتاپ شاپ درس دیا کرتا تھا۔ درس دیتے وقت میری میز پر ایک
پتلا سا بید رکھا ہوتا تھا۔ اور جو بچہ توجہ کے ساتھ میرا درس نہیں سنتا
تھا۔ اسے میں بید سے اس بری طرح مارتا تھا کہ بے چارہ چھٹیں مار
مار کر رونے لگتا تھا اور کبھی کبھی یہ بھی ہوتا تھا کہ میں کسی کتہ ذہین
بچے کے کتہ حوں پر سوار ہو کر اسے اس طرح بید مار مار کر دوڑاتا تھا
کہ وہ غریب بے دم ہو کر گرنے لگتا تھا اور یہ میرے مزاج کی وہی
بنیادی عادت ہے جو میری سیاسی خطیبانہ شاعری میں تلخ و ترش لہجہ بن
کر آج بھی نمودار ہوتی رہتی ہے اور میری شاعری کا نثار میرے
لہجے کی درشتی پر چنچ تلخ الٹا ہے۔“ (۳)

غور فرمائیے تو اس لب و لہجے میں طبعاً اشرافیہ کا اعتماد، دوسروں کو خود سے کم
سمجھنے کا رویہ حتیٰ کہ اپنی شاعری کو بھی جسے حقارت سے سیاسی خطیبانہ شاعری کا ہمراہ
رہے ہیں، صاف محسوس ہوتے ہیں۔ ان کے کردار کے ان پہلوؤں سے ان کی رنگہ
اور خود کشینی کو ان کے اسلوب سے دریافت کرنا آسان ہو جاتا ہے۔ جنس صاحب کو اپنے
خاندان پر بے حد فخر تھا۔ انہوں نے اپنے پر دادا کے نام کو جن القابات سے کیا تھا،
درج کیا ہے، اس تفاخر کا اندازہ محض اس ایک بات سے بھی لگایا جاسکتا ہے جن کا نام
الدولہ تہور جنگ نواب فقیر محمد خان گویا انہیں اپنی معاشی فارغ الہلی اور والدین کے

جس کی سب سے شدید قدامت پسندی کی وجہ سے وہ دیگر شعرا کو خود سے کتر سمجھتے تھے جس کا
دوران ان کے اپنے نظریے کے فتووں سے نکلنا ہوا تھا۔

”شاعروں کی مجلسی اور اس کے اسباب“ میں وہ دولت مند کو اہل اور عالم اور
دیگر مجلس کہہ کر اس کی تعظیم کرتے ہیں اور وہ خود ایک وقت نواب اور شاعر دونوں ہی
تھے۔ یعنی نہ شاعر کی طرح مجلس تھے اور نہ دولت مند کی طرح اہل۔ خانقاہی دولت مند کی
پانچ سو سالوں کی قریبوں میں اس طرح ہوتا ہے۔

”مگر میں دولت پانی کی طرح بہتی پھرتی تھی اور اس کے دولت
پانی اقدار و حکومت کا مظاہر بھی بناتا تھا۔ زندگی اور زندگی کی
تعمیر سے قلمی باہت اور درد مند انسانیت کے مشاہد سے ناز
ہونے کے سبب اثرات سے گھبراہٹ کا لگی تھی۔“ (۵)

پہلی آہی کے اسلوب کی تشکیل میں ان کی شخصیت اور خانقاہی ماحول کے علاوہ کچھ
تعمیر کے اثرات بھی نظر آتے ہیں۔ ان شخصیات کے ان کی تخلیقی زندگی پر اثرات
انہوں نے خود بھی اثرات کیے۔ اقدار میں وہ مزاج کشمیری کے شاگرد ہوئے۔ حضرت
ان کشمیری اور ان کے عروج و زوال میں شعر کہنے والے شعراء میں سے ایک بے حد نمایاں
نام تھا۔ ان سے باقاعدہ اصلاح لینے رہے۔ اگرچہ انہوں نے پہلے شعری مجموعے
”دعا اب“ میں سے ان اصطلاحات کو خارج کر دیا لیکن اپنے اسلوب میں سے مزاج
کشمیری کی تربیت کو خارج نہ کر سکے۔ یہی وجہ ہے کہ بعد میں اگرچہ انہوں نے نہ صرف
ان کی اصلاح کو اپنا کر لیا بلکہ ان کے شعور کے طور پر مشہور ہوئے۔ لیکن اس کے باوجود
ان کے شعروں کی اصلاح پر مزاج کشمیری کے اثرات مسلسل نظر آتے ہیں۔ بلکہ اور وسیع
ان کے اثرات کا اثر انہوں نے ”دعا اب“ کے دیباچے میں لیا گیا ہے۔
”اس مجموعے میں نثر بھی ہے، نثر لیس بھی ہے اور شعری بھی نثر کی

طرف بیکور نے مجھے صاحب کیا تھا۔ لڑکیں آہائی اور مامولی اثرات
 کا تہجد ہیں اور گھٹوں کے باپ میں وہیں اللہ ہی صاحب شہر کا شہر
 گزارہ ہوں کہ اس صنف گنج کی جانب سب سے پہلے نہیں ہزاروں
 نے مجھے تہجد دلائی تھی اور اس کے ساتھ ساتھ تہجدوں پر موزوں ہی نے
 اس قدر قہقہے مارے تھے کہ میرے دل کو اس غیر فطری صنف سے

بیکور دیا تھا۔ (۶)

ان شعراء کے علاوہ جوش کی شاعری کے اسلوب اور موضوعات پر نثری ہند
 شعراء اور اقبال کے اثرات بھی واضح طور پر دیکھے جاسکتے ہیں۔ اقبال کے اثرات سے وہ
 جمالیوں اور بھاری بھر کم الفاظ کے استعمال بھی طرف راغب ہوئے جب کہ نثری ہندوں
 کے اثرات سے وہ "شاعر انقلاب" کے منصب پر فائز ہوئے۔ جوش صاحب کی شاعری
 اور دیگر قہقہوں سے پتہ چلتا ہے کہ وہ حسن و عشق اور غریبات کے چاہی کو شاعری اور
 معاشرتی و سیاسی موضوعات کو غزلیت کہتے تھے لیکن حیرت کی بات ہے کہ شاعری و غزلیت
 دونوں میں ان کے اسلوب کے حوالے سے کوئی نمایاں فرق نظر نہیں آتا۔

اس مفکر سے مضمون میں میں نے ان کی شاعری اور سوانحی بیانات کی جانچ کر
 ان کے اسلوب کے بنیادی عناصر کو دریافت کرنے کی کوشش کی ہے۔ یہ سوال کہ ان
 اسلوب کا اردو شاعری میں کیا مقام ہے اور ہمارے دور سے اس کی کیا نسبت ہے اگلے
 ہونا ہوتی ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ اس حوالے سے ابھی تک ایسا پتہ نہ دیا گیا ہے
 ۔ کچھ کے نزدیک وہ اقبال سے بھی زیادہ قد آور شاعر ہے جب کہ کچھ صاحب کے
 شاعری ماننے کے لیے تیار نہیں ہیں۔

ایسے ادبی تجارعات کے فیصلے کے لیے ہمیں وقت کا انحصار کرنا ہے کہ ایک
 ایک ایسی قوت کا ہر وہ ہے جو کسی جانب داری کے بغیر اور کسی روئے عامت کے بغیر نہ ہو

مہ کرتی ہے۔ سچی وہ ہے کہ ہم دیکھتے ہیں کہ اپنے وقت کے بہت سے "قبول قرین" لوہو آج محلِ تاریخِ ادب کی کتابوں میں قید ہیں اور نقادوں اور محققوں کے علاوہ ان کے بارے میں اکثر شعر پند سزا بھی بے خبر ہے۔

♦♦♦♦♦

حوالہ جات

۱۔ ستارے جوش (مرتبہ) بحر انصاری، اردو گل پبلشرز کراچی (اپریل ۱۹۸۴ء) ص ۶۵

۲۔ نعلی، شمیم، جوش، کتب خانہ رشید دہلی، ۱۹۳۹ء، ص ۳۱۳

۳۔ بیاضی ۳

۴۔ دیوان ادب، جوش، مکتبہ اردو لاہور، ۱۹۳۲ء، ص ۹

۵۔ بیاضی ۱۱

۶۔ بیاضی ۱۲

اردو نثر نگاری میں خواتین کا کردار

اردو ادب پر ایک مدت تک مردوں کی حکومت رہی۔ ابتدائی دور میں مردوں کے اور کوئی اس میدان میں نظر نہیں آتا۔ کیا اس کی وجہ یہ تھی کہ خواتین میں وہ شعور کی کمی تھی؟ نہیں اس کی اصل وجہ اور دماغی وجہ معاشرتی پابندیوں تھیں۔ جسے اپنے گھر کی چار دیواری تک محدود تھی۔ گھر داری اور گھر کے مردوں کی خدمت اس کی زندگی کا دماغ مقصد تھا۔ اگر وہ کچھ بچہ سکتی تھی وہ قرآن پاک۔ وہ بھی عربی زبان تک گھر وقت ایک ماٹریکل رہتا۔ اور وہ دور بھی آیا جب خواتین نے سولہ اڑھائی لاکھ لکھ دیا۔ یہ انقلاب کیونکر ممکن ہوا؟ آپ نے دیکھتے ہیں:

ملا وہی نے ۱۹۴۵ء میں "سب دن" لکھ کر اردو ادب میں نثر کی نگاہیں انیسویں صدی کے آغاز پر فوراً ولیم کالج کالج قائم ہوا۔ ڈاکٹر جان گلگرسٹ نے سولہ لاکھ رکھنے والی شخصیات کو دعوت دی کہ وہ فارسی اور سنسکرت کا ادب اردو میں لے کر آئیں۔ اردو ادب کو ایک نئی راہ مل گئی۔ اس کے بعد کئی سالوں پر عظیم سیاسی ماہرین کے مدد سے احمد خان کا زمانہ آیا۔ انہوں نے سیاسی، معاشرتی اور ادبی دنیا کے لیے نئی راہیں کھولیں۔ ملی گزشتہ بے خودی، اس سے وابستہ شخصیات اور ان کے کارہائے نمایاں سے ان واقف نہیں۔

اردو نثر کے اصلاحی اور انقلابی دور کے طویل دورانیہ نے اردو ادب کو
 ہیں جو سرسید احمد خان کی قائم کردہ روایت پر مددگار کاغذوں سے۔ مزید وہ نے اردو
 اس کو تنقیدی نظر سے تو کوئی خاص اہمیت حاصل نہ ہوگی البتہ ان کی نثر نے اردو ادب

چلتی رہی شروع نہیں کر دی۔

ذرا دیر کا سب سے 1911ء میں خواتین کے مسائل کو سطر عام ہوا اور خواتین
 کو اس وقت پر مجبور کر دیا کہ وہ اپنے خوراک کے بارے میں حقوق کے لیے جدوجہد
 کریں اور اپنی قوم کو اپنی صلاحیتوں سے فیض یاب کریں۔ ان کے بعد شہر
 (1899ء-1900ء) اور سرشار (1899ء-1900ء) نے شہری طب پر خاص توجہ دی۔ شروع
 شروع میں تو خواتین معاشرتی پابندیوں کی نظر اپنی تعلقات پر اپنے نام تک نہ لگھتی تھیں
 اور وہ ان مسائل یا زہدوں کے نام سے جانی دیکھتی رہتی تھیں۔ مگر ایک وقت وہ بھی آوا
 بہ ان کی تعلقات ان کے اپنے ناموں سے شائع ہونے لگیں اور خواتین بھرپور انداز میں
 جانی دیا رہ چکا تھا۔

خواتین کے ہاتھوں کے مرکزی خیالات کو سامنے رکھتے ہوئے ہم ان باتوں کو
 دیکھا اور دیکھوں میں تقسیم کر سکتے ہیں۔ گو کہ کئی جگہ یہ فرق اکتا واضح بھی نہیں ہے۔
 یہ پہلی بار خواتین اس دور میں توجہ اور سرشار سے متاثر نظر آتی ہیں۔ اور
 یہ اپنی حرکت بگڑ بات بھی نہیں ہے کیونکہ یہ ان کی اپنی کاوشوں کا ابتدائی دور ہے اور
 کار ہے ان کے سامنے کوئی ایسا نمونہ ہے جس سے وہ متاثر ہو کر ان کے نفسی قدم پر بھی
 رہی ہیں۔ خواتین کا سب سے پہلا شائع ہونے والا ہول مذہب انگریزی کا "اسٹریٹ ایسٹ"۔
 یہ اس زمانے میں تعلیم عام نہ تھی اور خواتین کی تعلیم تو ایک جرم بھی جانی جاتی تھی۔
 معاشرے ہ مردوں کی حکومت تھی اور خواتین کے باخواب ہونے کے باعث اخلاقی اقتدار
 ان کا دور میں بگڑا اور پگڑا ہوا تھا۔ خواتین کی تعلیم محض اسلامی تعلیمات تک محدود تھی۔
 اور تعلیم حاصل کرنے کی خواہش مند خواتین اپنی چار دیواری ہی میں گھٹ کر رہ جاتی
 تھیں۔ مگر اب ان خواتین کی رہائی تیار ہونے شروع ہو رہی تھی ان کے ہاتھوں تک پہنچی تو انہوں
 نے بھی انہی کے انداز میں کھنڈ شروع کر دیا۔ حتیٰ کہ ان کی کہانیاں، ان کا اسلوب، سب

انہی سے جڑا تھا۔ اسی وجہ سے "اصلاح النساء" میں ہاول نگار نے اس بات پر زور دیا ہے کہ تمام بیچوں کو خیر ہمارا کی معافی کی طرح ایک سونہ ہونا چاہیے۔ اس کے بعد اور بہت سے ہاول لکھے گئے۔ مثلاً مولیٰ بیگم کے ہاول آج کل، گھوڑا بیٹی، شریف بیٹی، مولیٰ بیگم، عباسی بیگم کا ہاول زہرا بیگم، خدر سجادہ بیگم کے ہاول اختر النساء، آدو مظلومان، خیران نصیب، چاہدار، بیگم، تریہ، معافی، ہاجوں مرزا کے ہاول سرگزشت، بانہو، مطہر نسواں، مولیٰ، تہذیب النساء، اور فاطمہ بیگم، سدیعہ سہاسی اور والدہ الفضال علی کے ہاول بھی مقبول ہوئے۔

اس زمانے میں مرد خواتین پر اس حد تک حاوی تھے کہ وہ آگے بڑھ کر معاشرے کو تبدیل کرنے کے لیے کوشش کر سکتی تھیں۔ یہ خواتین انگریزوں کی ترقی کو حسرت کی نگاہ سے دیکھتی تھیں۔ اسی لیے انہوں نے اپنے ہاولوں میں انگریزوں کے طرز زندگی کو مختلف زاویوں سے پیش کیا ہے۔ یہ قدم قدم پر ان کے آدو معاشرے میں کی جا رہی تھی اور ان کی تعلیم سے جڑا نظر آتی ہیں۔ یہ خواتین زمانے کی تبدیلیوں سے باخبر آگاہ ہیں۔ یہ اس بات کی خواہش مند ہیں کہ کسی طرح خواتین کا معاشرہ ترقی کی راہ پر گامزن ہو جائے تاکہ وہ خواتین کو ان کے حقوق دلا سکیں اور انہیں آزادی دلا کر اپنے مقاصد میں کامیاب ہو سکیں۔ انہیں جاگیردارانہ نظام میں تبدیلی کے ساتھ ہی امید کی کرن نظر آتا شروع ہو جاتی ہے۔ انہوں نے مسلمانوں کی عقیم شخصیات کے بارے میں بھی لکھا ہے مگر فی الحال انگریزوں کی حکومت ہے۔ اور حقیقت تو یہ ہے کہ وہ بھی انگریزوں سے جڑا ہیں۔ اسی وجہ سے ان کے ہاولوں میں ہمیشہ ایک جدوجہد نظر آتی ہے، روایات اور جدیدیت کو اپنانے کی خواہش کی کش مکش کی صورت میں ظاہر ہوتی ہے۔ ہر ہاول لکھے بنیادوں پر قائم ہے۔ اور ان کے مرکزی کردار ان کی اس سوچ کے طہرہ دار ہیں۔ ہر ایک ہاولوں میں بہر حال جدید تہذیب کی برائیوں اور پرانی روایات کی اچھائیوں کا کلی اثر ہے۔ مگر ان میں سے بیشتر ہاولوں میں پرانی روایات حتیٰ کہ ہونے کی پختی ہو گئی تھی

ہے۔ ان باتوں کا مرکزی خیال ایسے اور غریب گروہوں کا طرز زندگی ہے۔ غلو ہے
 غریب گروہوں میں انفرادی کو بہت اہمیت حاصل ہے۔ باتوں کا طرز انگریزوں سے بہت
 جھوٹی نظر آتا ہے تو پورا نہیں اتنا مگر اپنے مفہوم میں ضرور کامیاب ہو جاتا ہے بلکہ
 اپنے کارکنوں کو بڑا کر اور معاشرے کی اصلاح کرنا۔ کہانی میں دہرائی کا نام نہیں رہتا۔
 کارکن کی جگہ پر قرار رکھنے کے لیے کوئی طریقہ کار استعمال نہیں کیا گیا۔ کردار بھی ایک
 معاشرے کے باہر ہیں بلکہ ان کی شخصیت میں کوئی اور چیز عطا نہیں ہے۔ جیسا کہ ان باتوں
 میں ہمارے سے ظاہر ہے یہ سب کے سب گواہی کے بارے میں ہیں۔ کوئی ایک نام
 خوب کرنے سے مراد یہ ہے کہ مرکزی کو ہی گناہ دیا جاتا ہے۔ پھر ایک ان کی
 چوٹی کی علامت بھی ہیں۔

یہ حقیقت ہے کہ ان باتوں میں ہم ایک نیا ہیرو دیکھتے ہیں۔ اسلوب انگریز
 ہے اور مرکزی خیال اور ان کو بہت اہمیت حاصل ہے۔ انہیں چاہا کہ ان باتوں سے
 نئے باتوں کو اب اس بات کا احساس ہو گیا ہے کہ کہنا بھی ایک ہی ہے اور انہیں کی توہ
 اپنی طرف مبذول کرنا اور بڑا کر رکھنا بھی اہمیت کا حامل ہے۔ ان یہ ناول نگار انسان اور
 معاشرے کے حقیقی کا مطالعہ کرتی نظر آتی ہیں۔ یہ ان بات کا جائزہ لیتی ہیں کہ کن طرح
 ناپی ہوئی انہیں پر اثر انداز ہوتے ہیں اور کن طرح یہ سماجی معاشرے کے لیے
 نظر دارے بہت ہو سکتے ہیں۔ ان باتوں میں ہمیں لطیفیت کی محک بھی نظر آتی ہے۔
 اب یہ ناول نگاروں کے پاس یہ ہم چھ کی مثال ہے اور انہیں معلوم ہو گیا ہے کہ کن طرح
 اپنی کے بارے میں اپنی کیفیت کو ایسے یا غیر ایسے دیا جاسکتا ہے۔ ان دور کی مشہور
 ناول نگار تھی اور ان کے باتوں کی گہرے سے متوجہ رہتی ہے

نورانی
 علامت نامی ناول
 علامت نامی ناول

انے آرتن تاجن
 معنہ انکار
 الق. المص. تصور. نام. ہا۔
 تحت ہا۔

ان ناولوں کے مرکزی خیال کا دائرہ بہت وسیع ہے۔ ان میں سیاست، فلسفہ اور سائنس کی حدود ایجادات کا ذکر ہے۔ ان کی کہانی کا دائرہ شروع ہوتی، آگے بڑھتی اور یہاں چڑھتی ہے۔ ان کرداروں میں سے ہر ایک کی اپنی ایک انفرادیت ہے۔ ناول نگاروں نے ان کرداروں کے ان کے ماحول سے تعلق اور نفسیاتی پہلو کو بھی اہمیت دی ہے۔ کردار اب متجاہد چلتے پھرتے انسان نظر آتے ہیں۔ وہ سوچتے ہیں، کام کرتے ہیں، کسی جگہ سے تعلق رکھتے ہیں، کسی ماحول میں بیٹھے ہیں، کسی خانہ میں رہتے ہیں، کسی گروہ کے ہاں ہیں اور ایک معاشرے کا حصہ ہیں۔ ناول نگاروں کی سوچ کا دائرہ وسیع ہے اور ہر گھنٹہ ان کی کہانی کا ایک حصہ بن جاتا ہے۔ وہ کرداروں کے ساتھ ساتھ سفر کرتے ہیں اور زندگی کی پیچیدگیوں کا اندازہ لگاتے ہوئے خود کو تبدیل کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ یہ تبدیلی ہم ان ناولوں کے ناموں میں بھی دیکھ سکتے ہیں۔

سہ۔ نفسیاتی ناول: اس دور میں ناول امتیاز ملی سرگرمی ہے، کیونکہ وہ شروع ہی سے اپنے کرداروں کا نفسیاتی تجزیہ کرتی نظر آتی ہیں۔ ان کے بعد مصمت چٹائی اور قرۃ العین کے نام آتے ہیں۔ ان کے ناولوں کی فہرست یہ ہے:

نواب امتیاز علی اندھیرا خواب، میری باقیات مصیبت، نکالم مصیبت

مصمت چٹائی ضدی، نیچر می گیار، جیب آدمی، دل کی دنیا، سوالی، مصعب

ایک قطرۃ خون

قرۃ العین مہدی میرے بھی جسم خانے، سفید لیم دل، آگ کا دریا، آتش کے

بہسور، کار جہاں روز ہے، گروہی رنگ چمن

یہ ناول نگار بہت تفصیل سے انسانی سوچ اور اس کی پیچیدگیوں کا مطالعہ کرتے

جہاں زندگی کی پریشانیوں اور مصائب کے آگے تھکنا نہیں دانتیں۔ انہوں نے یہ بات کی
 پہلی ہی ہے کہ فوائمن اپنی بہت، اپنی قوت اور اپنی اور اپنے اور ہزاروں اپنی تھک رہی
 تھی ہیں۔ یہ دنیا کا مقابلہ کرتی تھک رہی ہیں۔ مثلاً "سچی کلمہ" میں مصمت پہاڑی نے دنیا
 بہت ہی انداز میں تنبیہ کی ہے اور اپنا ناول ان بچوں کے نام لیا ہے جو "دوسرے" کے
 پہلے جنم ہوتے ہیں۔ "قرآن الہین" حیدر کے ناول ان کی ذہنی زندگی کی عکاسی کرتے ہیں۔
 ان کے ناول زیادہ تر سماجی رومان کے زور رکھتی ہیں۔ صغیر کے بارے میں ہیں جہاں غیر ملکی
 بینا کے پاسوں پر مظالم ڈھاتے ہیں۔ اور پھر ۱۹۴۷ء میں قیام پاکستان کے وقت کے
 مصائب پر بھی لکھتے ہوتے ہیں۔

نسیات سے گہری دلچسپی کے باعث ان ناولوں میں نفسیاتی کٹنے دیکھنے کو ملنے
 ہیں۔ یہ کتنے ہی عجیبہ نسیات کو پیش پیش کرتے ہیں۔ عام نفسیاتی حقیقت کی طرف اشارہ
 کرتے ہیں۔ ہم اب ان کے کرداروں کے مزاج اور ذہنی و نفسی کیفیات کا بھی اندازہ لگا
 سکتے ہیں۔ حاصل جب کارل مارکس کی تحریک کے زیر اثر سرمایہ دار طبقے کے خلاف آواز
 اٹھائی گئی اور ہندو تعلیم اور مغربی تہذیب کے اثر سے اگر ایک طرف نوجوانوں میں جمہولی
 ذہنیت اور بے جانہ نظموں سے آزادی حاصل کرنے کا رجحان بڑھتا تو دوسری طرف علم
 نسیات سے گہری دلچسپی کی وجہ سے ان کی توجہ انسانی نفسیات کی طرف بھی مبذول ہو گئی۔
 ان کے خیال میں اب میں جنس کو ایک اہم موضوع کی حیثیت حاصل ہوئی۔ میں ناول
 انہوں نے جنسی حقیقت نگار کی راہ اختیار کی۔ مصمت کی اس بے باکی کو فحاشی کا نام دیا
 گیا اور ان کی پادال میں سرکار نے ان پر مقدمہ بھی چلایا۔ حاصل انہوں نے حقیقت کی
 جان بوجھ کر اس حد تک نہیں کی کہ زندگی کا لفظ "کیا" ہے۔ بلکہ انہوں نے اظہار کی ذہن
 کے اندر کر یہ بھی دیکھا کہ زندگی "کیوں" ہے۔ انہوں نے ظاہری حقیقت کا
 قہر لہجہ کران کے اصل چہرے کو دکھایا۔ اس طرح ان کا روش حقیقت سے زیادہ فطرت

سے استوار ہوں۔ انہوں نے معاشرے اور لڑکے بائیں تصادم اور تعلق کا ذکر کیا ہے۔
انہوں نے تصور و شعور کا مطالعہ کیا ہے۔ یہ نالے کی کوشش کی ہے کہ کس طرح خارجی
تعلق افراد کی زندگی میں ہڈ پائی اور لائی نکلتے و ریلٹ کی صورت میں سامنے آتی ہیں۔
انہوں نے زندگی اور کائنات کے آفاقی تصور کا تفصیلی جائزہ لیا ہے۔ ان کا موضوع ذہن
کی دنیا ہے۔ اور کونکہ ذہن کی کائنات کو منطقی ترتیب سے پیش نہیں کیا جا سکتا لہذا ان کے
ناولوں میں روایتی مرکزی خیال نہیں ملتا بلکہ ایک مطالعے کا عمل نظر آتا ہے۔

۳۔ معاشرتی ناول: اس دور کا آغاز یوں تو قرۃ العین حیدر سے ہوتا ہے جنہوں نے
”آگ کا دنیا“ لکھ کر نثری تجربے میں ایک تہلکہ مچا دیا۔ کیونکہ ان کا یہ ناول ہندوستان کی
سماجی، تہذیبی، سیاسی، مذہبی، تاریخی، تعلیمی اور معاشرتی زندگی کا ایک طرح کا سفر نامہ
ہے۔ مگر ان کے ساتھ ساتھ ایسے نام بھی ہیں جنہوں نے اس طرزِ تجربے میں بہت نام پایا
اور جن کے ناول نہ صرف بہت مقبول ہوئے بلکہ انہیں ادبی اعزازات سے بھی نوازا گیا۔
چند اہم ناول نگاروں اور ان کے ناولوں کے نام یہ ہیں:

علاقہ فاطمہ	نشان محفل (آدم بی ایوارڈ یافتہ)، دلک تورو، پنا سفر
بیلہ ہاشمی	سلاش بہاراں (آدم بی ایوارڈ یافتہ)، رومی، آتش رفتہ، اپنا اچہ جہنم
خدیجہ مستور	آنگن (آدم بی ایوارڈ یافتہ)، زمین
رضیہ فصیح احمد	آبلہ پا (آدم بی ایوارڈ یافتہ)، حجاج درد، انتظار موسم گل

ان کے علاوہ فاطمہ بیگم، اسے آر خاتون اور زبیدہ خاتون نے بھی پاکستانی
معاشرے کی سادہ طرزِ زندگی کی عکاسی کی ہے۔ چاہے ناول تاریخی نوعیت کے ہوں یا
معاشرتی، ان میں کسی نہ کسی طرح عورت کو ہی مرکزی حیثیت حاصل ہے۔ آخر یہ مطلب
کیوں؟ یہ پکار کیوں؟ معاشرے میں آخر عورت کا کیا مقام ہے؟ کیا وہ اپنے اس مقام،
شاکر ہے، مطمئن ہے؟ اگر نہیں تو پھر وہ یہ مقام حاصل کرنے کے لیے کیا کر رہی ہے؟ اگر

برہم آتے ہیں۔ ان جذباتی ذہل گھبراہٹ اور ان کے ذہنوں کی گھبراہٹ میں ہے
 اسے آرتھروں طبع، شعور، افکار، ہاں، پشت، زبان، کان
 لاطری میں شہ، اہلی، نگار، کراں، ڈرنا، رستا
 نورو قانون شاکت، عیب، لجن، جتا، اورا، لہ، لہن
 راجیہ ہنٹا بے بی، خاندان، انسانیت، ماورائے، عادی، عاقی، خوشی
 صدیہ مظہر عالی، کی، کج، شہریں، وحش، دل، سلطنت، کتاب
 سلی سولی چنگے سے بہا، آہائے، اسن، دیا میں، عروج، دل، اک، مقبول، ہیں
 بے درد، اہل، سماجی
 اللت منہاں یہ کیا؟ بے چارو، آگ اور برف
 زبیرہ قانون نورو، مروس، تار، باقوت

یہ ذہل ایک خاص شعبہ زندگی میں مقبول ہوتے رہے ہیں۔ کیونکہ یہ ایک خاص معاشرے کے لیے لکھے جاتے تھے۔ یہ ان گھبراہٹوں کی بچوں میں بہت مقبول ہوتے جو ابتدائی تعلیم کے بعد گھبراہٹ کر گھبراہٹ کر نکلتے اور بچا گھبراہٹ کی آہ لگاتے رہتے۔ اس طرح ہر ذہل یہ ذہل ان بچوں میں حقیقی سوچ بھی ڈالتے ہیں جو اس دنیا کو کسی پرہیز کا دیکھ تصور کر لیتے ہیں جہاں کوئی خواہش کا شعراہہ آکر ان کی دنیا بدل ڈالتے گا۔ یہ ان گھبراہٹوں میں بچنے کی اکثر ممانعت ہوتی جو خود کو تعلیم پانے والے بن کر رہتے تھے۔

ان ذہلوں کا مرکزی خیال تقریباً ہمیشہ ایک ہی جیسا ہوتا تھا۔ وہی کہ، جانا، زمین، سماں، عیسا، اچھا یا بُرا انہما۔ ان میں زیادہ تر ان لڑکیوں کا تذکرہ پایا جاتا ہے جو بصری کا ہنس ہوتی ہیں۔ بڑی بڑی آنکھیں، لمبی بالیں، گلے لے پل، گھبراہٹ، کسی سر یا ہاتھ کے نیچے کھڑی اپنے تخیل میں کسی شعراہے سے سلیم کی بھر پور دی جاتی

نہیں، اگر یہ کسی گھنٹی دیا میں کھسا گیا ہوا ہے تو اس کے سرواتی پر اٹھ گئے ہیں کسی
 وی کی صورت نظر آئے گی۔ اگر یہ کوئی ایسا ہو گا تو کسی کی آنکھوں سے آنسو بہتی ہیں
 گئے۔ یہاں سرواتی دیکھتے ہی ہوا کے مرکزی ٹیبل کا اندازہ لگانا کوئی آسان کام نہیں ہے۔
 ان میں سرواتی کے مسائل، جہاں کو خصوصاً لڑکوں کو پہنچانے کے مسائل کا دار
 ہے۔ ان میں جہاں اور والدین کے مابین تعلقات کا بھی تذکرہ خاص طور پر ان لڑکوں کے
 جانے سے جو ناہانز صورت اور بے جا ادا کی وجہ سے آکر جاتے ہیں۔ ان میں صورت کے
 ہالی مسائل، جاگیر وراثت نظام کی طرائق، گھریلو معاملات اور تعلیم کی اہمیت کا بھی بیان
 ہے۔ یہ جاننے کی کوشش کی گئی ہے کہ تعلیم میں بہت سے مسائل کا حل ہے۔

یہ ہوا ہے کسی بھی دور کے ہوں اور ان میں چاہے کسی نوعیت کے مسائل کا
 تذکرہ ہو، ایک بات بہت نمایاں ہے جو ان ہواؤں کی خصوصیت میں شامل ہے، وہ ہے ان
 ہواؤں کا ذخیرہ الفاظ جو نہ صرف بہت وسیع ہے بلکہ یہ کہ خواتین کی نہ ہائی گئے گئے
 ہواؤں میں ان الفاظ و عبارتوں کا بھی بڑا استعمال ہے جنہیں خصوصاً خواتین سے مشورہ
 کیا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ دوسری نہ ہواؤں کے الفاظ کا استعمال بھی ان کا خاصہ ہے۔

آپ بڑھ چکے دیکھتے ہیں

- کوئی تو ایسے ہی جہوں کے پیچھے چلی رہتی ہے۔

- بے لے میں مر سگئے اپنی بیٹی کو کئی وقت بات دلی ہے۔

- آٹھن کی بناہت میں اترے ہوئے چاند کا ٹکڑا

- آنکھیں سیاہ رات کی سی کال

- کونسا ہے اناج کے کھیت اور آسوں کے نور سے نکلتی ہو۔

- آنکھیں میں گڑی ہوئی سوئی کی مانند ہے جس

- جمال بھیہم، غم کے بچے

- وہاں نے وقت سے سمجھ کر لیا تھا۔ بہت اونچے بیٹھے بیٹھے وہ اتنا بچے سرک اٹکی
تھیں۔ ہر اہلی بھی نہیں کہ بچی کے قریب دنگی ہوں۔

- اسی پہلی بلیوں کی جارح کے چاند کی طرح تھکی ہو رہی تھیں۔ بچے ٹکرتے ہوئے
تھے اور بیک اپ کے بارے اصلی صورت پہچانی نہ جاتی تھی۔

- چڑیوں نے بار بار اہارا بچا بچا ہنگ اارا

- بہانا دل نہ سیرگی شام تم کی یہ جانا تو آگ نکالنا نہ مگر کو میں

- فوڈ انگریزوں کی رواجی ٹنگلی اور سرد سوری کے برعکس نہ جاتی تھی۔

- اوسے یہ انگریزوں نے اسے کوئی یاد نہیں آئے گا۔

- تم اس کا منہ یہ تو

- تم پر بھری جان قربان

- آپ کو اپنے بچوں کی بہاریں دیکھنا نصیب ہوں

- جسیں آنکھوں کی مستی

- ہرے ہرے ہونوں پر دہلی مگر بہت

- شرم و حیا سے جھکی بلیں

- خوار آلودہ لگا ہیں

- وہ مسکین غلام نہیں ہیں، اسے سر نہ بھرے اور طوسی ہیں۔

ان تمام باتوں کے مطالعے سے ہم یہ اخذ کر سکتے ہیں کہ ہولی ٹکالوں کے

باتوں کے موضوعات زیادہ تر مذبح اڑیں ہیں

- محبت کا معاشرے میں مقام

- جاگیردارانہ نظام اور اس کی خرابیاں

- مہاں بھلی کے تعلقات

- عورت کے شادی شدہ زندگی میں مساک

- روزگاری دانتا نہیں

ان کے ساتھ ہم یہ بھی دیکھتے ہیں کہ بہت کم بادل لگا رہتی ہیں جنہوں نے

ہم سے معلومات کا ذکر کیا ہے۔ مثلاً

- مہاجرین کے مساک

- بے روزگاری کے نتیجے میں بچوں کی تعلیمات

- تارنما پر عمل

- شادی کے مساک

- کاروباری شادیوں کی باتیں

یہ ان کے علاوہ یہ کہ نگر یا تمام ہی بادل لگاؤں نے "رہائیت" اور "جدیدیت" کے

بھاری بھاری ہیں۔

کسی بھی بادل لگانے والی خواتین کی تعلیم یا خواندگی کے موضوع پر نہیں لکھا۔ یہ کہا

ہے کہ ان کے بادلوں میں اس امر پر زور دیا گیا ہے کہ تعلیم پر توجہ دینا یا فائدہ نہیں کا سب

سے لہجے اور جوتی ہے مگر کوئی بادل بھی اس موضوع پر نہیں لکھا گیا جہاں عورت کو سکول،

ان یا پروفیشنل اس مقصد سے جانے دکھایا گیا ہو کہ کس طرح یہ عورت دوسری خواتین

سے اپنی تعلیم کے بل بوتے پر افضل ہو سکتی ہے۔

بہر حال یہ کہنا لگانا ہو گا کہ خواتین بادل لگاؤں نے آزادی نسواں کے لیے

ان تمام کو لہرا لیا۔ یہ انہی کے مریوں بنتے ہے کہ معاشرہ خواتین کے مساک سے

انہوں کے من سے رہنمائی ہو۔ ان پر گئی بہت سی بے جا پابندیاں تھیں۔ انہیں

انہوں کے بارے میں بات ہے۔ یہ ان تمام شہرہ ہائے زندگی میں نظر آنے لگیں جو کبھی نہیں

انہوں کے لیے تھیں تھے۔ ان کی تلاش و پیمود کے لیے انہیں نہیں جہاں ان کی آواز

بنی جاتی تھی اور سنی جاتی ہے اور جہاں ان کے مسائل کا عمل اسن طریقے سے اسی طرح ہے۔
 یہ انہی کی کاوشوں کا نتیجہ ہے کہ اردو ادب میں خاص طور پر خواتین کے ادب پر کام
 کیا گیا یعنی اس ادب پر جسے ہم خواتین بڑیاں خواتین کہہ سکتے ہیں۔ لیکن کتاب لکھی گئی اور
 محفل ان الفاظ یا ان کا اوقات کا مجموعہ ہے جو صرف اور صرف خواتین سے منسوب ہیں۔
 اس سلسلے میں کہیں کو یہاں ہی نہیں بلکہ جانا چاہیے مگر ہمیں مل کر اسے آگے
 بڑھانا چاہیے تاکہ اس ادب کی مزید ترقی اور وسیع میں مدد مل سکے۔

•••••

مومن بحیثیت شاعر، مخم، موسیقار اور استاد

پہلے بنو پاک میں دلی (دلی) اور بعد قندیم سے شعر و ادب اور بطور ان کا مرکز رہا۔ وہاں مردم خیز طے نے لاتعداد نواح روزگار کو جنم دیا۔ لوہے پیر، طالب، مومن، رتے، ساج، رام، علی، ساج، ذوق اور داغ دہلوی، معنی آفرینی، ہشکل پندی اور سعادت علی کے وہاں میں اپنا جانی نہیں رکھتے تھے اور ان عالی مرتبت شعرا نے دارلکافتہ دلی میں مزید اور اور شاعری کے لیے دارالطرب تھا جنم لیا۔ مذکورہ بالا شعرا نے اور اور فارسی میں شعر و ادب کو اس کی سرانجام تک پہنچایا۔ ان میں سے بیشتر شعرا نے گرام کا فارسی کلام کے اور کلام پر ترجیح اختیار رکھا ہے۔ حکیم مومن خان مومن انہی دار روزگار شعرا میں سے ہی جو خیال کی عدت اور شوخی بہان کے لیے جانی نہیں رکھتے۔

حکیم مومن خان مومن صف اول کے شعرا میں شمار ہوتے ہیں۔ آپ نے ہائے لہری سے تھے۔ ان کے دادا حکیم دار خان اور ان کے بھائی سلطنت علیہ کے آفرینی اور شاہ عالم کے عہد میں دلی آئے اور شاہی طبیوں میں شامل ہوئے۔ شاہی سرکار سے لیکر وضع بلاد میں جا کیرلی۔ جب انگریز سرکار نے بھمبھر کی ریاست نواب فیض علی کو کھٹا کی تو یہ علاقہ بھی اس میں شامل تھا۔ لہذا نواب فیض خان نے یہ جاگیر ہوائے بڑا دہیہ علاقہ آٹھن مقرر کر دی جو دراصل مومن کے خاندان میں ملتی تھی۔ ۱۸۵۷ء میں کانگادوں دلی میں کوچہ چیلوں میں رہائش پذیر تھا۔ یہیں مومن ۱۳۱۵ھ (۱۸۹۷ء) پیدا ہوئے (۲)۔ آپ کے والد ماجد کا نام حکیم قلام خان تھا۔ زندگی گھنٹی مٹی آپ نے اپنی والدہ کی آغوش پر مہر و محبت میں اور والد کے سایہ شفقت

کے امر کیے۔ بیٹیوں کے گھر میں جہاں مومن کا خاندان رہائش پذیر تھا۔ شاہ مہاراجن کا مدرسہ وہاں قریب ہی واقع تھا۔ مومن کے والد کو شاہ صاحب سے کمال تعلیم حاصل کرنی تھی۔ جب مومن پیدا ہوئے تو حضرت شاہ عبدالعزیز نے ہی آپ کے کان میں قرآن مجید کی تلاوت کا نام رکھا لیکن بعد میں آپ کے اہل خاندان کو یہ نام پسند نہ آیا لہذا آپ کا نام "صاحب" رکھا گیا۔ (۳) آپ کو مومن علی بھی کہتے ہیں لیکن صرف عام میں مومن نام ہی مشہور پا گیا۔ (۴) آپ نے ابتدائی تعلیم اس زمانے کے روحانی کے مطابق حاصل کی۔ اس دور میں مرہٹہ زبان قاری تھی۔ آپ نے عبداللہ خان طوی سے اس زبان میں کتب فیض کیا (۵)۔ روایت ہے کہ عربی کی تعلیم آپ نے شاہ عبدالعزیز دہلوی سے حاصل کی۔ (۶) آپ نے ان دونوں زبانوں میں اس قدر دھڑل پیدا کی کہ اپنے دور کے اساتذہ پر بہت لے گئے۔

آپ نے بلا کا حافظ پایا تھا۔ ہم بات شاہ صاحب سے سن لیتے تھے تو ہمارے لئے آکر لیتے۔ اکثر شاہ عبدالعزیز کا وقت ایک بار سن کر ہی ہم ہوا کر دیتے۔ جب عربی زبان میں کمالی استعداد حاصل ہو گئی تو اپنے والد اور چچا غلام حیدر خان اور حکیم غلام حسن خان سے طب کی کتابیں پڑھیں اور انہی کے مطلب میں نوسٹو لوسکی کرتے رہے۔ ہمارے اختلاف زبان کے عربی و فارسی پر اس قدر قدرت حاصل کی کہ قاری زبان والے انہیں اہل زبان سمجھتے تھے۔ علوم خداوند کے علاوہ طب، ریل، شہر، موسیقی اور ریاضی میں بھی دل رکھنے لگے۔ ہم ان علوم میں ان کے کمال کی داستانیں مہاراجے سے خالی نہیں (۷)۔

زبان اور آواز فنی انہیں کسی ایک فن پر مہم نہیں کرتی تھی۔ آواز کے علم میں طبیعت پر چھٹے نہ پائے اور دل میں طرح طرح کے شوق پلنے رہے۔ شاعری کے علاوہ کالم کالم آیا۔ اس علم کو اہل کمال سے نہ صرف حاصل کیا بلکہ اس میں بہت کچھ لگا۔ (۸) طبعاً آپ حکمت و طبیعت کو دل سے چاہتے اور سراج تھے کہیں کہیں

ابو بکرؓ تھا۔ اتفاقاً میں آپ سے قادری میں شعر کہیں شروع کیا لیکن آپ کا دفتر کلام اللہ
 میں ہے۔ آپ نے پہلے شعر کی اصلاح کرد نصیر خان سے کر لی تھی۔ اگرچہ طب و شعر
 میں باہر و بی دوست تھے، لیکن کبھی بھی آپ نے شاعری اور طبابت (حکمت) کو ہیلہ
 حوالہ نہیں دیا۔ میں عالم طبابت میں جہانگیر آباد، سہوان، جناح، دہلی اور سوات پور کے
 سرکے۔ دیکھو جا کر کہتے ہیں:

دل سے دیکھو میں آیا ہوں شوق

دیوان بھولا آئے ہیں دیوانہ تر میں ہم

پوری مری سہوان گئے وہاں فرماتے ہیں۔

بھولا دی کو سہوان آیا

پرزہ گری میں دکھانوں میں (۹)

آپ نے سربلی اور خوشاد گولی سے سخت لڑتے گئے۔ بارہ اور قادری دواؤں نے ہاتھوں
 میں آپ نے دیا سربلی سے پرہیز کیا۔ دوسرے اشعار میں صرف دو قصیدوں کا ذکر ملتا ہے۔
 یہ قصیدہ آپ نے دہلی سے لکھنؤ سے لکھنؤ کے طور پر کیا۔ دوسرے لکھنؤ میں
 لکھنؤ میں چائے کے ٹکڑوں تھے اور وہی میں رہتے تھے۔ ان کی عادتیں شہر شہر مشہور
 تھیں۔ یہ لکھنؤ سے ایک ہاتھی نہیں تھا۔ عطا کیا تھا۔ ان کے ٹکڑے کے طور پر
 دہلی دیا گیا جس کا مطلع ہے:

مکھ بولی تو کیا ہوا ہے وہی تر و آخری

کھڑت درد سے پہا شعر طبع قادری (۱۰)

دہلی دہلی کی کہانیاں میں موزوں ہیں۔ (۱۱)

ان کی تعریف اور دوسرے ہاتھ کی ہے آپ کے نظریات زندگی کا ایک ہون

دہلی دہلی کتب میں بولی اور لہجہ مطلقاً قرآن میں پہلی تھی کوہہ عاقبتی میں

کفل مجھے۔ جس کا ذکر اپنی شکوہی کتابت ستم (۱۳۳۱ھ) میں خود کرتے ہیں (۱۲)۔ آپ نے
قاری ایمان میں اپنے مثنوی کا ذکر یوں کرتے ہیں:

قاری نہ مثنوی آن علم جان بہ لب آمد ز مثنوی

کافر بہار سر کھنڈ، از خاک مومن خان (۱۳)

تعلیم مومن کے والد حکیم غلام نبی خان نے آپ کی تعلیم پر خصوصاً توجہ دی۔ آپ کو

شاہ عبدالقادر کے پاس بھیجا تاکہ عربی، فارسی، لغت، منطق و معانی کی تعلیمات سے بہرہ ور

ہو سکیں۔ آپ کا ذہن اس قدر توانا اور حافظہ اتنا قوی تھا کہ شاہ عبدالقادر نے ظاہری مرید

علوم کے ساتھ ساتھ علوم باطنی اور اس کے اسرار و رموز سے بھی آپ کو آشنا کیا۔ آپ

حافظ قرآن بھی تھے۔ آپ نے شعر و ادب میں اعلیٰ و ارفع مقام حاصل کیا۔ مومن

الہوری، شاکانی اور ابوالفرج رندی کے مقابلے اپنے ذکر یوں کرتے ہیں:

دبہ ام گھٹنی کہا یاد

کہ بہ ریحان دل خشن و خاشاک

الہوری گر بہ است دامن خورشید

بوالفرج گرز دست دامن سہاک (۱۴)

من گویم ز قدر شاکانی

چہ توان کردن بہ ستم و آک (۱۵)

مومن خان مومن سجادہ شامی (علم نجوم) اور علم دل میں بھی کافی دسترس رکھتے

تھے۔ لیکن جیسا کہ پہلے ذکر کیا جا چکا ہے، انہوں نے ان علوم سے کبھی باطنی کام لیا

نہیں۔ مومن کہتے ہیں:

ح طاب و اکرم پے باشد

روزم ہر شب - علم پے باشد

پیارے شام و عوام

ح طاب و اکرم پے باشد (۱۳)

حب پرانی (حب سختی) میں کافی مہارت حاصل تھی۔ اس کے علاوہ موسیقی اور شطرنج بازی میں بھی بے ہمت تھے۔ علم میں تو کافی اہلی اور بے کے حامل تھے۔ ان کے پاس ہر قسم کی موسیقی کے علم میں استاد مانے جاتے تھے۔ آپ نے کسی سے موسیقی کی تعلیم حاصل کی۔ اس علم میں تو سر بھی طوری تھے۔ غوری موسیقی کی دشمنی ترمیم دیتے اور غوری ساز بھی جانتے۔ اپنے اس نگر اور مہارت پر خود نازاں ہیں۔ کہتے ہیں

نغمہ نغمی و خوش آوازی میں

شہر گوئی و نغمہ طواری میں

کو ساری کو زندگی سے تعبیر کرتے ہیں اور چنگ نوازی کو کان کے لیے نوازش کا وسیلہ سمجھتے ہیں۔ کہتے ہیں

زجرہ سازی سے دستاوی

چنگ نوازی گوش نوازی

ہاست اور موسیقی: حکیم موسیٰ خان موسیٰ موسیقی دان اور (حکیم) شطرنج کے ماہر نوازی، علم میں اور علم نجوم میں ماہر ہے حکیم و حکیم تو تھے ہی، آپ ایک اچھے سیاست دان بھی تھے آپ کے شعور سے پتہ چلتا ہے کہ حکمت و ہمت سے کافی اختلاف رکھتے تھے۔ سرزمین علم و حکمتوں کے کام اور اقتدار اور تعلق سے بھی ماضی نہیں رہے۔ ایک قصیدے میں لکھتے ہیں

ایسا مصوبیان ہے لب و لسان

جان کن و جان آفرین (۱۵)

افغانستان ہے انگریزوں کا تسلط کالی طریقے سے ہے۔ ۱۹۶۹ء تا ۱۹۸۴ء میں
جب انگریزوں نے سرزمین میں قابض تھا۔ جہاں آباد میں دوسرے لوگوں کی گستاخات
آپ نے قلم و تاریخ کہا ہے۔

ہو ادب انان دار آو بخت

زہنی کاثران پریت نصیب

برآورد سر مومن ما و گت

کہ نصرت من اللہ واقع قرب

شادی آپ ایک آزاد مٹش اور عاشق مزاج شاعر تھے اور جیسا کہ اہل دل خانوادگی
زندگی کی طرف سے بے اعتنا ہوا کرتے ہیں۔ مومن بھی ایک لاپرواہ قسم کے انسان تھے اور
ان کی یہی روش ازدواجی زندگی میں ناکامی کا سبب بنی اور یہ ظاہر آپ کی شادی جو آپ
کے والد کی وفات کے بعد منعقد ہوئی تھی، کچھ زیادہ کامیاب نہ ہوئی۔ آپ نے وہ
شادی کی۔ پہلی بیوی سے آپ کے کوئی اولاد نہیں۔ دوسری شریک حیات سے دو بچے
ہوئے ایک بیٹی اور ایک بیٹا۔ صاحبزادے کا نام شولیب احمد نصیر خان اور صاحبزادی، بی بی
نجیم صاحبہ یہ دونوں آپ کی شریک حیات، انجمن النساء، نجیم کے وطن سے تھے۔ مومن اپنے
ان دونوں بچوں سے بہت محبت کرتے تھے۔ ان کی تعلیم و تربیت پر آپ نے بہت
توجہ کی۔

مذہب اور مومن: باوجود اس کے کہ کہتے ہیں اور لکھا گیا ہے کہ مومن ایک مذہب
عاشق مزاج شاعر تھے۔ نظر ہازی، عیاشی و سہل پسندی آپ کی طبیعت کا خاصہ تھا لیکن دعا
اور پالنا مومن ایک مذہب پرست اور دین دار انسان تھے۔ مدرسہ شاعر عبدالعزیز میں شاعر

یہ سارے کے سارے زانے کنوڑے کیا اور ان سے یہ عالم دینی سے دینی کام حاصل کیا
 یہ بات خود اس امر پر دلالت کرتا ہے کہ آپ دینی علوم سے بہرہ و اپنی رکھتے تھے اور
 آپ انہی پر غی کے مرتب تھے اور مولیٰ اسماعیل صاحب کو اپنا وارث مقرر رکھتے تھے۔
 اور انہی کو فریضی کہتے تھے۔ لیکن بدعت پند نہیں تھے۔ کتاب و سنت سے گروہ تلف
 تھے اور ذاتی طور پر اس پر عمل ہی دیکھتے تھے اور کہتے ہیں

گوید ہون دکنر و صیان عدم
 دین یک تن و قلعان عدم
 مومن شوم بھری منجی
 آنچه شد از مستغان عدم (۱۷)

یہ سارے غری اور لڑو شامی میں رہا عیادت، قصائد اور قطعات میں حضرت رسول اکرم
 و صلوات اللہ علیہ وسلم پر ہوا، دینی اور علم سے عقیدت کا اظہار کیا ہے۔ مثلاً فرماتے

مروء کہ خاکی زہری بزدلہ ایم
 لہان لہان قدم پہ مگر زود ایم
 سرایم رہا عاری واپ
 دلی کہ یہ دہان ویر زود ایم (۱۸)

یہ سارے لڑو شامی سے لکھو سزا نہ چاہا اور نہ ہی اس امید پر کسی کی مدد سرائی کی۔ اپنے
 لہان لہان قدم پہ مگر زود ایم، سو بھلی دکنر سرائی سے بھی مالی منفعت حاصل نہ
 کیا کہ دینی علوم سے مالی مفاد حاصل کرنا ذاتی طور پر آپ کو پسند نہیں تھا۔ صرف
 دینی امور میں دینی و ایمانی و ایمان کے حاصل سے اور یہ بگروہ وادہ سے
 دینی امور ہی پر گروہ وادہ کے کی اور ہی پر دینی دیکھ کر تھے۔ (۱۹)

دہلی ۱۳۶۸ھ تا ۱۸۵۴ء

موسى کا نام علم انگيز تھا۔ آپ نے مگر کي بہت مہمت اسے باہم ہونے کے لیے کرنا چاہی۔
 وہاں پہلا اور بہت سے پہلے گراہے۔ ہاتھ اور ہار ادا ہوئے گئے۔ مگر ان سوانے کے ہاں
 اس سوانے کے ہاں نہ اور وہاں پانگے۔ خود کہتے ہیں کہ پانگے میں پانگے سے پانگے
 ہاں میں ہاں کا (۲۰)۔ پانگے نہ اور وہاں کہ۔ خود اپنے قصہ میں اس واقعہ کا

موسى کہہ کر باہم انگيز ہاں ہاں ہاں
 خود پانگے انگيز ہاں ہاں ہاں ہاں
 انگيز کہ ہاں ہاں ہاں ہاں ہاں ہاں
 ہاں ہاں انگيز ہاں ہاں ہاں ہاں ہاں

(۱۳۶۸ھ تا ۱۸۵۴ء)

مرزا اسد اللہ خان غالب نے اس وقت لکھی تھی کہ اس قصہ کو لکھا اور موسیٰ کی وفات پر
 اسوں کو لکھا گیا۔ آپ کی تاریخ وفات مرزا غالب نے کیم شعبان ۱۲۸۱ھ تا ۱۲۸۲ھ
 ۱۸۵۴ء بروز جمعہ کو ہے۔ اس طرح غالب نے ایک روایت میں موسیٰ کی وفات پر
 ان الفاظ میں علم و اسوں کا لکھا گیا ہے:

شرط است کہ ہوا کی خرابی ہو مر
 لکھا ہے یہ سنا نہ ہو پانگے ہو مر
 کافر پانگے ہو مر
 چنان کہ ہے پانگے پانگے ہو مر (۲۱)

موسیٰ کے شاگرد حکیم موسیٰ خان موسیٰ شعر و صحبت اور خیر و ان کے اہل و عیال
 اساتذہ میں شمار ہوتے تھے۔ آپ کے شاگردوں کی تعداد بہت زیادہ ہے۔ ان میں
 ہر ایک یہ ذات خود اسب و شاعر و فرزند تھا۔ آپ کے مشہور شاگردوں کے نام

بہارِ نئی
 نواب محمد مصطفیٰ خان، مجلسِ شہداء (سالِ پیدائش ۱۲۲۱ھ بمطابق ۱۸۰۶ء) صاحبِ تذکرہ

پہرہ، مجلسِ شہداء (۲۲)

مرزا مالک مرثیہ خان مظفرنگ بہار

نواب اکبر خان

میر حسین نسیم، جائے پیدائش دہلی، انتہائی ذکی الفطن تھے۔

تیسرے بیٹے مولیٰ، مجلسِ آشت، جائے پیدائش دہلی (۲۳)

سید۔ علام علی خان اہشت

نواب علام خاص کریم، اہلئے غازی سون، میں آپ کا ذکر ہے۔ آپ کا نام نسیم

تھا۔ (۲۴)

عظیم خیر الدین ہاس (۲۵)

نواب مولیٰ خان ظریف پیلے اسلئے مجلس کرتے تھے، مہرجم اور ظریف مجلس

(۲۶)

میرزا محمد اہل قیصر شہزادے (۲۷)

نواب محمد صاحب بی (سومن کی محبوب ترین شاگردوں میں سے تھے اور میں

نہایت ہی تھے۔ (۲۸)

ان شاگردوں کے علاوہ سومن خان سومن کی زندگی میں کچھ ہم لکھنوں اور

انہوں میں بہت حاصل تھی۔ یہ مختلف چیزوں سے آپ کے ہم صحبت رہے ہیں۔

نواب کے اہلئے گرامی سومن کے قلمدانے تاریخ وقات کے ضمن میں آتے ہیں۔

نواب محمد نسیم خان، ۱۸۰۶ء میں مولیٰ خان، عظیم احسن خان اور عظیم سکھانہ

مومن و نیر و سہابی و علوی و اللہ
 صرتی اشرف و آزادہ پور اعظم شان
 غالب سوتہ جان گرچہ نیرزا بہ شہر
 بستہ در بزم علمی محض و بزم شان (۳۱)

آپ کے دوست اور ہم عصر شیفتہ آپ کے بارے میں کہتے ہیں۔ "تقریب کے
 پہل میں بے قوت شاعری میں ان کو حاصل ہے۔ کسی کو کم ہی حاصل ہوئی ہوگی۔ ان
 کا کام ہر صنف میں وہ دیکھ رکھتا ہے کہ جو دوسروں کو کسی ایک صنف میں بھی سمجھ نہیں
 سکتے۔ (۳۲)۔ آگے چلی کر شیفتہ کہتے ہیں: "بزم وادعت سے لے کر اس وقت تک، اس
 بیت کی تاریخ انہوں کی جہان آباد اور اس شعر کے پانچوں سے ہے وہ کہیں نہیں گئے۔
 پانچ تیسے مزاج دستوں اور شیریں دامن شاہدوں کی صحبت میں ان گزارتے
 تے۔" (۳۳)

دکتر دہر احمد ریسوی اپنی تصنیف "تاریخ جدید اردو نثر" میں آپ کی شعری
 بات کا یہی اعتراف کرتے ہیں۔ غالب، مومن و ظفر نوزل میں میر کی روایت کو لاندہ
 رہتے ہیں۔ دہلی کی شاعری میں مومن کی لطافت و نزاکت شتم ہے۔

مہاک آب بیات محمد حسین آزاد کہتے ہیں۔ "نثر میں ان کے خیالات
 بعد نازک اور مضامین عالی ہیں اور استعارہ و تخیل کے زور نے اور بھی اعلیٰ درجے پر
 پہنچے۔ ان میں سوادات عاشقانہ خوب مزے سے ادا کئے ہیں۔ اشعار میں فارسی کی
 دہلیزیں اور انہیں تراشیں ہیں کہ اردو کی سلاست میں اشکال پیدا کرتی ہیں۔" (۳۴)

نہیں اور انہوں کے استعمال نے مومن کے کلام کو لکھن کر رکھا ہے۔

۔۔۔ کہ وہاں ہے یہ لٹوٹی اثر انہاں ہوگا

مٹر میں کون مرے حال کا پرہاں ہوگا

پھر اہل ہند کو کہہ کر حضرت بھی
 اچھا نہ کریں گے تو کچھ اچھا نہ کریں گے
 ہم اسے شہرِ عتیق پھری پڑی کہیں ہا کھانا
 تک لینی لیا کہ نہ عالم ہند نہ گئی
 وقتے لیرت شہر جہا نے کام کیا
 کہ اب ہوں سے بھی اے اے برابری گزرتے

مومن جان مومن نے اپنے علم نجوم کی مہارت کو ایک نوزل کے شعر میں کہا ہے کہ لہذا یہ لہذا سے
 بیان کیا ہے۔

ان نصیحوں پر کیا آخر نکاس

آسان بھی کیا ختم ایجاد ہے (۳۵)

شہری کی روایت میں مومن کا پتا ہی رنگ ہے۔ مومن کی شہری پر پھر مومن کی سر پہنچا
 اثر غالب ہے۔ انسانی جذبات قدرتی عناصر، عالم ہند اور ہندو مت کے عقلموں اور مومن
 روح کے قوانین کو اپنے نفسوں انداز میں بیان کرتے ہیں۔ ان کی شہریوں زبان کے لہذا
 سے نوزل کا انداز لے ہوئے ہیں۔ (۳۶) شہری کا انداز ملاحظہ ہو

وہ ہاتھ کو زور سے چھڑا

وہ ترا آپ کسی شہرا

وہ چنے پہ لیت کے جہا

مطلب کے کمن پہ زور جہا

بے نام اب تو وہ ہوا

بہن چھوڑ خدا کے واسطے چھوڑ

قلعہ تارنگ کہنے میں خاص مگر کہتے تھے۔ شاہ مہر اوسر کا قلعہ تارنگ وقت ملاحظہ ہو۔

دوست ہے وہ اور اجلی سے ہے ہر وہاں ہو گئے
 غمزداری، فطرت و ہر صفت و اکرم، علم و عمل

۱۳۳۹ھ

نور پائے چرخِ وقت اور مضمون کے علاوہ پہیلیاں بھی لکھی ہیں۔ پہیلی کا انداز لکھا ہے۔

نہ بولے وہ جب تک کہ کوئی پائے

نہ لفظ نہ سستی کہہ میں نہ کہ آئے

نہیں چہ ہے وہ فطرت ہے

نہانے کا سوال کیا ہے

شب و روز ٹوٹا پھولا کس

اس طرح سے ۱۴ کوٹیا کرے (۳۷)

۱۱ چوں نے مومن کی زندگی پر بہت گہرا اثر ڈالا ہے۔ ایک جن کی زندگی

چلی اور دوسری صوبہ کے ساتھ گہری وابستگی اور بزرگانِ دین کے ساتھ عقیدت و محبت

شعرا کی طرف سے مومن میں کہا جاتا ہے کہ ان کی پاروں پہنچی ہوئی۔ جس کا ذکر مثنویوں میں

کئے ہیں۔ سب سے اہم پہنچی کا ذکر جن کے دوست اور شاگرد اچلتے نے اپنے

مہذب ذکر شعرا "فطرت ہے خار" میں کیا ہے۔ (۳۸) مومن کی دوسری مشق مثنویوں میں

یہ نام صراحت کے نزدیک جن کی آپ دیکھیں ہیں۔ مومن کی فزول کی سب سے بڑی

مہبت یہ قسم کی لگی ہے کہ اس میں "محبت" محبوب ہے۔ یہ خصوصیت مومن کے طرز

کمال کی بہت جن کی فزول کوئی ہے۔ (۳۹) مومن کا یہ مشہور اور مقبول عام شعرا جن

کلامِ انبیا کا بجز یہ تو نہیں ہے۔

مگر ساری تو کی عشق میں مومن

آئینی وقت میں کیا خاک مسلاں ہوں گے

موسم کی تربیت جس ماحول میں ہوئی اس نے ان کی طبیعت پر بہت گہرے
 اثرات مرتب کیے اور اسی کا نتیجہ تھا کہ انہیں مذہب سے خاصا شغف رہا۔ چنانچہ
 مہد مہرین کے خاندان سے ان کا خاندان کے بہت قریبی رشتہ تھے، اس لیے انہوں نے
 کتاب و سنت کو اپنے علاقہ کی بنیاد بنایا تھا۔ کلب علی خان قاسمی کہتے ہیں کہ ۱۹۵۰ء
 کے لگ بھگ، موسم کا انداز اور رشتہ خاندانی تھا۔ اور وہ عشقِ باذنی سے کاہنہ گل ہوا
 ۔ موسم کی غزل، غزل کی شوقی، عشقی، بھڑ اور مزیت کی بہترین ترجمان کی جا سکتی ہے۔
 ان کی اردو شاعری میں ایران کے ماہی ہر شاعر عربی کا انداز نمایاں ہے۔ لہذا کام کے
 یہ چند اشعار ملاحظہ ہوں:

۔ ہے یہ غم گور میں رنجِ شبِ اول سے فزوں
 کہ وہ مہرہ مرے ماتم میں یہ نہاں ہوا
 ۔ لے رقیب سے وہ جب سے وصل ہوا
 دہلی جان گئی ایسے جگمگ کے لیے
 ۔ کیا کیا جوابِ غمور میں باتیں بنا گیا
 لوب بھی دلِ دستِ اسی دلِ سخن سے ہے
 ۔ مگے وہ خواب سے اٹھ لیر کے مگر آخر شب
 اپنے ہالے لے دکھایا یہ اثرِ آخر شب
 ۔ جاگ ہوسے سے یہ لہزے ہیں تو اسے ہوا شگ
 ایک میں کیا کہ بھی جاگ کر جاں ہوں گے
 ۔ دہلی پاکی دہلی کی گواہی مرے آنسو
 اسی یوسف ہے درد کا اہل تو دیکھ

کہاں ہے ناؤ تو سے کان بچتے ہیں انہوں
 تم ہے مجھ کو سونے والا کے آنے کی
 سونے نہ ملتی میں وہ تک وہ سونے نہ ہوا
 ہونے ہاں ہے وہ دل جو ہونے ہاں نہ ہوا
 بعد جزا جو قابل دل جو خطاب ہی
 میرا سوال ہی سرتوں کا جواب تھا

۰۰۰۰۰۰۰۰۰۰۰

حواشی

- ۱۔ آپ بیات مہولی گوئین آزاد میں ۲۸۲
- ۲۔ لہذا ان الفاظ اسلوب ج ۲۱ (کے سپاہیوں) میں ۸۳۵
- ۳۔ آپ بیات مہولی گوئین آزاد میں ۲۸۲
- ۴۔ لہذا ان الفاظ اسلوب ج ۲۱ (کے سپاہیوں) میں ۸۳۵
- ۵۔ لہذا ان الفاظ اسلوب ج ۲۱ (کے سپاہیوں) میں ۸۳۵
- ۶۔ جنت شہر میں ۲۲۳، سونے ہواں کی شاعری میں ۲۶
- ۷۔ لہذا ان الفاظ اسلوب ج ۲۱ (کے سپاہیوں) میں ۸۳۵
- ۸۔ آپ بیات مہولی گوئین آزاد میں ۲۸۲
- ۹۔ لہذا ان الفاظ اسلوب ج ۲۱

۱۰. کتابت کاتب ج ۳۳ میں ۳۰۸، ۳۰۹

۱۱. کتب کے بارے میں ۳۲۶

۱۲. کتب کا

۱۳. آب حیات میں ۳۸۸

۱۴. کتب کا ۳۸۳

۱۵. آب حیات میں ۳۹۰

۱۶. کتب

۱۷. اردو اور سوانح اسلام میں ۸۳۵

۱۸. کتب کا ۸۳۹

ماخذ و منابع

۱. آب حیات، مولوی محمد حسین آزاد، شیخ کلام علی ایضاً سزا، طبعی پرچک پریس لاہور
۲. اردو اور سوانح اسلام، ج ۱، طبع اول، پنجاب پبلیشرز لاہور، ۱۹۸۷ء
۳. انیسویں سوئس (اردو و فارسی) مرتبہ و مترجم ڈاکٹر سعید احمد صدیقی، کاتب اکیڈمی، دہلی

دہلی، ۱۹۷۷ء

۴. جہان آباد اردو ڈاکٹر جمیل چلی، مجلس ترقی ادب لاہور، طبع سوم، ۱۹۹۳ء
۵. جہان آباد اردو ڈاکٹر محمد امجد علی، مجلس یک کاؤنڈیشن، طبع اول، ۱۹۸۸ء
۶. ڈاکٹر شعرائے اردو، مولانا محمد سعید الرحمن خان، انجمن ترقی اردو، دہلی، ۱۹۳۷ء
۷. آب حیات میں، مرقیہ گوہری، چنگی پریس، دہلی، ۱۹۳۵ء
۸. آب حیات میں، مکی علی خان قاسمی (مترجم)، اورنگ علی شاہ میگزین، نومبر ۱۹۵۹ء
۹. کتابت کاتب مرتبہ سید مرثیہ حسین کاظمی، ج ۳، مجلس ترقی ادب
لاہور، ۱۹۷۷ء

۱۰۔ کلیاتِ مومن (مومن خان مومن) چنگی ڈاکٹر اہقراد احمد خان (اردو کلاسیک ادب) ج

۱۰۔ مجلس ترقی ادب لاہور، ۱۹۶۳ء

۱۱۔ تذکرہ گلشن بے خار، نواب محمد مصطفیٰ خان شیلو، نجیس آئیڈی، نومبر ۱۹۶۳ء

۱۲۔ تذکرہ بے خار، نواب محمد مصطفیٰ خان شیلو، مرجع کتب ملی خان فائق، مجلس ترقی ادب

لاہور، ۱۹۶۳ء

۱۳۔ دیوانِ مومن، مرجع ضیاء، احمد ہدایتی، الہ آباد، ۱۹۳۳ء

۱۴۔ دیوانِ مومن خان مومن (فارسی) احرام الدولہ حکیم محمد اللہ خان بہادر، مطبع سلطانی

۱۹۳۷ء

۱۵۔ مومن اور اس کی شاعری، ڈاکٹر سرین اختر، ادارہ تحقیق و تصنیف پاکستان، لاہور

ن م راشد: پس منظر و پیش منظر

جدید عہد میں صرف بیسویں صدی کے ابتدائی پچاس سال ہی ایسے ہیں جن میں ہمارے ہاں پہلی بار دینی سطح پر ایک ہم گیر تحریک کا مل نظر آتا ہے جو کہ ہندوستان میں پہلی سرمایہ دارانہ قوتوں کی سیاسی معاشی جدوجہد کے نتیجے میں ظہور پذیر ہوا تھا۔ اس عمل سے قریب تین سو سال کی عیسیت سے ہمارے پہلے جدید منظر سرسید احمد خاں نے مسلمانوں کے ذہنی مستقبل کے لئے جن روشن خیالی اور نثر اور روز تصورات کا اظہار کیا تھا، بیسویں صدی کے نصف اول میں 11 جزی صد تک ہماری *Intelligentsia* کے تنہا ہی شعور اور مستقبل پر آگے کا حصہ بن کر ایک نئے سماج کے خواب کی صورت میں بچنے لگے۔ جن سیاسی معاشی تبدیلیوں کا ذکر میں نے کیا ہے وہ یہاں کے لوگوں کا دینی یا سماجی مطالبہ نہ تھیں بلکہ ان کا خصوصاً کے جاگیردار کی مدد سے ایک سرمایہ داری طاقت کے خام مال اور مصنوعات کیلئے ایک اقتصادی انتظام کرنا تھا۔ ظاہر ہے ایسے نوآبادیاتی نظام میں قرون وسطیٰ کے جاگیردار اور جدید یورپی سرمایہ داری نظاموں کی مستند، فعال اور مثبت خصوصیات ممکن ہی نہیں اس جاگیردارانہ نوآبادیت کے باعث بیسویں صدی کے نصف اول میں مسلمانوں کا اپنی اپنی سماجی قوم پرستی کی مذہبی بنیادوں سے اگلے مرحلوں میں نہ جاسکا۔ لہذا 1947ء کے شاہراہ اسلام تک پہنچی ہوئی اس سفر نے علامہ اقبال کو متشکل کیا۔ عالمی سطح پر یورپی اقوام کے عظیم تصادم کی پیدا کردہ نفسیات نے شام و مشرق کو مجبور کیا کہ وہ عرب کے حجاز فکر سے اٹکے جو کہ مسلم قوم کو اس عالمی بساط پر ایک طاقت کے طور پر متعارف کرانے کے لئے اقبال نے ایک فکری نظام بھی وضع کیا۔ یہ اشتراکی نظام فکر کے

مروج کا اور قدر سرمایہ داری نظام تو سرمایہ کی اتنی سی سیاحت کے ارتقا کے نتیجے میں
 متکفل ہوا تھا لیکن اشتراکی اور اقابلی نظام دو نظریوں کے ایسے تصورات اور نظریے تھے جو
 باہمی نظری مسابقت کے باوجود سرمایہ داریت اور اس کی سجا کرہ خواہشات کے نتیجے میں
 تصور پذیر ہونے تھے لہذا ادارے ہاں جہاں جاگیر داری نوآبادیاتی نظام تھا وہیں متکفل کی
 ترقی کے اقابلی یا اشتراکی راستے میں سے کسی ایک کا انتخاب ہی نظریے سے وابستگی قرار
 پڑا۔ جبکہ عالمی سرمایے اور سرمایہ داروں تو ان کا امن کے حصولی اپنا بھی ایک فیصلہ تھا جس نے
 بعد میں ادارے ہاں ان دنوں پر حاوی آجاتا تھا۔ یہ یہاں کے نوآبادیاتی نظام کا رد عمل
 بھی ہو سکتا ہے کہ سرمایہ داروں کی سمیت ترقی کا یہ دینی سرمایہ دارانہ دستہ اپنا نئے دامن کی فکر
 کو بطور سیاسی و انتظامی نظریے نہ صرف قبول نہ کیا گیا بلکہ انہیں ملک کی نگاہ سے بھی روکنا
 گیا یہ بات بھی یہاں کی جاگیر دارانہ نوآبادیاتی قوتوں کے حق میں گئی۔ لیکن سرمایہ داروں کی
 اور ان کے بعد آنے والے تمام تبدیلی پسند اور جہاں کے ہاں یہ دینی نظریے کے جدید تصور
 خیالی و مقامات سرایت کر گئے۔ یہ ہے وہ تمام نظریے اور جس میں ان م راشد کا بھی
 ارتقا ہوا۔

راشد ادارے ہاں دانشوری کی اس تحریک سے وابستہ تھے جو سرمایہ دارانہ
 ہوئی تھی اور جس میں بیسویں صدی کے نصف اول میں سامراج دشمنی اور بددینی
 میں رہتے ہوئے علیحدہ تشخص کا مسئلہ بھی اس کا حصہ بن گیا تھا۔ اشتراکی ترقی پسندی کا
 ذرا ایک طرف رکھیے اور راشد اور اقابلی کے ذہنی رد واپار کو سامنے رکھتے ہوئے اگر بات
 کیجئے تو راشد اپنی نظری بنیاد کو الگ طریقے سے سمجھتے نظر آتے ہیں لیکن اس طرح کہ
 یہاں وہ بہت کچھ شعوری طور پر ترتیب دیتے ہیں وہاں بہت کچھ ان کے نہ جانے ہونے
 بھی اور شعوری طور پر ترتیب پا جاتا ہے۔ لہذا ماضی کی مخالفت کے باوجود انہیں ان کے ہاں
 اور آتا ہے بلکہ ان کے باوجود انہاں کی شاعری میں سرمایہ دارانہ کے ہونے سے تشبیہ ہے

طرح بیب میں ایک فرقہ اور وہ ہے جس میں عکس کلی نہ کہ کسی شکر کامل۔ یہ وہی ہے
 کی طرح راشد کے وہی سطر میں بھی اس کے صرف میں سہارے کے اعلیٰ فکر اور
 تھکے سہارے وہ بھی دل۔ روح اور وہاں کی جہانے انہیں ہضم اور مادیت کی اس میں
 راشد ان کا اظہار رنگی پالم کی نرم لولہ میں لولہ کلائی لولہ کی تکرار سے روح میں خطاب کی
 صورتوں میں سوال کے قالب میں آئے ہیں کہ رہا کہ شعور ہیٹھ ۱۹۳۰ء کے آسپے پہلے
 کہتی فکر کی حریفیں ملے کرتے ہے۔ وہ عکس انہیں اور زمانوں کے شعور کی وہ عکس ہیں
 سے راشد کی شاعری ہماری چڑی ہے اس کے ۱۹۳۰ء کی ہادیت سے ہم ملتی ہے
 سوالات کا یہ سلسلہ راشد کی جس جنمو کی نکتہ ہی کرتا ہے اس کے تھقی ہنگامہ کے شکی
 شعری بیبت کی ضرورت تھی گویا بیبت ایک فکری تھقی نکالنا ہے۔ اسی کے بیبت میں کی
 مادیت میں آئے وہ شاعری کا کوئی نا حال نہیں ہوتا۔ لیکن ہمارے کی شعرا اس سلسلے
 اسی حوالے سے قبول کیا ہے اور وہ ہدیہ علم کی بیبت میں غیر فکری شاعری کہہ سکتے ہیں۔
 ان کے ہاں شعور کی تہ بہ ہواد اور بیبت اس طرح سے اٹھنے ہوتے ہیں جیسے ایک ہوا
 صورت کوئی سامان چہر کرتی ہے جس میں بیاز، قوم اور مصلحت شعور ہے میں ایک ایک تجربے
 دکھائی دیتے ہیں اور پھر اس سامان کو کسی ہدیہ ہدیہ اپنی ایش کے ہم کے ساتھ چینی کرنا ہوتا
 ہے۔ یہ وہی دور کی ہے چلے، ہضم اور غیر واضح کیفیات، انسانی مسائل اور بیبت کے
 آزاد علم ایسی ناگزیر تھی کہ راشد کے ہاں موضوعی بیبت ہی جاتی ہے۔

نثر بات ہوتی تھی راشد کی فکر کی تو دیکھنے کہ اس طرح راشد اپنے نثر شعری
 اساس پر ہدیہ علم کی بنیادیں استوار کر رہے ہیں وہ کہتے ہیں تھکے سب سے لہذا انہیں
 اپنے بعض افکار سے بیبت رہی ہے اور ان کی رسالت کو میں نے ہم بنایا ہے۔ انہیں
 محض اصوات نہیں یا الفاظ کا کھیل نہیں بلکہ دوسروں کے افکار میں جہان بنا کے انہیں
 ڈر ہے ہے "یا در ہے راشد نے افکار میں جہان کی بات کی ہے نہ کہ جہان میں جہان

اور شاعری کے لئے کہا جاتا ہے۔ اس کا یہ بھی گونا ہے کہ "لوب کا مقصد شاعری کے ذہن
 میں باطنی تحریک پیدا کرنا ہے جو آزادانہ طور پر لہر کا ہارٹ جٹے اور اصل راشد لوب کو
 یہ تمام لہرات کے ذریعے ہائے نقیبات کے انہدام اور نئی اقدار کی تشکیل کا اہم
 کردار رکھتے ہیں۔ اس کی ممکن شاعری کے ذریعے شاعری کو سکون کی نیند سلانا نہیں چاہئے
 بلکہ وہ چاہے رازی اور سوز و حسرت رازی کی شکل میں سے وہ چاہے کہ "مبارک"
 برقی و سوز آفتاب اور ان چند کتابوں میں سے ایک ہے جن میں نیا شعور پہلے پہل پیدا
 کرنے کی اہمیت پر اس کے واسطے راضی کے پس منظر میں انہی شعروں کی گونج سنائی
 رہی ہے جو راشد لگا جاتے تھے۔ ان کے شاعری کی جدید دانشورانہ روایت میں اقبال
 نے برداشت کی تھا دکھائی دیتے ہیں۔ بچہ نگار سے ہیں دماغی لوب کی روایت کا رنگاں
 ہے کہ وہ ہے ان کے راشد کا نقش ہی اس کی تجلی اور انہیت اور بعض کے نزدیک
 زمینی کا سب سے گیا۔ سوچنے اگر خود مد اقبال کو رہتی پالیسی کا سہارا حاصل نہ ہوتا تو وہ
 نئی زمینی کی کس منزل پر ہوتا اور اصل شعروں صدی کا فلسفہ اول کارزار ہی ایسا تھا
 کہ ان میں آگاہی ستونیت کی بجائے مصری مطالبات، روح مصر سے عرفان کے حصول
 کے لئے اور سوج کی شکل میں پیغام یا نسب انہیں پر اسرار، اقداریت کی قننا، سیاسی سماجی
 بحث ہم مصر زندگی اور اس کے مسائل کا شعور و تجربہ سے لوب کی بنیاد بنے تھے پھر
 وہ ان کی بنیاد کی بنیاد شاعری کی طرح حقیقت نگاری پر رکھی گئی تھی۔ راشد کی اس بات
 پر اندازہ رکھئے کہ "وہ حساسی یا قہنی تجربہ شخصی جس میں قدیم شاعر دوسروں کے عشق
 لینے کے بہتے شعر مکتبہ مکتبہ آج سچوہ خیز ہو چکی ہے۔ آج کے شاعر کے لئے
 شعور ہے کہ وہ زندگی کو اپنی آنکھوں سے دیکھے، اپنے کانوں سے سنے اور اپنے دل سے
 لکھ لکھ۔ اس کے لئے صرف یہ جان کر کافی نہیں ہے کہ آنکھیں کیا دیکھ چکی ہیں
 لہذا یہ جان کر بھی ضروری ہے کہ آنکھیں آ کے چل کر کیا دیکھیں گی یا انہیں کیا دیکھنا

ہوتی۔ اس وقت ہندی کو ہندو علم کی بنیاد بناتے ہوئے وہ اہم اہم شاعری کے ساتھ
 ساتھ اور ان کی گریات پر ہم اسی زمانے کے انہماک کے حوالے سے انہیں کی شاعری کو بھی
 زبانوں قرار دیتے ہوئے کہتے ہیں کہ "انہیں کی شاعری تو ذرا سی مگر نعت اور پانچویں
 ہوتی" اس طرح کا بھی اور شاعری تو خیر ایک طرف رہی اور حالی سے جڑیں لگنے کی شعری
 گھر سے بھی نہیں نہیں تھے۔ بلکہ یہ سب لکھتے ہوئے منظر اور دانش میں بہت سے
 اثرات نظر آ رہے ہیں مثلاً گزیرہ، ہتھوڑا، انفرادیت، تکیہ، بے گناہی اور لاشی و مریوں کے
 الزامات، انیت اور حقیقت نگاری۔ یہ ان کی حقیقت نگاری اور انیت کی قسمی قسمی کی ہم
 سے وہاں اولی ملائیت اور پورا انیت کے معنوں میں سمجھتے تھے۔ حالانکہ دانش نے کہا ہے
 کہ "میں نے اپنی نگاروں میں ہرگز کسی کی تعظیم نہیں کی، بلکہ صرف شان کے بعد کی ہر شے
 اور سیاسی چیز و دہی پر صرف ذہنی کی قسمی میرے لئے یہ تسلیم کرنا ہیٹھ میری کنہ ہے کہ
 ترقی پسندوں کو میری نگاروں میں انہیں حکومت یا اقتدار کے خلاف آواز نہیں دے سکتی
 مذہبی رہا کاری، آمریت اور معاشرتی اور جذباتی پابندیوں کے خلاف میرے شعر و روایوں
 انہوں نے غصوں کیوں نہ کیا۔"

خیر چلے، منگو کی بات چلی ہے تو دانش کی نگار حقیقت نگاری کے لئے آگے
 لئے ذرا منگو سے مدد لیتے ہیں۔ ایک نظم دیکھئے!

بھاری چٹا ہوں نے ٹھکانا ہت سے پر چھا۔ "میں تو حکومت ہوں کی؟"
 عود کا دھواں آگ کے ہستر سے پریشان ہو کر اٹھا ہوا میں ساپ کی لڑائی
 نے مل کھا کر کہا۔ "تو میرے بیٹے کا راز ہے یا میں؟"
 لڑتے آسمان کی بجلی پھٹکی فضاؤں میں ہر قول کر رہے
 اور بہار نے خزاں کی غمی کھولی اور بلند درختوں سے سرگوشیاں شروع کر دیں
 طلوع آفتاب کی آزی تر بھی کر لوں کے شعر سے انہیں گواہ کرنا چاہئے کہ

منیر نیازی اور ناصر کاظمی کے موضوعات کا تقابلی جائزہ

تقابلی جائزہ اور اس کی اہمیت:

ہر دور میں لکائی مضامین یا جائزہ کی ضرورت کی عوامل سے اہمیت کی حامل رہتی ہے۔ یہ تقابلی جائزہ کہیں تو معاصرین میں ہوتا ہے۔ کئی قدیم اور جدید نویسوں کے مابین ایک لکھی اور مضمون مابین سب پر اترنا چاہیے ہوتا ہے۔ کہیں اس کی ضرورت مختلف ادوار کے موازنہ کی صورت امرتی ہے۔ اس کے باعث مختلف رویوں کی ایک ہی مہم اور اس کے نالے سے اختلاف کی نوعیت بھی ظاہر ہوتی ہے۔ مجموعی طور پر کہا جاسکتا ہے کہ تقابلی جائزے کی بدولت کسی ادیب یا ادیب کو چھوٹا یا بڑا، کمتر یا برتر ثابت کرنا محسوس نہیں ہوتا۔ بلکہ مندرجہ ذیل اہم نوعیت کے پہلو اور نتیجہ نیر نکات اس سے حاصل کیے جاسکتے ہیں۔

۱۔ شخصیت یا فن کے حوالے سے تقابلی مضامین زیادہ سے زیادہ وسعت مضامین اور نور و فکر کی ضرورت اور صلاحیت کو اہم دیتا ہے۔

۲۔ اس کی بدولت لکھی اور مصری رجحانات کے نئے نئے پہلو سامنے آتے ہیں۔

۳۔ تحقیق اور تنقید کی نئی نئی ضرورتیں پیدا ہوتی ہیں۔

۴۔ تقابلی جائزے کے نئے حوالے اور سمت مندرجہ روپے سامنے آتے ہیں۔

۵۔ تقابلی جائزہ ادبی سب پر بحث تنقید اور حوالہ خیالات کی نئی نئی صورتیں پیدا کرتا ہے۔

۶۔ موازنہ اور تقابلی کے باعث شخصیت، فن، مہم اور مصری تقابلی مہم مل کر نئے نئے نتائج کی حامل کرتے ہیں۔

انگریزی ادیب میں بھی تقابلی صورت حال کا حوالہ ملتا ہے۔ مثلاً W. Orth اور John Frost کے ہاں ہمیں نیچر ناظرہ ملتی ہے۔ ایک کا مقصد انگلینڈ سے اور دوسرے

کا تعلق امریکہ سے تھا۔ دونوں کے ہاں نیچر کا حوالہ فرق ہے۔ W. Worth کے ہاں نیچر ایک اخلاقی درس رکھتی ہے۔ یہ ایک Kind ہے، قسم ہے، راہنمائی ہے۔ بلکہ دوست کے ہاں نیچر ایک ایسی نظر ہے۔ یہاں اخلاقی درس نہیں اور نہ راہنمائی ہے۔ اسی طرح W. Worth اور کولنج کا جب تقابلی جائزہ لیا جاتا ہے۔ تو دونوں کا تعلق ایک ہی مہد ہے، ایک ہی سرزمین سے ہے۔ دونوں دوست ہیں۔ دونوں روایتی نہیں رکھتے ہیں۔ لیکن ایک نے نظریات کی بات کی۔ تو دوسرے نے باخلاق نظریات کو حوالہ دیا۔ یہاں فرق اگر وہی طرز احساس کا بھی ہے۔ اسی ضمن میں جب Teeth اور ایلیٹ کی علامت نگاری کا ذکر آتا ہے تو دونوں کا علامتی انداز اس حوالے سے فرق ہو جاتا ہے کہ Yeats کے علامتی آئیڈیل کے حوالے سے ہیں۔ جب کہ ایلیٹ کے ہاں علامتوں کا استعمال General عمومی طور پر ہوتا ہے۔

شعر و ادب کی بھی معاشرے کا اثر ہے۔ وہ اپنے مہد کا ترجمان ہوتا ہے۔ اس سے اس مہد کی انفرادی اور اجتماعی زندگی اور مختلف روایوں کی ترجمانی ہوتی ہے۔ ادب سے ہمیں روایت کا ایک تسلسل بھی ہاتھ آتا ہے جو اس بات کا نشان ہوتا ہے کہ مختلف نسلیں اور ادبی مہدات باہمی، حال اور مستقبل کے حوالے سے کیا رہے اور کیا رو سکتے ہیں۔

ادب ادب کی جو شعری اور ادبی روایت تقسیم سے پہلی پہلی آرہی تھی۔ آزادی کا سہارا اس میں ہے پانچ اضلاع اور مہدوں کو سمجھنے ہوئے ظہور ہوا۔ جہاں آزاد دہلی اور نئی سرزمین کا حوالہ تھا۔ وہاں ہجرت، درد و الم، مہاجرین کے مساکین، فداوات کی خون آشامی، مختلف رجحانوں سے بھرنے کا معدن، اداسی اور تجلی کے کرب چھے سارے موضوعات تھے درد و شعر و ادب کا نیا موضوع بن گئے۔ اس کے ساتھ ساتھ نئی آزاد سرزمین پر خود فریبی، باخلاق نظریات، نفسیاتی اور اخلاقی قدروں کی پامالی کا جو درد ہوا۔ یہ تمام حوالے لہذا ان مناسبات کے ساتھ درد و شعر و ادب میں داخل ہو گئے کہ وہیں تمام شعراء نے ہی ان موضوعات پر لکھا۔ جہاں پادریس محمد اکرم:

تقسیم کے بعد نئی سلطنت کے قیام کے ساتھ ہی اس نوزائیدہ ملک

کو لاتعداد مسائل کا سامنا کرنا چاہنا انہیں نے انہیں کے ساتھ
جس بربریت اور وحشت سے زندگی کا مظاہرہ کیا تھا۔ اس کے
بہرے تک مناظر سے ہمارے گھٹنے والے اور تک متاثر رہے اور ان کی
سوانح میں واضح تبدیلی پیدا ہوئی۔ (۱)

ان شعراء میں دو نام خصوصیت کے ساتھ قابل ذکر ہیں۔ میر تقی میر اور ناصر کاظمی۔ ان
دو نامی زندگی کے کرب میں ان کی ذاتی زندگی کے سچے تجربے بھی کھلے ہوئے تھے۔ مظاہر
ڈاکٹر رشید احمد گوریج ناصر کاظمی کے لیے لکھتے ہیں۔

”ناصر کاظمی غنوں کا دریا عبور کر کے پاکستان پہنچے تھے۔ پاکستان کی
تعلیم سے محرومی، کمزور مالی وسائل، سرکاری محسوس میں ٹھکر
ان کی اداسی میں ان کی ذات کی عمر میں بھی ہیں۔“ (۲)

مگر ہستی، وطن، شہر، بگیاں ان کا ایک ہی حوالہ ہے۔ آزادی کا اظہار، اپنی تہذیب کا،
سے سویروں کی توحید کا۔ اور رشتے باطنوں کی اس تلاش کا بھی جو حصول آزادی کی جدوجہد
میں منظر سے کاتب ہو گئے۔ اب مگر ہمیں یا بستیاں آباد ہوں۔ وطن کی آزادی کا موضوع
ظہور ہو یا بات اپنی تہذیب و سماجی کے حوالے سے ہو۔ معاملہ ایک ہی ہے کہ شاعر اس
مگر ہستی، وطن، شہر اور گلیوں کو آباد دیکھنا اور آباد رکھنا چاہتا ہے۔ میر تقی میر اور ناصر کاظمی
دونوں کے یہاں اس موضوع پر بہت بات ہوئی ہے۔ دونوں کا اپنا اپنا نقطہ نظر اور محسوس
قرن اسامی ہے۔ لیکن بنیادی خیال اور موضوع کی وحدت دونوں کے یہاں کم و بیش ایک
کی ہے۔ نیز میر تقی میر اس حوالے سے جب بات کرتے ہیں تو اس موضوع کے بھی گہری بات
لکھتے جاتے ہیں۔

اپنے گروں سے دور ہوں میں بگرتے ہوئے آوارہ لوگ

کبھی کبھی جب وقت چلے تو اپنے گھر بھی جاتے رہنا

لیکن جب گھر میں گھر کا تخت نہ ہو، اپنا بیت کے در بند ہو جائیں۔ رشتوں میں نا اہلی
اسانگیں۔ تو بگرتے ہوئے کے سوہنے کا انداز طریق ہو جاتا ہے۔

اب کون نظر ہے ہمارے لیے وہاں
 شام آگئی ہے لوٹ کے گھر جائیں ہم تو کیا
 بھی گھر اور جسم کا خارجی حوالہ ایک ہو جاتا ہے۔ اجنبیت کا احساس نہ ملے
 لگتا ہے۔ اپنے آپ سے ہی دوری کا کرب جاگ اٹتا ہے۔ گھر میں رہیں یا نہ رہیں۔
 دل و دماغ اس حوالے سے کوئی واضح سوچ نہیں رکھتے۔ بے چینی رہے گی، احساس تنہائی
 اور کچھ پا کر بھی نہ پائے گی کیفیت ساتھ ساتھ رہتی ہے۔

منہ گھر سے نکل کے ہم بھی
 بہت بہت دور دور اکیلے

اپنے گھر کو داپن جاؤ، وہ دور گھر بھاتا ہے
 جہاں بھی جاؤں میرا ساتھ پیچھے پیچھے آتا ہے
 سوار شہر سے ہی رک گیا تھا میں تو سیر
 اور ایک دشت با سیرے گھر کی راہ میں تھا
 مکان ہے قبر، جسے لوگ خود بناتے ہیں
 میں اپنے گھر میں ہوں یا میں کہی مزار میں ہوں
 رات کے سفیان گنبد میں رہتی ہے ہاں کی
 پیرے داروں کی سرداؤں کے طلسمی شور سے

جب کہ ہمارے یہ انداز دیکھتے ہیں میں نظر آتا ہے۔

اب وہ دریا، نہ وہ بہتی، نہ وہ لوگ
 کیا خبر کون کہاں تھا پہلے

بقول شیخ علی بابا

”منیر نازی کی شاعری تھرو تھرو اور خوف و ہراس کے جو مظہر دکھا
 رہی تھی۔ نئے شاعروں کی ایک پوری کلیپ ان پر یوں فریبت ہوئی
 کہ اس کے ہاں دشت و سرا سبکی سکے رانج اوقت میں گئی۔ مگر ان

میں سے کوئی بھی منیر یازدی کی تہیہ نہ کرے۔ (۳۲)
 دہشت، ڈر اور خوف کے عناصر بھی اس شخص اور شعر سے پیدا ہوتے ہیں۔
 یہ کوئی صورت حال واضح نہیں۔ ٹھنک و شہادت کی لفظ ہے۔ لیر یعنی امداد ہے۔ کیا
 یہاں اور کسی لفظ اور کیرا ماحول در قفل ہے۔ منیر اور ہسر کاگی دونوں کے ہاں اس
 کیفیت کا اظہار اسی حوالے سے ہوا ہے۔ منیر کا کہنا ہے

۔ شہر کی گھوٹوں میں گہری حیرتی گہری رہی
 رات بادل اس طرح آئے کہ میں تو ڈر گیا

یہ گ ہسر کا کہنا ہے

۔ گہنی اندھیری رات ہے دیکھو

اپنے آپ سے ڈر گتا ہے

حیرت کے ہاں ہجرت اور ملاقات کی باتوں نے بھی خوف و ہراس اور حیرت
 زیب کا حیرت گدہ سا بنا دیا۔

ہجرت اور قسارت نایک اور اہم موضوع اور حوالہ ہے جو دونوں شاعروں کے
 ہاں ملتا ہے۔ یہاں دونوں کے طرز احساس میں شکت، رنج اور درد مندی کا عنصر
 پایا جاتا ہے۔ ایک وہ یادیں جو ہجرت کے حوالے سے باطنی بن گئیں۔ دوسرا وہ رنج جو اب
 کی صورت حال میں سامنے موجود ہے۔ مثلاً ہسر کا گزشتہ سطر سے معلق کہنا ہے:

۔ وہ راز ستر نہ بیخیز ہسر

بہر اہک نہ غم کھنک کے ہوسے

۔ آ کے منزل پہ آگہ بھر آئی

سب حیرت و رشکان نے چھین لیا

یہ کہ منیر یازدی کا کہنا ہے:

۔ آنکھوں میں از رہی ہے کئی مصلحتوں کی دھول

ہجرت سوائے دہر ہے اور ہم ہیں دوستو

۔ یہ اپنی ہی منزلیں اور رفتگاہوں کی یاد
 تمہاریوں کا زہر ہے اور ہم ہیں دوستو
 ۔ لے جاتی ہے سارے خواب میرے
 یہ رات ہجرت کا عالم ہو گئی ہے

حقیقت یہ ہے کہ ہجرت دونوں کا تجربہ ہے ۔ وہ حادثہ جو دونوں شعراء پر
 گزرا اور بہ آزادی کا سورج طلوع ہوا۔ تو معاشرتی زندگی کی ہمواری، خود غرضی کی
 دنیا اور انسانی رویے ہی یکساں تھے ۔ سماج کا داخلی اور خارجی پیکر متضاد ہو کر ٹوٹ رہا
 تھا۔ یہاں پھر اس منظر پر اپنی موصوفات ان کی شاعری میں جگہ بناتے ہیں۔ ہجر
 کا کہنا ہے

۔ ان وہاں سے یہ لوہ کی بولی
 طلحہ کو خوف خدا کا نہ رہا
 ۔ کہیں آئی بہار اب کے وہیں
 ہونے خون ہے لہان میں گل کے

سوال یہ اہم ہے کہ کیا یہ شعرا کو زمین بہتی وہی تھیں جن کے لیے قربانیاں دی گئیں۔ کیا
 میں اس میں تھک کی حالت کا سفر تھا۔ حقیقت میں یہ شربا تھ آ پاور اگر نہیں آیا تو پھر اس
 نکتے پر حقیقت اور حقیقت کا تضاد زور پکارتا ہے ۔ زمین اکتا جاتا ہے ۔ انسانی رویوں کی
 ہمواریوں اور شعروں سے کہ شعروں نے کتنا ہے ۔ لیکن پھر بھی شکایت اپنے سے
 کی ہے۔

۔ حالت ہی یہی ہے تم نے تو میری اپنی
 جس شرم میں بھی رہنا اکتا ہے ہونے رہنا
 اب کہ ہجر کا کہنا ہے

۔ دل تو میرا وہاں ہے ہجر
 شرم کیوں سائیں سائیں کرتا ہے

یہاں بھی شہر باہتی، وطن میں دو زندگی شاعر کو نہیں ملی۔ جس کے لیے نوح نے
زمانوں کا سفر طے کیا۔ اسی اور گری سے پھر بھی دل آزاد نہ ہو سکا۔

۔ اگاسے گمر کی دیوہوں پہ ہجر

اوی ہال کھولے سو رہی ہے

پا پاہول، آزادی کا نیا سہرا طلوع ہو کر بھی ان اہلوں کی توجہ نہ بن سکا۔ لگا ہی جس کی
جنگالی تھیں۔ خالی مکان اور چاندی جاری کا تصور بہتوں، گمروں اور شہروں کو آہ نہ کر سکا۔

۔ یہ گمری اندھیاری ہے

اس گمری سے جلدی ہواگ

۔ پلے دل سے امیدوں کے مسافر

یہ گمری آج خالی ہو رہی ہے

صورت حال یہ ہے کہ گمر ہو یا ہستی، وطن ہو یا شہر، ان کی آزادی اور روٹی

انسانی رشتوں کے غلط، درد مندی، اہمیت اور اعلیٰ اقدار کی بنیاد پر قائم ہوتی ہے۔ قیام

پاکستان کے بعد سماجی زندگی جس طور سے افسوسناک تھی۔ امن و امان کی دگرگوں حالت

بے اعتباری، نفسا نفسی، خود فریبی اور ذاتی مفاد کے حصول میں سب کے سب سرگرداں۔ یہ

انسانی بے چینی یا ہی اعتبار و اعتماد کے اور بند کر دیتی ہے۔ خود فریبی جینے نہیں دیتی۔ ناصر

اور غیر نیازی دونوں کے یہاں اس کے واضح نقوش ملتے ہیں۔ مثلاً ناصر کاظمی کا کہنا ہے۔

۔ بہت ہی سادہ ہے تو اور زمانہ ہے عیار

خدا کرے کہ تجھے شہر کی ہوا نہ لگے

۔ دل میں بے تاب ہیں کیا کیا منظر

کبھی اس شہر میں آ کر دیکھو

ہب کہ ضمیر نیازی کے یہاں یہ صورت حال کچھ اس طرح سے ہے۔ جیسے بہت

گھبراہٹ اور انقلابی رویے سر اٹھاتے ہیں۔ کب دلجو میں گئی آجاتی ہے۔ اکابریت کے

ناگوارانہ رویے امن بھارت پر آمادہ ہو جاتا ہے۔ اندر ہی اندر سینے، کڑھنے اور جی جھانے کی

کیلیت کو ہجر کے لیے بھی مہتم ہوتی دکھائی دیتی ہے۔

۔ اس شہر شگندل کو چلا دینا چاہیے

پھر اس کی خاک کو بھی اڑا دینا چاہیے

۔ مٹی نہیں چلا سکتی جس زمین پر

اک مٹر اس زمین پر اٹھا دینا چاہیے

یعنی ایسا اعزاز ان کے یہاں کم کم ہے۔ کیونکہ سماج کا منظر نامہ اور زندگی

رفتوں کی بے انتہا لہاں جس تو اثر اور تندی کے ساتھ ظاہر ہو رہی ہیں۔ اس سے قوت

اور تہمت کی لٹا اہم بنتی ہے۔ ایک غیر اور آسپ زندگی کی لٹا ہے۔ جو چاندوں طریق

اعمال کے ہوتے ہے۔

حیرت اور تہمت کی کیفیت دونوں کے یہاں مٹی ہے۔ لیکن ہجر کا مٹی کے ہاں

انفرادیت سے جڑا ہے۔ ایک سوچ بچار دانی کیلیت ہے۔ کیسے ہوا۔ کیوں ہوا۔ کیا ہوا ہوا

ہوت ہے۔ سب کو مٹی کے ہاں اک گنہ جہانی اور ظلمتانی فضا مٹی ہے۔ حیرت اور تہمت

کی کیفیت مٹی شہت ہے۔ تندی اور تیزی ہے۔ ہر اس پر ایک ظلم چھایا ہوا ہے۔

۔ مٹی اس ملک پر آسپ کا سماں ہے یا کیا ہے

کہ لاکھ تیز تر ہے اور سزا آہست آہست

میں بھاری اسی کیفیت کو یہاں بیان کرتے ہیں:

۔ میں بہت کڑور تھا اس ملک میں ہجرت کے بعد

ہے مجھے اس ملک میں کڑور تر اس نے کیا

۔ کہ یاد میں ہوں کہ آہا نہیں یہاں

گلیاں ہو خاک و خون کی دہشت سے بھر گئی

ان کے گھوٹے زاہ مینا میں زیادہ تر نہیں بھی ایسے ہی مواتات کے باج آتی

تھا میں میں وہی ہجرت آزادی اور دیگر ایسے مہمومات ملتے ہیں۔ مٹا جن گروں سے

میں نے ہجرت کی۔ اسے وہی ہ سلام اسے شہروں کے لیے دیا۔ ہجرت کا تر۔ یہ کیا لاکھ

ہے۔ میں کسی جگہ ملنا نہیں ہوں۔ وغیرہ

تنگ سے اور پالت کا ایک پہلو ہم لیتا ہے۔ یہ ایک بے خطر سفر ہے۔ جس میں
 ہمارے جسم کی ضرورت ہے۔ اللہ اور باہر کی دنیاؤں کا تصادم، اپنے ہونے یا نہ ہونے
 کا ہوتے اور گہری۔ ایک یقین کی تلاش ساتھ ساتھ ہے۔ لیکن وہاں شعرا نے کمال
 فہارت سے خارجی رنگوں کے حوالے سے داخلی کیفیات کو زبان ملی۔ اور داخلی دنیا کو
 خارجی حالات سے ہم آہنگ کیا۔ اہل فح کو تک

”اور پالت کے اس اکیلے بے خطر سفر میں منیر اللہ کی دنیا میں بھی اور

تنگ کے ہیں اور باہر کی دنیا میں بھی اور یہ تو وہی دنیا کو حیرت سے

دہن میں جذب کیا ہے۔ تو اللہ کی بے چین کائنات کو خارجی رنگ

مطابق ہے۔“ (۴)

اس حوالے سے ایک شعر کا ہاسر کاظمی کے لیے کہا ہے

”ہاسر کاظمی نے اپنے دہن سے ظاہر کی طرف اور ظاہر سے دہن

کی طرف بھرت کی۔ آزادی کے سوچ نے نفس اور دہن کو جس

صحت اور گرمی اور جس خاک و غم سے روشناس کر دیا

تھا۔۔۔۔۔ ہاسر نے اپنی روح کی گہرائیوں میں اس عظیم اضطراب

کو چھوڑی۔“ (۵)

اور پھر دونوں کے ہاں اس حوالے سے ایک خاص بلند ہوشیاری، امید اور پختہ

کا فطر بھی ہم لیتا ہے۔ جو ان کی سوچ کو متحرک اور فعال بنا ہے۔ یہ بلند ہوشیاری ایک

طرف تو پہلی مسائل سے بچنے اور دوسری طرف ایک نئے سوچ کی تعمیر کا خیال رکھتی

ہے۔ مگر ہاسر کا کہا ہے

نہ پائی نہ ہو اداں راہی

پھر آئے گا دور صبح کا

۔ کیا خبر کب کوئی کرن پھولے
 چائے واہ چائے رہنا
 ۔ ان اندھیروں میں کرن ہے کوئی
 شب زور آگے اٹھا کر دیکھ

ہر لمحہ ہنسی کے ہاں یہ صورت حال کچھ اس طرح سے ہے:

۔ چا میں محبوبت سے نہ رواں ہو
 جہاں تک مجھے اتنا لے سکی

۔ میرا اک طاقت ہے میری تخی ایام میں
 اس صفت سے آدمی تم میں نکال کرنا نہیں

منیر کی بلند دستگی زیادہ تر ذات کے حوالے سے بہت قوی کا

انگیزہ لگی ہے۔ جب کہ ہمسرا کا بھی کا یہ رویہ زیادہ تر اجتماعی بھی بن جاتا ہے۔ لیکن ایک نئی
 اجتماعی زندگی کے سونے کا تصور بھی منیر کے ہاں موجود ہے۔

۔ دیکھو منیر بہار میں گلشن

رنگ سے اسٹے جاتے ہیں

حقیقت یہ ہے کہ سماج کے ناموافق رویے جب سرچڑھ کر پڑتے ہیں اور
 فکارت بہت کچھ سوچنے، کرنے اور کہنے بھی اس تضادم کیفیت کی کشاکش سے بچ نہیں سکتا۔
 جہاں کے ہر معاشرتی رویوں کے بچے پیدا ہو جاتی ہے۔ اس صورت حال میں حساس ذہن
 تمہائی کا کہن بھی آباد کر لیتا ہے۔ بلکہ تمہائی کی یہ دنیا خود بخود اس کے اندر پیدا ہو جاتی
 ہے۔ یہ وہ ایسا ہے جو ہماری ذہن سے تمہائی کا زہر ہٹاتی رہتی ہے۔ تھپتھپتے جتے اور
 زندگی کے گہرے پیلے میں بھی وہ تمہائی کی اس صلیب کو کندھوں پر اٹھائے پھرتا ہے۔ منیر
 یازدی اور ہمسرا کا بھی دونوں کے یہاں تمہائی کا متوسط سے حد اہمیت کا حامل ہے۔ اس
 تمہائی کا ایک سراہنا ذات کی تلاش، دوسرا سراہنا انسانی اقتدار کی تلاش، اور تیسرا سراہنے
 دھتکے سر میں ظہور، شکایت کے ساتھ بہت ہے۔ گویا تمہائی کا یہ پہلو بے بسی، باہمی اور

بہائی کے حوالے میں گم نہیں ہو جاتا۔ بلکہ لعل ہے۔ اسے سطر کو بہائی و بہائی کہتے ہیں۔
 یہ بیان ہے۔ حیرت نازی کے لیے ڈاکٹر و کار اور دوسری لکھتے ہیں۔

اور اپنی ذات کی سٹائش میں سرگرمیاں ہیں۔ ان کی آواز میں کہ

بھاتی نہیں۔ بلکہ سب سے شہروں میں ہر گرجہائی اور افسروں کی کے

رہت میں گم ہو جاتی ہے۔ اس لیے ان کی شاعری میں وہ سب

رہت، دوسرے، شہر، دیرانے اور مستند گاڑ کر ہے۔ (۵)

جو کہ ہیں اس میں گھائی کی ہر بہت شہر ہے۔ اپنے ذات کے حوالے ہی رہتا۔ خود سے

رہتا تھا

۔ زمانے کے لب پر زمانے کی باتیں

بھری دکھ بھری داستان میرے دل میں

۔ کتنے یاد ہیں پھر بھی میرے اس آبادی میں آگیا ہے

اپنے ہی تم کے نقشے سے اپنا ہی بہاتا ہے

۔ وہاں رہے تو کسی نے بھی نہیں کے بات نہ کی

مکے دلن سے تو سب یاد ہاتھ ملنے لگے

ہوئے ہی گئی گھائی کا ایک جہاں آباد ہے:

۔ شہر سنان ہے گدھر جائیں

خاک ہو کر کہیں پھر جائیں

انسان کے ہونے شہروں میں ہے سنا

۔ سطر ہے اور غربت کا سطر ہے

تم کا صد کارواں دیکھا نہ جانے

وہر کے یہاں اس میں گھائی کا ایک چار ہجرت اور فسادات کے حوالے سے بھی

انسان کے ہونے شہروں میں ہے سنا

انسان کے ہونے شہروں میں ہے سنا، دکھ، اپنا ہی گرب جب اپنی انہما پر پختہ فکری سے ہم کنار

ہوتا ہے تو اکثر یہاں ہوتا ہے۔ یہ ایک فطری امر بھی ہے کہ زندگی کی ناپائیداری اور موت کی
حقیقت کی آہٹ لہنے والے پر سنائی دینے لگتی ہے۔ یہ ہماری اردو شاعری کی کلاسیک روایت
کا بھی حصہ ہے۔ دہلوی وستان کے شعراء نے بھی اس موضوع کو کمال مہارت سے برتا۔ اس
میں زندگی اور موت کے قطعے کی رنگ آمیزی نے شاعری کے مزاج اور معیار کو چلیبگی اور
شور سے بھی ہلکا کر دیا۔ منیر اور ہاسر کاظمی کا بھی یہاں سے ہے۔ تو دوسری طرف یہ ان کے ہمد
سے انکار اور دشمنی ہے لگتی ہے لکنی کا بھی یہاں سے ہے۔ منیر اس حوالے سے کہتے ہیں:

۔۔۔ یہ جہر مرگ مسلسل ہی زندگی ہے منیر

۔۔۔ جہاں میں اس پہ اختیار کس کا تھا

۔۔۔ ماضی تھا مقام اپنا منیر

۔۔۔ خواہش زینت تھی دوام طلب

۔۔۔ جب کہ ہاسر کاظمی کے ہاں یہ موضوع اس طور پر برتا گیا ہے۔

۔۔۔ نہ پانچ کپے گزرتی ہے زندگی ہاسر

۔۔۔ بس ایک جہر ہے یہ اختیار اگر ہے بھی

۔۔۔ موت اور زینت کے ہراس اور رعب

۔۔۔ آہری بزم میں آغور سے سن

یہاں اسی پہلو سے یہ کلمہ بھی ابھرتا ہے کہ زندگی اور موت کی اصل حقیقت ہب

دل و دماغ پر مختلف ہو جانے۔ تو فکر کی ایک دہی دہی لہر مزاج کا حصہ بننے لگتی ہے۔

اس سے زندگی کو کھینچنے اور سنے کا قرینہ ہاتھ آتا ہے۔ اسے پختگی فکر کے ساتھ کھینچنے کا سلیقہ

ملتا ہے۔ ہاسر اور منیر جہاں دونوں کی شاعری میں اس حوالے سے اشعار ملتے ہیں۔ کہیں

خدا کی نصیبی ہے تو کہیں گردش زمانہ کی بات، ایسے میں تمام دکھ، غم اور آسواگیاں خالق

چاہ کوئی پہنٹی ہیں۔ ہاسر کا کہنا ہے:

۔۔۔ اس کہنے میں ہے سب درد و عزم

۔۔۔ دل منم ہے کہ خدا غور سے سن

۔ ہاسر آشوب زمانہ سے غافل نہ رہو

بلکہ آگاہ ہے جب خلق خدا کچھ کہتی ہے

منہ چڑائی کے ہیں یہ صورت حال بلکہ اس طرح سے ہے:

۔ مجھ سے بہت قریب ہے تو پھر بھی لے لے منہ

پردہ سا کوئی میرے تیرے درمیان تو ہے

۔ یاد رکھی جیسا اے منیر اس شام کی تہائیاں

ایک میدان ناک دولت اور تو خدا کے سامنے

منیر اور ہاسر کا فنی دونوں کے یہاں ایک اور قدر مشترک بھی ہے۔ جسے ہم

تہذیبی شعور کی پاسداری کہہ سکتے ہیں۔ تہذیبی شعور ہماری شعری و ادبی کلاسیکی روایت

کا حصہ بھی ہے اور اس میں انفرادی مزاج کا اپنا بھی حصہ ہوتا ہے۔ کہ وہ کس روایت کے

کس حصے کو کہاں سے ساتھ لیتا ہے۔ اور کہاں اپنی انفرادیت کو بھی سمجھتا ہے۔ دونوں شعراء

لے تہذیبی شعور اور اقتدار کی پاسداری کو اپنے اندر جذب کیا اور خود ان کے اپنے مزاج

میں اپنی شانگلی کا یہ عنصر موجود ہے۔ ہاسر کے بارے میں زاہد کا یہی لکھتی ہیں:

"ہاسر نے میر کی روایت کو اپنے اندر جذب کر لیا اور جب ان

کے بیان ان کی اپنی غزل آگے تو اس میں یہ سریت اس طرح

نکل مل گئی تھی کہ الگ سے پہچانی نہ جاتی تھی۔" (۶)

تو کیا روایت اور انفرادیت سے مل کر ہداگت رنگ و جود میں آتا ہے۔ دونوں

شعرا کے یہاں اس شانگلی کا اہلی معیار ذوق، رنگ دکھاؤ، محبوب سے معاملات کا قرینہ،

جب اور پس و پیش کی صورت حال ہے۔ اس رنگ دکھاؤ کی کیفیت اس وقت خاص طور پر

اہل لہجہ ہے۔ جہاں تہذیبی عشق کے حوالے سے بات ہوئی ہے۔ تو معاملہ محض جمال

نہایت لہجہ، لہجہ کی کیفیت ہی میں رہتا اور محبوب کے سراپے تک محدود رہتا ہے۔ مثلاً منیر

آگاہ کے ہیں اس کا حوالہ اس طرح سے ہے:

- یہ لڑکی جو اس وقت سرہالم کھڑی ہے
 لڑتا ہوا بادل ہے کہ بھولوں کی لڑی ہے
 - کھٹے گے ہے بھلی اک سرخ رنگ سے کی
 اک شمع کے لہوں کا لعلیں اپنا چمکا
 - منیر بھول سے چہرے پہ اٹک ڈھکتے ہیں
 کہ جسے عمل سم رنگ سے پھینکے گے
 وہ کہ ہر کاگی کہتے ہیں

- آگہیں نہیں کہ وہ چھٹکتے ساغر
 عارض کہ شراب قرقرات
 - رنگ کھٹے صوا کی دھوپ
 زلف کھٹے جنگل کی رات
 کی جنج رازی اور تہذیبی انداز کا بیڑہ محبوب سے ملنا کے وقت بھی اور جتنی ہے
 - میں ہاتھ لکھی اسے لکھا
 اسے کھلی گواہ رہتا
 - اسے دل نہ توپ کہ قہر ہوگا
 رسوا کوئی شہر شہر ہوگا
 ہمسرے یہاں اس انداز میں میر کی آواز سنائی دیتی ہے۔ کیا تہذیبی روایت کو
 چیلنے سے بڑے کا نام ہے مٹھا میر کہتے ہیں

- دور بیٹھا لہار میر اس سے
 عشق ہن سے لوب نہیں آتا
 بیوی لہو یا ہم کہہ سکتے ہیں کہ ہمسر کاگی اور منیر نیازی کی شاعری تقسیم کے
 بعد ہر جہت کے حوالے سے بہت سے مہنوسومات میں یکساں ہے۔ جس میں کلاگی
 شاعری کی روایت کا رنگ بھی کھلا ہوا ہے۔ فرق صرف دونوں کے طرز احساس اور مزاج کا

ہے۔ بعض مقالات پر بھی ان کا لب و لہجہ فرق ہو جاتا ہے اور کہیں شدت جوش میں انداز فرق ہو جاتا ہے۔ دونوں نے ماضی، حالی اور مستقبل کے حوالے سے بات کی ہے۔ یہاں کا کرب، ہجرت کا سوسن، اسکے سویروں کی آرزو، یاس، رنج و الم، امید، اپنی سر زمین سے محبت اور ہجر و فراق کے قہرے دونوں کے یہاں موجود ہیں۔ تہذیبی شعور کی صورت حال کم و بیش دونوں کے یہاں یکساں ہے۔

دونوں کے ہاں قدر مشترک یہ بھی ہے کہ ہجرت کے تجربات اور اس کے کرب سے دونوں یکساں گزرے۔ ماضی کی یادیں اور کھیلنے والوں کی یاد کی خلش دونوں کے لیے سرمایہ حیات ہے۔ پھر اپنی مٹی اور زمین سے محبت کی خوشبو دونوں کے ضمیر میں کھلی ہوئی ہے۔ ناصر کاظمی کا مجموعہ کلام نشاط خواب زیادہ تر ایسی نظموں پر مشتمل ہے جو وطن کی محبت میں سرشار ہیں۔ دونوں کی زندگی اور فن کی دنیا کو باہم مربوط کیا۔ شاعری کے ہی مگر اور شاعر کے باہمی عکس میں کیا کیا تصویریں اور رنگین زمانے ہوتے ہیں۔ اس تک پہنچنے والے کم کم پہنچے ہوتے ہیں۔ ناصر کاظمی اس حوالے سے "بزرگ نے" کے پیش نظر "تہذیب" میں لکھتے ہیں۔

شعر کی ماریت پہ سوچنے والے عموماً شاعر کو بھول جاتے ہیں۔ اس شاعر کو جو جھس جھل بدل کر ہر زمانے میں نئے جلوے اپنے ساتھ لے کر آتا رہا ہے۔ ہمارے زمانے کا شاعر کئی اعتبار سے اکیلا ہے۔ بلکہ ہوئی دنیا کا عکس اور شاعری میں شاعر کا فرار ایک بہانہ تھا۔ جو دنیا میں اپنے فرار کے لیے اصولی رہی تھی۔ شاعر نے اس باوے کا جھس جھل لکھا تھا۔ جو ہر گاؤں کے گروا گرو پھر کاٹتا ہے اور آنے والے حادثوں کی خبر دیتا ہے۔ (۱۷)

یہاں ذات اور کائنات کے حادثات و تغیرات اکائی بن جاتے ہیں اور جیسے ناصر کاظمی کا ہے۔ اس میں ماضی اور بیتے زمانے کی چاپ بھی بخوبی سنائی دیتی ہے۔ جو گویا قربان گاہ کے بعد اس کا شرد کھینے کی بھی خواہش مند ہے۔

اس حوالے سے سہلی احمد منیر نیازی کے بارے میں لکھتے ہیں۔
 ”منیر نیازی کی شاعری ایک طویل جدوجہد یعنی کے بعد وطن کی پہلی
 جھک دیکھنے سے مراد رکھتی ہے۔ اس شاعری میں جہاں کر
 رہے والے اور بھولے ہوئے گم شدہ تجربوں کو زندہ کرنے کی ایک
 ایسی غیر معمولی صلاحیت ہے۔ اس عہد کے کسی دوسرے شاعر میں
 نظر نہیں آتی۔ منیر نے صرف مجھے میرا بچپن یاد دلاتا ہے۔ بلکہ بچپن
 اور بھشت کی سرحد پر میرے لبوں میں گم شدہ بعض نادرہ ہستیوں کو
 بھی میرے سامنے لاتا ہے۔ جہاں گھروں کی دیواروں پر سوراخیں
 رہے تھے۔ آسمان کے ہاتھوں میں گولیاں پلکتی تھیں۔“ (۸)

ان اقتباسات میں ناصر نے شاعر کو اپنی ذات کے حوالے سے وہ یاد کیا جو
 لوگوں کو آنے والے حادثوں کی خبر دیتا ہے۔ اور منیر نیازی کے حوالے سے وہ یادیں سامنے
 آتی ہیں۔ جو ماضی کا سکویا ہوا مگر بہت اور بچپن کا حوالہ ہے۔ گویا ان دونوں کا فن ماضی
 حال اور مستقبل کے تسلسل کی ایک کڑی ہے۔ وہ فن جو زندگی سے لبریز ہے۔ جو ذات کی
 نظیری اور کائنات کے الہام پر قائم ہوتا ہے۔ دونوں اپنے عہد کی بھرپور آواز ہیں۔ وہ آواز
 جو اپنے عہد کے بھرپور کرب کو ساتھ لے کر چلتی ہے لیکن انفرادی ماضیوں کے اختلاف کے
 باعث ایک دوسرے سے مختلف بھی ہو جاتی ہے۔ یہ اختلاف موضوعات کی خارجی سطح کی
 بجائے داخلی سطح پر حسوسات اور تاثرات کی اداسگی کے حوالے سے دکھائی دیتا ہے۔ جہاں
 یہ اداسگی بھی دھجھے اور کبھی شدید سروں کی لے میں ایک دوسرے سے راستے بدل بھی گئی

—

❖❖❖❖❖❖❖

حوالہ جات

- ۱۔ محمد اکرم، پروفیسر: تاریخ ادب اردو، طبعی بک ہاؤس، بنگلہ اردو بازار، لاہور، ۱۹۹۱ء، ص ۳۰۹
- ۲۔ رشید احمد گوری، ڈاکٹر: اردو ادب بیسویں صدی میں، طبعی کتاب خانہ، اردو بازار، لاہور، ص ۱۰۰، ۱۹۷۹ء
- ۳۔ شیخ محمد ملک، حیدر نازی، ایک ہائر تعلیم ماہرین، اردو تعلیم کا نئی جلد، طبعی بیرون، ۱۹۷۰ء، ص ۳۵
- ۴۔ ایضاً ص ۳۷
- ۵۔ گلگتی ادب، پاشا رحمان، مطلق خوب، ۳ ویں، ۱۹۳۶ء، ہائم آپر، کراچی، ۱۹۸۵ء، ص ۳۲۲
- ۶۔ وقار احمد رضوی، ڈاکٹر: تاریخ جدید اردو نثر، نیشنل بک فاؤنڈیشن، اسلام آباد، ۱۹۸۸ء، ص ۹۱۱
- ۷۔ زاہد قاسمی، ہاجر قاسمی، شخصیت اور فن، فضل حق پبلیشرز، لاہور، نومبر ۱۹۹۰ء، ص ۱۰۸
- ۸۔ ہاجر قاسمی، اشہار نف، بنگلہ لے، مکتبہ کارواں، پکھری روڈ، لاہور، چھٹا ایڈیشن، ص ۱۰۰، ۱۹۷۵ء
- ۹۔ سکیل آف، کچھ نظروں کی دنیا، ماہ منیر، گورا پبلیشرز، لوڈ مال، لاہور، ص ۱۰۰، ۱۹۷۵ء

کتابیات

- ۱۔ حسن رضوی، ڈاکٹر: وہ تیرا شاعر، وہ تیرا نام، ہاجر قاسمی، شخصیت اور فن، بنگلہ لے، پکھری روڈ، لاہور، ۱۹۹۶ء
- ۲۔ سکیل آف، کچھ نظروں کی دنیا، ماہ منیر، گورا پبلیشرز، لوڈ مال، لاہور، ص ۱۰۰

- ۳۔ صلاح الدین احمد شیخ: ناصر کاظمی ایک دھیان، آغاز پبلشرز، لاہور، پاکستان
لاہور، جولائی ۱۹۹۱ء
- ۴۔ فتح محمد ملک: منیر نیازی ایک باثر لیون، ماہنامہ احمد علم قادی، جلد ۱، جی
جوز ۱۹۷۰ء
- ۵۔ گوہر بی، رشید احمد، ڈاکٹر: اردو ادب کی صدیوں کی علمی کتاب خانہ، اردو
بازار، لاہور، پاکستان
- ۶۔ محمد اکرم، پرو فیسر: چارٹرس اردو، علمی بک ہاؤس، چاند اردو بازار، لاہور،
۱۹۹۱ء
- ۷۔ منیر نیازی، ماہ منیر، گورا پبلشرز، ۲۵ لوئر مال، لاہور، جون ۱۹۷۵ء
- ۸۔ منیر نیازی، انفرنیات منیر، گورا پبلشرز، ۲۵ لوئر مال، لاہور، جون ۱۹۹۳ء
- ۹۔ ناصر کاظمی: رنگ نے، مکتبہ کاروان، کنگری روڈ، لاہور، چھٹا ایڈیشن، پاکستان
- ۱۰۔ ناصر کاظمی، نکاح خواب، مکتبہ خیال، لاہور، طبع اول ۱۹۷۷ء
- ۱۱۔ ناصر کاظمی، دوجان، مکتبہ خیال، لاہور، طبع اپریل ۱۹۹۶ء
- ۱۲۔ تاجید قاسمی: ناصر کاظمی شخصیت و فن، فضل حق ایڈیٹرز پبلشرز، لاہور، نومبر ۱۹۸۸ء
- ۱۳۔ وقار احمد صدیقی، ڈاکٹر: تاریخ جدید اردو نثر، نیشنل بک فاؤنڈیشن، اسلام آباد،
۱۹۸۸ء

رسائل و جرائد

- ۱۔ تحقیقی ادب، پاشا رحمان، مشفق خرمی، ۳ ذی ۹۰۲۶ء، عالم آباد، کراچی، ۱۹۸۵ء

جو انداز بیان ہو سا حراشہ

تو یہاں نے کہا کہ

"میں جیسا بکری بھی ہوں اسی کا اگھدا کروں گا"

یہی لفظ نظر قرآنسی ادب بظن کا بھی ہے جو کہتا ہے کہ اسلوب ہی انسان ہے یعنی انسان ہی وہی اسلوب ہے۔ اسلوب اسلوب ہے ہر کسی کو اسلوب نہیں ہونا موضوع، ایڈٹ اسکیم اور تکنیک کسی بھی ادیب یا شاعر کی جڑی پھول ہوتے ہیں لیکن "صاحب اسلوب" کوئی کوئی ہی ہوتا ہے۔ یعنی "طرز تحریر" اور "طرز بیان" جیسے خارجی عناصر سے انکا قدم "اسلوب" کہلاتا ہے۔ اسی لیے ڈاکٹر سید میوانہ نے کہا ہے کہ

"بلاک صرف خارجی عناصر تحریر کا نام نہیں بلکہ مصنف کی شخصیت

کے داخلی نقوش کا دوسرا نام ہے۔" (۱)

مصنف سے مخصوص نظریات میں انسانی زندگی کے مختلف تجربات جذب ہوتے ہیں۔ بشمول مصنف کے ذاتی تجربات، محسوسات۔ اسی کا دوسرا نام اسلوب ہے۔

بدیع الزکاج کے مطابق ہر بڑا شاعر یا ادیب اسی انفرادیت کے سبب دوسروں کو حیرت کرتا ہے جو اس سے مخصوص اسلوب کی عطا ہوتی ہے۔

مشرقی ادبیات میں بھی قوی طور پر "اسلوب" کو "ادبی اگھدا کا زہر" خیال کیا جاتا رہا ہے اور ہمارے گھرانے کی شعرا گلین اور اسلوب کی اس باہمی اہمیت سے خوب واقف ہیں۔ صاحب اسلوب حقد میں میں سبک بندی سے متعلق شعراء میرزا بیگل (قاری) اور میرزا غالب (اور) کے ہاں مضامین لائق شعری مہیم جمید ازہم ہے۔ وہ ہیں کہ بیان کیا گیا ہے وہ وہی اختصار سے کام لینے کے سبب اکثر مقامات پر بیگل اور غالب کی کہی ہوئی

بات تھوڑی ہو جاتی ہے اور ان صاحب اسلوب شعراء نے یہ کام جان بوجھ کر
 کیا ہے۔ سہل ہے اور ہے کہ انہوں نے ایسا کیوں کیا صرف دماغ اس لیے نہیں کہ ان
 سے قلم بہک مرقی میں حافظ شیرازی نے ان کی راہیں مسدود کر دیں۔ اس کا ایک سبب
 خیال بندی اور مضمون آفرینی کے ضمن میں ان کی اپنی افتاد طبع بھی تھی۔ غالب کہتے ہیں

آگہی دام شنیدن جس قدر چاہے بچائے
 دماغ مکتا ہے اپنے عالم تقریر کا

(سیرت غالب)

بندش الفاظ بڑنے سے مگوں کے کم نہیں
 شاعری بھی کام ہے آتش مرصع ساز کا

(سید علی آتش)

سیف انداز عیاں بات بدل دیتا ہے
 دہن دیا میں کوئی بات نئی بات نہیں

(سیف الدین سیف)

لیکن گو حسن معنوی کا خیال یہ ہے کہ اسلوب تراشنے کا معاملہ کسی ایک شاعر یا نثر نگار کی
 ہوشیاری کا حاصل نہیں رہتا۔ معنوی صاحب کہتے ہیں

”الفاظ اور آہنگ کی جہاں ایک آدمی کے جس کا رنگ اس کے لیے
 تو پہلی ایک نسل کی ذہنی قوت درکار ہوتی ہے۔ بڑے سے بڑا شاعر

مجلس اپنے دل بولتے، کسی نہ ہوں کوئی زندگی نہیں دے سکتا۔“ (۲)

غالب، ذاکر، خلیفہ، اختر کا یہ کہا بھی درست ہے کہ

”اسلوب انداز نگارش ہے۔ اسلوب تخلیقی نگار کی شخصیت کے
 نفسی محرکات کے ساتھ ساتھ موضوع کے تقاضوں اور محفل سے متعلق

بھائیاتی معیاروں کی مناسبت سے رنگ و بنا رہا ہے۔ اسی لیے فزول

اور قصیدہ یا منظوی کے اسلوب میں فرق نظر آتا ہے۔“ (۳)

اور سبکٹ کا یہ کہنا بھی بجا کہ

”اسلوب سے مراد یہ ہے کہ مناسب جگہ صحیح لفظ کا استعمال کیا جائے۔“

لیکن ”اسلوب“ بکسر مجلس بھی کہہ سکتی ہیں۔ اسلوب کی پہچان کے سلسلے میں

مختلف انواع نظریہ سازی کے سبب اس قسم میں الجھنیں بڑھتی ہی گئیں، یہاں تک کہ

بیسویں صدی کی تیسری دہائی میں آئی۔ اسے رچھڑانے کی بجائے بار اسلوبیات کی طرف توجہ

کی اور بطور خاص نے صرف مختلف لکھنے والوں کی تحریروں کے اسلوبیاتی جائزے پیش کرنے

کے ساتھ ساتھ اسلوبیات سے متعلق تجزیہ کرنے کے اصول بھی مقرر کیے۔ آئی اسے رچھڑانے

نے شاعری یا نثری فن پاروں کو شخصیت کے اعتبار کی بجائے فن کار کی بنی ہوئی زبان کی

قسموں عظیم کے حوالے سے اہمیت دیتے ہوئے شعر کے لسانی ماحول کو خاص طور پر اہم

قرار دیا۔ اس ضمن میں ایک نظریہ گو حسن منگرنی کا بھی ہے۔ وہ کہتے ہیں

”الفاظ تو اس تعلق کا ذریعہ اختیار ہیں جو ہمارے اور خارجی چیزوں

کے درمیان ہوتا ہے۔“ (۴)

مختصر یہ کہ ۲۰ ویں صدی کی تیسری دہائی میں اسلوبیات نے لسانی حسن کاری اور منقرہ

اسلوب بیان کے دائروں سے آگاہ کرنا شروع کیا اور اس سے اگلا قدم سوچنا سے

شغف کی صورت ظاہر ہوا۔ ڈاکٹر مرزا ظہیر بیگ نے کہا کہ

”..... اگر آوازیں ہی نہ ہوں تو معیاری عمل کہاں سے پیدا ہوا۔“ (۵)

یہاں اسلوبیات کا معاملہ لسانیات سے ہو گیا۔ ۱۹۵۰ء کے بعد اسلوبیات کی جانب توجہ

ہونے والے ہفتدہج میں سے زیادہ تر کا تعلق ادبیات کے موضوعات اور لسانیات کے

مباحث تھا۔ اب ان لوگوں نے اسلوبیات پر ایک علم کی حیثیت سے غور کرنا شروع کیا اور

شعری یا نثری اسلوب کے ہر پہلو پر روشنی ڈالے۔ ان کو مست کہتا ہے۔

”انگوار خیال کے دوران لسانی انتخاب کے نام اسلوب سے موسیقی، سنی

نوی، معنوی زبان کی ہر سچ، ممکن ہو سکے۔“

سوتی سچ پر الفاظ کا انتخاب کرتے وقت کسی مخصوص آواز یا آوازوں کو ترجیح دینا اس
اہمیت اختیار کر گیا۔ مثال کے طور پر کول آوازوں کو اگر ہم ترجیح دینا کے تو میں میں ط
کا استعمال کریں گے اور اگر کشت آوازوں کو ترجیح دینا کے تو لہذا کو ترجیح دے۔
جب کہ ہفتات نگاری کی اہمیت پہلے سے کہیں زیادہ کی۔

اردو غزل کو شعرا میں اس چیز کا سب سے زیادہ اہتمام نظر اقبال سے کہا ہے۔

وقوف نگاری کے معاملے میں بھی نظر اقبال سے مثال ملتا ہے۔

یہ زبان ہوں، نفا بھری بدعا سے کہ تو

نہیں رہے گا، اگر کہ دیا ”نہیں رہتا“

لوب کے مطالعے کی سچ پر آج بھی کچھ لوگ اسلوبیات کے زیادہ قائل دکھائی نہیں دیتے۔

ایسے ہفتہ بھی ہیں جو یہ سمجھتے ہیں کہ لسانیات کی طرح یہ علم بھی زبان کے مطالعے کا ایک

پہلو ہے اور اس سے زیادہ اور کچھ نہیں لیکن بغور دیکھا جائے تو لسانیات اور اسلوبیات نگاری میں

کا نام ہے۔ لسانیات زبان کے کلی پہلو ہوتے ہیں۔ صحیحی تو وہ علامتی بول چال ہے، لسانی

ترسیلی، لسانی حوالہ جاتی اور لسانی بنیادی یا جملاتی ہیں اسلوبیات نگاری میں لسانی و لسانی

اہمیت حاصل ہے۔ ہر لسانی پارے کے مختلف اجزاء ایک دوسرے میں جڑت رکھتے ہیں۔

جن کا تجزیہ کر کے تحقیق کو ایک کلی کی حیثیت سے لگایا جاتا ہے۔ وہ جو کہا جاتا ہے کہ ”کلی“

”کلی“ کے اجزاء سے جو لگتا ہے تو اس کلیے کا اطلاق اسلوب پر بھی کیا جاتا ہے۔ اس

اوقات میں بھی ہوتا ہے کہ تحقیق کار سادہ سے اگراف کر کے پنج اسلوب وضع کرتے

ہیں۔ ان کے نزدیک سادہ سے اگراف ہی سب کچھ ہے جب کہ کچھ لوگوں کے اس نقطہ

کے شعری اسالیب کے صوتی پہلوؤں سے بحث کی ہے لیکن انہوں نے اردو کے صرف نئی کے صوتی نظام کا جو جدول بنا دیا ہے وہ کسی حد تک احمورا اور غیر سائنٹیفک ہے۔ اور وہ یہ ہیں ڈاکٹر محمد حسن، ڈاکٹر گوپی چند باریک، مفتی تبسم، شمس الرحمن قادری، رشید حسن خان اور ڈاکٹر مرزا حامد رنگ نے سائنٹیفک انداز اپنایا اور اسلوبیات پر کچھ نئے لسانیات سے بھی گہرے شغف کا ثبوت دیا۔ ڈاکٹر محمد حسن کے دو مضامین "غالب کا شعری آہنگ" اور "غالب کا نثری آہنگ" اس خصوص میں اہمیت کے حامل ہیں۔ جب کہ ڈاکٹر گوپی چند باریک نے راجندر سنگھ بیدی، انکار حسین، علامہ اقبال، میر تقی میر اور میر انیس کے اسالیب اور صوتیاتی نظام، مفتی تبسم نے غالب کے شعری اسلوب کو موضوع بنا دیا۔ شمس الرحمن نے میرزا غالب کی شرح لکھتے ہوئے بالترتیب "شعر شور انگیز" اور "تفہیم غالب" میں ان دو نئے شعراء سے خصوصاً اسالیب پر بات کی۔ رشید حسن خان نے میر امن اور صاحب علی بیگ سرور کے اسالیب بیان کو موضوع بنا دیا۔ ڈاکٹر مرزا حامد بیگ نے صاحب اسلوب انسان نگاروں کو "انسانے کا منظر نامہ" میں زیر بحث لانے کے ساتھ ساتھ میر امن کی "ہارنگ و بہار" ایک نادر متن مرتب کرتے ہوئے میر امن کے خصوصاً اسلوب پر بات کی۔

یہ صفحہ میں فی الوقت جو اہم نثری اور پندرہویں صدی کا ادب ادارہ ہے جہاں ڈاکٹر محمد حسن، ڈاکٹر شاہب دہلوی اور پروفیسر نصیر احمد خان کی زیر نگرانی گزشتہ تیس برس سے اسلوبیات کی درس و تدریس کا سلسلہ جاری ہے۔ ان لوگوں کی زیر نگرانی ادبی اسلوبیات سے متعلق ڈاکٹر بیگ اور ایم اے کے کئی تحقیقی مقالوں کو مکمل کیا گیا۔ جن میں درج ذیل مقالہ بات اہم خاص قابل ذکر ہیں۔

- ۱۔ پریم چند کے اسلوب کے "قصائیں کا ارتقا" از احمد حسین انصاری
- ۲۔ نثری لسانیات میر کا "اسلوبیاتی مطالعہ" از شاہب دہلوی
- ۳۔ ہارنگ و بہار کا "اسلوبیاتی مطالعہ" از شعیب رضا خان

”سداھارتھ“ کا فنی و فکری جائزہ

”ہرمین“ (۱۹۱۸ء-۱۹۶۲ء) ایک جرمن ادیب ہے جس نے نثر اور شاعری دونوں میں طبع آزمائی کی۔ اس کو کئی بڑے اور کامیاب ناول لکھنے پر ہمیشہ ناول نگار یا شاعر شہرت حاصل ہوئی۔ ہرمین کے مقبول ترین ناولوں میں سے ایک ”سداھارتھ“ ہے جس نے ہرمین کو ۱۹۳۶ء میں ادب کا لوٹن انعام دلویا۔

اس ناول کا موضوع فلسفیانہ ہے۔ دنیا بھر میں قلمی کو بنیاد بنا کر بہت کم ناول لکھے گئے ہیں۔ اور اس میں ایسے ناولوں کی تعداد نہ ہونے کے برابر ہے۔ اس ترجمہ شدہ ناول نے اور اس کی کو کسی حد تک پورا کرنے کی کوشش کی ہے۔

”سداھارتھ“ کا ترجمہ دنیا بھر کی زبانوں میں ہو چکا ہے۔ انگریزی کا مستند ترجمہ ہٹا رڈز Hilda Rosner نے کیا جسے سامنے رکھتے ہوئے ”آصف لرنی“ نے اس کا اور اس ترجمہ کیا۔ یہ ترجمہ ۱۹۸۳ء میں قوسین دلا اور سے شائع ہوا۔ یہ کتاب دو بارہ گلشن پورس نے چھاپا ہے۔ یہ ترجمہ اس لحاظ سے دوسرے ترجموں سے مختلف ہے کہ یہ ترجمہ اور اس کے مختلف عنوانات میں تقسیم کیا گیا ہے۔ یہ عنوانات درحقیقت مرکزی کردار

”سداھارتھ“ کی ذاتی حالت اور حالات زندگی کی فوری کرتے ہیں۔ ناول کا پہلا باب ”ہرمین زبوت“ کے نام سے ہے جس میں سداھارتھ کے گھر چھوڑنے کا قصہ ہے، اس کا ضمنی عنوان خیریاں ہے جس میں سداھارتھ شہنشاہی بنتا ہے۔ تیسرا باب ”کوتم“ کے نام سے ہے جس میں سداھارتھ کی ملاقات کوتم بدھ سے ہوتی ہے۔

سے ہے جب اس پر حقیقت آشکارا ہوتی ہے۔ گلابی باب اس کی روحانی زندگی اور زندگی کی طرف پہلا قدم "لوگوں کے درمیان" دوسرا اور "مشاور" تیسرا قدم ہیں۔ اور آدھی ہیں۔ مندرجہ بالا اب میں "سودھارتھ" دنیا کے باہر جہاں کا حصہ بناتا ہے اور خود کو اس سے بچاتا ہے۔ "دو بار کٹارے" اس کی روحانی زندگی کی طرف ایک بار بھی۔ اس کا راستہ ہے۔ "ماجھی" اس راستے پر اس کا ہم سفر ہے اور اس کا استاد بھی۔ "اس کا ہاتھ" باب اس کی ذہنی و دنیاوی تعلیمات کے دنوں رخنوں کو پورا کرنے کو نظر کرتا ہے۔ "سوم" اس کی روحانی تکمیل کا نام ہے جب کہ "گوند" اس سفر کی کھانا اور اس کے پیارے کی ترہیانی ہے جس کو اویب یوں کہتا چاہتا تھا۔ اس پہلوؤں پر مکالمہ کی شکل میں قرآن و احادیث ملتی ہے اور یوں ناول اپنے انجام کو پہنچتا ہے۔ سودھارتھ واصل کہانی ہے جو عیسائی کے سفر کی ماہی تلاش کی راہ کو دکھانے اور پالنے کی جستجو کی۔ سودھارتھ ایک ایسی شخص ہے جو مذہب کی جگہ بندوں اور روایت کے سامنے نئے خود کو تلاش کرنے میں متنبہ ہے مگر کہیں اس کا سرا نہیں پاتا گیا ضروری نہیں کہ مذہب کی موجودگی انسان کو خود بخود انسانی کے راستے کا پتہ ملے اسے اپنا پتہ پانے کے لیے انسان کو سفر پر لگانا پڑتا ہے۔ اویب ہمیں ایسے ہی ایک سفر کی کھانا بنا رہا ہے۔

اس ناول کا پلاٹ بالکل سادہ ہے۔ خط مستقیم کی طرح ایک کھارے سے شروع ہو کر دوسرے سرے پر ختم ہو جاتا ہے۔ زیادہ تر یہاں اعداد اپنا کیا ہے مگر کہیں کہیں مکالمے کی ٹھیک بھی استعمال ہوتی ہے۔ اس ناول کی زبان اور روایت اس کی انتہائی خصوصیت ہے جو کہیں بھی ناول کی موضوعاتی ضرورت کے باعث بھاری پن پیدا نہیں ہونے دیتی۔ اس ناول میں ناول سے آخر تک گفتگو کی کیفیت کہیں بھی ناول کی دل چسپی کو ختم نہیں ہونے دیتی۔ وہ گفتگو جو سودھارتھ کے ذہن میں شروع سے آخر تک جاری رہتی ہے۔ ایک شخص اور فقیر کی گفتگو، جان لینے اور پالنے کا سفر اس کا بنیادی عنصر ہے جو ناول کو

اہم تک سمجھ کیے دیکتا ہے۔

سودھارتھ کامرکزی کردار حاصل ایک خیالی کردار ہے جس کا تعلق سودھارتھ (مہاتما) سے کوئی تعلق نہیں مگر کہانی کامرکزی خیالی اور آقا پانا نے صرف مہاتما کو ہی زندگی سے اٹھ کر لیا ہے مگر جس کا پتہ خیالات کی مدد تک خود ہرمن کی اپنی زندگی میں بھی تلاش کیا جاسکتا ہے۔

کہانی کا آغاز سودھارتھ کے ایام شباب سے ہوتا ہے۔ سودھارتھ ہرمن زاہد ہے جو تمام تر عبادات اور تعلیم کے باوجود خود کو لایم تصور کرتا ہے۔ اس کے استاد اس کا دوست "گوند" اور اس کا باپ اسے اور باپ بگتے ہیں۔ ہر ایک اس کی اور کا دلچسپ ہے مگر وہ خود کو باوجود اتنا اہم جاننے کے اطمینان اور سکون سے جاری پاتا ہے۔ اس کے اور کردار کا ماحول اور اس کی ذہنی تعلیم و تربیت نے اس کے اندر وہی تکلیف پیدا کر دی۔ وہ ملت ذہنی انگار کا نظار ہے۔ وہ خداؤں پر بھی شک کرتا ہے اور اپنے عالموں کی تعلیم پر بھی۔ اس کے استاد اسے لڑھکے کے حصول کی تعلیم دیتے ہیں جب کہ خود سودھارتھ کو یقین ہے کہ نہ ان میں سے کسی کو یہ حاصل ہوا ہے اور نہ ہی یہ اس کے سکھانے پر قادر ہیں۔ "آقا" کو چھڑ کرنے اور پرانا میں مل جاتا منزل ہرمن ہے۔ یہ منزل خود اپنی ذات کی گلی کے بعد حاصل ہوتی ہے۔ سودھارتھ اس سارے قسطے کو بگتے سے کاسر ہے۔ یہ مثال ذات اور گلی ذات کیا ہے۔ اس مثال ذات کی تیسرا پہلے باب کے پہلے حصے میں پانچویں گلی ہے کہ جس کے نتیجے میں گھبراہٹ چھوڑ کر سنیاسی بن جاتا ہے۔ سنیاسی کی منزل اس کو گیان اور آتم تیاگ کی مشقوں کی تربیت و تربیت دینے پر زور دیتی ہے۔ جسمانی مشقوں سے وہ موسم کی غیبوں کو سہتا اور جسمانی ضروریات و اہلیت پر قابو پانا سیکھتا ہے۔ مگر لڑھکے سنیاسی بھی اس کی تعلق نہیں کر پاتے، آتم تیاگ کی ہر مشق کا انتہا کو پالنے پر لقم ہوتا۔ ہر گلیوں نے اسے اپنی ذات کی گلی کرنا سکھایا۔ دنیا اور سنیاسی ایک ہی حقیقت

ہے۔ بلکہ حال ہے۔ جھوٹ اور دھوکا ہے۔ اس سے بچنا اس سے دور بھاگنا ہے۔ اپنی
 ذات کی نگہی، اس کا نکات کی نگہی کے لیے اس نے سخت ریاضت کی تاکہ وہ حقیقت کو
 پاسکے۔ آقا کو تلاش کر سکے مگر وہ نہیں برسوں نے اس کو اس سوار سے بچنے سے روک کر دیا۔
 ہے۔ وہ اصل وہ آقا تو خود اس کی ذات کا حصہ ہے۔ اس سے باہر کی کوئی چیز نہیں رہتا۔
 خبیثی ایسا سوچتے ہیں تو غلط کرتے ہیں۔ جو ایسا سوچتا ہے وہ سراب کے پیچھے بھاگتا ہے۔
 تمام برہمن جو اس کو سکھاتے رہے۔ وہ تمام خبیثی ایسا ہے جسے جوگی جو اس کو آتا اور
 زمان کا سچا سکھاتے رہے۔ وہ حقیقت وہ خود بچکے ہوئے ہیں۔ خود انہیں دانتے کاظم نہیں
 وہ کسی کی رہو نہائی کیا کریں گے۔ یہ سوچا اس کی زندگی میں ایک غریب انتخاب سے آتی
 ہے۔ وہ جان لیتا ہے کہ اس نے اپنی منزل اور اس کو جاننے والے راستے کا حقین خود
 کرنا ہے۔ دوسروں کے تجربات کسی کو بکھری نہیں سکھائے۔ روحانی تجربات اور داخلی
 مندی کی باتیں اور مختلف چیزیں ہیں۔ دونوں کو واضح کرنے میں مشکل ہے تو سکھاتا تو ہرگز
 میں سے ہے۔ جس جی کا تجربہ، تجربہ کار اور تجربہ و خبیثی اور جوگی کو بھی نہیں ہوا وہ کسی
 کو کیسے سکھائی جاسکتی ہیں۔ انہی خیالات کا اظہار "گوند" کے ساتھ مکالمے میں ملتا ہے۔
 انہی خیالات کی اگلی کڑی ہمیں "گوتم" ہی باب میں ملتی ہیں۔ اس باب میں کھنک
 وضاحتیں ملتی ہیں۔ سدھارتھ کی داخلی لکھن اور فکر کا دھارا کیا رخ اختیار کرتا ہے۔ اس باب
 میں نہایت وضاحت سے بیان کیا گیا ہے۔ یہ سدھارتھ کی زندگی کا ایک اہم سوز ہے جب
 "گوند" اور سدھارتھ دونوں گوتم کی تعلیمات سے فیصلہ باب ہوتے ہیں۔ گوند جو اول
 سے آخر تک سدھارتھ کے عقل قدم پر چلا آ رہا تھا گوتم کا پیدا ہونے جاتا ہے مگر سدھارتھ
 اس کو اپنی منزل قرار نہیں دیتا۔ وہ گوتم سے ایک طویل مکالمہ کرتا ہے۔ وہ اس کے تمام
 خیالات سے اتفاق کرتا ہے مگر "کھنک" کے تصور کے بارے میں اس کے ذہن میں وہی

کہیں ہیں جو روزِ قیل سے اس کے اہل میں تھے۔ وہ مہاتما کی باتوں اور تعلیمات کے
 اچھے پیروں سے تو اتفاق کرتا ہے مگر اسے مہاتما جہ سے بھی وہی عقارت ہے جو اسے
 ہر کسی سے ہے اور انہوں نے اس سے بھی کہی کہ وہ تجربہ یافتہ جس کی بات وہ کرتے ہیں وہ سمجھا
 گیا ہے۔ آپ اس مقام تک اپنی جستجو کے ذریعے پہنچے، اپنے راستے سے سوچنے سے
 یہاں سے علم سے انکشاف سے پہنچے۔ آپ نے تعلیمات سے کچھ نہیں سیکھا اور یہی میں
 سوچتا ہوں۔ اس عقارت کے کسی کو بھی تعلیم سے کئی نہیں مل سکتی۔ اسے عقارت آپ سے
 کی کوئی تلافی اور تعلیمات کے ذریعے نہیں بنا سکتے کہ نروان کی گزری آپ پر کیا تھی۔
 مہاتما کی عقیدت بہت گہرائی رکھتی ہیں۔ بہت کچھ سمجھتی ہیں۔ مگر ایک چیز ہے جو
 واضح اور قابلِ توجہ تعلیم اپنے اندر نہیں رکھتی۔ اس میں وہ اسرار موجود نہیں جس کا عقارت
 نے جانت لیا ہے۔ حاصل کیا تھا۔ ہزاروں لاکھوں انسانوں میں سے بس اسی نے۔ بس
 میں نے سچا اور سچا کہا۔ اسی لیے میں اپنے راستے پر چل چکا ہوں۔ کسی دوسرے
 اور ہر چیز سے کی عقارت میں نہیں کہ میں جاننا ہوں اس سے بہتر کچھ نہیں بلکہ تمام عقاید اور
 ہم سبھی کو تک کہنے کے لیے اور اپنے مقصد پر تمہا پہنچنے کے لیے یا سرجانے
 کے لیے۔

میں اس کی زندگی کا پورا رخ اس کے سامنے آتا ہے۔ اسے نروان حاصل
 ہونے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس میں سے سوچ اور سوچ سے علم پیدا ہوتا ہے۔ اسے پتہ
 چلا کہ اس سے فرار میں نروان نہیں۔ وہ خود کو پانے کے لیے خود سے بھاگتا رہا۔
 اور حقیقت خود کو بھاگتا رہا کہ پانے نہیں اور میں وہ دنیا کو ایک نئے روپ میں دیکھتا ہے۔
 حضرت ابراہیم علیہ السلام کے ساتھ ملتا ہوا کہ ہوتی ہے۔ وہ دنیا جس میں فاقہ مستی اور بھوک
 تھی وہ اس کے لیے گزرا۔ دوسری حالتوں کی متقاضی نہیں۔ وہ اس کے لیے بنا ہوا نہیں

پھر ایک دل چاہپ تھا تھا ہے۔ وہ تو اندر اندر خفا ہوں اور حقیقتوں سے لہجہ حاصل کر کے اس دنیا میں داخل ہو جاتا ہے۔ "کلمہ" کا باب اہلیت کی طرف لٹری ہجرت کی علامت بن کر آتا ہے۔ یہاں وہ انسانی اور ہنسائی خصوصیات سے متعلق ہوتا ہے۔ کلمہ کے دیکھنے سے وہ سناہر میں داخل ہوتا ہے۔ لوگوں کے درمیان رہتا سیکھتا ہے۔ وہ خود کو طوطے کے طور پر اس دنیا میں داخل ہو جاتا ہے جو اس کے لیے ایک دل چاہپ کیلئے ہے۔ یہ کیلئے وہ زیادہ عرصہ دیر رہ کر نہیں کیلئے پاتا اور آخر کار اس کیلئے کا حصہ بن جاتا ہے۔ یہاں ہر سب سے مثبت چیز جو اس کو تھراں کرتی ہے وہ عام لوگوں کے جذبات و احساسات ہیں جنہیں وہ محسوس کرنے سے عاری ہے۔ وہ خود کو عام آدمی بننے نہیں دیتا مگر جس کے شب و روز عام آدمی کی طرح صوفیوں کے گھروں اور صحبت کے گرد گھومتے ہیں۔ اس کے اندر کی آواز مرنی جاتی ہے۔ مگر مرنی ہوئی یہ آواز اسے وہاں کے سفر پر لے جاتی ہے۔ ۳۰ برس کی عمر میں زندگی چھوڑ کر آخر کار وہ نکل رہا ہے۔

دنیا کی عمر و زندگی کو خیر یا کبھی کے بعد وہ خود کو موت کے حوالے کرنا چاہتا ہے۔ مگر ہر ایک اس کے اندر ایک آواز اٹھتی ہے۔ "کلمہ" وہ ساری مذہبی تعبیرات جو اس کے طبع کا حصہ بن چکی ہیں اس کی سولی ہوئی حسیات کو چٹائی ہیں۔ موت کی چٹانوں پر اس نے زندگی کے لٹکانے ہوئے احساس کو بڑھا دیا۔ اس احساس نے اسے بے خود کیا اور بالآخر ۳۰ برس کو بڑھ چھوٹی ہری پادری کے ساپنی ذات کے تجربے نے اس پر یہ انکشاف کیا کہ اپنی ذات کی محبت نے اسے اپنی حسیات سے روک دیا اور خود چھوٹی میں غور کی حد تک بڑھ گیا تھا۔ سچا سچ ہے کہ جب گوہر جو اس کا ساہیہ تھا جسے سچا کہ سوجھا تھا ایک دن وہاں کا روپ دھار لے گا۔ اسے چھوڑ کر کلمہ کے سایے میں چھوٹتا ہے تو اسے سخت تکلیف پہنچتی ہے۔ اس کی آواز کو نہیں پہنچتی ہے۔ مگر وہ کلمہ کی زندگی کو سر جاتا ہے۔ آج "کلمہ" کے لٹکانے ان ساری باتوں پر اسے سوچنے پر مجبور کیا۔ وہ ایک بار بار سوچتا

اور نیچے کی طرف راغب ہوں اور یا کے کنارے جہاں اس نے "اوم" کا لفظ سنا دیکھا ہے
 بھی کی رفاقت لی۔ وہ طہرت کی طرف راغب ہوا۔ جیسا کہ اصل کرم (سودھا تھو) کے
 ساتھ بھی ہوا تھا۔

انگلہ اہاب میں وہ اہم واقعات دیکھتا رہا اور اسے جانتا۔ ایک کرم بڑھ کی صورت
 اور دوسرا کلا سے ملا بڑھ کی شکل میں بھی ہے وہ سر سے پہلے ہلاتے کی یادگار
 اپنا اور سودھا تھو کا بیٹا اسے دیتی ہے۔ جہاں سودھا تھو ایک نئے جنم سے آشنا ہوتا ہے۔
 بیٹا اس کو کہتا ہے۔ اس کے لیے جنمات کا ایک نیا جہان دیا ہو جاتا ہے۔ وہ ہر آسوی
 اس کو دے کر اسے اپنے راستے پر چلانے کی کوشش کرتا ہے مگر اس کا بیٹا شرم کی پتھر
 زندگی کو چھوڑ کر وہ بڑھے یا ٹھہریوں کی فقیرانہ زندگی کو قبول نہیں کر سکتا اور وہیں شرم بھرا
 جاتا ہے۔ اس وقت وہ اپنی زندگی کا تجربہ کرتا ہے کہ کیسے کسی سال پہلے اس نے بھی اپنے
 باپ کو بھڑکا دیا تھا کہ وہ خود اپنے راستے کے انتخاب کی اجازت اسے دے دے۔ اس
 باپ میں باپ بیٹے کے درمیان کی کشمکش تھی اور پرانی نسل کی نسل نہایت خوب صورت
 انداز میں چلی کی گئی ہے۔ پرانی نسل کا تجربہ اور نئی نسل کا جذبہ ایک دوسرے سے
 بدستور ہے۔

"— وہ کون سا باپ ہے اور کون سا گرو ہے جو اسے اس کی اپنی زندگی

گزارنے اور اسی کے مطابق رہنے سے باز رکھ سکے۔"

بہت مدت تک سودھا تھو اپنے بیٹے کے ظم میں دیکھتا ہوا رہا۔ لیکن اس کی بے

لیکن سونا نے آخر اپنے ظم سے بھرتہ کر لیا۔

آخری دو ایجاب "اوم تھو" "گودھ" کس قدر اہمیت کے حامل ہیں یہاں اسے

کا اندازہ ہونا لگایا جا سکتا ہے کہ وہ تمام فیڈا میں جن پر اس بول کی علامت کھڑی کی گئی

تھی ان کا سرا ہوا تھا آتا ہے۔ اس میں ان تمام سوالوں کے جواب کا ہے جن کے گرو کہانی

گھومتی ہے۔ وہ منزل، وہ راستہ کیا تھا جس کی سوجھاڑھ کو سچائی تھی۔ کہانی کا انت کیا ہے؟ کیا سوجھاڑھ کو خزاں حاصل ہوا؟ کیا اس نے پرماتما کی ہلک بھلکی۔ بھلی کا راستہ اس کو ملا۔ وہ مانی سڑکی خود کو گھومنے میں سوجھاڑھ نے کیا پایا۔ ان سب باتوں کو واضح کرنے کے لیے ہرمن نے مکالمے کا سہارا یا اور جز باتیں وہ خود واضح کرنا چاہتا تھا یا جو سوجھاڑھ کی کہانی کے حوالے سے وہ سامنے لانا چاہتا تھا۔ اس کو اس نے لہارت و سخاوت اور تحصیل کے ساتھ اس میں چھوٹی کیا ہے۔ ان پر تھمرے سے پہلے طہری ہے کہ ان باتوں کو یہاں بیان کر دیا جائے۔

”اور ساری آوازیں ساری منزلیں ساری سرزمیں، سارے دکھ، سارے سکھ سب جگیاں اور بریا جیاں یہ سب مل کر ہی دیا تھے۔ یہ سب مل کر واقعات کا بہاؤ ہیں دھارا اور بیون رنگ تھے۔ جب سوجھاڑھ نے ٹور سے اویا کو سنا تو اسے یہ ہزار گیت والی رنگ سٹی دی۔ جب وہ کسی ایک دکھ یا ایک قہقہے کو نہیں سن رہا تھا، جب وہ اپنی آواز کو کسی ایک غصوں آواز سے باندھ کر اسے اپنی ذات میں جذب نہیں کر رہا تھا، بلکہ ان سب کو سستا یہ گل، یکساںی، سب بھر بھر گیتوں والی یہ ویشل رنگ ایک ہی شہ تھی۔
ہوم۔ تھیل۔

”اس کے چہرے پر علم کا اطمینان دکھتا، اس شخص کا اطمینان جو خواہشات کے تصادم کا کار نہیں ہے۔ جسے کئی مل گئی ہے، جو واقعات کے بہاؤ، بیون دھارا سے ہم آہنگ ہے، وہ مدد دہی اور مہربانی سے بھر گیا ہے۔ جس نے اپنے آپ کو اس بہاؤ پر چھوڑ دیا ہے اور اب کام ایشیا کی یکساںی میں شامل ہو گیا ہے۔

سوجھاڑھ نے جتنا کہ زندگی کو اس کی اصل شکل میں قبول کرنا ہی تھیل ہے۔
ناہیا نہیں، دنیا کو رنگ کرنا، انجام کو پانے کے لیے غس بھلی، اتر ہے، اتر ہے سب کو مل کر دیکھنا، دیا کو اس کے بہاؤ، رنگ اور اصل شکل میں قبول کرنا ہی ”ہوم“ ہے۔ اس

پاتے کی وضاحت کو وہ سے وہ اپنے نکلے میں ہیں کرتا ہے۔
 "تو وہ کہتا ہے کہ اسے وہی چیز نظر آتی ہے جس کی اسے مثال ہوتی ہے۔
 وہ کوئی چیز نہ پاسکتا ہے نہ اپنے آپ میں جذب کر سکتا ہے، اس لیے اس کے سامنے ایک
 برف مقصود ہے۔ اس لیے کہ اس پر ایک منزل کی دھن سوار ہے۔ برف کے مٹی میں ایک
 مقصود مگر پالینے سے مراد ہے آزاد ہونا اور نئی چیز میں قبول کرنے کے قابل ہونا اس مقصود
 پاتہ نہ ہونا، تو اسے مگر ہم تم شایہ وہی مثالوں میں کیونکہ اپنے مقصود کی مثالوں میں تم بہت ہی
 لگی چیزیں کو نہیں دیکھ پاتے جو بالکل تمہاری ناک کے لیے ہیں۔"

اسی باب میں وہ اس کچھ کی بھر ایک بار وضاحت کرتا ہے کہ وہ اچھوں سے
 محض اس لیے بھاگتا رہا کیونکہ اس کے نزدیک ماہی یا سمند اور ہاتھ مٹی سکتا، لیکن
 لیکن ہاں اہم کسی کو علم سے لیں باب کرنا ممکن ہے جب کہ کام اس سے ہاتھ مٹی
 کھانے کے اور ہے وہ ہے جو ہر حال ممکن نہ تھا۔

وہ اس نتیجے پر بھی پہنچتا ہے کہ دنیا میں ایک اچھا کوئی نہیں۔ ہر اچھائی کے اور
 برائی اور ہر برائی میں اچھائی موجود ہے۔

"دنیا جو ہمارے اندر باہر اور گرد ہوتی ہے وہ بھی ایک طرز نہیں ہوتی۔
 کوئی بھی آدمی یا کوئی کام مکمل طور پر مستعد یا مکمل طور پر نردا نہیں ہوتا۔ نہ کوئی آدمی
 پورے کا پورا باہلی یا پورا مٹی مٹی ہوتا ہے۔ مگر یہاں لگتا ہے کہ وہ اس لیے کہ ہم اس دھوکے
 میں جھکا ہیں کہ دہت ہی اصل چیز ہے۔ دہت حقیقی نہیں ہے۔ گونہ۔ جسے یہ احساس پارہ
 ہوا ہے اور اگر دہت حقیقی نہیں ہے تو وہ گیر جو اس دنیا کو اور لہا لہا کو دکھ اور کٹی کو دہت
 اور جسے کو الگ کرتی ہے۔ وہ بھی دھوکا ہے۔ لیا ہے۔"

یہی نہیں سوچا تھا نے اپنے تجربات کو مثبت جاہ اس نے اپنی زندگی سے اتنے
 کیا کہ کوئی شکل حتمی نہیں ہر چیز تبدیل ہوتی ہے اور تبدیل شدہ چیز اپنے اندر تحلیل کا

طرز لے ہوئے ہے۔

”سپر ہیرے دوست، میں اگلی پائی ہوں اور تم نے اگلی پاپ کیے ہیں مگر اگلی
 دن یہ پائی اگلی برعکس بن جائیگی گے، کسی دن تمہیں حاصل کر لیں گے۔ کسی دن بدھ میں
 جائیگی گے اور یہ کسی دن اگلی ملا ہے، یہ محض تکیہ ہے۔ کوئی پائی بدھ بنے تو نہیں جا رہا۔
 وہ ترقی تو نہیں کر رہا جاؤنگ، ہمارے طویل میں اس کے سوا کوئی اور گمان نہیں آسکتا۔ نہیں
 پائی کے اندر اگلی ایک نمونہ بدھ موجود ہوتا ہے، اس کا مستقل پہلے سے وہی ہے۔ اس میں
 پیچھے ہوئے اور نمونہ بدھ کو پہچاننا چاہیے۔ اس میں ہم میں، ہر ایک میں۔ گویا، یہ دیانہ تو
 بائبل ہے، نہ عقل پر پہنچنے کے لیے کسی طویل راستے پر لڑنا پڑتا ہے۔ نہیں، یہ تو ہر لمحے
 عمل ہے۔ ہر گناہ پہلے سے اپنے اندر عقل اور دوست لے ہوئے ہے، ہمارے پیچھے نمونہ
 بڑھے ہیں ہمارے اور وہ پیچھے پیچھے اپنے اندر موت لے ہوئے ہیں اور ہمارے ہمارے
 حیات ابلی کے حامل ہیں۔ ایک آدمی کے لیے یہ ممکن نہیں کہ کوئی دوسرا کہاں تک پہنچا ہے
 اپنا اور جاری میں اگلی بدھ موجود ہیں اور زمین کے من میں اگلی چھو ہے۔ یہ تو ممکن ہے
 کہ گمان دہان میں وقت کا اثر نہیں ہو جائے اور ایک ہی وقت میں باطنی عمل، مستقل
 میں جھانکا جاسکتا ہے۔ ہر جہج اگلی گئی ہے۔ ہر جہج عمل ہے، ہر جہج برعکس ہے۔ لہذا اگلی تو
 گنا ہے کہ جو ہر گناہ ہے وہ اچھا ہے۔ زندگی اگلی اور موت اگلی، پتہ اگلی اور پاپ اگلی۔
 رہائی اگلی ہوتی اگلی، ہر جہج لازمی ہے۔ ہر جہج کو صرف اثبات چاہیے میری توفیق اور
 میری محبت میری کہ جو ہر ہر میرے ساتھ سب جگہ تک ہے اور کوئی چیز میرا جگہ نہیں ہلا
 سکتی۔ میں نے اپنے جسم اور جان کے ذریعے سے یہ سچا کہ میرے لیے یہ لازمی تھا کہ
 میں پاپ کروں، مجھے بوجھ چاہیے تھا۔ مجھے چاہیہ، دلچسپیت کی جدوجہد کرنی تھی اور اگلی اور
 گناہ کا تجربہ حاصل کرنا تھا اور نراش کے پانچ میں گناہ تھا کہ میں سچی حاصل کر سکوں
 کہ مجھے ان کے خلاف مزاحمت نہیں کرنا ہے تاکہ میں پیدا کر سکوں اور پھر اس کا خواہشوں

کی کسی تھیکائی دنیا سے مقابلہ نہ کر سکیں۔ اسی سے پیار کروں اور اس بات پر فخر کروں کہ
میں زمین دار ہوں۔ تو گویا یہ ہیں وہ خیالات جو سرے میں آتے ہیں۔

وہ خیالات میں اس بات کا اظہار بنا کر کہ ہے کہ اشیاء اپنے حالت تبدیل کرنے
پر آج بھر ہے وہ کل بیک اور شکل اختیار کرنے کا۔ لیکن وہ محض اس کی نظری شکل
سے پیار نہیں کرتے بلکہ اس کے ہر اس روپ سے پیار کرتے ہیں جو اس کے اندر چھپا ہے اور
وقت آنے پر ظاہر ہوگا۔ یہ اپنی نوعیت سے بالکل انوکھا خیال ہے کہ چیزوں سے اس کے
تمام تر خواص کے ساتھ پیار کیا جائے۔ ہر چیز ہر لمحہ اپنے اندر ایک اور روپ کی چھٹی چھ
ہے۔ اس لیے اس کی محض تبدیلی شہد یا ظاہری روپ سے پیار قطعاً غلط ہے۔ ہر چیز اپنی
جامعیت کے ساتھ تمام خواص کے ساتھ ملوہ وہ مثبت ہوں یا منفی سمیت کی بنیاد ہے۔

اسی طرح سوجھاؤ مادیت پر زور دیتا ہے۔ وہ لیبیل یا الفاظ کے پیچھے بھاگنے
بھاگتے اس نتیجے پر پہنچا کہ الفاظ کی وضاحت ممکن نہیں بلکہ ان کے پیچھے کوئی سمجھوتہ نہیں
انسان انھوں کے پیچھے بھاگ کر بیکو حاصل کر نہیں کر سکتا۔

..... مجھے بہت ہے بھر سے اور وہ بات اور اس ساری چیزوں سے جو ہم
دیکھتے ہیں اور جن سے بچتے ہیں۔ گویا میں بھر سے بہت کر سکتا ہوں اور ان سے جو
پہلاں کے ایک ٹکڑے سے پیار کر سکتا ہوں۔ یہ سب چیزیں ہیں اور انہی چیزوں سے
پیار کر سکتا ہے۔ مگر الفاظ سے بہت نہیں کی جا سکتی۔ لہذا سکھنا میرے لیے بہت ہے۔
ان میں نہ سمجھنی ہوتی ہے نہ لڑی، نہ رنگ، نہ کھڑے کولے، نہ پودے، نہ حوا۔ ان میں الفاظ
کے ساتھ بیکو نہیں ہوتا۔ شاید یہی وجہ ہے کہ ہمیں شافی نہیں حاصل ہوتی، شاید یہی وجہ ہے
کے لیے بہت الفاظ ہیں۔ سناؤ اور نہ ان میں بھی محض الفاظ ہیں، گویا نہ ان کوئی چیز نہیں
ہے۔ اس ایک لفظ ہے نہ ان۔

سوجھاؤ سنے جانا کہ دنیا اور اس کی اشیاء بالکل نہیں ہر چیز اپنی جگہ ہوتی ہے۔ اور ہر چیز

سے محبت کرتا ہے۔ اس سارے جیوں سے انفرادیت سے محبت کرنا چاہتا ہے۔

"مجھے تو لگتا ہے کہ وہی کہ دیا میں اہم ترین چیز محبت ہے۔ بلاشبہ اسے
مطرحی کے لیے ضروری ہونا ہوگا کہ وہ اپنا کام سمجھ کر لے۔ اس کی تکرر کرے، اس سے
نکرت کرے مگر میں سمجھتا ہوں کہ اہم چیز ہے وہاں سے محبت کرنا، نکرت نہیں نکھارتے نہیں۔
میں ایک دوسرے سے نکرت نہیں کرتی بلکہ یہ کہ ہم اس قابل ہوں کہ دیا کو اپنے آپ کو
اور ساری چیزوں کو دیکھیں تو محبت اور احترام اور پسندیدگی کے ساتھ۔"

اس باب میں من تمام نکاتی، خیالات پر بحث ہوئی جن کو مد نظر رکھا کر اسباب

نے یہ ناول لکھا تھا۔

"سودھارتھ" اپنے موضوع کے اعتبار سے ایک معیاری ناول ہے۔ اس کی
دبان میں کوئی الجھاؤ نہیں۔ سادگی اور سادگی کہیں بھی یہ اس میں نہیں ہونے دیتی کہ یہ کسی
اپنے ہنرمند کی تخلیق ہے جو اس زمین کا نہیں۔ جس کی کہ یہ کہانی ہے۔ کہانی کا قلم، اس
کی تخلیق بھی اس کی کامیابی کی دلیل ہے۔

چوں کہ اس ناول کا موضوع فلسفیانہ ہے اس لیے یہ عام قاری کی دلچسپی
کا باعث نہیں ہو سکتا ہی البتہ ہر لوگ اس نوعیت کے ناول چاہتے ہیں وہ اس کی سلی
"محبت سے تو حیرت بھی ہو سکتے ہیں اور اس سے لطف بھی لے سکتے ہیں لیکن اس کی کہانی
کو پانے کے ضروری ہے کہ آپ روحانیت، ہمدردی، دلیرو کے بارے میں بنیادی علم
رکھتے ہوں۔

ناول کا بنیادی اسباب کو ہم بدھ کی زندگی کے واقعات سے تعبیر کیا گیا ہے۔ مگر
پہلے، اپنے راستے کا نہیں کرنا اور ہر غلطی کی باکی ہونا دلیرو سب واقعات ہر
سودھارتھ میں بیان کیے گئے ہیں ہر گونہ بدھ کی زندگی کی واضح چھاپ دیکھی جا سکتی ہے۔
"سودھارتھ" ایک مطرحی دنیا کے فلسفے کو روحانیت کو لکھنے کی کوشش کا نام ہے۔

ہر کسی پر کہ خود اپنے کوزہ کی ماحول سے بھاگ کر مشرق کی سوجھ بھٹ میں چلا پاتا ہے اس لیے اس کی ذاتی فکر اور نظارہ خیالات کی بھٹکیاں ہمیں سوجھ بھٹ کے گی مکالموں میں دیکھنے کو ملتی ہیں اور کبھی کبھی تو محسوس ہوتا ہے کہ ہر کسی، سوجھ بھٹ کی جگہ لے لیتا ہے۔ ہر کسی ایک مغربی دنیا کا آدمی ہے۔ اس کی پہچان جس ماحول میں ہوئی ہے وہ آزادی برائے اور شخصی اور ذاتی تجربے کو نوعیت دیتا ہے۔ مغرب کی عقلیت پسندی کی جھلک ہمیں جا بجا نظر آتی ہے۔ سوجھ بھٹ ایک مشرقی دنیا کا آدمی ہے مگر اس کی عقلیت اور استدلال میں مغرب کی جھلک ہے۔ یہی نہیں سوجھ بھٹ کی روٹن خیالی بھی یہاں کے ماحول سے نکالیں کہانی جب وہ اپنی زندگی کے ہر لمحے سے واقفے کو آزمائش اور ہر تجربے کو بھڑکی کا ارضیہ پاتا ہے۔ ہمارے ہاں ایسا روٹن نہیں تھا۔ بہت جگہ پر یہ بھی احساس ہوتا کہ اپنے نظریات کی ترویج اور خیالات کے لیے اس نے مشرق کے سفر اور اپنے بچے کے مطالعے کی بنیاد پر اس ماحول کو تخلیق کرنے کی کوشش کی ہے۔ گو کہ یہ ایک اچھا ماحول ہے جسے لوہی انعام بھی مگر مشرق کے آدمی کے لیے یہاں "سوجھ بھٹ" اور ہی ہر شے کے ادنیٰ سطحے ہیں اس میں روحانی سطح پر ہلاکت کم ہوتی نظر آتی ہے ہاں البتہ مشرق کے سرد اور لکی ہاتھی جو مشرق سے دور ہے مغرب کے رہنے والوں اور تارکین کے لیے دل چسپی، تجربے کے ساتھ ساتھ قابل قبول بھی ہو سکتی ہیں جس کی وجہ یہ ہے کہ مغرب کا عقلمند اور خود کو ایک ہی انداز سے سوچنے کے قائل ہیں۔ اگر یہ ماحول استدلالی اور عقلی انداز سے نہ اظہار خیال کرتا تو شاید اسے مغرب میں پڑ پڑائی نہ حاصل ہوتی۔ ہر ماحول ماحول اور دنیاوی زندگی کی کشش، صحیح راستے کا انتخاب یہ وہ الجھنیں ہیں جن میں کبھی نہ کبھی انسان ضرور پڑتا ہے خاص طور پر وہ جو مادیت پسند نہیں خواہ وہ مغرب کا باشندہ ہو یا مشرق کا۔

"سوجھ بھٹ" کو تشبہ انداز میں بھی سمجھنے کی کوشش کی جا سکتی ہے۔ "سوجھ بھٹ"

کا مرکزی کردار حقیقت اور "اوم" کی علامت ہو سکتا ہے۔ "گوند" ہی دکھوں کے گرد کی علامت جب کہ کام سہانی کاروبار حیات کی اور گلابت کی علامت ہے۔ "اسودج" دامن اور وقت اور خلوت کے طور پر سامنے آتا ہے۔ اگر اس علامتی حوالے سے بھی دہلی کو سمجھا جائے تو اس کے لئے جتنی سامنے آسکتے ہیں۔

اس دہلی میں جو ہاتھی قسطنطنیہ حوالوں پر روحانی حوالوں سے ملتی ہیں۔ ان سے ادیب کا اپنا تکرر جھلکا ہے۔ ایک بات کا ذکر ابتدا سے آخر تک ملتا ہے کہ دہلی اور قسطنطنیہ کی سہانی نہیں ہا سکتی۔ دوسرا زمانہ کا تجربہ حاصل کرنا ہر ایک کی بات نہیں اور ضروری نہیں کہ زمانہ کوئی چیز ہے بھی یا نہیں۔ ماہانیت اور ترک دنیا قلم ہے۔ دنیا بالا جہاں نہیں۔ دنیا کے ہر عنصر کو محسوس کرنا اور سمجھنا ضروری ہے۔ جذبات اور شے، محبت، ذاتی سب چیزیں زندگی کا حصہ ہیں۔ زندگی سے الگ کوئی چیز نہیں۔ ہر تجربہ خواہ وہ کسی بھی قسم کا ہو اپنے اندر مثبت بیٹوں لے ہوتے ہے۔ ہر تجربہ ہمیں دکھانے کہ ضروری سمجھاتا ہے۔ ہر چیز اپنی جگہ ایک عمل اکائی ہے۔ تکمیل ہر چیز کا بنیادی عنصر ہے۔ چیزوں کو ان کے تمام تر عناصر کے ساتھ قبول کرنا چاہیے۔ اس میں ہر مین نے گوتم بودا کے اس فلسفے کو بھی نہایت شد و دہ سے واضح کرنے کے کوشش کی ہے کہ محبت دنیا کا نسبت ترین جذبہ ہے۔ ہمیں چیزوں سے انسانوں سے جدا کرنا چاہیے۔ اس کے ساتھ ساتھ اس فلسفہ کو بھی سامنے لانے کی کوشش کی گئی ہے کہ اتفاق کی کوئی اہمیت نہیں۔ ہم بعض اوقات اتفاق کے پکار میں رہتے ہیں اور ان چیزوں کے حصول کے لیے کوشاں رہتے ہیں جن کا کوئی وجود ہی نہیں۔ اتفاق کے پیچھے ضروری نہیں کہ کوئی معنویت بھی ہو۔ بعض اوقات قلم بعض نقطہ ہی ہوتے ہیں۔ ان کے اندر کا خالی پن انسان کو الجھا سکتا ہے۔

سودھارتو میں کہادوں کی گھبراہٹ نہیں۔ بزرگرو کا منظر بھی قانع ہے۔ اس سودھارتو جن سے بات کرتا ہے صرف وہی لوگ ظاہر ہوتے ہیں۔ نہ تو تہذیب نظر آتی

بعد از زمانہ اور نہ ہی ماحول کی نظر میں دیکھنے کو ملتی ہے۔ زندگی کی لہروں سے جاری ہر
 چیز، ہر منظر نظر آتا ہے۔ اس کا وہی وہی اچھٹا ہے اس پر سوادھو کی نظر پڑتی ہے۔
 کہ وہوں میں وہی لوگ سامنے آتے ہیں جن کا وہ ہر سہ سے سوادھو سے تعلق ہے۔
 سوادھو کا باپ ہر ایک سوانی لیکن مشفق باپ ہے جو اپنے بیٹے کے اور اس کے اس کی
 محبت سے ڈر جاتا ہے۔ گوہر جو ہوتی اور ہر شے کی اور سے بندھا ہوا ہے۔ سوادھو کو
 گرا جاتا ہے مگر آخر اس کی سوانی سوادھو سے الگ ہو جاتی ہے اور گوہر اس کا اور ہی
 جاتا ہے۔ گوہر کے افکار پر سوادھو کی ہر چھائی نظر آتی ہے مگر آخر کار وہ اپنا راستہ لیا
 دھڑکتا ہے کہ حاصل کی تلاش میں آخر کار وہ کب تک سوادھو کا ساتھ دے سکتی ہے
 ۔ گویا سوانی نظرت کے میں مطابقت جہاں اس کا دل ٹھہرا وہیں اس نے قیام کر لیا۔ گویا
 کہ وہ نہایت مضبوط، خوب صورت اور چھا جانے والا ہے۔ پورے ماحول میں گویا اپنے منظر
 ترین کردار کے ہر جہر مچالی ہوئی نظر آتی ہے۔ وہ ایک مقررہ اور سوانی نظر میں کر رہا
 صورت ہے جو حکموں کے تحت الٹ دینے پر قادر ہے۔ جس کا ذہن جس کا وہ اس کے
 اپنے اختیار میں ہے اور جس کا بہترین مصرف اسے معلوم ہے۔ وہ خود کو باہر رکھ کر کھیل کا
 مزہ لیتی ہے حالانکہ وہ خود کھیل کا حصہ ہے۔ وہ خود چلتی میں جھکا ہے اور یہی اس کی
 کامیابی کا راز ہے۔ سوادھو کو دنیا داری کے راستے پر لانے والی گھاٹی مگر وہ پاری کے
 گرا اس نے کام سوانی سے سیکھے۔ کام سوانی ایک خاص انداز سے سوچنے والا سوانی
 جو پاری تھا۔ سوادھو نے جس کو گرو مانا جسے اس کی زندگی میں نہایت اہمیت حاصل ہوئی
 وہ "داسودھ" ہے۔ اس کے چہرے کی تمنا اور وہی سکون نے سوادھو کے دل میں
 یہ خیال جنکایا کہ نردان کا کوئی تجربہ شاید اس نے بھی حاصل کیا ہے۔ سوادھو کے قلب میں
 روحانی سفر میں داسودھ کا کردار ایسا ہے جو غم خوار بھی ہے اور دانش مندی کا سر پہنچا۔
 جس سے سوادھو مقدر ہر فیض باپ ہوا۔ سوادھو کا پیرا گو چند دنوں تک ہی اس کے

ساتھ رہا بلکہ مگر رشتوں کی پہچان بہر حال سدھارتھ کو اس نے ہی دلائی، عام آدمی کے
 رہا اور سوچ تک رسائی بھی سدھارتھ کو حاصل ہی نہ ہو سکی تھی۔ عام لوگوں کی عام سمجھ
 رشتوں کے بدمعن میں بندھے رہتا کے لوگ کیوں دکھ اٹھاتے ہیں۔ بیٹے کی محبت نے
 اسے سمجھایا۔ اس کا بیٹا ہی نسل کا لٹا تھا، بن کر سامنے آتا ہے جو سدھارتھ کو اس کا ماضی یاد
 دلاتا ہے۔ اس کی اپنی جوانی، اپنا تجربہ، خود دنیا دیکھنے اور اپنے راستے کا تعین کرنا ہر جوان
 شخص کے ضمیر میں شامل ہے۔ اس کے خون کا حصہ ہے، خود وہ جوان کسی بھی عہد کا کیوں نہ
 ہو۔ گوتم بدھ کا ذکر بادل میں اپنے تاریخی پس منظر کے ساتھ ہی ملتا ہے۔ سدھارتھ اور گوتم
 کو وہ علیحدہ شخصیات کے طور پر سامنے لانے کا مقصد شاید یہ تھا کہ ایک ہی عہد میں دو عظیم
 شخصیات کی نمود ممکن ہے۔ ایک ہی وقت میں دو عظیم لوگوں کا وجود اور جنم ممکن ہے۔

"سدھارتھ" ایک نہایت اچھا اور دل چسپ ناول ہے، باوجود اس کے کہ اس
 میں بہت سی کہیوں کو محسوس کیا گیا مگر اس کی دل چسپی نے ہمیں اردو زبان میں آصف قرنی
 کی سہرائی سے فیضان ہونے کا موقع بھی دیا۔ ترجمہ میں ایک اہلی ترنٹے کی خوبیاں موجود
 ہیں لیکن یہ ترجمہ ہاتھوں نہیں نکلی ترجمہ ہے۔ انگریزی کی ہو بہو نقل۔ اسی مافی الضمیر کو
 اردو نقلی ترجمہ کی شکل میں لکھا گیا ہے۔ کوئی شک نہیں کہ زبان پر گرفت بہر حال مضبوط
 ہے۔ وہی بدلتی جو انگریزی میں ملتی ہے اردو کا بھی خاصا نظر آتی ہے۔ شاید اس کی وجہ
 اللہ اور احوال سے باخبریت اور خود مسترجم کا اپنا روحانیت کی طرف فطری رجحان بھی ہے۔

ناول کی انسانی خوبی یہ ہے کہ اردو ترنٹے میں اس کے آخر میں ایک نہایت
 مخلص مکالمہ موجود ہے جو ناول کے تمام اہم پہلو پر روشنی ڈالتا ہے۔ مکالمے میں اس
 مکالمے سے بات کی گئی ہے کہ کیسے سدھارتھ خود آگئی اور حقیقت کی حواش کا سفر کرتا ہے۔
 مکالمے میں یہ بحث نہایت عمدہ طریقے سے موجود ہے کہ مذہبی روایتی طریقوں کو جھٹلانے کا
 جو رویہ یہ ظاہر سدھارتھ میں نظر آتا ہے مگر "اوم" کا لفظ اس کی ذہنی تبدیلی کا باعث بھی بناتا

ہے جو یورپ کے دہلی تھاد کو ظاہر کرتا ہے جو بیک وقت فریب سے بھارت بھی کرتا ہے مگر
جو اس کے ضمیر اور خون میں شامل ہو کر اس کے ادارے میں تہہ ملی پیدا کرنے پر بھی قادر
ہے۔ روحانیت کے حوالے سے مشرق اور مغرب کے طریقہ کار کے فرق کو بھی نہایت
تفصیلات سے منکاشے میں بیان کیا گیا ہے۔ اس طرح ہاول میں یہ تھاد اور واضح ہو جاتا ہے
کہ مشرق کے آدمی کا مغربی انداز میں حقیقت کی تلاش میں ٹھکانا ایک اپنہا ہے۔ اس سے
ظاہر ہوتا کہ اس ماحول کو تخلیق کرنے میں مغربی ذہن کا ہاتھ ہے۔

ہاول کے آخر میں ہرمن جیے کا مختصر تعارف دیا گیا ہے جو انگریزی ہاول کے
آخر میں دیے گئے تعارف کا قطعی ترجمہ ہے۔ اصل فرنی نے خود سے ہرمن جیے کے
بارے میں کچھ جاننے یا پہلے سے لکھے گئے انگریزی تعارف میں کوئی اضافہ کرنے کی کوشش
نہیں کی کیوں کہ اگر وہ ایسا کرتے تو ضرور اس کی نشان دہی کرتے کہ ۱۹۳۶ء میں ہرمن کو
لٹنے والا ادب کا نوبل انعام اسی کتاب پر ملا تھا۔

♦♦♦♦♦

ماخذات

اصل فرنی، سولہ جلد، تو سین لائبر، ۱۹۸۳ء

Hermann Hessa, Siddartha, Bantam Books July.1971.

Britanica in depth 21

Microsoft Britanica Encyclopedia 2000.

Microsoft Encartha Encyclopedia 2004

<http://en.wikipedia.org/w/wiki-ptml?title>

اردو ادب پر تحریک آزادی اور جمہوری بیداری کے اثرات

قلمی تحریکیں اور سہلی اور قلمی تبدیلیوں کے ذریعہ ادب بھی تبدیلیوں سے
 بہت زیادہ متاثر ہے۔ معاشرے کے افراد کے قلمی رویے ادب کی جہات کا تعین کرتے ہیں۔
 پندرہویں صدی اور سولہویں صدی عیسوی میں مختلف ادبی تبدیلیوں کی آمد ہو رہی تھی۔
 سماجی قوانین سے آزادی کی خواہش کی بیداری اور پھر اس سلسلے میں قلمی کوششوں کے نتیجے
 میں بھی ادب متاثر ہوا۔ آزادی کی اس تحریک اور جمہوری بیداری کے اردو ادب پر اثرات کا
 جائزہ لینے سے پہلے حساب ہو گا اگر اس زمانے کے مفکرین کا کسی قدر تعین کیا جائے۔
 تحریک آزادی و سہلی جمہوری بیداری کا نتیجہ ہے۔ انہماں کے بیداری جن آزادی کا شعور
 اور اس کے حصول کی خواہش جب قلمی صورت میں آگئی ہے تو تحریک کی شکل اختیار کرتی
 ہے۔ جمہوری قلمی تحریکیں انہماں سے ادب میں بہت گہری ہیں۔ سہلی قلمی صورتوں کے
 سلسلے آخر میں نئے مفکرین بیدار ہوتے ہیں۔ ان مفکر کے مطالعے سے قلمی بہتر ہو گا کہ
 اردو ادب کے حوالے سے جمہوری قلم کے سہلی مظهر پر ایک سرسری نظر اٹال فی جائے۔

جمہوری قلم ایک وسیع تر قلمی رویے کی نشاں کی کرتی ہے جو سیاسی اور سماجی طور
 پر آزادی اور وسیع قلمی پر دلالت کرتی ہے۔ جبکہ جمہوریت جدید سیاسی نظریے کے
 مفروضے ہیں جن کی رو سے کسی ملک کا سیاسی نظم و نسق جاننے کے لیے مطلق اہمیت یا
 اہمیت کے خلاف ایک جمہوری حکم حکومت، جس کی تشکیل دانے دانے کے ذریعے ہوتی
 سماجی لائحہ عمل کی حمایت کرتی ہے، انہماں میں آتی ہے۔ یہ حکومت ملک کے سیاسی نصب
 العین کا سہلی تعین کرتی ہے۔ اس طرح سے اجتماعی مفکرانہ دہش کے لیے معاشرتی و سماجی

لگا سے سب کو ترقی کے یکساں مواقع فراہم کرتی ہے۔ جمہوری نظام حکومت کا تصور
 سوچو، دیا میں خاص سیاسی ہو کر رہ گیا ہے لیکن جمہوری لگن اس سے جھٹکتی ہوئی ہوئے
 بھی اس سے ماورا ہے۔ لیکن یہ سیاسی آزادی سے بلند ہو کر پہلی فرسٹوں میں بطور
 اقوام کی ذہنی، فکری اور تہذیبی اور اخلاقی زندگی میں عظیم انسانی اقتدار کی تعمیر و تکمیل پہنچا
 ہو جاتی ہے۔ چنانچہ یہ اولاً اس ذہنی آزادی کا مطالبہ کرتی ہے جس کے بغیر جمہوریت کا
 استحکام ہی ممکن ہے، نہ ہی انسانی اقتدار اور اصولوں کی ترقی و ترقی ہو سکتی ہے۔ حسب
 لگن انسان کا یہ اتنی حق ہے لیکن لگائی، سیاسی شعور، معاشی بدعنوانی، ذہنی تعصب، عوامی
 بصیرت اور نسلی امتیاز اس کے پختہ میں حرا م ہو جاتا ہے۔ انسانی ذہنی طرح طرح کی ذہنی
 اور سیاسی بکریاؤں کا شکار ہو جاتا ہے۔ وہ تو کھاتے میں جلا ہو جاتا ہے۔ نتیجے میں وہ
 جمہوری لگن کو پر امن چڑھانے میں ناکام رہتا ہے اور اس کی ذہنی صلاحیتیں گھٹتی ہوئی
 رہ جاتی ہیں۔ قومی سطح پر بھی وہ رنگ، نسل، قومیت اور زبان کی حدودوں میں گرفتار ہو کر
 ہندوستانی یک جہتی، مساوات، برادری اور متحدہ لگن کی قدروں کی آبیاری نہیں کر سکتا۔

دوسرا ملک صدیوں سے سیاسی انتظامات سے گزارتا رہا ہے۔ یہ مختلف ذہنوں میں
 مطلق اعلیٰ نیت، شہنشاہیت، بادشاہی تسلط اور لگائی کا شکار رہا ہے۔ ان سیاسی حالات میں
 جبریت، اظہار اور ناس ممانگی کی صحیح حقیقتوں کا سامنا کرنے کے باوجود یہاں کے لوگوں
 میں آزادی کی روح زکوہ رہی ہے اور اس کا مؤثر اظہار ہمارے تہذیبی کار، جو معاشرے
 کے خیر کا درجہ رکھتے ہیں، کرتے رہے ہیں۔ اردو ادب اور خاص کر شاعری میں ارتقائی
 سے جمہوری فکر کے محدود سیاسی تصور کے بجائے اس کے عالمگیر انسانی تصور کے نکات
 ملتے ہیں۔ شعرا نے بیڑے حسب لگن کے تقدس، ضرورت اور اہمیت کا تصور کیا ہے، چنانچہ
 انہوں نے سیاسی، سماجی اور مذہبی روایات و رسوم کی بالادستی اور جبریت کے خلاف اپنے
 رد عمل کا اظہار کیا ہے۔ مسلمانوں میں تصوف اور ہندوؤں میں بھگتی تحریک نے انسان

مگر حضور ہندوستان کی آزادی ان کے لیے سیاسی، سماجی، تعلیمی اور مذہبی ہر سب سے بڑا مقصد تھا۔ ان کے لیے مسلمانوں نے مسلم لیگ کے بانی قاسم سے جہاد کا مطالبہ کیا اور کافی حد تک تسلیم بھی کر لیا گیا۔

مسلم لیگ کے قیام کے چھپے چھپے سونے کا فرما تھی کہ مسلمانوں کو الگ قومیت کا شعور دیا جائے۔ 1909ء میں منتر مارنے اور اصلاحات سے کم از کم انگریزوں کی نظر میں۔ یہ مقصد ایک حد تک پورا ہونا دکھائی دیا۔ 1915ء میں دستوری اصلاحات کے نفاذ کی بات ہوئی تو ہندوؤں اور مسلمانوں نے مخالفت کی راہ اپنی تاکہ اس موقع سے فائدہ اٹھایا جاسکے۔ اسی سال مسلم لیگ اور کانگریس کا اجلاس بمبئی میں ہوا جس میں دونوں جماعتوں نے اپنی اپنی مجلس تظلمی آئین قائم کی۔ 1916ء میں ان دونوں مجلس کا مشترکہ اجلاس ہوا جس میں قائد اعظم کی سفارشی قراردادیں بعض ترامیم کے بعد منظور کر لی گئیں۔ بعد میں گھنٹوں میں منعقدہ اجلاس میں ان کی توثیق کر دی گئی اور اسے "بیان گھنٹوں" کا نام دیا گیا۔ اس معاہدے سے مسلمانوں نے یہ سمجھ لیا کہ اب انگریزوں کے ساتھ ساتھ ہندوؤں نے بھی ان کی جہاد کا مفہوم تسلیم کر لیا ہے۔

ہندوؤں اور مسلمانوں کے اس گھومتے کے علاوہ ہوم رول تحریک بھی ایک اہم سیاسی واقعہ تھا۔ اس تحریک کی بانی سزائی بیٹھ گئیں۔ جلد ہی یہ تحریک بہت مقبول ہوئی اور انگریزوں نے اسے خطرہ سمجھتے ہوئے قائد تحریک کو نظر بند کر دیا۔ لیکن اس کے نتیجے میں سیاسی شعور رکھنے والا طبقہ زیادہ بے چارہ ہو گیا۔ اس سے نہ صرف سزائی بیٹھ کو رہا کر دیا گیا بلکہ دستوری اصلاحات کے نفاذ کا بھی اعلان ہو گیا۔

کانگریس کی جنرلی اٹریٹ سے واپسی بھی اسی دوران ہوئی۔ شروع میں انہوں نے انگریزوں سے تعاون اور حسن سلوک کی راہ اختیار کی۔ نتیجتاً ایک ماہ میں سزائی ہندوستانی انگریزوں کے لیے جنگی خدمات کے لیے بھیج دیے گئے۔ تحریک خلافت

تربیک ہوم تھاوان کی منظوری اور جوش کی وجہ سے یہ زمانہ مسلم لیگ کے بانی مظفر میں چلے جانے کا ہے۔ 1924ء میں قائد اعظم کی مصداقت میں لاہور میں ہونے والا اجلاس مسلم لیگ کے بانی شریک ہونے کا اعلان تھا۔ اس کے بعد کا جلسہ 1927ء میں دہلی میں ہوا۔ اس جلسے میں اتحاد اور دلی جوش کی گتیں بانی میں کہا گیا تھا کہ متحدہ اور ہمجنی کو الگ الگ صورتوں کا نتیجہ دیا جائے، سرحد اور بلوچستان میں دوسرے مسلمانوں کی طرح اصلاحات و نظریات کی جائیں، پنجاب اور بنگال میں آزادی کے کامیاب سے لڑائی کی آہی ہونے اور مرکزی مجلس قانون ساز میں مسلمانوں کو بھی مناسب نمائندگی دی جائے۔

اسی دوران میں شملہ میں اسمبلی کے اجلاس کے دنوں میں قائد اعظم کی مصداقت میں ہندو مسلم مصالحت کی ایک اور کوشش ہوئی لیکن چندوں کی بہت دھمکی کی وجہ سے یہ کوشش ناکام ہوئی۔ نومبر 1927ء میں سائمن کمیشن قائم کیا گیا جس کا مقصد آئینی اصلاحات کے لیے اتحاد اور جوش کرنا تھا۔ چونکہ کمیشن کے تمام اراکان انگریز تھے اس لیے چاہتیں تھے اس کمیشن سے تھاوان سے الگ کیا جائے۔ قائد اعظم بھی اس سے تھاوان کے مخالف تھے لیکن دیکھ دوسرے سائمن اس کے حق میں تھے اس لیے مسلم لیگ میں بھی اس مسئلے پر اختلافات پیدا ہوئے۔ اسی زمانے میں انگریزوں نے اہلی اہل کو آئین کے معلق اپنی مختلف اور مصلحتی اتحاد اور سپلے کی جوشی عمل کی۔ کانگریس کی رجوع پر 1928ء میں تمام جماعتوں کا اجلاس ہوا لیکن متحدہ کے مسئلے پر اتفاق رائے نہ ہونے کی وجہ سے ان کمیٹیوں کی رپورٹ جاری نہ ہو سکی۔ سرحد کی زیر مصداقت ایک کھلی قائم کر کے اس مسئلے پر نظر دہلی کی گئی اور اس کے بعد سرحد رپورٹ قبول کی گئی۔ مسلمانوں نے اس میں چکر تراجم کا مطالبہ کیا جو ہندوؤں کی خدمت کی وجہ سے نہ دیا گیا۔ یہ رپورٹ حکومت کو بھیجی گئی اور ساتھ ہی یہ بھی کہا گیا کہ اگر 1929ء کے اجلاس تک اس کے معلق دستور کا غلام نہ ہوا تو کانگریس کو آزادی دینی دینے کے مطالبے کو منظور کر عمل آزادی کا مطالبہ شروع کر دے گی۔ اس رپورٹ کے نتیجے میں

ہوا یہ نہیں کم از کم مسلمانوں کو خود ہونے کا احساس ضرور ہوا گیا۔

1829ء میں وائسرائے لارڈ ارون نے کول میز کانفرنس ہانے کا اعلان کیا۔

کانگریس نے بکو شراکاء پیش کیں جن کے منظور ہونے پر کانگریس نے اس کانفرنس میں

شہریت سے انکار کیا اور 1830ء میں سول ڈرامائی کی تحریک شروع کی جس کا مقصد

حکومت پر دباؤ ڈالنا تھا۔ 1831ء میں مصلحت ہوئی اور یہ تحریک واپس لے کر دوسری

کول میز کانفرنس میں شرکت پر آمادگی ظاہر کی۔ مسلمانوں کی نمائندگی سر آغا خان نے کی۔

اس کے نتیجے میں بدامان انتخاب کو تسلیم کیا گیا جس پر ہندوؤں نے بھرا احتجاج کیا۔

برطانوی حکومت نے اپنے دستور فیصلے شائع کیے تو ہندوؤں اور مسلمانوں

دونوں نے اس کی مذمت کی۔ نتیجاً ایک کھلی قائم کر کے مختلف طبقوں کے بیانات سننے

کے اور اس کھلی کی رپورٹ برطانوی پارلیمنٹ میں منظور ہوئی اور اسے گورنمنٹ ایکٹ

آف 1835ء کا نام دیا گیا۔

1836-37ء کے انتخابات میں جن علاقوں میں کانگریس کو طلب حاصل ہوا

وہاں مسلمانوں پر تشدد کی وارداتیں ہوئے لگیں اور جگہ جگہ فسادات شروع ہو گئے جن میں

مسلمانوں کو بہت ہانی اور مالی نقصان اٹھانا پڑا۔ سرحد اور سندھ میں مسلمانوں، پنجاب اور

بھال میں احمد پارٹی اور باقی سات صوبوں میں کانگریس کی حکومت قائم ہوئی۔ ہندوؤں

نے اپنے اقتدار کے صوبوں میں مسلمانوں کے حقوق کو پامال کیا۔ 1838ء میں دوسری

مالی جنگ کے آغاز کے ساتھ کانگریس کی وزارتیں مستعفی ہوئی اور مسلمانوں نے ہرے

جگہ میں عدم نجات منایا۔

اس سارے پس منظر سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ مسلمانوں نے اپنے الگ تشخص

کو قائم رکھتے ہوئے ہندوؤں سے مصلحت کی کوششیں کیں جو ہر مرتبہ ہندوؤں کی ہمت

دھڑکی کی وجہ سے ناکام ہوتی رہیں۔ کانگریس کے اس طرز عمل کی وجہ سے مسلم لیگ کو

ایڈ کرنے میں آسانی ہوگی کہ بعد انگریزوں کے تحت اپنی تہذیب و تمدن، اپنی زبان اور
 ادب، اپنی اقدار اور نظریات و فلسفہ اعلیٰ کر رہے قرار دیکھا جاسکے گا۔ لیکن اس سے ایک الگ
 مسلم حکومت قائم کرنے کی ضرورت کا احساس ہوا جو مارچ 1940ء میں ایک قرارداد کی
 شکل میں منظور ہوا۔ اس سے آپریٹ آزادی کو ایک واضح منزل ملی اور اگلے سات سال کی
 مسلسل کوشش سے پاکستان کا قیام عمل میں آیا۔

بیسویں صدی کے نصف اول میں کھائی گئی سطح پر بھی کئی تہذیبوں نے دنیا کو جنم دیا
 اور ادب پر چلا۔ ان کا بھی مختصر جائزہ لینے کی ضرورت ہے۔

بیسویں صدی ہی سے خاص اچھلی بندہ ترقیوں شروع ہو چکی تھیں جنہوں نے
 بیسویں صدی تک آئے آئے بہت عظیم عمل اختیار کر لی۔ مسلمانوں نے بھی ان کے
 چیلے پر اپنی کوششیں کیں۔ یہاں لفظ بہت کچھ ہو گیا۔ اسی اثنا میں بدنام زمانہ کتاب
 "ریگنڈا" رسول کی اٹھت سے مسلمانوں کے جذبات میں آگ لگا گئی۔ اس کے
 مصنف راجپال کو لکھ کر دیا گیا۔ 1936ء میں شروع ہوا کہ اس کی تحریروں اور حرکتوں
 کے باعث آگ کو دیا گیا جس سے کشمیر کی خطا اور بھی طراپ ہو گئی۔ دونوں طرف مسکری
 ترقیت شروع ہو گئی اور اسی طور سے میں چ گیا اور فرقہ وارانہ لڑائیاں شروع ہو گئے۔

پہلی رنگ حکیم کے خاتمے کے بعد اس کا لڑا صورت حال میں ہندوستان کے
 ہندوں خصوصاً مسلمانوں میں بادی، ارضی اور مقامی مسائل کی طرف توجہ بڑھ گئی۔ ترکی
 میں خلافت کی منوبی اور جمہوریت کے قیام کی وجہ سے ہندوستان کے راجا اہمیت
 مسلمانوں کو بہت دکھ پہنچا۔ اسی سے سے تھان میں یہ خشک و شہادت پچھا ہوئے کہ
 سیاست، معاشرت اور مہجرت میں دینی کو کہاں تک داخل کرنا مناسب ہے۔ اسی دوران
 وہاں میں اشتراکی انقلاب کے حکم ہو جانے کے باعث لڑجوانوں کی نہ صرف لکھنؤ میں
 انقلاب ہوا بلکہ اشتراکی لڑجی بھی دیکھی پچھا ہوئی۔ اسی دیکھی کے سطر اثرات کو لکھنے کے

لئے بعض اہل علم حضرات نے اسلام کی مصلحت و مناسبت سے اس کے سیاسی، معاشرتی، اقتصادی اور اخلاقی و فکری نظام کی سمجھنے اور سمجھانے کی کوششیں شروع کر دیں۔ یہ دونوں رجحانات بعد میں ترقی پا کر اہم رویوں کی شکل میں اصل گئے۔

اس دور میں مختلف تعلیمی اداروں کے ساتھ ساتھ بعض اور بہتر تعلیمی ادارے بھی قائم ہوئے۔ ان اداروں سے اردو اور ہندی کے فروغ کے لیے کوششیں کی گئیں۔ اور عمل کاغذ پتھر پر لکھ کر پھیل گیا۔ اس میں مختلف مشرقی زبانوں میں مضامین شائع ہوتے تھے۔ سرسید تحریک کے زیر اثر اور دیگر جگہ و جہات کی بنا پر کئی عالمی جنگ سے قبل نئے تعلیم یافتہ طبقے نے انگریزی عادت و اطوار کو اپنانا شروع کر دیا تھا۔ ایسا کرنے سے وہ خود کو مہذب اور شانست ظاہر کرنے کے خواہش مند تھے۔ اس طبقے نے دیکھا کہ انگریز ماری، عملی اور اقداری قدروں کو مذہب کے ظاہری پہلوؤں کی بہ نسبت زیادہ اہمیت دیتے ہیں تو اس نے بھی آزاد خیالی، روشن فکری، مذہبی تھکیک اور بارہ پرستی کو نئی تہذیب کا لہرہ سمجھ کر اختیار کر لیا لیکن انگریزوں کی اخلاقی صفات اور ذہنی خصائص کو اپنانے کی کوششیں بہت کم ہوئیں۔ اسی فیشن کی رو میں ملک میں جا بجا خصوصاً شہروں میں مشرقی تمدن کے ساتھ ساتھ مغربی تمدن کے مصنوعی نمونے بھی نظر آنے لگے۔ اکبر آبادی نے اسی طبقے کو نشاۃ تھکیک بنا دیا۔ جنگ عظیم کے خاتمے کے ساتھ ہی انگریزوں کا نیا روپ سامنے آیا تو یہ طبقہ بھی اپنے نظریات پر نظر ثانی کرنے پر مجبور ہوا۔ سیاسی اور سماجی واقعات کی شدت کے باعث حکمرانوں کے خلاف احتجاج کا سلسلہ شروع ہوا تو یہ طبقہ بھی دوسرے طبقوں کے ساتھ مل کر آزادی کی جدوجہد میں شریک ہوا۔

دیگر تخلیقی تہذیبوں میں طرز زندگی، مصوری، موسیقی، خطاطی اور ادبی سرگرمیاں وغیرہ شامل ہیں۔ انگریزوں کا طرز تعمیر مسلمانوں سے مختلف تھا۔ نئے تعلیم یافتہ طبقے نے اسی کی تقلید میں انگریزی طرز کی رہائش اختیار کرنا شروع کی۔ مغلیہ سلطنت کے خاتمے سے

مرکز کو کھڑا اور ریاستوں کو مضمون کیا تو دیکھی جائیں، مہاراجوں اور لوہوں کے موسیقاروں کی بہت سرچائی کی۔ ان کے نتیجے میں انیسویں صدی کے راج اول کا زمانہ کھائی موسیقی کے عروج کا زمانہ ہے۔ مصوری اور خطاطی جیسے فنون کو بھی فروغ حاصل ہوا اور مسلمانوں میں مہاراجن چنگلی اور باسراٹھ نقش جیسے لوگ پیدا ہوئے۔ اسی طرح خطاطی کے میدان میں بھی عبدالحمید پڑوی، رقم اور دوسرے کی اساتذہ کاملین پیدا ہوئے۔

ان دستخط سیاسی اور ثقافتی کاغذ میں اردو ادب میں کئی تبدیلیاں پیدا ہوئیں۔ یہ ایک نئے دور کا آغاز تھا (مولانا آزاد کا کلمہ حسین اور اللہ):

”انیسویں صدی کے آغاز اور وسطی جنگ عظیم تک بڑے عظیم گوجن سیاسی اور سماجی حالات سے دوچار ہوا چڑا اور جو اردو شاعری میں بھی منعکس ہوئے ان کی مختصری لہرست یہ ہے: وطن اور وطنیت کا تصور، سیاسی نظریہ کا شہدہ احساس اور ہندو آزادی کی تحریک، نئی دانشوں کی چاقوقی اور ان کا اثر اجتماعی زندگی پر، اسلامیات ہند کی نئی گروت اور ملی گروتھ تحریک کا ردعمل۔ اتحاد اسلام اور نئی دانش خیالی کا علم، تحریک ہوم رول وغیرہ۔ نئی زندگی کے یہ چند نقطہ داخل ان سیاسی اور سماجی رجحانات کی نشاندہی کرتے ہیں جو انیسویں صدی کے اسلامی رجحانات کے بعد رونق دیاں بناؤ ہندو لہرست۔ ان دور کی عوامی زندگی میں امید و جہم کے جنگام میں شہدہ ہے گنتی اور عدم اطمینان کی کیفیت پائی جاتی ہے، جسے عصر نو کی تفسیر کہا جاسکتا ہے۔“ (۱)

مسلمانوں کے نظر میں گوجن کو اجتماعی طور پر سرحدہ تحریک بہت حد تک متاثر کر چکی تھی۔ سرحدہ کی زندگی ہی میں اس کا ردعمل بھی شروع ہو گیا تھا۔ اکبر الہ آبادی اور اودھائی ان میں سے تھے۔ 1901ء میں ”مشرق لہر“ کا آغاز ہوا تو یہ ردعمل سرحدہ کی

واقفیت اور عظمت کے مقابلے میں اردو ادب میں گھٹن اور ذلت اور ان کے مہاجر کے تصور کی صورت میں ظاہر ہوا۔ اس کے علاوہ انا مل جبرگی، سلیم پائی جی، کیلاست، سب تلخ لہجہ اور دیگر شعراء کے ہاں فطرت افادہ، ہندوستانی ماحول، امن و آس، سادگی، کونچہ، روزمرہ زندگی کے حسن کی تصویر کشی کی گئی۔ یوں بیسویں صدی کا آغاز، پاکستان سرحد کی واقفیت، عظمت اور افادیت کے مقابلے میں لطیف نگہداشت، مسرت اور لذت کے پہلو سمجھتے آئے۔ لیکن اس تحریک کو باطنیاً نہیں کہا جا سکتا۔ یہ دراصل آسویں صدی اور نوردوستی کا ماحول پیدا کرنے کی ایک کوشش تھی۔ اس تحریک کو رومانوی تحریک کا نام دیا گیا۔

اس تحریک کے آغاز کرنے والوں میں بلدیم کا نام نمایاں ہے۔ خیال پرستی کے اس لہجے میں نیاز فتح پوری اور ل۔ احمد اکبر آبادی بھی ان کے شریک تھے۔ یہ لیکن والوں کا وہ گروہ تھا جو نثر کے پردے میں شاعری کرتے تھے۔ اس گروہ کے نزدیک ادب کا مقصد اصلاح و بصیرت نہیں بلکہ تخلیقی حسن و تکمیلی فن تھا۔ مہدی افادہ، بھون کو کھنڈی، باب انا مل بھی اسی داستان کے نمائندے ہیں۔ یہ ناول نگاروں صرف حقیقت نگاروں کے طور پر رہا بلکہ تنقید میں بھی مہدی افادہ اور نیاز فتح پوری وغیرہ نے اسی رنگ کو اپنایا۔

رومانویت بظاہر خارجی حیثیتوں سے فرار کی ایک شکل نظر آتی ہے لیکن اس میں کچھ ایسے عناصر بھی ہیں جو دراصل آزادی کی تحریکوں اور سماجی تبدیلی کے پیدا کردہ ہیں۔ بغاوت، اشتعال کی صدوں کو چھوٹا ہوا جذبہ، ماضی کی بازیافت وغیرہ موجود ماحول کے خلاف ایک رد عمل کو ظاہر کرتے ہیں۔ بقول ڈاکٹر انور سوریہ:

”ان (رومانوی ادیبوں) کے پس پشت خیال کی آزادی اور جہان کنڈا فکرت دے کر جہان نو کی تعمیر قدر مشترک کے طور پر موجود تھی۔ اس کوشش میں رومانی تحریک نے ایک سرکش نوع کی طرح آگے بڑھے اور قدامت کی ہر شے کو مسمار کرنے کی سعی کی۔۔۔ اہم بات یہ ہے کہ قہر“

کی اس لہر میں پیشتر وہاں نے مغربی ادب کی امتثال کو اردو میں مانگے کرنے کی کوشش کی تھی لیکن ان کے مغربی مزاج کو قبول نہیں کیا۔ اور ان کی وہاں نے مشرق کی مدح کو نہ صرف برقرار رکھا بلکہ مشرق کو تہذیب کا آئینہ سمجھنے پر بھی اصرار کیا اور اس کی تہذیبی برتری کو ثابت کرنے کی کوشش کی۔ چنانچہ اردو کی روایتی تحریک میں مشرق پسندی ایک ایسا آئینہ مل ہے جو اپنی قوت ماضی کی عظمت سے حاصل کرتا ہے۔" (2)

بنگ عظیم سے پہلے کے ہنگو واقعات نے عوام کی دلچسپیوں کا رخ سیاست کی طرف موڑ دیا جس سے ذہنی بیداری اور جذباتی جوش و خروش پیدا ہو گیا۔ حسرت موہانی کا اردو کے مصلیٰ، وحید الدین سلیم کا 'ہفتہ وار مسلم گزٹ'، مولانا ظفر علی خان کا 'روزنامہ زمیندار'، مولانا ابوالکلام آزاد کا 'الہلال' اور مولانا محمد علی جوہر کا 'کامریٹے ایس وور کے لٹاکرہ مسلم اخبارات درساں ہیں۔ ان سب میں انگریزوں کی سیاسی پالیسیوں کے خلاف جذبات کا اظہار ادنیٰ صورت میں ملتا ہے۔ سیاسی واقعات کے زیر اثر شدید اور تند و تیز جذبات کا اظہار نظم و نثر دونوں میں ہونے لگا۔ بنگ عظیم کے بعد کا زمانہ تحریکوں اور ہنگاموں کا زمانہ تھا۔ عوام میں قومی بیداری اور سیاسی سوچ بوجھ بیدار کرنے اور انہیں جھجھورنے کی ضرورت تھی۔ یہ کام جذباتی، جوشیلے اور خطیبانہ انداز کے بغیر مشکل تھا۔ چنانچہ مولانا ظفر علی خان، مولانا ابوالکلام آزاد اور محمد علی جوہر کے ہاں یہ عناصر بہ افراط ملتے ہیں۔

ملک کے سیاسی حالات کی نوعیت کچھ ایسی تھی کہ گلے والے حقیقی واقعات سے صرف نظر نہیں کر سکتے تھے۔ لہذا نظم اور نثر دونوں میں سیاسیات کی جھلک پورے جوش کے ساتھ نمایاں رہی۔ ظفر علی خان، اکبر الہ آبادی، چکبست، آغا حشر، غلام بھیک خیرنگ وغیرہ کی بیسیوں نظمیوں سیاسی موضوعات پر ہیں۔

اقبال نے جن تمام مسائل پر فکری اور فلسفیانہ انداز میں غور کیا۔ اقبال کے کلام کے اسیے اردو شاعری کو نہ صرف وسعت مگر بلکہ ادنیٰ بخین بھی ملتا ہے۔ ان کے پیام کی ہم گیری، خفایت، طبعی و عملی امکانات، انقلابی تصویبات، انسان دوستی اور انسان کی غیر جانبداری صلاحیتوں پر ایمان و ماضی انہی حالات کا رد عمل تھا جس کے ذریعے انہوں نے مسلمانوں میں اعتماد پیدا کرنے کی کوشش کی۔ اقبال اور ان کی ہم عصر اور بعد کی شاعری میں ماضی سے زیادہ مستقبل کا اور اپنی حالت پر قائم سے زیادہ کچھ کرنے کے عزم کا اظہار ہوتا ہے۔

جنگ عظیم سے پہلے ہی حالی، اسامیل، اکبروف آبادی، چکوست اور اقبال کے ہاتھوں اردو غزل اپنے قدیم روایتی انداز نظر کو اٹھاتی، ٹھیکرنا اور عصری رجحانات کو اپنے دامن میں جگہ دے رہی تھی تاہم امیر اور داغ ہی غزل کے مقبول شاعر رہے۔ جنگ عظیم کے بعد صورتحال بدل گیا اقبال نے غزل کو اس طرح بدلا کہ اس میں عظمت و وقار، تازگی و ندرت اور ایک نئی رمزیت و اشاریت، معنویت اور طبیعت پیدا کر دی۔ دوسرے غزل گو شعرا یعنی مسرت، فانی، یگان، امیر گوٹروی، بکر مراد آبادی وغیرہ نے اقبال کی طرح اس سلف کو نہیں دیکھا۔ لیکن ان کی تصویبات، ان کے طرز احساس، ان کے لہجے اور ان کے رویے میں نئے حالات اور نئے تصورات کے تحت تبدیلی آگئی۔ نئے عشقیہ تصورات اور زندگی کے سیاسی اور سماجی تاثرات غزل میں راونے لگے۔

ان حالات کی وجہ سے جہاں مندرجہ بالا خارجی زاویہ پیدا ہوا وہیں کچھ اور جہاں نے داخل میں بنا دی۔ یہ کچھ تو ان کے اپنے طبعی میلان کا اثر تھا اور کچھ اس خارجی پہلو کا رد عمل بھی۔ اسی دور میں بعض شعرا کے ہاں شعر و ادب کی مقصدیت سے قطع نظر غافلگی اور جاڑائی انداز نظر پیدا ہوا۔ ان کی دنیا خوش آنکھ جذبات کی ایک حسین کائنات بن گئی۔ اس قبیل کے شاعروں کا عشق حسن سے زیادہ اس سے پیدا شدہ جذبہ سرستی سے تھا اور ان کا تصور انقلاب ان کی داخلی آرزو و مندی کا آئینہ دار۔ ان شاعروں میں اختر شیرانی، قاتر

پریا لوی، عفت اللہ خان، جوش ملیح آبادی، حنیف ہالہ جری اور ان کے بعد جلال اللہ امری۔
یاد فرمائی، اختر حسینی اور احسان دانش وغیرہ کے نام لیے جاسکتے ہیں۔

نثر کے حوالے سے دیکھا جائے تو مختصر افسانہ نگاری کا آغاز بھی سویرے صدی
کے شروع ہی میں پریم چند اور یلدرم کے ہاتھوں انہی دنوں ہوا جب اردو ناول امراتہ ہان
ہوا اور 'نواب سستی' کی شکل میں فلسفہ نفسیات اور منطق کی دنیا میں قدم رکھ رہا تھا۔ پریم
چند کے ابتدائی دور کے افسانے، یلدرم، سلطان حیدر جوش اور نیاز علی ری کے افسانے سب
داستانوں کی رنگین روایت کی یاد دلاتے ہیں۔ تاہم اس اشتراک کے باوجود ان گھنے دالوں
کے تکنیکی محرکات یکساں نہیں تھے۔ پریم چند اور جوش مقصدی اور اصلاحی محرکات رکھتے تھے۔
پریم چند کا مقصد یہ تھا کہ ان کے افسانوں کے ذریعے قوم اور وطن کی محبت اور اس محبت
میں آنے والی دھن سب جگہ تازہ کر دینے کا جذبہ پیدا کیا جائے۔

اسی دوران روس میں اشتراکی انقلاب برپا ہو چکا تھا جس کے اثرات ہندوستان
میں بھی پہنچے تھے۔ بقول ڈاکٹر جس الدین صدیقی:

"1917ء کے روسی انقلاب نے اشتراکیت، عدالت اور سرمائے
کے موضوعات پر اہل فکر کی توجہ کو مرکوز کر دیا تھا.....
ہندوستان میں یہ احساس بھی پیدا ہو رہا تھا کہ سیاسی آزادی کا
مطالبہ برحق سمی، لیکن سیاسی آزادی اس وقت تک بیکار ثابت
ہو گی، جب تک اس کے ساتھ ہی عوام کی معاشی آزادی بھی
شامل نہ ہو۔" (3)

اس کے نتیجے میں مزدور، کسان، افساس، بیکاری، بے گارت، سرمایہ داری، ملوکیت جیسے مضامین
و موضوعات بھی شعروادب میں جگہ پا گئے۔ 1930ء کے عالمگیر معاشی بحران کے
بعد حقیقت نگاری کا رجحان بہت جاوی ہونے لگا اور افسانہ و ناول کی دنیا میں لذتیت اور

مکتبہ کے ذریعہ آ گیا۔ نئے نئے مکتبوں میں مکتبہ پہاڑیوں سے بھی جو کوشش ہو رہی ہے، اس کی
 بنیادی بنیادیں پوری، اکثر خود بخود، اور پھر پھر ایک کوشش ہے۔ مکتبہ کے ذریعہ
 مکتبہ پہاڑی، سعادت سنی مکتبہ، اور دیگر مکتبہ، مکتبہ پہاڑی، مکتبہ پہاڑی، مکتبہ پہاڑی
 جنہوں نے ترقی پسند تحریک کے لیے راستہ ہموار کیا۔ اس میں کے مکتبہ پہاڑی نے پہلی
 سہائی قدموں کے خلاف آواز اٹھائی۔ مغربی علوم و فنون کے خلاف آواز اٹھائی، مکتبہ پہاڑی
 کے تعلق کے حالات اٹھائے گئے۔ مکتبہ پہاڑی کے پہلے مکتبہ پہاڑی نے پہلا قدم اٹھایا
 اور مکتبہ پہاڑی کی اس غلامی کے نتیجے میں بہت سا کوشش عمل میں آئی ہے۔ مکتبہ پہاڑی کی
 ترقی پسند

"مکتبہ پہاڑی کی تحریک کا پہلا اہم کارنامہ ایک مجموعے کی
 صورت میں شائع ہوا جس کا نام "مکتبہ پہاڑی" تھا۔ اس کتاب
 میں بڑے خاص کسی چیز اس کی اہمیت سے اٹھائے گئے۔ اس کی
 اہمیت سے اسے ادب نے خود بخود ہی کاظم بنا دیا۔ یہ کتاب پہ
 پہلا دہائیہ ملے تھا۔ اس کتاب کا مقصد ہی قدموں کی
 تعمیر سے زیادہ پہاڑی مکتبوں کی تحریک تھی۔" (4)

ترقی پسند تحریک ادب کے ذریعے تبلیغ اور عملی جدوجہد کے ذریعے ملک میں
 مکتبہ پہاڑی کی آواز مندی تھی۔ اس کو آواز ہی میں فعال حیثیت حاصل ہوئی اور اس نے
 ملک کی ادبی فضا میں تحریک اور رد عمل پیدا کیا۔ اس تحریک کے مشہور میں زندگی، مکتبہ پہاڑی
 میں بنیادی مسائل کو موضوع تھی، جانا قرار پایا اس میں ہونک مکتبہ پہاڑی، مکتبہ پہاڑی
 کے مسائل، جن میں غیر ملکی سامراج کے خلاف جدوجہد کو اٹھانے کے علاوہ مکتبہ
 مذہب، جنس، جنگ اور سماجی کے بارے میں رجحان پسندی اور مکتبہ پہاڑی کے خیالات کا
 رنگ قیام کر اور شعراء ادب میں سماجی مکتبہ پہاڑی کو فروغ دے کر نتیجے اور زندگی

حالت گناہ میں تھی۔ اس تحریک نے آزادی ہمارے کے مفکرانہ اور انقلابی اثر پر اس
 تحریک کے بہتر اثر کو پہنچایا ہے۔ ہمارے اپنے ہر ایک اور ہر ایک کے
 زہرا اور ادیب کا ہمارا سرمایہ تخلیق ہوا۔ ہمارے ہر ایک اور ہر ایک کے

”ترقی پسند تحریک کے زہرا اور ادیب تخلیق ہوا اس پر ترقی پسند
 نظریے کی بھاپ گہری گئی ہوئی تھی۔ چنانچہ اس ادیب میں
 پاریکھنا، تجزیہ اور تخلیق کا عنصر ہر مقدار میں موجود ہے اور
 تحریک کا مقصد ہے کہ انہیں نظر آتا ہے۔ تاہم ادیب زندگی کا
 مطالعہ ادیب کے تجربے کا جزو بن جاتا ہے تو ایسے ادیب
 ہمارے بھی تخلیق ہوتے ہیں جن میں جمالیاتی شان موجود ہوتی
 ہے اور انہیں تخلیق کے تحت بنانوں پر پکھنے کے باوجود ہمارا
 قرار دیا جا سکتا ہے۔ اس حقیقت سے انکار ممکن نہیں کہ ترقی
 پسند تحریک کے بعض اعضاء نے جو ادیب بنائے ہیں ان میں زندگی کی
 تصویر ہی نہیں بلکہ ان کی رہاں تخلیق ہی موجود تھی اور اس نے
 مستقبل کو متاثر بھی کیا ہے۔“ (5)

مجموعی طور پر دیکھا جائے تو سیاسی حالات اور سماجی اور جمہوری تبدیلیاں نے
 ادیب کو داخلی اور خارجی دونوں سطحوں پر متاثر کیا۔ ادیب کے مضمومات اور نظریے میں
 تبدیلی آئی تو نظریات، روایا، اور اسلوب، روش، اسلوب اور تخلیق کے حوالے سے بھی
 متغیر حالات کے اثر سے رہے۔

حوالہ جات

- 1- غلام حسین ذوالفقار، ڈاکٹر، "اردو شاعری کا سیاسی اور سماجی نکتہ نظر"،
سنگ میل جہلی یکشنز، لاہور، 1998ء، ص 426
- 2- انور صدیق، ڈاکٹر، "اردو ادب کی تحریکیں"، ایجنس ترقی اردو پاکستان، کراچی،
1999ء، ص 461
- 3- شمس الدین صدیقی، ڈاکٹر، تاریخ ادبیات مسلمانان پاکستان، ایف، ڈی، بی،
پنجاب یونیورسٹی، لاہور، ص 40
- 4- عزیز احمد، "ترقی پسند ادب"، کاروان ادب، مٹان، 1993ء، ص 55
- 5- انور صدیق، ڈاکٹر، "اردو ادب کی تحریکیں"، ص 504

فاصلاتی تعلیم: وڈیو مکالمے کا کردار

فاصلاتی طریقہ تعلیم کا آغاز انیسویں صدی کے وسط میں جرنیپ اور امریکہ سے ہوا۔ شروع میں تو خط کتابت کو ذریعہ تعلیم بنایا گیا جیسا کہ دنیا سے ہاں علامہ اقبال اورینٹل یونیورسٹی، اسلام آباد کا طریقہ ہے۔ لیکن بیسویں صدی کی دوسری دہائی میں ریڈیو کی ایجاد اور چھٹی دہائی میں ٹیلی وژن کے تصور کے سبب عالمی سطح پر فاصلاتی طریقہ تعلیم کے ضمن میں ترقی کے نئے تجربے اور طریقے دیکھنے کو ملے۔

بیسویں صدی کے آغاز میں ٹیلی فون کی ایجاد اور بتدریج ترقی نے فاصلاتی تعلیم میں اساتذہ کی دور افتادہ طالب علموں تک رسائی میں اضافہ کیا لیکن ٹیلی فون سسٹم (System) کا کردار اس ضمن میں زیادہ فائدہ مند ثابت نہیں ہوا تاہم بیسویں صدی کی آٹھویں اور نویں دہائی میں ٹیلی مکالمے (Teleconferencing) کی بنیاد نہیں رکھی گئی۔

ٹیلی ٹیلی مکالموں نے دور افتادہ طلبہ و طالبات کے ساتھ اساتذہ کے رابطے کو سہل بنایا اس طرح دور افتادہ سوال کرنے والے طالب علم اور جواب دہندہ استاد کے مابین رابطہ نہ صرف سہل ہوا بلکہ جامعیت کے ساتھ ممکن ہو سکا۔ یہ دو طرفہ رابطہ ٹیلی حدود کا پابند نہیں تھا۔ ہر لمحہ بھر میں ایک ملک سے دوسرے ملک تک بات کرنے اور سوال کا جواب پانے کی سہولت حاصل ہوگی۔

ٹیلی مکالمے کی کئی اقسام ہیں جن میں آڈیو ٹیلی مکالمہ Audio

(Teleconferencing) آڈیو گرافکس ٹیلی مکالمہ Audio Graphics

تہا۔ (Galbreath, 1995)۔ کوڈ یک کیا ہے؟ اس کا تصور ایک اچھی ذہنی بات تھی۔
 Modem کے طور پر کیا جاسکتا ہے۔ یہ Modem لفظ سے ماخوذ ہے جو کہ آئی ٹی کی زبان میں
 جو کہ آئی ٹی کی زبان میں آئی ٹی کے ذریعے ایک نظام سے دوسرے نظام تک جھانکا ہے۔
 Analog Signal کو Code گوٹ اور Digitize کرتا ہے۔ یہ آئی ٹی کی زبان میں
 کے ذریعے ہی کی تبدیل کرتا ہے۔

یہ طرفہ جامع نکالنے کو کامیاب بنانے کے لیے مختلف آلات جیسا کہ آئی ٹی
 Monitors (TV Monitors) کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ تقنی ٹیکنالوجی
 (Technology) کو بھی اس شعبہ کے لیے استعمال کیا جاسکتا ہے۔ جس میں جامع
 گیمٹ، ریگولر، ریگولر (Players) اور دیگر ذرائع شامل ہیں۔

ایک نظام سے گی خدمات تک تبدیل

یہ کہ نظام (Systems) ایک ہی وقت میں کثیر سنی کنٹرول ہوتے
 (Multipoint Control Unit) یا MCU کے ذریعے گی خدمات کو باہم بنانے کی
 صلاحیت رکھتے ہیں۔ کثیر سنی مکالمہ بہت حد تک ملنے پاتے ہو سکتا ہے۔ اس طرح وقت کے
 تقیم اور MCU کے تشکیل اور Logical ہتوں کو مد نظر رکھا جائے۔

قدری خصوصیتوں والے دو طرفہ جامع مکالمہ

جامع مکالمے سے مختلف قدرتی خصوصیتوں کے لیے وسیع ذہنی باتوں کو فروغ

خطر رکھنا نہایت ضروری ہے۔

(الف) ذہنی باتوں کا ایک اصول ہے کہ معلم کو ہر بات سے پورا وقت کے بعد اپنا قدسی

طریقہ سہولت کرتے رہنا چاہیے۔ مگر چھاننے کے دوران مہیاک سہولت

بات کی طرف آنا چاہتا ہے یا پھر طالب علموں کو پھیلنے پھولنے کی باتوں

میں تقسیم کر کے گی تقنی مرکزی میں مشغول کیا جاسکتا ہے۔

(ب) دوران پذیرد وایج مکالمہ لیکن ہے طلبہ چاہتے چاہتے ہے زائد ہو جائیگا اس لیے دور الزامہ طالب علموں کے ماحول کو زیادہ پرکشش بنانے کے لیے ایسی نوکات یہاں مقرر ہیں کہ انکی پڑھانے کی اہمیت دی جاسکتی ہے۔

(ج) بھری سوار کی چوری کے دوران انکی چند باتوں کا لیٹل رکھنا ضروری ہے۔ مثال کے طور پر بھرتی برسات کے اٹھاؤ اور لیر داغ چھینکے رنگوں کا استعمال کیپڑ کے مونٹور (Monitor) پر ایسا دکھائی نہیں دے۔ اس کے برعکس بھری سوار کے مختلف حصوں کو اگر مختلف انداز میں جیٹی کیا جائے تو اس طرح سے طلبہ کی توجہ حاصل کی جاسکتی ہے۔

تدریسی طریقہ ہائے کار بنانے دو طرفہ وایج مکالمہ

دوسرے طریقہ تعلیم کی طرح دو طرفہ وایج مکالمے کے لیے بھی چند تدریسی طریقہ ہائے کار کو یاد رکھنا اشد ضروری ہے۔

(الف) اس فاسلانی طریقہ تعلیم میں ایسی اوقات طلبہ تعلیمی کورس کو پانگل فی وی ہ ویل بھانے والے پروگراموں کی طرح سمجھتے ہیں اور اس طرح زیادہ توجہ سے نہیں پڑھتے۔ (Reed & Wooduff, 1995)۔ اس لیے وایج مکالمے سے پہلے کافی محنت اور بہتر تدابیر اپنانے کی ضرورت ہوتی ہے۔ خاص طور پر طالب علم اور استاد کے درمیان دو طرفہ رابطے کو موثر بنانے پر زیادہ توجہ مرکوز کرنی چاہیے۔

(ب) طالب علموں کو پہلے ہی سے آگاہ کر دینا چاہیے کہ پڑھائی کے دوران کسی قسم کی آواز بچا کرنے یا کسی اور سرگرمی میں مشغول ہونے سے پرہیز کریں۔ (Reed & Wooduff, 1995)۔ کیوں کہ اس سے پڑھائی کا معیار متاثر ہوسکتا ہے۔

(ج) ایک اور پہلو یہ نظر رکھنا نہایت ضروری ہے کہ دو طرفہ وایج مکالمے کے دوران

صرف اسٹوریج نہ ہونا ہے بلکہ تمام طلبہ کو بھی چھوٹی چھوٹی کے عمل میں مشغول رکھنا ضروری ہے اور اس کا آسان عمل ہے کہ ان سے ویڈیو کا سہولت کرنے کا سلسلہ جاری رہے۔

ذرائع مکالمے کے فوائد:

ذرائع مکالمے کے چند فوائد درج ذیل ہیں:

(الف) یہ اسٹوریج اور طلبہ کے درمیان باہمی گفتگو مقامات پر موجودگی طلبہ کے مابین تصویریں رابطہ میں کرتا ہے۔

(ب) دوسرے جغرافیائی مقامات پر موجود ماہرین تک رابطہ ممکن بناتا ہے۔
(Reed & Woodruff, 1995)

(ج) انتہائی ضرورت مند طلبہ تک رسائی میں آتا ہے۔

(د) مزید باتیں یہ کہ دور افتادہ علاقوں میں رہائش پذیر طلبہ تک بھی رسائی ممکن ہو جاتی ہے۔

ذرائع مکالمے کی حدود و قصور:

کی دوسری ٹیکنالوجیز (Technologies) کی طرح ذرائع مکالمے کی بھی چند حدود و قصور ہیں۔

(الف) کوڈنگ (Codec) بنانے کی مشینوں کے ذرائع کے تخیل کرنے کے طریقے مختلف ہیں۔ لہذا بعض اوقات دو مختلف Codecs کے درمیان ترجمانی کے عمل میں دشواری کا سامنا کرنا پڑ سکتا ہے۔ لہذا اس مسئلے کے حل کے لیے بہتر Protocols بھی بنائی گئی ہیں۔

(ب) جب تک اسٹوریج پر وقت سے کام نہ لے لے اس وقت تک کسی طلبہ میں کو اسٹوریج طلبہ نہ کرے کہیں میں دل میں ہی کے ساتھ حصہ نہیں لیتے۔

(۵) دیگر تعلیمی مواد بشمول فزیری لٹریچر اور تصاویر کی صورت میں تیار نہ کیے جائیں تو طلبہ کو پڑھنے پڑھانے اور سمجھنے میں دقت پائی آسکتی ہے۔

(۶) اگر تدریس کے لیے برقی رفتار ذرائع موجود نہ ہوں تو تصویروں اور آوازوں کے ذریعے تک کر دکھائی دیتے ہیں، سبب کہ ان کا تدریسی سے سسٹم (System) کو کچھ طور پر سمیٹ نہ کرنے کی وجہ سے موصول ہونے والی آواز میں بلااشتکائی اور جھجک ہے۔ (Reed & Woodruff, 1995) نیز کہ اصل تعلیمی عمل سے تعلق نہ رکھتی ہے۔

۶۰

عموماً تعلیمی تعلیم کے لیے خط کتابت یا ویب (Web) کو وسیلہ قرار دیا جاتا ہے مگر ذرا غور کیا جائے تو یہ برقی رفتار ذریعہ تعلیم ہے۔ سب سے اہم بات تو یہ ہے کہ اس کے ذریعے استاد اور طالب علم کے درمیان براہ راست رابطہ ممکن ہوتا ہے لیکن ان تمام خوبیوں کے ساتھ ساتھ باقی طریقہ ہائے تعلیم کے مقابلے میں یہ کئی مہنگا پڑتا ہے۔ لہذا یہ ہے کہ اس کا استعمال ترقی پذیر ممالک میں ابھی تک ایک خواب ہی ہے۔ البتہ تعلیمی مواصلات کے میدان میں ترقی اس خواب کو شرمندہ تعبیر کر سکتی ہے۔

◆◆◆◆◆

حوالہ جات

1. Baig, F. (2003). Distance education under the shadow of information technology. Journal of Elementary Education, Department of elementary education, university of the Punjab, Lahore, Vol.13, No1, pp.68-73
2. Galbreath, J. (1995). Compressed digital videocnferencing. Educational Technology, Vol.35, No.1, pp.31-38.
3. Reed, J. & Woodruff, M. (1995). Using compressed video for distance learning, retrieved April 12,2005, from <http://www.kn.pacbell.com/wired/vidconf/using.html>

ایتھنز کا حقیقی سوسطائی

یونان کی سڑکوں میں فلسفیانہ افکار کے لیے اجمالی درختوں پر ہی ہے فلسفیانہ افکار کو
یونانوں نے حضرت سقراط کی یہاں سے قریباً چھ سو برس قبل ہی متعارف ترقی ملی۔ اور اس میں
کے قریب لاکھوں سالوں کی تاریخی کائنات کی نگاہی وقت اور اس میں ہماری وسعت کی عقل
کافی کی تاریخی مہارت کے حوالے سے عقل نہیں۔ مہارت اور اساطیر مستند ہیں اور ان ہی
اس قدر قابل اعتبار کہ ان پر عمل کر کے انسان زندگی اور کائنات سے مختلف وقتی مہارت
کے مہارت اسے لے۔

یونانی فلسفہ کے اورد میں Thales تھا جس کا جانیس پیدا فلسفی تھا۔ وہ پہلا
فلسفی جس نے 600 قبل مسیح میں ہونے والے سورج گرہن کے واقعہ کی عقل اور وقت واصل
کئی کی عقل۔ تھا جس نے فلسفہ اور حساب کے علوم کا بھی ماہر تھا۔ وہ اپنی کوکل کائنات کی
تحقیق کا آغاز قرار دیا تھا۔ یاد رہے کہ قرآن پاک نے بھی پانی ہی کو جب وجود مہارت مہارت
ہے۔ سورہ الانبیاء کی آیت نمبر 29 میں فرمایا ہے "اور ہم نے پانی سے ہر زندہ جی جان
کی" جب کہ سورہ نور کی آیت 35 میں بیان ہے "اور خدا نے ہر جاندار کو پانی سے
پیدا کیا۔" تاہم اس وقت لگتی کائنات کے حوالے سے یہ تصور اس لحاظ سے قابل قدر تھا
کہ پہلی مرتبہ انسانی عقل پر وہاں میں یونانی فلسفہ کی بنیاد بنا۔ پھر اس فلسفی اس سرزمین
سے اٹھے اور فلسفہ کا دامن فلسفہ و مشورہ نظریات سے بھر دیا۔ ان قدر ہم فلسفیوں میں
کسی میٹر، زین، پیر اٹھیں، ڈیوکرٹس اور ہیکے گورس۔ وغیرہ شامل ہیں۔
ہیکے گورس پر فلسفہ کے دور اول کا آغاز ہوتا ہے اور وقت کے طلوع ہوا سوسطائی فلسفہ

ہوتا ہے۔ سوفسطائیوں سے ۴۵۰ برس قبل ہی یونان کے قدیم اور تاریخی شہر ایتھنز کو مرکزی حیثیت حاصل ہو چکی تھی یعنی ایتھنز، جہاں مذہب:

”یہ شہر پورے یونان کا علمی و ادبی مرکز تھا۔ یہیں عقل و دانش مبینی

ہئیں عقلی کی تربیتی باہمی ہوتی تھی۔“

یونان حکومت طبقہ لوہاس سے لوہاس کے ہاتھوں میں آ چکا تھا اور مذہب کی بجائے دانش تحت قوت پر چمکن ہو چکی تھی۔ سوفسطائی اس ہی منظر سے ابھرے۔ یہ لوگ اپنے آپ کو Sophist کہلاتے تھے یعنی ظریف اور باخبر۔ یہ تسلیم کر سوفسطائی دیباہی تجربات کے مجدد کے شمار تھے تاہم ان کے پاس کوئی واضح اخلاقی نظریہ نہ تھا۔ وہ تو معاشرہ کے بعض لوگوں کو تعلیم دیتے تھے اور کس نوع کی تعلیم

”یہ پیشہ وار اور دیباہی تعلیم کے علماء۔ لوگوں کو دیباہی تعلیم

کے نام پر خود فرضی ادب پرستی اور ذات پرستی کی تعلیم دیتے تھے۔ ان

کے نزدیک افراد کی اجتماعی یا معاشرتی زندگی کی کوئی اہمیت نہیں تھی۔

ان کی تعلیم کا سارا زور فرد کی ذاتی زندگی اور ذاتی مصلحت کی تسکین کے

مذہب پر تھا۔“

یہ لوگ یونانی نواآبادیوں سے ایتھنز میں وارد ہوئے۔ ان کی ذہانت کی نوعیت

ماہی تھی اور ان کے خیال میں ریاستی و حکومتی امور میں اثر و رسوخ حاصل کرنے کے لیے

اس نوعیت کی ذہانت اور بالخصوص لسانی مہارت درکار تھی۔ اس لسانی مہارت سے کیا مراد

تھی؟

” (ایتھنز کے افراد کو) فنِ خطابت پر مہور حاصل ہو۔ خطابت سے

مراد یہ ہے کہ آپ کو اپنی بات ایسے انداز میں کہنے کا ہنر آتا ہو کہ

دوسرے قائل ہو جائیں۔“

فی الحقیقت سوسطالی نہ تو فلسفی تھے اور نہ ہی دانش اور زندگی کے اچھے معلم جیسے مسائل کی طرف متوجہ ہوتے۔ ان کا کمال اور فن تو ان کی حاضر زمانی اور لسانی مہارت تھی جسے انہوں نے منطقی بحث میں استعمال کیا اور افراد معاشرہ کی توجہ منجی۔ انصاف اور اخلاق پر مہم چلانے کی بجائے ذہنی افراط پر مہم چلانے کی سعی کی۔ اپنی دانش کی کامیابی ہی ان کے نزدیک اصل کامیابی تھی خواہ وہ کامیابی جوں سے جاگن اور الفاظ کے حلی اور بھیر سے ہی کیوں نہ حاصل ہوتی۔ بالفاظ دیگر سوسطالی الفاظ کے جذبہ نظر طرے سے جاننے میں مہارت رکھتے تھے۔ اسی مہارت کو وہ تعلیم دینے کے عمل کے دوران بروئے کار لاتے تھے۔ یہ درست کہ یہ دنیا دار معلم فلسفی نہ تھے تاہم دنیاوی علوم پر دسترس رکھتے تھے۔ اسی لیے ان کی مہارت رقم طراز ہیں۔

"ان کا قصہ یہ تھا کہ وہ ساری اخلاقیات کی منتقلی کی بجائے لسانی مہارت ہی کو علم کی انتہا سمجھتے تھے۔ وہ زبان کی فصاحت و بلاغت کو بڑی اہمیت دیتے تھے یعنی Rhetoric لہذا یہ ایک معرہ منہ حقیقت ہے کہ ان کی وجہ سے زبان نے بہت ترقی کی۔ انہوں نے زبان کی گراں پر بڑی توجہ دی۔" — وہ زبان کی فصاحت و بلاغت کے لیے خوب صورت اور انوکھی تشبیہات اور استعاروں کے استعمال کو ضروری سمجھتے تھے۔"

حتیٰ کہ ایک سوسطالی "گورجیاں" تو بحث و مہارت کے ضمن میں اس نکتہ پر یقین رکھتا تھا کہ بحث میں کامیابی کے حصول کا انحصار ذہانت و لطافت یا دانش پر نہیں بلکہ بلائی، حاضر زمانی اور لسانی مہارت پر ہے۔ اس کا یہ نظریہ "سوسٹری" کے نام سے مشہور ہوا اور "پروٹے گورس" نامی سوسطالی "یونانی ریاستوں کے دورے کرتا تھا تاکہ وہاں کے لوگوں کو سوسٹری سکھائے" سوسطالی اپنی چرب زبانی سے افراد کو باور کرواتے تھے کہ

آپ کو بزم خود سوسطائی یعنی خود مند و دانشور نہیں کہلوا دیا تھا۔ بلکہ یہ قول دل ایسا ہے۔
 سترابا "خیر پیشہ و طالب دانش" تھا۔ اس کی تعلیمات ختم کا نکتہ آگاہی یہ تھا۔
 "میں صرف ایک چیز چاہتا ہوں کہ میں بیکہ نہیں جانتا"

سوسطائیں اور سترابا کے مابین دوسرا تضاد یہ تھا کہ وہ ہمہ جہت سمجھتا تھا اس
 کا کوئی معاوضہ وصول نہ کرتا تھا۔ یہاں یہ یاد رہے کہ قدیم یونان کی روایت کے مطابق
 معاوضہ کے عوض تعلیم دینا ناپسندیدہ تصور ہوتا تھا اور سترابا پر یہ الزام لگایا گیا تھا کہ وہ اپنے
 معلم معاوضہ وصول کرتا ہے۔ اس نے زہر کا پتلا پینے سے قبل اہل ایتھنز کے سامنے اس
 ضمن میں وضاحت بھی دی۔ اس کے الفاظ تھے۔

"مجھ پر الزام لگایا گیا تھا کہ میں معلم ہوں اور پیسے لیتا ہوں۔"

اس الزام میں (دیگر لوازمات کی طرح) ذرا بھر صداقت نہیں۔"

اور سچ تو یہ ہے کہ اگر یہ الزام مبنی بر صداقت ہوتا تو سترابا کی زندگی تنگ دہنی اور غربت کی
 ہیئت نہ پڑتی۔ سترابا کی زندگی میں اس کی بیوی اسرار کرتی رہی تھی کہ وہ لوگوں کو تعلیم
 دینے کا معاوضہ لے مگر نول تو سترابا خود کو معلما نہ شان کا حامل سمجھتا ہی نہ تھا۔ وہ تو نول
 طالب دانش تھا، علاوہ ازیں وہ اپنے طریقہ تعلیم کو تعلیم کے نام سے موسوم نہیں کرتا تھا۔
 بقول کورامین اس کا نقطہ نظر یہ تھا۔

"جو کچھ وہ لوگوں سے اپنے علم کے لیے پوچھتا ہے اسے وہ سمجھتا ہے"

تعلیم دینا کیسے کہہ سکتا ہے؟ اس کے علاوہ چونکہ وہ کچھ لیتا نہیں تھا

اس لیے ہر شخص اس کے پاس آ سکتا تھا۔"

ہماری معاوضوں کے عوض سوسطری کی سطح تعلیم دینا یہ سوسطائیں ہی کا تھا

تھا۔ ظاہری خدائیں اور جسمانی بناوٹ کے لحاظ سے سترابا ہرگز طالب نظر تھا مگر یہ جاننا

کہ اس کی شخصیت فلسفاتی کشش کی حامل تھی جس کا راز اس کے طرز گفتگو میں پائیے

منظوم کے فن میں تو سفسطائی بھی حالات تھے، تاہم سترابا کا صحیح نظر مختلف تھا۔ وہ طبی علوم کی اہمیت سے انکاری تو نہ تھا تاہم اس کا کہنا یہ تھا۔

”یہ بعد کے مسائل ہیں جب کہ اولین مسئلہ انسانی کی سماجی تعلقات کی اصلاح کا ہے اور یہ کام انسان کی سماجی تعلیمات کو سمجھنے کے مترادف ہے اور اصل کام یہ ہے کہ انسان کی سماجی تعلیمات میں جو کھائیں یا جو بنیادیں ہیں اس کی اصلاح کی جائے۔“

بالفاظ دیگر اخلاقی تعلیم کا وہی تھا۔ اس کے عطف علم میں اخلاقی تعلیم کو مرکزی حیثیت حاصل ہے۔ عطف علم کے ضمن میں اس کا اور سفسطائیوں کا تضاد یہ تھا کہ سترابا کسی شے کے مخصوص تصور یعنی Concept کو ترجیحاً اہمیت دیتا تھا جب کہ سفسطائی Perception پر یقین رکھتے تھے۔ Perception کی بنیاد حواسِ خمسہ ہیں جن کا سترابا مانگ نہ تھا کیوں کہ اس کے خیال میں انسانی ذات کو وہ اہمیت کرنا اور انسانی علم کے حصول کے پانچ درجے مع اہم، شمار، جس لمس و جس اانتہ انسان کو حقیقت کی اوپری سطح تک ہی محدود رکھتے ہیں۔ اس حقیقت کی گہرائی یا اصلیت سے آگاہ نہیں کرتے۔ سترابا نے Perception کو سرے سے نظر انداز کرتے ہوئے Conception کو علم کی بنیاد ٹھہرایا۔ اسی کے اہراج میں اس کے شاگرد الاطون نے بھی اوراک بالحواس کو درخورد اانتہا نہیں سمجھا۔ علامہ محمد اقبال نے اسی نکتہ سے اختلاف کرتے ہوئے یہ طور دلیل قرآن پاک کی مثال پیش کی تھی۔ وہ کہتے ہیں!

”سترابا کے شاگرد رشید الاطون کو بھی اوراک بالحواس سے نظرت ہی نہ تھی۔ اس کا خیال تھا کہ اوراک بالحواس سے کوئی حقیقی علم تو حاصل نہیں ہوتا۔ ہم اس کی بنا پر صرف اک دانے قائم کر سکتے ہیں۔ لیکن اس کے قرآن مجید نے سمو و بصر کا شہد اللہ تعالیٰ کے گواہ

قدر انمولات میں کیا اور عوامت اپنے اعمال و انعمال کا جواب دے

ظہرایا۔

حس علم میں علم تو ہو سکتے ہیں تاہم یہی حقیقت کی طرف بڑھنے کا اشارہ ہے جب
یہی وہ ابتدائی ذہن ہے جہاں رنگ کر انہی کوئی ابتدائی تصور وضع کرتا ہے، مگر اگر انہی میں
حقیقت کی تہوں تک پہنچنے کی تڑپ یا اصل نتیجہ معلوم کرنے کی لگن ہو تو وہ اپنے ابتدائی تصور
پر غور و فکر کرے گا۔ اسے ہر ذہنیے سے ہاتھ پرکے گا اور ہر ایک خاص نتیجے پر پہنچے گا۔
یہ نتیجہ Concept ہے۔ مراد یہ ہے کہ Cognition-Perception کی بنیاد بھی ہے
اور محرک بھی لہذا اسے کسی صورت، قطعاً نظر انداز نہیں کیا جاسکتا جیسا کہ سترلا نے کیا۔
یہہ Perception کو صرف آخری قرار نہیں دیا جاسکتا، جو کہ سوسفٹائیوں کی بڑی غلطی
تھی۔ ایسا ہی نہیں اسے غلطی ہی نہیں منافقت کا نام بھی دیتا ہے۔ سو بقول اس کے
"سوفیسٹس (Sophists) کی یہ غلطی یا منافقت ہے کہ وہ کسی چیز
کے بارے میں یہی ہی نظر میں رکھ کر ایک فیصلہ جو غلط بھی ہو سکتا
ہے، کر لینے کے عمل کو درست قرار دیتے تھے۔"

کہا جاسکتا ہے کہ ان معنوں میں سوسفٹائیوں کے ہاں فکری سلطیت تھی جب کہ
سترلا کا فلسفہ علم (مذکورہ بالا غامی سے قطع نظر) نام نہاد سوسفٹائیوں سے مقابلہ درج تھا۔
جب سترلا Concept کو ترجیحاً اہم گردانتا ہے تو واضح ہو جاتا ہے کہ اس کے نزدیک کسی
شے کی حقیقت، اس شے کے مادی وجود کی بجائے اس کے تصور میں پنہاں ہوتی ہے۔
گویا کوئی بھی شے، اپنے حقیقی تصور کا خام مادی روپ ہوتی ہے، مگر سوال یہ اٹھتا ہے کہ کسی
مادی شے کے حقیقی تصور تک کی مگر رسائی حاصل کی جائے؟ سترلا کے نزدیک یہ رسائی
صرف عقل کے توسط سے نصیب ہوتی ہے اور صرف اہل علم ہی صاحب عقل ہو سکتے ہیں۔
صاحب عقل کو عقل کے روپ میں ایک عنصر رو بہر آ جاتا ہے جو صحیح یا درست عقل کی طرف

اس کی رہنمائی کرتا ہے۔ سزا کا صحیح اور سب سے اعلیٰ کرنے والے کو ہی "پارماٹمنس" سمجھا ہے۔
 آسان الفاظ میں یوں کہہ لیجئے کہ علم اخلاقی عمل (یعنی) کی بنیاد ہے۔ نیکی اور علم کے اس
 تعلق کو جس طرح سزا نے پیش کیا، ڈاکٹر مظفر حسین ملک اسے سادہ عام فہم الفاظ میں
 یوں تحریر کرتے ہیں:

"نیکی علم ہے۔ اخلاقی کمال اور طبیعت اذوں ایک ہی چیز ہیں۔ (علم) علم"

ہے (اس لیے بدی عبادت کے سزاوں ہے۔ (بدی شریعت ہے)۔"

یہاں سزا کے ہاں علم اور اخلاقیات کا جو بہت بلند نظریہ آتا ہے تاہم غامض
 سے بہرا نہیں۔ اس کے درج ذیل نقطہ نظر یعنی "ایک عالم جو نیکی کی اصل حقیقت سے
 واقف ہو چکا ہو، کبھی غلطی نہیں کر سکتا۔" پر اعتراض وارد کیا جاسکتا ہے۔ وہ نظریہ یہ ہے کہ
 عالم بھی بہر حال انسان ہوتا ہے۔ انسان جو تضادات کا مجموعہ ہے، جس کے باطن میں ہمہ
 وقت کبوتریاں کی ٹھٹھکیاں جاری رہتی ہیں۔

"بدی کے اندر نیکی کی آرزو اور نیکی کے اندر بدی کی رغبت ہمیشہ موجود

رہتی ہے۔ جب تک انسان جیتا ہے وہ خطرے کے حصار میں ہے

ساری عمر کی تپسیا ہی عمر میں جسم ہو سکتی ہے اور ساری عمر کے گناہ ایک

تپ سے دھل سکتے ہیں۔"

(ہانو قدسیہ یہ سوال اور گلاب صاحبگیر (پروفیسر)

کہتا ہے مقصود ہے کہ انسان جہل ہو یا عالم، غافرا عقل ہو یا فطین، پارسا ہو یا خطا کار، بہر

حال حتیٰ الموت کے ساتھ اس کی ذات پر کوئی علم نہیں لگایا جاسکتا۔ کون جانے کوئی کس

انسان کی کال کب کر لے۔ ویسے کو فرزانہ ہمارے اور فرزانے کو دیوانہ، چوروں کو

قلب ہمارے اور بادشاہوں کو جھگی۔ دراصل کسی شخص کا صاحب علم ہونا اس بات پر سند

نہیں کہ وہ کبھی غلطی نہ کرے گا۔ آخر انسان خطا کا پتلا بھی تو ہے۔ یہاں مجھے معروف

ہوں" وہی گدھا" کے ایک صاحب علم ہر پطیر کے اگلا یاد آ رہے ہیں جو تہذیب کے
دعا سے ہی بہ کر خطا کار بن گیا تھا۔ اس کا معترف گناہ بننے

"میں برا آدمی نہیں ہوں۔ Devil نہیں ہوں۔۔۔ لیکن اسے سارے علم
کے باوجود میں اپنے Emotions پر قابو نہ پاسکا۔۔۔ ہاں اسے
سارے علم کے باوجود میں اپنے عمل پر قابو نہ تھا"

اگرچہ سقراط نے نظریہ علم پر تنقید و بحث کے سلسلے کو طویل دیا جا سکتا ہے مگر اس
امر سے نظر نہیں کہ یہ وہی تھا جس نے نیکی کے مفہوم کا تعین کر کے اسے علم کے ہم پندہ
اس کا بدل قرار دے کر امور منکث و معاشرہ کی سہولتی کے پیش نظر لازم قرار دیا کہ
"حکومت کی قیادت مائل ترین (یعنی اہل علم) آدمی کے ہاتھ میں ہونی چاہیے۔

چونکہ اس کے نزدیک صاحب علم فرد سے یہ توقع کرنا ہی محال ہے کہ وہ علم
عمل کا مرکب ہوگا اس لیے کہ وہ نیکی و بدی میں تمیز کرنا جانتا ہے۔ علم کی خوبی اس میں
نیکی، خیر اور اہل اخلاقیات کے اوصاف پیدا کر دیتی ہے۔ سو اگر معاشرے اور حکومت کو
انکار سے بچنا مقصود ہے تو حکمران طبقے کا راجہ علم سے آراستہ ہونا لازم ہے۔ اس طرح
سقراط نے گویا بہترین منکث کا تصور پیش کیا۔ بعد ازاں اسی تصور نے افلاطون کے ہاں
مثالی ریاست، یا Ideal State کا نام پایا۔ اس میں سوز نے یونین، کاجر تصور پیش کیا
اس کے ذائقے بھی مثالی ریاست سے جانتے ہیں۔ کوئی نظریہ بھی "ایک جے عالم کی
ظہور" محسوس کرتا ہے جو

"مصلحتی کے ہاتھوں صورت پذیر نہیں ہوگا بلکہ مصلحتیں اس کی تعمیر
کر لیا گے۔ وہ ہائی جن کے پاس ایک واضح راہ عمل ہوگا۔ افراد جن
کے پاس سنے سنے خیالات ہوں گے۔ وہ لوگ جو ولیرن ایک شخص
رستے پر چلی کھڑے ہوں گے جب کہ دونوں طرف سے ان پر تیراں

کی بوجھ سے چڑھی ہوگی۔" (کوئی بشر بہ سوال علی ماہیں سوال پوری)

بہر طور ماننا پڑے گا کہ مثالی ریاست ہو یا پوری ہو یا ایک یا عالم سترلا لے

اس ایک خواب کا خاکہ ضرور وضع کیا۔

سترلا کے نظریہ علم سے متعلق بات کرتے ہوئے ہم اس کے اختصار و استدلال

کو نظر انداز نہیں کر سکتے۔ دراصل یہی اس کی توجہ مرکوز کر لینے والی تکنیک کے بنیادی اجزا

تھے۔ جہاں تک استدلال کا تعلق ہے تو سترلا اسے بنیادی ذریعہ علم سمجھتا تھا۔ اختصار اس کا

سوز چھیڑا تھا، جس کے توسط سے وہ لوگوں کے خیالات کو منہ دیکھیں دیا تاکہ رسائی حاصل

کرے۔ ان کی سوچ کی گہرائی سے شناسائی حاصل کرتا۔ وہ پھر لاطینی کا لہجہ جان کر کسی

نہایت سادا سے سوال سے بحث کا آغاز کرتا۔ اس کے سوالات ہر نوع کی ترتیب و تنظیم

سے نا آشنا تھے جو پہلے پہلے طویل گہری مباحث میں اصل جاتے مقررہ کے الزام کو

آکٹوپس کی مانند بکڑ لیتے، جہاں الزام کو آکٹوپس کی مانند بکڑ لیتے، جہاں الزام سے

فرسودہ خیالات کو گروہ بناتے، اعلیٰ معلومات میں توسیع کرتے، وہیں عقل سلیم کے

استعمال سے نسل در نسل منتقل ہونے والے سوچ کے نئے نئے نظام قدیم پر از سر نو نگاہ

تکرار کرنے پر ضرور مجبور کرتے تھے۔ یہ سوالات کیا تھے؟ دہانہ ذہن کا تھے ہیں:

"نی نوع آدم کے تعلقات اور اس کی ضرورت کیا ہیں۔ نیکی

کیا ہے؟ بدی کیا ہے؟ پاک باز کون ہوتا ہے؟ ناپاک کون ہوتا ہے؟

ہوش مندی کیا ہے؟ پاگل پن (ہوش مندی) کیا ہے؟ حرات کے

کہتے ہیں؟ بزدلی کے کہتے ہیں؟ حکومت کی نوعیت کیا ہے؟ لوگوں

پر حکمرانی کرنے والے اوصاف کیا ہوتے ہیں؟ خوب صورت بدن

کی پیار کے لائق ہے یا خوب صورت ہاتھ بھی پیار کے لائق ہے۔"

سترلا ان سوالات اور استدلال کی حد سے کئی بڑے بڑے نام نہاد علماء اور

دانش دوسری کی (So Called) بات کی بات لگتی ہے اس لیے میں یہ لکھتا ہوں کہ یہ نظریات کو ہے یا کہ نہ مسترد کرنا ہے۔ اس کے علاوہ ان کے بارے کی وضاحتیں اور بعض سترلا کو زیر کا بیان بھی کرنا ہے تاکہ کسی کوئی کامیاب اور نیا اور کھلی ہوئی سترلا سترلا موت سے خوف کھا کر اہل اقتدار سے اپنے اہل کی مداخلت کے باعث سر جھکانے والا ہو کر نہ تھا۔ وہ خوب جانتا تھا کہ وہ صاحب اقتدار افراد کے ہونے میں ہر بات کی اور نظریات کے صحیح ہونا ہے۔ یہ جانتے کے باوجود وہ احتیاط، احتیاط سے کام لے آیا۔ وہ ان لوگوں کو فکر میں مبتلا تھا جو عقلی سطح میں کامیاب ہونے کے بعد احتیاط اور سوچ و انداز سے اپنی کم عقلی پر غور کرنے کی ذمیت تکہ گوارا نہ کرتے۔ کیا ہمیں سترلا کے استحباب اور ان کی بابت کہنا ہے۔

”سترلا کی طرح سوال پوچھتے ہیں آج تک کوئی نہیں کر رہا۔“

مگر واضح رہے کہ سترلا کے استحباب و استحباب کا مقصد ہر طرح کی بات شامداد، بھاری بھاری اور مرعب کن الفاظ استعمال کرنا نہیں تھا نہ ہی مجلس بحث کے لیے اس کا صلح نظر تھا۔ شعور آواز دوسروں کے نظریات کی عقلی یا تخلیقی نہیں چاہتا تھا۔ اس نظریاتی برتری حاصل کرنے کا بھی حتمی نہ تھا۔ پھر اس کا مقصد کیا تھا؟ وہ انتہا قیامت کا بیڑا تھا اور حتمی دانش کا جوڑا۔ وہ اہل ایمان کی روایات کہنے سے غفلت پاتی تھا جو اہل ایمان کی بالخصوص نوجوان نسل کو فرسودہ روایات کے اندھا منہ اجراع سے بچانا چاہتا تھا۔ اہل سترلا ہی حتمی سہولت ملی اور ذہنی انقلاب کا داعی تھا جو علم کی قدر و قیمت بچاتا تھا۔ اس نے انتہا قیامت کو علم کا حاصل اور فلسفوں کو جہالت کا نتیجہ قرار دیتے ہوئے واضح کر دیا تھا۔

”علم اور جہالت یعنی غیر اور شر میں انتخاب انسان کے بس میں ہے“

ماخذات

- 1۔ دھان مذہب، علی کے ہندو تاریخی خطوط سے (سرخا سے مندرجہ حکم برسرِ علیؑ)، رنگ
پبلشرز، لاہور، مئی 1997
- 2۔ یونین گارڈ (مصنف)، شاہد سید (مترجم)، سہلی کی دنیا، اردو سائنس ہلڈ، لاہور،
1999ء
- 3۔ ایشیائی عیس (مصنف)، ہدیہ نواز (مترجم)، برہانی فلسفہ، گارڈنٹ، لاہور، 1998ء
- 4۔ سید علی ہاشمی جہانپوری، نام فخری سوانح، آئینہ سب، لاہور، اکتوبر 1975ء
- 5۔ کورائین (مصنف)، آرزو سید حسن (مترجم)، سرخا (سوانح عمری)، گارڈنٹ، لاہور،
خبر 1996ء
- 6۔ ہاتھ دیکھ، راجہ گندھ (محل)، رنگ میل نیلی کیشنز، لاہور، 2002ء
- 7۔ مظہر حسن ملک (ڈاکٹر)، تقیسی تراویح، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد، 1990ء
- 8۔ دل ابرہات، سید طاہر علی شاہ (مترجم)، داستان فلسفہ، گلشن ہاؤس، لاہور، 1995ء
- 9۔ طاہر گوہر (ڈاکٹر)، سید ظہیر ہزاری (مترجم)، تشکیل جدید الہیات اسلام، بزم اقبال،
لاہور، 2000ء
- 10۔ رنگ ذہب مانگیر (پروفیسر)، بے از رنگان محفل، مشورہ علامت (ماہنامہ)، جلد
نمبر 10، شمارہ نمبر 4، لاہور، نومبر 1999ء

غزلیات غالب..... تحقیق باعتبار قوافی

غزل میں قوافی مرکزی حیثیت رکھتے ہیں۔ ان سے یہاں غزل کا داخلی آہنگ بنتا ہے وہاں ہر شعر اپنی مکمل صورت بھی اختیار کرتا ہے۔ غزل کے انحصار اور روضہ ایچ کی ضرورتوں میں بھی قوافی مددگار پہنچاتے ہیں اور موضوع سے عہدہ بردار ہونے اور شعر کے بھائیائی حسن کو ابھار کرنے میں بھی ان کا واضح عمل داخل ہے۔ اردو غزل میں غالب کو چوتھے مقام حاصل ہے۔ اس میں ان کی نظر اور فن دونوں کا برابر حصہ ہے۔ مگر ان کے بغیر ایک ہزار اشیدہ ہیرو ہے اور فن مگر کے بغیر ایک گوبر کم میار۔ غالب کی غزل میں جہاں ایک منظرہ مگر سر اچھارتی نظر آتی ہے وہاں فنی اعتبار سے بھی گونا گوں خصوصیات سامنے آتی ہیں۔ ان میں سے ایک قوافی کا چناؤ اور اشعار میں سوزوں مقام پر ان کا جواز ہے۔ یہ پہلو ایک بڑی تحقیق کا متقاضی ہے۔ تنقیدی حوالے سے بھی اور تحقیقی حوالے سے بھی۔ اس مضمون میں میرے پیش نظر اس کا تحقیقی پہلو ہے اور وہ یہ کہ غالب نے کون سے قوافی کے تحت کتنی غزلیں اور اشعار کہے۔ ان میں سے کتنی غزلیں بغیر ردیف کے ہیں، کتنی بغیر تخلص کے اور کتنی ایسی ہیں جن میں انہوں نے تخلص کا استعمال کیا۔ اس کے ساتھ ساتھ یہ کہ کتنی تصنیفات بھی ذیل میں درج ہیں جو دوران تحقیق میرے سامنے آئیں اور جن کا تعلق بہ ظاہر موضوع سے نہیں لیکن باطن وہ نہ صرف اس موضوع کا حصہ ہیں بلکہ اس کی وضاحت میں مددگار ہیں۔

غالب کے ہاں ایسے قوافی جن کا آخری حرف الف ہے (مثلاً: مراد، ہواد، ہوا، فرما، گویا، فیرو) کا استعمال سب سے زیادہ ملتا ہے۔ غالب نے ان قوافی میں ۴۰ (چالیس)

نوزلیں کہیں جن کے کل اشعار ۳۵ ہیں۔ ان میں سے ۵ نوزلیں بغیر مطلع کے ہیں۔ ۶ نوزلوں میں ٹھکس اسد، ۲ میں غالب اور ۹ نوزلیں بغیر ٹھکس کے ہیں۔

ایسے قوافی جن کا آخری حرف 'ب' ہے (مثلاً: آب، آب، گرداب، تپ وغیرہ) میں غالب نے ۵ نوزلیں کہیں جن کے اشعار کی کل تعداد ۵۶ ہے۔ ۲ میں ٹھکس اسد اور غالب اور ایک نوزل بغیر ٹھکس کے ہے۔

'ت' پر ختم ہونے والے قوافی (مثلاً: قیامت، حضرت، دوست، صورت وغیرہ) میں ۵ نوزلیں کہیں۔ ان میں سے ایک نوزل بغیر مطلع کے ہے۔ اشعار کی کل تعداد ۳۱ ہے۔ نوزلوں میں ٹھکس اسد، ۲ میں غالب اور ۲ بغیر ٹھکس کے ہیں۔

'ا' پر ختم ہونے والے قوافی میں ۵ نوزلیں ہیں۔ ایک بغیر مطلع کے ہے۔ کل اشعار ۳۶۔ ۲ نوزلوں میں ٹھکس غالب، ۲ میں اسد اور ایک بغیر ٹھکس کے ہے۔

'ز' پر ختم ہونے والے قوافی (مثلاً: بار، بار، بار، بار وغیرہ) میں ۳۵ نوزلیں کہیں۔ ۵ نوزلیں بغیر مطلع کے ہیں۔ اشعار کی کل تعداد ۲۶۸ ہے۔ ۲۰ نوزلوں میں ٹھکس غالب، ۷ میں اسد اور ۸ بغیر ٹھکس کے ہیں۔

'لا' پر ختم ہونے والے قوافی (مثلاً: سال، سال، سال، سال وغیرہ) میں ۳ نوزلیں کہیں۔ بغیر مطلع کے ہے ۱۰ بغیر ہر ایک کے۔ اشعار کی کل تعداد ۲۳۔ ۳ میں ٹھکس اسد اور ایک میں ٹھکس استعمال نہیں کیا۔

'س' پر ختم ہونے والے قوافی (مثلاً: آس، پاس، اواس وغیرہ) میں ایک نوزل کہیں۔ نوزلوں کے کل اشعار ۶ ہیں اور ٹھکس اسد استعمال ہوا ہے۔

'ش' پر ختم ہونے والے قوافی (مثلاً: جوش، جوش، سرواں وغیرہ) میں ایک نوزل کہیں۔ اشعار کی کل تعداد ۱۳ اور ٹھکس غالب ہے۔

'ن' پر ختم ہونے والے قوافی میں ایک نوزل کہیں۔ کل اشعار ۷۔ ٹھکس استعمال نہیں۔

نہی ہے نظم ہونے والے قوافی (مثلاً: پاک۔ پاک۔ پاک، و غیرہ) میں ۴ نوزلیں
 لکھیں۔ کل اشعار ۱۰ ہیں اور دونوں میں ٹکس اسد استعمال ہوا ہے۔

۱۱) نظم ہونے والے قوافی (مثلاً: آئی، چال، سہاں، وغیرہ) میں ۷ نوزلیں لکھیں۔
 کل اشعار ۴۲۔ ۴۳ میں ٹکس غالب۔ ۴۴ میں اسد اور ایک نوزل میں ٹکس استعمال نہیں۔

۱۲) نظم ہونے والے قوافی (مثلاً: ہم، کم، ہم، ہم، وغیرہ) میں ۸ نوزلیں لکھیں۔ کل
 اشعار ۷۔ ۸ نوزلوں میں ٹکس غالب اور ایک میں اسد استعمال ہوا ہے۔

۱۳) نظم ہونے والے قوافی (مثلاً: تین، سب، تین، وغیرہ) میں ۱۱ نوزلیں لکھیں۔

ایک نوزل بغیر مطلع کے ہے۔ کل اشعار ۱۱۔ ۸ نوزلوں میں ٹکس غالب۔ ۳ میں اسد اور ایک

نوزل بغیر ٹکس کے ہے۔ ۱۱) نظم ہونے والے قوافی (مثلاً: کہاں، لکھاں، کہاں، وغیرہ) میں

۲۳ نوزلیں لکھیں۔ کل اشعار ۱۹۔ ۱۳ نوزلوں میں ٹکس غالب۔ ۵ میں اسد اور ۶ نوزلوں
 میں ٹکس استعمال نہیں۔

۱۴) نظم ہونے والے قوافی (مثلاً: جو، کھو، دو، خود، وغیرہ) میں ۳ نوزلیں لکھیں۔ کل

اشعار ۷۔ ایک نوزل بغیر مطلع کے ہے۔ ۳ نوزلوں میں ٹکس غالب اور ایک میں ٹکس
 کا استعمال نہیں۔

۱۵) نظم ہونے والے قوافی (مثلاً: خواہ، مگنا، کلا، وغیرہ) میں ۵ نوزلیں لکھیں۔

ایک نوزل بغیر مطلع کے ہے ایک میں ردیف کا استعمال نہیں۔ کل اشعار ۳۔ ۳ نوزلوں میں
 ٹکس اسد، ایک میں غالب اور ایک بغیر ٹکس کے ہے۔

۱۶) نظم ہونے والے قوافی (مثلاً: راضی، تسلی، معنی، وغیرہ) میں ۷ نوزلیں

لکھیں۔ دو نوزلیں بغیر مطلع کے ہیں اور دو میں ردیف کا استعمال نہیں۔ کل اشعار ۱۱ ہیں۔

۱۷) نوزلوں میں ٹکس غالب۔ ایک میں اسد اور ۶ میں ٹکس استعمال نہیں۔

۱۸) نظم ہونے والے قوافی میں ۷ نوزلیں لکھیں۔ ایک نوزل بغیر مطلع کے ہے

کل اشعار ۳۹ ہیں۔ ۶ نزلوں میں نظمیں غالب اور ایک میں اسد استعمال ہوا ہے۔

ان تمام اشعار و شمار کو جمع کیا جائے تو نتائج یہ نکلتے ہیں۔

غالب نے کل ۱۸۳ نزلیں لکھیں جن کے اشعار کی تعداد ۱۳۷۳ ہے۔

ایسی نزلیں جن میں نظمیں غالب سے ان کی تعداد ۱۰۵ ہے۔

ایسی نزلیں جن میں نظمیں اسد سے ان کی تعداد ۳۸ ہے۔

ایسی نزلیں جو بغیر نظمیں کے ہیں ان کی تعداد ۴۰ ہے۔

بغیر مطلع کے نزلوں کی تعداد ۱۹ ہے۔

بغیر ردیف کے نزلوں کی تعداد ۴ ہے۔

حقیقت سے یہ بھی معلوم ہوا کہ

ایسی نزلیں جو صرف تین اشعار پر مشتمل ہیں ان کی تعداد ۲۶ ہے۔

۳ اشعار پر مشتمل نزلوں کی تعداد ۱۳ ہے۔

۵ اشعار پر مشتمل نزلوں کی تعداد ۱۳ ہے۔

۱۰ سے زائد اشعار پر مشتمل نزلوں کی تعداد ۲۸ ہے۔

۱۰۵۶ اشعار پر مشتمل نزلوں کی تعداد ۱۰۳ ہے۔

غالب کی طویل ترین نزل ۷۱ اشعار پر مشتمل ہے۔

غالب نے کبھی بھی اپنے نظمیں کو بطور تازیہ استعمال نہیں کیا۔

یہ مادی تفصیل روحان غالب (نسخہ ظاہر) مرتبہ ڈاکٹر گوہر نوشادی سنگ میل

نئی دہلی، ۱۹۹۸ء کی بنیاد پر اردو کی گئی ہے اور دوران حقیقت روحان غالب کا

تعداد ۱۰۵۶ اشعار ہی میر سے پیش نظر رہا۔

”تمنا ہے تاب“ کے حوالے سے ایک خط

بھئی۔ حلیمہ

آپ کی کتاب ”تمنا ہے تاب“ دوبارہ پڑھنے سے منگوا کر پڑھی۔ مگر تقریباً 1975ء میں۔ اب اس کا پورا نسخہ کہ اس پر تفصیلی تبصرہ لکھوں۔ کوئی بہت چاہتا ہے کہ ہر پارہ پاکستان کا سفر کرنے سے وہاں کے حالات اور مغربوں سے قریبی تعلق بلکہ شناسائی پیدا ہوگی ہے اور اس شناسائی کی مدد سے وہاں کے حالات کا خاکہ مرتب کرنا چاہتا تھا۔ مگر اب مجھ پر یہ بتانا ہے کہ آپ کو لکھ بھیجتا ہوں۔ ممکن ہو تو کہیں بھیجا دیں۔

یہ کتاب نہیں ایک اہم دستاویز ہے۔ اس کی اڑھائی بات یہ بھی ہے کہ اس کا نصف اٹھانٹا کشمیر چھوڑ کر پاکستان جا بیٹھا اور اس مہاجرت پر پوری کتاب میں نہ کوئی طرف توجہ ہے اور نہ مظلومیت کا احساس جو پاکستان کی سرگزشت لکھنے والوں کا عام دستور ہے۔ پوری کتاب بے تکلف دوستوں اور شناساؤں کے تذکروں اور تجزیوں سے مہارت ہے۔ اس کے علاوہ اگر کچھ ہے تو نئی ترقی پسندی کی ضرورت اور اہمیت کا تذکرہ جو مجھے خاص طور پر پسند آیا۔ دراصل ترقی پسند تحریک کے زوال کے اسباب (خصوصاً پاکستان میں) یہ بھی تھے کہ وہاں کے حالات (اور وہاں کیا، ہندوستان میں بھی یہی ہوا) کا تجزیہ ترقی پسند نقطہ نظر سے نہیں کیا گیا اور اپنے دلوں کے باوجود ترقی پسند نعرہ بازوں کے ہچے گلہ میں گرنے لگے۔ یوں کہوں ترقی پسند کہانے کے باوجود ترقی سے منحرف یا اجنبی ہو گئے اور اہل اقتدار سے کلاس کیمریکلر کا تجزیہ کرنے کی کوشش سے بھی منحرف ہو گئے (سوائے چند استثنا کے)۔ سب سے بڑی بھول یہ ہوئی کہ ارباب اقتدار کے دیے ہوئے نعروں کا بھلا

صدیاں میں گم ہو کر رہ گئے اور بعد کو یعنی بھلو اور خیا، الحق تک (اور اس کے بعد بھی) وہاں کی مقامی سیاست کی طبقہ دارانہ تقسیم نہ کر سکے۔ ظاہر ہے رشید احمد کی کتاب اس قسم کے تجزیے سے خالی ہے مگر اس قسم کی طبقہ داری تقسیم کی جھلکیاں (اور کسی قدر ابہامی جھلکیاں) جتنی رشید احمد کے علامتی انسانوں میں ملتی ہیں اور کہیں نہیں ملتیں۔ میرا تو یہ بھی خیال ہے کہ وہی اور اسی قسم کی چھٹی ہوئی جھلکیوں کو مختلف تہذیبی اور تمدنی اور اساطیری حوالوں میں پہچان کر پیش کرنے کی کوششوں کا نتیجہ انظارِ مسین اور بعض دوسرے انسان نگاروں اور شاعروں کے ہاں نظر آتا ہے جس کے تفصیلی تجزیے کی ضرورت ہے۔

مجھے بڑی غوٹی ہے کہ اس مجموعے میں افراد کے تذکرے کے پیچھے اس قسم کا شعور اور تجزیہ صاف جھلکتا ہے جس سے صرف اس ملک کی ہی نہیں، سارے ایشیائی ممالک کی لہذا اور اس کے جز توڑ کا اندازہ ہوتا ہے اور خود مصنف جو ایک کئی ہوئی جنگ کی طرح مختلف نظریوں میں آوارہ نظر آتا ہے اور محنت سے ہے کہ دنیا کیا سے کیا ہو گئی ہے (۲) ایک سرگزشت نہیں بلکہ ایک ایسے داستان بیان کرتا چلا جاتا ہے جس کا مطالعہ ہلاک کے دور کے تخریب پسند یا زوال آوارہ معاشرے کے اہم سے کیا جاسکتا ہے حالانکہ مصنف کا مفہوم اس زوال آوارگی کو پیش کرنے کا ہرگز نہیں ہے۔

فیصل صاحب کا تذکرہ اچھا ہے اور بے جا ہے۔ ان سے واقفیت مصنف کو نہیں ہے۔ ایب مرزا کا حال بھی خاصا سرسری ہے۔ زیادہ قربت سے انہیں پہچانا اور ان کے اہلے سے منوبہائی کو جانتا اور بیان کرنا ضروری تھا۔ یہی کی میر احمد شیخ اور کشور ناہید اور ہالہ شاکر کے سلیٹے میں بھی ٹھکتی ہے جن سے میں واقف تھا یا ہوں۔ صرف بیان کا کافی نہیں تھا بہت تجزیاتی پہلو بھی ہوتا تو ان کے پاکستان کی تہذیبی زندگی کے تضادات پر بھی نظر پڑتی۔ ہر حال یہ تصنیف اور مختلف قسم کی یادداشت ہے جس کے تجزیے سے ملک ہی کی نہیں بلکہ بڑے عظیم کی ادبی نفسیات پر روشنی چڑھ سکتی ہے۔ آخر ہم نے اپنی تمدنی کمزوریوں کو

کیسے کیسے اہل ہم وہ ہے ہیں۔ تڑپتی پھرتی کے تجھ پہ میں اور زیادہ توہ چاہیے تھی کہ اس کے ورے ہم اپنے دانش مندوں کی زیادہ بہتر پہچان کر پاتے، آخر جیسے تھی کار اور ادارے تو وہیں بھی تھے، ان پر کیا گزری۔ امدودی فلسفہ اور بکری لڑ پھاری وغیرہ کی شورش کا ذکر بھی تو ہوا چاہیے تھا۔ اور جیسا بھی لکھی کہ جیسا ہو، کچھ ایسے طرحہ بھی گزرتے ہوں گے جنہوں نے انگڑائی ہی کو شہاد بنا دیا۔ کچھ دن کا ذکر بھی لازم تھا کہ جیسا تر چھا جی تو صحیح وہ جہاں ہوتی ہے۔

چاہتا ہوں کہ آپ کی کامیابی اور کامرانی پر داد دوں۔ یہی بہت ہے کہ آپ نے لکھی کہ یہاں تھیں تو ہم ایسے دور ان لوگوں کو کہہ اور اور ایہام اور ایہام کے اٹیلے ہی سے کیا۔ وہاں کے معاشرے کا تصور اور وہاں کے امدودی تکان کا اسے لکھیں۔ میری رائے میں آپ ان اعتبار سے مفرد ہیں، ان کا ایہام غیر مفاہات ہے۔

more strength to your elbow

فیروز علی

محمد حسن

•••••

ہنگامہ میں اجنبی

”ہنگامہ میں اجنبی“ ایک اجنبی دہلی کی اجنبی ثقافت سے پیدا ہونے والا شعری تجربہ ہے۔ اس مجموعے کی روح گردانی کرتے ہوئے مجھے ایسے بہت سے شعرا اور ادیبوں کا خیال آیا جو اس قسم کے ثقافتی تجربے سے گزرتے تھے۔ میرا اولین فوری طور پر یاد آوا (Pablo Neruda) کی عظیم نظم ”ماہو بیج کی بندوبس“ کی طرف گیا۔ ماہو بیج میں کا (Inca) کی یادگار ہے جو (Peru) کے پہاڑی سلسلوں میں واقع ہے۔ پھر کے ہیں، تہذیبی آثار، اساطیر سے متاثر ہو کر نیرودا نے اسپانوی زبان کی عظیم نظم تخلیق کی تھی، نیرودا ہی کے حوالے سے مجھے اس کے قریبی دوست لورکا (Lorca) کا خیال آتا ہے جس نے ہنگامہ کے قیام کے دوران میں اس نئی ثقافت میں شعری تجربے کیے تھے۔ اس کے ساتھ ہی میرا ذہن (Poe) کی طرف منتقل ہو گیا ہے جو ہندوستان میں اپنے مقامی متن کے دوران یہاں کی تہذیب اور روح مالا سے بہت متاثر ہوا تھا۔ لیکن ہندوستانی ثقافت پر پختہ رہنا ہی، مقبول ہونے کا سبب نہیں ہے اور ان کا اصل پرورش جیسے مستحق نہیں ہوتا۔ ہنگامہ ثقافت کے تجربے ہی سے وجود میں آئی تھی۔ اردو کے حوالے سے گھانگہا اور علی گڑھ کے ہندوستان میں ہندوستان کی دہلیس کو آ پادویاتی ثقافت کا نکتہ میں تجربہ کیا تھا۔ گھانگہا کی سالہاں اور کھلی کھلاڑیوں، پیرہن شراب کی دکھوں، سکرٹ مین کرشنے والی نیا نیا نیا نیا کے مس کو کچھ کر مقلد ہند کی دلی کا شاعر چھینا خیر ہو کر رہ گیا تھا اور اب ان دنوں میں ہندو اور کے دیگر شاعر راشد کے بارے میں بھی سوچ رہا ہوں جو ایک

مشن پر چند کتابوں سے ایران میں گیا اور واپس پر اس نے "ایران میں انجیلی" جیسا شاہکار
 اور ادب کی نذر کیا۔ اب میں نے مہدائرشید کی کتاب "ہلاک میں انجیلی" دیکھی تو مجھے
 فوراً ہی "ایران میں انجیلی" کا خیال آیا اور "ایران میں انجیلی" سے میں واقف تھا مگر
 "ہلاک میں انجیلی" میرے لیے ایک انجیلی شعری مجموعہ تھا۔ اتفاق سے میں گئی بار ہلاک
 جانچا تھا اس لیے اس مجموعے کی نظموں کی کثافت میرے لیے انجیلی نہ تھی۔ میں ہلاک کے
 تخلیقی تاثر سے انجیلی طرح واقف تھا۔

اب میں آپ کو یہ بھی بتا دوں کہ مہدائرشید کے اس مجموعے کو پڑھنے سے پہلے
 میرے بعد اس کی شاعری کے بارے میں کچھ تعصبات تھے۔ اس کی تشابوہی دستاویزوں
 اطلاعات اور محاورات سے میں پریشان خاطر ہو جاتا تھا۔ سچ یہ ہے کہ اپنے دوست کی نئی
 نظموں کا مجموعہ میں نے ہی تعصب کے زہر اثر پڑھا شروع کیا تھا۔ اس مجموعے کو پڑھنے
 ہوئے جو تاثرات میرے ذہن میں آئے میں انہیں قلم بند کر رہا ہوں۔

شاعر "ہلاک میں انجیلی" ہو یا "ایران میں انجیلی"۔ اس کی تخلیقی ذات اس کی
 شاعری کا تعین کرتی ہے۔ میں سوچتا ہوں کہ اگر مہدائرشید دوسری جنگ عظیم کے دوران میں
 ایران گیا ہوتا اور یہ طور شاعر اگر وہ اس دور کے بارے میں اپنے شعری تجربات بیان کرتا
 تو وہ راشد کے تجربات سے مختلف ہوتا اور اگر راشد کو ہمارے اس جدید دور میں ہلاک
 کے تخلیقی مظہروں میں زندگی بسر کرنے کا موقع ملتا تو اس کا تجربہ مہدائرشید سے مختلف
 ہوتا۔ راشد کے "ایران میں انجیلی" میں جنگ کی جاہ کارہوں کے منظر ہیں، نوآبادیاتی
 قوتوں کا مسلہ کردہ آشوب ہے۔ سیاہی و سماہی بے معنویت ہے۔ ایٹمی نواک کے
 زوال، بے بسی اور نوآبادیاتی مظالم کے خلاف ایک آواز ہے۔ شاعر کی منظر نسبت
 اس آشوب کا خاتمہ چاہتی ہے۔ اس کے برعکس "ہلاک میں انجیلی" ایک مختلف شعری تخلیقی
 ہے۔ "ہلاک میں انجیلی" کی نظمیوں سوسائٹی کے بکھرے ہوئے منظر ناموں کو پیش کرتی

ہیں۔ لہجے کے ٹکڑے ہونے کے علاوہ سے عام سوسائٹی کا ایک حصہ بن جاتا ہے۔ اس میں
 انسانی وجود کسی نہ کسی صورت میں وجودی کرب سے گزرنا ہوا نظر آتا ہے۔
 عام کے دائرے میں خدائی لہجہ کا جو نقش بنتا ہے۔ اس کی ایک واضح صورت "سوانی
 کپ" میں دیکھی جاسکتی ہے۔ بنگال کا لہجہ رول و آفس ایک Erotic Culture کی
 شکل بناتا ہے۔

آلودہ سڑکی ٹولٹی ہو

سڑکیوں کا

اور پیاز کا ڈھکا

پاہل میں

اور ان کے اوپر

پھل جیسی ہوتی ہے

یہاں ہے اور سوا ہے

اور رنگی کا جام بھرا ہے

کڑے کی کڑکی کو پھونک

سونا اوتار جاتا ہے

پچھلے بڑی دھوپ کی نئی

جسم میں داخل ہوتی ہے

ہاں ہوسلا ہے

ایک ہی نظر لگتا ہے

سوانی کپ

سوانی کپ

ہن ۱۲

اور ہمارے ہسٹوں کے

بگے ہونے دکھانوں کی

ہو اس بھلا

اسیں اکی کھا

وہ ہونوں پر معصومات لہرائیں ہشروہات

جنسی تھوک، ان کے لیس اور خون کے نمبر

آگسیں ان ترتیب سے پڑھتی ہیں

ان کی مہارت دہرائی ہیں

چپے یہ اٹھوک ہوں

ہا جند پوہن لٹے ہوں

سے خانوں کے باہر

مچھلی اور چاول کی بو سے

ملا جلاک لڑا ہے جو

شہوت میں کر بگھرا ہے

جو ہاں ہاکی کر

آگسوں کے دستوں سے

دل میں آتا ہے

بناگ ہر آنے والے زائر کے لیے Erotic Culture کا شہر نظر آتا ہے۔ پورٹو

ان ہی راز میں شامل ہے۔ وہ بھی رات، صبح، شرب اور جنس کا بیان کرتا ہے۔ اس
 مجوسے کی نگہیں چمکتے ہوئے جس بار بار یہ سوچتا رہا کہ کیا میں بھی عام راز میں کی طرح
 بھانک کے Erotic Culture کے تجربے ہی تک محدود رہے گا یا وہ اس شعر کے
 Ceta Culture کو بھی دیکھ سکے اور اکتانے گا۔ میں اپنے سوال کا جواب تلاش نہیں کر
 سکا۔ شاید اس مجوسے کو زیادہ توجہ سے چمکنے کے بعد اس کا جواب مل سکے گا۔

جنس ان نگہوں کا ایک بنیادی استعارہ ہے جو اکثر و بیشتر نگہوں میں موجود
 ہے۔ جنس اشتہاؤں کی کیفیت میں یہ استعارہ بھڑکتا ہوا ملتا ہے۔ مگر، کوہنوں، نگہوں، دیند
 گروہوں، ماسٹر کی نگہوں، مہروں اور اعضا پر چماتا ہوا یہ استعارہ اس کے بدلے میں ایک
 چھپاتی خواہش کے طور پر بھی موجود ہے اور سہمی اکتساب کی ہے بس حالتوں میں مجوسی
 روپاری کے سخنوں سے بھی بھاگتا ہے۔

اسلوب کی حیثیت کے اعتبار سے عبدالرشید کی شاعری یقیناً اپنے قاری کو صحت
 اور ہی مسئلے کا اشارہ کر رہی ہے۔ اس کے شعری حیرانے عام طور پر ہم کلام ہونے کے
 لیے ہلکی آمادہ نہیں ہوتے۔ ان حیرانوں سے ہم کلام ہونے کے لیے ہم کو ہمدرد اور غور
 و فکر کی منزلوں سے گزرنا پڑتا ہے اور تب تک نہیں جا کر ہم نگہوں سے محظوظ ہوتے ہیں۔ مگر
 ان مجوسے کی چوکھٹوں کی حیرانے اہالیانے کے اعتبار سے بہت صاف ہیں۔ ان میں
 کشمکش کی چھپکی نہیں ہے۔ انوں استعاروں اور تشابہوں کی صحت میں باخوبی کا
 احساس ہوتا ہے۔ ان نگہوں میں "تاریکی میں جو بھی ہے" "مرے پاس اک چنیا تھی"
 مانے اور Patpong قابل ذکر ہیں۔ یہ نگہیں اسلوب کی صحت اور معنوی تکمیل میں
 ایک کے لائق سے آشنا کرتی ہیں۔ ان نگہوں کا صوتی آہنگ بھی متاثر کرنے والا ہے۔
 بہت صاف اور روشن استعارے اور حیرانے ہمیں اپنی سمت کھینچتے ہیں۔ مری دانے
 میں "شام کی بارش" اس سلسلے کی تازہ و ظہم کی جا سکتی ہے۔ جن نگہوں کی طرف میں یہاں

اشارہ کر رہا ہوں۔ خاص طور پر ہماری فون کی مستحق ہیں۔ وہ اس لیے کہ وہ وہاں تھیں
اس گروپ کی دوسری نظموں کے مقابلے میں ایک مختلف انداز کی حامل ہیں۔
اس گروپ کی دوسری نظموں کے مقابلے میں یہ نظمیں ہمیں فی الفور ٹھک
(Click) کرتی ہیں اور ایک ایسے شعری تجربے سے آشنا کرتی ہیں جو اس گروپ میں
منظر محسوس ہوتا ہے۔ مگر یہ کوئی سلسلہ سول نہیں ہے کہ فی الفور ٹھک (Click) کرنے والی
شعری ادبی ہوتی ہے اور ہر شاعری فی الفور ٹھک نہیں کرتی وہ ابھی نہیں ہوتی ہے۔
پورے کہنے کا مقصد یہ نہیں ہے کہ "پٹاک میں ابھی" کی جو نظمیں فوری طور پر ہمارے
حواس کو متاثر نہیں کرتی ہیں وہ ابھی نہیں ہیں۔ ہر نظم تعلیم کے ایک مختلف زاویے کا کھانا
کرتی ہے اور یہ وقت باگھی ہیں اور اگر آپ وقت دینے کے لیے تیار نہیں ہیں تو پھر وہ
آپ کو شاید فوری طور پر ٹھک نہیں کر سکیں گے۔ اس لیے ان نظموں کو ذرا صبر و سکون سے
پڑھنے کی ضرورت ہے۔ میں یہاں ایک مثال دے کر اس بات کو بیان کرنے کی کوشش
کروں گا۔ ہم جب کسی فرد کے گھر جاتے ہیں تو دروازے پر دھک دیتے ہیں یا کھٹی
بجاتے ہیں پھر چند منٹ یا کچھ دیر توقف کے بعد صاحب خانہ برآمد ہوتا ہے تو ہم اس سے
ملاقات کر کے معلق ہوتے ہیں یہی صورت حال ان نظموں کی ہے ہم ان کو پڑھتے ہیں
کچھ توقف اور انتظار کی منزل سے گزرنے میں اور پھر یہ نظمیں ہم کلام ہونے لگتی ہیں اور
تب ہم معلق ہوتے ہیں۔ دراصل معنی ایسی نظموں کی گہری ساخت کے اندر کسی ذہنی
چمپے ہوتے ہیں۔ ہمیں معنی کی صدف کو ان گہرائیوں سے برآمد کرنا ہوتا ہے۔ اس پر
عمل کے بعد ہی یہ نظمیں ہمیں ٹھک (Click) کر سکتی ہیں۔ مگر یہ ضروری نہیں ہے کہ
نظمیں مجھے ٹھک کریں مجھے تو سنی کرنی چاہیے معنی کا جہان بھی تو میرے سہا تہا ہی
تخلیق کرتا ہے لیکن آپ کو ان کے معنی خود تخلیق کرنے ہوں گے۔ اس لیے کہ ایسی نظمیں
عجیبگی کی طالب ہیں اور ایک ایسے کلام کی خواہاں ہیں جو ان کو برداشت کر سکے اور

عام رد تکلیف ہی میں ممکن ہو سکتا ہے جہاں حتیٰ معنوں کی کوئی ترقی نہیں ہے جہاں معنوی
 وسعت میں کوئی حد نہیں ہے۔ یہاں ان حدوں کا نہ ہونا ہی معنوی تکلیف کا فریضہ اہم دینے کے
 لیے مانظر رہتی ہیں۔

ہر شعری خیالات میں شاعر کا وجود موجود ہوتا ہے۔ اگرچہ اس خیالات کے باہر ہی
 کے لیے شاعر کا وجود اہم نہیں ہے۔ ان کے لیے تجزیہ کی اساس اس مواد پر ہے جو خیالات
 میں موجود ہے۔ خیالات سے باہر وہ دل چاہی نہیں رکھتے۔ تخلیقی عمل میں شاعر کا وجود تخلیقی
 کے پر عمل (Personal) ہونے کا اعلان ہے۔ مگر یہ بات تنقید کی ایک عام جہت ہے۔
 اس جہت کا ایک منظر یہ بھی ہے کہ تخلیقی عمل کی تکمیل کے بعد نظم Impersonal ہو جاتی
 ہے۔ اب شاعر خیالات کو نظم کا قاری بن کر رہ جاتا ہے۔ تخلیقی عمل کی یہی کیفیت "پلاک
 میں اپنی" کی بھی ہے۔ ان نظموں کا مانت Personality سے Impersonality
 کی منزل تک سفر کرتا ہے۔ اس حوالے سے کیا یہ بہتر نہ ہوگا کہ ہم عبدالرشید سے کہ جو اب
 نظموں کا قاری ہے ایک منظر کریں۔

ایک دو ہفتے میں ان نظموں کی تمثالوں کے بارے میں بھی کہنا چاہتا ہوں۔
 ادا، بھر، سانپ، کیلے، بھیگر، ہاول، چنیا، کھرا، سانپ اور سپناں ان نظموں کی نمائندہ
 تمثالیں ہیں جو اپنے مقامی مقامی حوالے سے ظہور پذیر ہوتی ہیں۔ "سانپ" کے علاوہ
 "چنیا" اور "سروشا" "پلاک میں اپنی" کے خوبصورت استعارے ہیں۔ "سروشا" میں
 چند خیالات ہر لمحے دانش کی "جہاں راز" کا پکا سا گیس بھی نظر آیا ہے۔ مگر "سروشا" بنیادی
 طور پر ایک مختلف استعارہ ہے۔

سروشا کی اپنی ہی چنیا
 مٹاؤں کی طرف پر ترقی بلکہ ہر جہتی
 بلکہ ہر جہتی ہر جہتی کی گزرا

سردشاہ کی لکھی ہوئی چڑیا
 تم اس کڑکی سے اندر آگئی ہو
 ان ہاں پہلے ہو کھوئی تھی کسی کے واسطے
 راجہ کا گھس اس گھوسے کی چند ہر لکھوں میں بھی دیکھا جاسکتا ہے۔ اس گھس
 کی سب سے خوب صورت لکھیں "ناج" میں آگئی جاسکتی ہے۔ - گنگا اہت تو یہ ہے کہ کسی
 نئے شاعر کا لکھتی تو یہ حشر ہونے والے شاعر کو بھی یقیناً گلہنی ارتجاع کی سطح پر لے
 جاتا ہے۔ اس کی ایک مثال انیس نامی کا شعری مجموعہ "نوسے" ہے جو بیٹت جان پریس کی
 گلہنی رفاقت میں لکھا گیا ہے۔ مہارشیہ کے ہاں اس کی مثال اس کی نظم "ناج" میں ملتی
 ہے۔ اس نظم میں اس کی تمناؤں اور حجازوں کی مخصوص عینک موجود نہیں ہے۔ بہت
 ماؤں مگر کسی حد تک رواج شعری عت کے استعمال سے اس مجموعے کی ایک خوب صورت
 نظم پیدا ہوئی ہے۔ یہ کہنے کی ضرورت نہیں ہے کہ اس نظم کی آہنگ اور اسلوب کے حوالے
 پر راجہ کی کس نظم کا اثر ہے:

ناج

اں درون جام کے ساتھ
 شب کے بکام کے ساتھ
 آج میں اپنے ہی بہرہ سے گل کیوں کا
 اپنے بہرہ سے
 لکھوں کی خدا لے لوں کا

ناج

اں ام کے ساتھ
 جس کا توفیق میں مگر کے

بہتر اور میں کھو آیا ہوں

اسے مری شب میں مہاں ہوتے ہوئے

زلم ہمال

مجھے رحمانی سے

زندہ رہنے کے لیے بھی

کوئی دکانی سے

نہی

ان اہلی کی تھی ہوئی عمر کے ساتھ

شب زنجیر کے ساتھ

اب میں ان نظموں کے اسلوب سادگی اور سلی کے بعض پہلوؤں کی طرف
 آپ کی توجہ مبذول کروانا چاہتا ہوں۔ "بناک میں انہی" کی ڈیڑھ تیس اشعار کی مدد میں
 کہیں گے ہیں۔ تاکہ اس لیے انہی ناگی کو یہ شکایت رہی ہے کہ اکثر نظموں میں مہلوس
 علم سے باہر نہیں نکلتا بلکہ لفظی دائروں میں ستر کر رہا ہے۔ مسئلہ یہ ہے کہ مہلوس کی
 نظموں میں عام مروجہ نظموں کی طرح سے معنی بڑا نہیں ہوتے ہیں۔ اگر آپ یہ سوچیں
 کہ یہاں مہلوس کے معنی سے جانت ہو کر تیسرے معنی میں داخل ہوگا اور پھر اس کے
 تمام معنی معنویت کی ایک زنجیر میں مرتب ہوتے چلے جائیں گے اور پھر نظم اختتام پر
 اپنے مہلوس کو سمجھیں کہ بھی ہوگی تو انار سے مہلوس کی نظموں میں اس قسم کے کارمولے سے
 مطابقت نہیں رہتی ہیں۔ ان نظموں سے معنویت کا مطالبہ یا مہلوس دریافت کرنے کے
 لیے بہت گھٹ طریقہ کار اپنانا پڑے گا۔

میں ذاتی طور پر اس مسئلہ میں یقین رکھتا ہوں کہ زبان کا بنیادی کام انسانی رابطہ

ہے اور یہ رابطہ انسانی کے ذریعے قائم ہوتا ہے۔ لہذا کسی بھی فن پارے میں رابطہ کا کام

ضروری ہے۔ یہ مسئلہ اسرا ہے کہ کسی نئی پارے میں ابداع کس سطح پر قائم ہوتا ہے۔ ابداع
 عالی کی انہوں میں بھی ہے اور آزاد کی "تختہ انبیاء" میں بھی۔ ظاہر ہے دونوں کی
 ساخت مختلف ہے۔ عالی کی شعری سادگی ابداع کی سادہ ترین سطحیں ملاتی ہیں اور آزاد
 اشعری طور پر اپنے استغراق میں معنویت۔ ابداع اور مطالب کے تراش سے بے نیاز
 رہتے ہیں۔ انکار باب کی انہوں میں حد سے زیادہ ہوا شعری استغراق ہے اور ذات سے
 کھینچے کاٹل ہے۔ جھگٹی گل میں بعض شعرا کے ہاں ایک ایسا سطح ضرور نمودار ہوتی ہے جب
 شاعر اپنے اند کے اتفاق میں اندر کر رہا ہے اور مراد سے بچانے پر قائم شدہ
 معنویت و مطالب کے ضابطوں سے بے نیاز ہو جاتا ہے۔ اس مقام پر وہ اپنے ذات سے
 ہم کلام ہوتا ہے اور شعری کثرت کی سرشاریوں میں سطر کرنے لگتا ہے۔ اس منزل پر وہ
 اپنی ضابطوں کے پارے میں سوچا بھی نہیں سکتا۔ علامت، استعارے اور تشابہوں کے اس
 کھیل میں زبان کی عمومی ادبی معنویت سے باندھ ہوتا جاتا ہے۔ سادہ انسانی میں زبان کا یہ
 کھیل سب سے آہستہ کی کہانوں میں طرب کیا گیا ہے۔ یہاں اسلوب کی ظہم کاری جب سطر
 دکھاتی ہے اور یہاں انسانی نوئیس کے ہاٹل یعنی تخیل کی ان تھک دور میں قاری تو ہاٹل
 لگ جاتا ہے مگر انسان نوئیس فرانسے بھر جاتا ہے۔ مسئلہ کا ایک رخ یہ
 بھی ہے کہ شاعر اپنے اظہار کے لیے جو شعری لسانیات استعمال کرتا ہے اس کا تعلق باطن
 کے اندر سے ہے بھی ہو سکتا ہے اور شاعر کے اپنے عہد کے مشترک تخلیقی تجربے سے بھی کہ
 جہاں وہ اپنے دور کی اس پاپر شعری لسانیات سے رجوع کرتا ہے جو اس کے اپنے عہد
 میں قبولی عام کا درجہ رکھتی ہیں۔ ان دونوں صورتوں میں شعری معنویت و مطالب کا کوئی
 مسئلہ پیدا نہیں ہوتا کہ شعری لسانیات کے درج الوقت کے عام باتوں میں موجود ہوتے
 ہیں اور یہ باتوں ان کی تعداد و قیمت اور معنویت سے بہ خوبی واقف ہوتے ہیں۔ ان باتوں
 کی تمام سطحیں جانی پہچانی ساؤس اور معروف ہوتی ہیں اس لیے ان کے استعمال اور تخیل

کوئی مسئلہ پیدا نہیں ہوتا۔ اس ضمنی مسئلہ میں بحث یہ ہوتی ہے کہ جب کسی عہد کے شاعر یا شاعری کے علاوہ اپنے دور کے مشن کو تخلیقی تجربے کی طرف رجوع نہیں کرتا کیوں کہ اس کا تجربہ ایک نئی شعور کے اظہار کے لیے ایک نئی شعری لسانیات پیدا کرتا ہے مگر مشکل یہ ہوتی ہے کہ اس کا دور اس نئی شعری لسانیات سے ماہوں نہیں ہوتا۔ یہ پہلی شعری لسانیات کا اسیر ہوتا ہے۔ پہلے سے بنے ہوئے معنوی دائروں اور مطالب کے امکانات کے حدود میں رہتے ہوئے اس کا دور شعری تنہیم کا اظہار اظہارے میں بہت سکتا ہے۔ دو تین آسانی کے باعث اسے رد کر دیا جاتا ہے۔ ۱۹۶۰ء کی نئی شاعری کے ساتھ یہی دشواری پیش آئی تھی۔ اس تجربے کے شاعر اپنے دور کے نئے تہذیبی تجربے کے اظہار کے لیے محدود شعری لسانیات کو رد کر کے ایک نئی شعری لسانیات پیدا کر رہے تھے۔ اسی مسئلے کے باعث ان کی ندرت خلافت کی آئی تھی۔

مہارشیہ کے ساتھ ہی یہی مسئلہ ہے کہ اپنے مفرد تجربے کے اظہار کے لیے ایک مفرد دور کی ماہوں شعری لسانیات پیدا کرتا ہے۔ یہ شعری لسانیات آئی مفرد اور ذاتی ہے کہ نئی شاعری کے ہوتی ماہوں شعرا پر بھی گزرتی ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ اس کا تجربہ تو مطلب ہے اور اس بات کی مستحق ہے کہ اس پر تنقید کی سے خود کیا جائے اور اسکی تخلیقی تخلیقیت ندرت کے باعث تک رہائی کے لیے ظہور کے ساتھ سنی کی جائے۔

یہاں میں اس بات کی بھی وضاحت کر دوں کہ میں شعور کے ماننے والوں کے ساتھ ہی کا شعور سے اتفاق نہیں کرتا کہ شعری تجربہ بہت حد کوئی لئے نہیں ہے کیوں کہ تخلیقی حکام میں شعور میں آنے سے پہلے شعری تجربہ اس حکام میں موجود ہوتا ہے۔ مسئلہ یہ ہے کہ اپنے مفرد دور کے ماننے والوں سے کسی تجربے کا مفرد دور کسی تخلیقی ذہن میں آتا ہے اور یہی شعور جو مہارشیہ کو مہارشیہ بنا رہا ہے۔ سوال یہ ہے کہ مہارشیہ شعور کو اپنی شکل دے کر اسے اس کی ایک ایک شکل نظر آتے ہیں۔ اگر تہذیبی حکام کا تجربہ

ہونا تو کامیاب کہاں نظر آئے۔
 تقسیم کے اس مسئلہ کا ایک سنا یہ بھی ہے کہ ہم میرا سن کی آنکھ سے تڑگو اور
 مہالی کی آنکھ سے شامی کو رکھنے کے عادی رہے ہیں۔ میرا سن کی آنکھ "سنان چاہب" کو
 کب قبول کرنے لگی اور عالی کی آنکھ میرا سن، راشد یا افکار چاہب کو کیسے تسلیم کرے گی۔
 ترقی پسندوں کی آنکھ سے دیکھنے والوں کو ایسا نظر سچا آہو۔ سہل نظر آئے گا اور ان ہی
 آنکھوں سے جھانکنے والوں کے لیے شاعر افکار چاہب بے معنی ہوگا۔ نئی شاعری پر انہیں
 ناگی کی گھسی ہوئی اذیتوں تقید کے باوجود ترقی پسند تحریک اور حلقہ ارباب ذوق کے بعض
 شامروں اور نقادوں کے پیدا کردہ شعری تصورات بدستور چھانکے ہوئے ہیں۔ میرا سن ہو یا
 راشد یا پھر چاہب نئی شاعری اور نئے اندازے کو تقید کی نئی آنکھ سے دیکھنے کی ضرورت
 ہے۔ ہم میں سے بہت سوں کے پاس یہ آنکھ موجود ہے دیکھنا یہ ہے کہ اس آنکھ کے
 تجزیے کب شروع ہوں گے اور اس کی ہسیرت کی روشنی سے نیا ادب کب روشن ہوگا۔
 انتظار کر رہا ہوں ان دنوں کا جب نئی تقیدی ہسیرت سے اس دور کے ادب کی تقسیم ممکن ہو
 سکے گی۔



ڈاکٹر انور نسیم، افسانے کی ہائپوٹیکنالوجی

ہمیں انسانی نگار رشید احمد نے انور نسیم کے بارے میں لکھا ہے "سائنس سے
 انہوں نے ڈاکٹر صاحب کی طبیعت کے تخلیقی پہلو کو کئی زاویوں سے جانچا ہے۔ ان میں
 سے ایک زاویہ ٹیکنیک پر گرفت کا ہے۔ ان کی ٹیکنیکی ہنرکاری کا اظہار ہے کہ ان کی کہانیاں
 قدم قدم پر اپنی پرتیں کھلتی ہیں اور ایک روایتی کے ساتھ انہماک تک نگاری کو اپنے ساتھ
 لے جاتی ہیں۔ دوسرا زاویہ حقیقت شناسی اور اشیاء و مصلحتات کی تہ میں ہنر کر وہ کچھ
 جاننے کی جستجو ہے جو دوسروں کی نظروں سے اوجھل ہوتا ہے۔ یہ امد کی بات ان کے
 کہانوں کی انفرادی تسبیہی گرہ بندی بھی کرتی ہے اور مجموعی انسانی مکتبش اور سیاسی سماجی
 مہارتوں میں معاشرے کا طبعاتی تجزیہ بھی ہوتا ہے۔ تیسرا زاویہ ان کے طرز استدلال کی
 صورت میں سامنے آتا ہے۔ ان کے مضمومات مواد ہی ہیں جو اس وقت کے معروض کے
 مضمومات تھے جب یہ کہانیاں لکھی گئیں۔ یوں ان میں ایک طرف تو رواج عصر کی خوشبو
 ہوتی ہے اور اس کے ساتھ ہی ان کی جو انفرادیت قائم ہوئی ہے وہ بھی طرز استدلال
 ہے۔ ان کے امد کا رجحان ان کے ادبی سہاگ سے مل کر ان کی کہانی کا جو خاکہ بناتا
 ہے اس میں استدلال اور عقل ایک وقت اپنا کام دکھاتے ہیں۔" (ص ۷-۸) رشید احمد
 نے یہ اگر بھی کیا ہے کہ انہوں نے ڈاکٹر انور نسیم کے افسانے "چاندنی" امرتسر میں
 پڑھے تھے، جبکہ اس مجموعے میں کوئی ایسا افسانہ شامل نہیں، اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ڈاکٹر
 صاحب اپنی عقلی، تمدنی اور پیشہ ورانہ زندگی میں جو نئے مکتبوں کے مگر تخلیقی زندگی میں
 "تخلیل اور تجزیہ تو رہے مگر اپنی تحریریں اور مضمومات کو بھی پوری طرح سنہال نہ سکے۔"

ہرگز گورنمنٹ کالج اور کے طالب علم رہے۔ اس لیے ان کی ابتدائی تحریروں میں انگریزی
 نگاری کے ظہور رنگ کی شے بھگ ہے اور شاید ایک یا دو اسرار نگار ان کی تخلیقات میں آئے
 نہیں پاسا اہل اس کی بھگ ڈاکٹر انور نسیم کی ہمسی زندگی، نگار پرورد میں چند افسانوں میں
 موجود ہے۔ دوسری بات یہ کہ ان کی زندگی میں سائنس شعور اور نگار کے ساتھ اسب و
 طبیعت کے برابری رنگ بھی جلوہ ریزی کرتے ہیں اور یہ ڈاکٹر خدیجہ احمد اور ڈاکٹر سلیم
 الزماں صدیقی کے قلمی کے آئینہ نگار دکھائی دیتے ہیں۔

ان کے افسانوں میں روانوی بھگ لہاواں ہے، ماضی کی یاد، بچپن، گلاب کی
 معصومیت اور چھڑے ہوئے زیادہ رنگیں اور پرتشش ہو کر افسانوی فضا کو دل آویز بنا دیتے
 ہیں مگر ان کے کرداروں کو تاٹھٹھک نہیں ہونے دیتے کہ بڑی ہوتی جہدے زندگی میں
 آسہ لگیں گانے والی سائنس اور ٹیکنالوجی بھی انور نسیم کی دوسری محبوبہ ہے۔ حقیقت میں ان
 پانچ افسانوں میں سے زور لڑاں میں سماں بہا ہے حد مؤثر افسانہ ہے جسے انہوں نے نورانی
 توجہ سے لکھا ہے۔ اس کی مرکزی کردار ساجدہ کی شخصیت کو اجماع نے میں نفسیاتی اور سماجی شعور
 سے کام لیا گیا اور اس کے ساتھ ساتھ جزئیات نگاری نے بھی اس افسانے کی وسعت، گہرائی
 اور تاثر میں اضافہ کیا، اس میں کئی ایسے گفتنی جملے ہیں جو افسانے کے قاری کے دل میں عکس
 پیدا کرتے ہیں کہ انور نسیم نے افسانہ نگاری کو بہت زیادہ وقت کیوں نہیں دیا۔

”جب عابدہ کلاں میں اگلائی لیتی ہے تو ڈاکٹر صاحب بے چارے بے حد نہیں
 ہو جاتے ہیں، ساری ڈیمانڈیشن بھول جاتے ہیں۔ میرا پائی کے بھجوں، کبیر کے وہوں
 میر کے شعروں کی یہ دیوانی لڑکی اس جہم سے یقیناً بہت مختلف تھی۔۔۔۔۔ یہ جو بوندوشی میں
 اتنے سارے Gallant قسم کے لڑکے دن بھر اس کے پاس آیا کرتے تھے، کبھی ایسے تو
 نہیں کہ کسی ایسے درخت کی ٹھنڈی اور گھسی پھاؤں تلے جس میں اس بھرے پھل لگے ہوں
 مسافروں کا منتظر رہتا ہے اور سماں بٹنے کے ساتھ ساتھ پتے چھڑنے لگتے ہیں، پھل گلابی

ہانک ہونے لگتا ہے، درست کی چھاؤں اب سمجھی نہیں رہی، کیا کھوکھا ہو جاتا ہے اور پھر کوئی
 سٹر۔ مس ساجدہ روح کے مسائل پر صرف بحث ہو سکتی ہے مگر جسم کے اپنے تجھے
 ہیں، ان تجھوں پر اگر صرف بحث کی جائے تو فطرتی اور بھی شدت سے بھڑک اٹتی ہے۔۔۔
 کئی میں ہم کرشن چندر کا ڈرامہ 'سراسر' کے باہر پہنچ کر رہے ہیں۔ ہمارے ایک ہم خیال
 آپا کر رضوی صاحب کو ڈرامے کے لیے جو فرنیچر دکھا رہے اس سے مطلب ہے۔۔۔
 میں ایک خاموشی اداں بنے کیف دیمبر کی اتوار کو اس نے چند مزاح و اقاہب کے درمیان شہر
 کے بازار فرنیچر مارٹ کے اگلوتے مالک ایم ڈی رضوی صاحب سے شادی کر لی۔۔۔
 گولڈن کے ہنٹ کھول (ص ۸۰ تا ۵۵)۔ اس افسانے کی تھیسس لانا چھٹیاں دینے کا
 مقصد یہ تھا کہ ان میں ایک دو ماہی افسانہ نگاری، پانکسٹ (پہلوں کے رسی کے جانب
 ہونے سے سچے کے کھوکھے ہونے تک کا بیان) اپنے اور اپنے ہم نصیبوں پر ہنس سکنے کا
 حوصلہ رکھنے والا استاد (کسی کی انگریزی پر سائنسی تجربات کی تعلیمات بھول جانے والا) ایک
 نظریات دان (جو بڑی نزاکت سے اپنے افسانے کی ہیروئن کے پہلے ہنسی تجربے کا ذکر
 روحی اعزاز میں کرتا ہے) اور سب سے بڑھ کر یہ کہ وہاں سے حقیقت تک کا سفر طے
 کرنے والا فنکار (جو اپنے افسانے کی بڑی جاہت سے نکالی ہوئی ہیروئن کو بالآخر ایک
 رومان فرنیچر مریٹ سے شادی پر آمادہ کرتا ہے) پر ہی طرح سے دکھائی دے۔

اوتھیں یہ فاسٹلے بھی ایک موٹر افسانہ ہے جس میں جدید دنیا کو خوش دلی سے
 قبول کرنے والے ایک تعلیم یافتہ شخص کو بھی اپنا گاہن اور اس کی سادہ اور معصوم زندگی کی یاد
 دہانی ہے، تاہم آخر میں افسانہ نگار کا لہجہ ان لوگوں کے مسائل ہو جاتا ہے جو جدید مدنییت سے
 جدا تو لگتے ہیں تاہم اس کے معیارات کے مطابق مہذب کہلانے والوں کی ضروریات پر
 غور ضرور کرتے ہیں۔

پنگلی بھر روشنی - ایک مطالعہ

پنگلی بھر روشنی وزیر آغا کا چارہ شعری مجموعہ ہے۔ اس میں ان کی چالیس نظمیں شامل ہیں۔ اس مجموعے کا نام ان کے ایک شعری مجموعے "پنٹا ہم نے پہاڑی راستے" کی علم "پنگلی بھر روشنی" سے لیا گیا ہے۔ یہ علم اس مجموعہ شعر کے فلسفے پر بھی روش کی گئی ہے۔ پنٹا ہم نے پہاڑی راستے میں وزیر آغا نے اپنے لیے ایک مختلف اور مشکل راستے کا انتخاب کیا تھا جو کوئی بھی امر کی گروہ کشائی اور ارتقا کے راستے کی طرف جاتا تھا۔ اس سفر میں شاعر نے جو کچھ دیکھا اور محسوس کیا، اسے ایک علامتی استعاراتی نظام میں encode کر کے شاعری کی قدر کر دیا تھا۔

پنگلی بھر روشنی وزیر آغا کے شعری سلسلے کو ظاہر کرتا ہے۔ اس مجموعے کی قرأت کے دوران اگرچہ حلقے میں نظموں کے باطن میں مستور روابط کا احساس دلاتی ہے لیکن پھر بھی کسی ایک مضمون میں ان نظموں کی تمام تر فکری اور احساسی جہات کا احاطہ کر سکتے ہیں۔ اس لیے بھی ممکن نہیں کہ حجم کے بڑا کچھ کی تکمیل نہیں ہوتی، اس کے معنوی امکانات موجود رہتے ہیں۔ ماہد جدید تنقید نے اس نکتے کو صراحت کے ساتھ بیان کیا ہے۔

ماہد جدید تنقید کی رائے:

- that meaning is what is intended by the author;
- that meaning is created by and contained in the text;
- that meaning is created by the reader.

لیکن یہ معنی آخری منصف اور قاری دونوں کا امتحان ہے۔

پہلی گھڑی کی زیادہ تر عینیں "اسرار" کے ہائے کو بند کر چکی ہوتی ہیں۔
اس مجموعے کی پہلی ہی نظم "بنوں" "علم" اپنے ہائے میں "اسرار" کو ضم کرنے کی سعی کرتی
ہے۔ علم کا دوسرا بند دیکھیے:

جب دہن تھی

اور جب وہ بیوا تھا

اپنے دن کا لفظ ایک ماہ

لفظ ایک خاک

جو مجھ تک پہنچنے کی اک لمحہ خواہش بنا

سانس روکے کھڑا تھا

وہ اک سلوٹوں سے گھرا، وہ سیاہی میں

گرد جس کے کوئی حاشیہ تک نہیں تھا

مگر جس کے ہونے کی بلکہ آخر تھی

میں سب جانا تھا !!

(علم)

میرا یہ احساس ہے کہ یہ علم اس مجموعے کی نگہوں کی بڑھتی ہوئی آواز ہے، اس
کا آواز گونے اور اسے ایک وسیع تر دائرے میں دکھا کر دیکھنے کے لیے پیش کیا گیا ہے، یہ
ہے۔ اس علم کا ایک تجربہ کن پہلو یہ ہے کہ اس میں شاعر نے نہ صرف "اسرار" کے زیادہ
انہ اہات کیا ہے بلکہ اس کی گہ کو کھولنے کے عمل سے بھی گزرا ہے۔ اس سے بھی زیادہ
تجربہ آگے بات یہ ہے کہ وہ اس "اسرار" کو جو حدود اور خود خالی سے ماورا ہے، بلند تر تھی
تھا، یہ دوسروں تک پہنچانے میں کامیاب ہوا ہے۔ نئی اور علم میں یہ علم ایک سوز کی مشیت
رہا ہے۔

ہم مصرعوں کی ایک کثیر تعداد جو علم کے بالائی چھتے، چھٹا ہائے ہی کو تھی

کہتی ہے اپنے ہاتھوں کے لیے ذریعہ آقا کی نظموں کے deep structure میں
 اتر کر ان پگڑیوں تک پہنچنا یعنی ایک مشکل کام ہے یہ کہہ رہی کہ زبان و مکالمے کی
 صورتوں سے اوپر اٹھا کر اس کو ایک نئے اور جہان کی طرف لے جاتی ہیں۔ ذریعہ آقا
 نے آئس ٹیبلے (Aldous Huxley) کے ناول سے لکھا ہے کہ جب اس نے آئس
 آوریو سکالین (Mescaline) کھائی تو وہ ایک عجیب و غریب روحانی تجربے سے گزرا
 کہ جس میں سامنے کی اشیاء لہائی اور مکالمے بکڑ بکڑوں سے آواز ہو کر خود اپنے اندر کی
 روشنی میں جھکا اٹھی تھیں۔ گویا اس کی طبیعت نہ تو ان تجربوں کی سی رہی جن میں روشنی بند
 پائی ہو اور نہ وہ روشنی تک پہنچنے کا "آریو" ہی رہی (میرا یہ کہہنا کی علامتی حیثیت بھی
 معلوم ہو گی) بلکہ اپنی "سوجھتی" کا نظریہ ہی تھیں۔ ذریعہ آقا کے پاس "سوجھتی" کا یہ
 تجربہ سوجھ ہے جسے آئس ٹیبلے نے liness کا نام دیا تھا۔ "پہلی تجربہ روشنی" کا نام
 "سوجھتی" کے دور آئے کی کیفیت سے بار بار گزرا ہے اور ہر بار اس نے اس
 "سوجھتی" کو ایک نئے ذریعے سے لکھا ہے۔ خیال کے تسلسل کی وجہ سے ذریعہ آقا کی
 نظموں کے گونے گنا آسانی نہیں، بلکہ اس کی نظموں سے یہ چند گونے دیکھے جہاں سے
 "سوجھتی" کے تجربے کی نکالی جاتی ہے

تسلسل یعنی باہمی ہو

تو رہتی ہو ایک جاتے ہیں

پہلے جہوں کے کہیں ہو

جس سے لکھتے ہیں

سے روشنی کے رہتے ہو

کی انہوں کے چھانے

بھڑ جاتی ہے

(پہلے تجربے کے انداز)

روشنی خفی آسمان کا آگ نگر
 سچ پتی صورتوں کا اژدھام
 اوس کی بوندوں کا عظیم سلسلہ
 خطرہ نکسوں کا آگ برہم جیہاں

(روشنی سے بات کر کے دیکھ لی)

پول گر جا
 دھچکے کوئی آگ بھاری آواز کا شیش
 زہر کا شیش
 نگوے جو کر کر بھیں ہی کر
 فرس زہنی پر آن بگرا!

ہم کیوں اوستے ان کر رہی سے
 گری شو کی دیواروں کے
 تھکاوے توڑ کے نئے
 کر رہی کر بیوں میں بھرے!
 پاروں چاہ بھری کر بھیں
 پلنے پلنے

لوکی بند ہی میں کر ہم گھار جوئے

(ہم دیکھیں بجلی بگڑی)

ان دن میں کر
 رشم کو کاپی سے بہر آنا تھا

آفریں گے
 بھاری زور بھاری سہا
 دیکھا دیکھا
 آفریں گے
 آہی کے سر بھری جھڑا پتے
 پھرتے تھی بھری گود
 بھوم کی بطن سے نکلا
 آفریں گے دن اس کو گئی تو
 آگے بڑھ کر
 لڑائی میں لپے لڑکے کو
 اپنی رکتی ہاتھوں میں بھر لیا تھا

(۱۱)

اب تو ہیں لگا ہے جیسے
 موسم سارے، وقت پر آنا
 وقت پر جانا، بھول چکے ہیں
 سب کی جا
 صاف سے گے بند توڑ گے
 گھر کے اندر آجاتے ہیں
 بہت سے
 کلاسی کلا کے استادوں میں
 بیٹے لگتے ہیں

برائے بہت ہو جاتی ہے
لشکوں کے بھل

روٹیوں کی کاشوں میں پختہ جاتے ہیں!

(ساری ٹھیس خاک ہوئی نہیں)

وزیر آغا نے illness کے تجربے کو ان ٹھیسوں کی بہت میں ہی پار کیوں کے
ساتھ سو دیا ہے، جس سے ان ٹھیسوں کے کی معنی نکل رہے ہیں۔ گاڑی جب ان ٹھیسوں کی
بنت پر نگاہ کرتا ہے تو یہ اس کو پراسراریت کے مقابل کھڑا کر دیتی ہے۔ اور جب وہ اس
پراسرار آئینہ شعری تجربے کے اندر سے گزرتا ہے تو ایک اہم کی کیفیت میں ادب
جاتا ہے۔

بعض ٹھیسوں میں شاعر اس پراسرار آئینہ تجربے کے دہلیز میں شہرہ ہونے اور اس
داخلی حالات کو گرفت میں لینے کی چوٹی کے مراحل میں سے گزرتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔

چلو، مکان کے اندر سے کو

اندھ سے ہم نکل جائیں!

بچے جاتے رہنے کے

ٹھوس پر اپنے قدم بھائیں!

گہرے کے اندر اتریں

صدیوں پرانا حشر دیکھیں

جس کے اندر تاریکی نے

ڈہرے ڈالے ہیں

(مکمل)

کوئی آتا نہیں، جاتا نہیں ہے

اور اس سے غلط چلا ہے
 اور نے کا پچہ ہاتھوں سے کوئی
 راکھ کھودے
 شراب، کیا جب کوئی چاہے
 کوئی بے ہمیں تک سو رہا ہے
 کئے، بھاری یہ لے کے چلے گا

(آخری کوشش)

اسے پھونے کی خواہش تھی کہ تو
 سہ جاتی ہے وہ اپنے ہی اندر
 وہ اندر میں میں سموں کی کمی ہے
 نہ کوئی کی کوئی اجنا ہے
 تھے لیکن چاہے وہ
 لپک کر آنے والی ہے
 ہری بھلی بھلی ہے

(اسرار)

شاعر نے داخل اور خارج، اندر اور باہر دونوں ممالکوں سے کا کائناتی شعور (cosmic consciousness) تک رسائی حاصل کی ہے اور ایک مرکزہ میں جا کر اسے جو تک
 ایک تھکے جا جو دماغ ہے اور بھلی رہا ہے۔ یہ وہ مقام ہے جہاں زمان و مکان کا وجود ہونے
 جاتا۔ اس مقام کی جان کبریٰ لطیفیات میں ایک تصویر کی ہے۔ شاعر اپنے آپ کو
 اس زندگی کے درمیان رہتا ہے تو ایک انوکھے احساس میں بھیک جاتا ہے۔ بھلی بھری دنیا کی
 نظموں کا شاعر اس آگے سے گزر کر عالم موجود کی طرف لوٹتا ہے تو اس کے پاس یہ آواز
 موجود اور وجود کی قلب ماریت کا سبب بنتا ہے۔ سبب کی دنیا میں یہی انسانی تھکر کی اجنا ہے

سج ہوئی تو تھیل کے اک کھ سے میں نے
 پوچھ لیا کیا حال ہے بھائی،
 کیسے تو نے رات جانی،
 چپ تھا، صحت سے بگڑ نہ ہو،
 میں نے دیکھا تھیل کے قدموں میں اس کی
 ساری دولت

مظہر، سانی چڑی تھی
 چڑ پگھسی ساری گھسیں خاک ہوئی تھیں!!

(ساری گھسیں خاک ہوئی تھیں)

اور اب ہم اک ایسے
 گھبرے عالم میں مسموت چڑے ہیں
 جہاں گڑنے والی کوئی چیز نہیں ہے
 وقت کے اندر
 دھند کی چھٹی نصب ہوئی ہیں
 اور ہم دھند کے نیچے کو
 ان اپنی دھندلی آنکھوں سے
 کبھی دھند دھند دھند
 دیکھ رہے ہیں!
 اپنے "ہولے" کے بے انت لہروں میں
 اُسکے گڑے ہیں!

(اُسکے گڑے ہیں)

(16)

وہ اب
 ہاتھ پیرا کر اچھڑ رہے
 ہے اور کھانا بھی نہیں کھاتا
 کوئی کھانے کے لیے اس سے نہیں کھاتا
 تو نے تو کئے ہوئے ہیں
 کہاں کے ہے اس لئے کھانا
 تو انکا ہم کھاتے ہیں
 مگر یہ کہہ کر نہیں کھاتے
 ہمارے پاس اب رکھا ہی کیا ہے
 کھانا ہمارا یہ تو ہے اب وہ وہی
 مگر وہ ہمارے ہاتھوں سے
 کھاتے ہیں کیسے تو ہمیں ہے!!

(پہلے نچے کے اٹھو)

روشنی کی شعلہ ہوا کی باتوں
 رت چکے تھے ہم، مگر
 جاتے تھے کھانے سے کھانا
 سو تیری
 گھر میں ہم آگے ہیں، تیری!
 تو مگر خاموشیوں میں ہے
 بات کیوں کرتی نہیں!!

(روشنی سے بات کر کے اٹھو)

ہوا

بادل کو چھاتی سے لگائے پھر رہی ہے
اسے وہ تھکیاں دیتے، بگی
جہولہ جھلاتی ہے
کبھی لوری سناتی ہے
مگر بادل کو جانے کیا ہوا ہے
کہ وہ اک بار بس روتا ہی جاتا ہے!

(ہوا کو کیا خبر!)

وزیر آفاق نے تہذیبی، ثقافتی، سماجی اور علمی آفاق کا مطالعہ کر رکھا ہے۔ اس مطالعے کی حدود فلسفہ، نفسیات، علم الانسان، موجودیت، مظہریت، لسانیات، طویات اور کلیات تک پھیلی ہوئی ہیں۔ وزیر آفاق نے اس مطالعے کو اپنی ذات کا جزو بنا لیا ہے اور اس سے انہیں کائناتی شعور حاصل ہوا ہے جس کے ثوابہ ان نظموں میں جا بجا نظر آتے ہیں۔ وزیر آفاق کے ہاں ہوا یہ ہے کہ جب تھکتی ممل کے دوران ذات کی کڑکی نکلی ہے تو یہ کائناتی شعور شعری داخلی ساخت کا جزو بن کر ظاہر ہوا ہے اور نظم کے پیکر میں تصور نے جہولہ کا باعث بنا ہے۔ ”یہاں“، ”پھر اک دن“ اور ”پلو، ہم نوٹ جاتے ہیں“ جیسی نظموں میں ذات اور کائنات کی سلولوں سے بھرے سفر کی داستان بھری ہوئی ہے۔ نظم کی روح سے نکال کر قاری کو کہاں سے کہاں پہنچا دیتا ہے۔ ان نظموں کے مطالعہ سے محسوس کرتا ہوں کہ شاعر آفاقیت کے در پر کیسے پہنچا؟ اس خم و در سفر کے دوران اس کا گزر کہاں کہاں سے ہوا اور راستے میں اس نے کیا کیا دیکھا! یہ سفر اپنی سرشت میں حدود و قیود سے ماہوا اور انجما ہے۔ یہاں یہ بات لاش نظر دینی چاہیے کہ شاعر اپنے اندر زمین کے سارے رشتوں کی گریہ سمیٹ کر ان دیکھے جہانوں کی طرف گیا ہے۔ دراصل یہ سفر حیات اور کائنات

کی وسعت، وجود کی گورنہ سروریت کو بے نقاب کرنے کے لیے عمل میں آیا ہے۔ اقبال نے کہا تھا 'ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں۔ جدید اور باطنی علم میں اقبال اور مجید احمد کے بعد ستاروں سے آگے کا یہ سطر وزیر آفانے کا ہے اور اس سطر کے حاصلات کو اس اعجاز سے شعری بیکیوں میں اظہار ہے کہ اشیاء اور مظاہر بذات خود استعارے اور علامتیں بن گئے ہیں۔ اس لیے اس سطر کی خصوصیات اور باہرہ الطبیعیات مرتب کرنا آسان نہیں اچھے نہیں ہے کہ اب بھی اردو تنقید اپنے تقاضات کا پورا اہار سے کی، وزیر آفانہ کا نام جدید اردو علم کے سب سے اول کے شعراء میں شامل ہوگا۔ وزیر آفانہ کی نظموں سے یہ چند نکلے دیجئے

پھر آگ دن

وہ کئے ہنگام سے

خوشبو کی طرح تھا

پہاڑی کے قریں جا کر دکھا

جس کے ہونے پر

بال و ہوا کا

آگ نکلاں تک جلی نہیں ہائی نہیں تھی

(پھر آگ دن --)

"یہاں" مگر پھر خدایا جانے

کہاں سے آیا

اور ایسے آیا کہ اب "نہیں" کا

کہنے کا بھی نام و نشان نہیں ہے

فقا "یہاں" کی ہر گزوں
کے سلسلے ہیں

پہاڑ چادوں طرف آگے ہیں
پتہ، بھولے، جنگ، پتے
ہوہ میں پھرنگے دستے ہیں

(یہاں)

پہاڑ اب لوٹ جاتے ہیں
کہاں تک ہم ستوں کے سہارے
اس بجے یا تھم ایس میں
پلٹے رہیں گے
کہاں ہم دھوڑ پائیں گے
اسے، جس کے نشانی پا
آگڑے فرش کی ریتوں کے اندر
جا چکے ہیں

لغزانی

جو کب کے ہمت چکے ہیں!!

(پہاڑ ہم لوٹ جاتے ہیں)

علم "یہاں" میں دربر آگے نے انسانی زندگی کے ارتقائی سفر کا سراک لگائی و
مکملی تاہم میں کیا ہے۔ علم "تو اسے طیرا" اور "کیوں دکھ اوزو کے" سے معاشرتی اور
توہی زندگی کی مختلف سطحوں کا شعور بھگتا ہے

یہاں کی جسی آسمانوں میں

وہ موج لڑا ہے

کوئی جہت پر نہیں جاتا

تک سے رابطہ تو ہے

(۱۵۱۷ء شہزاد)

تم دکھ کی مٹی کو زوی بھگتو

بگنوں والی چیز ہی چن کر

آسمان کو دکھو

(کیوں دکھ اڑھ کے۔۔)

تم بھی۔۔ آسمان کو دکھو ۱۱

"جوت" "کوئی نہیں تھا" اور "جوت شیراز" میں وزیر آغا نے موت کی

سودھی، اس کی بے رنگی اور سٹاک کی کو ابا کر کیا ہے۔ نظم "جوت" میں ہستی کو زمین کے

ہمالے سے انسانی زندگی کی علامت دکھایا ہے اور پھر انسانی وجود کی سرحدوں پر موت کے

مسئلے پیش کرتے ہوئے سائے دکھائے گئے ہیں۔ شاعر کا یہ احساس ہے کہ موت ابھی انسانی

کی شکل میں ظاہر ہوگی اور انسانی بدن میں پہلے کاڑھے گی۔ نظم کے آخر میں شاعر نے

موت کی اپنے انسانی کا اندازک سچا کی صورت میں کیا ہے۔ اور اس کو زندگی کی آخری آواز

قرار دیا ہے۔ اس سے انسانی زندگی میں دکھ کی بھنگی کا اظہار ہوتا ہے۔ "جوت" میں شاعر

زندگی کے آغاز اور انجام کو کائناتی تاجر میں گرفت میں لیتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔

نظم "کار سے آرزو" کی یہ لائنیں ملاحظہ کریں:

نہنے کو اک یا کھلوں دے کر

اس کی جگہوں پر خسرے آنسو کو

دائیں جہاں بچے دلچے کے ہنسا

ان لوگوں میں شاعر نے جس احساس کی ترجمانی کی ہے۔ علم "بے انت" میں یہ احساس اور
 ایسا عقلی اور جمالیاتی عمل سے گزرا کر ایک آفاق گیر تجربے میں داخل کیا ہے۔
 "اور میں پھر سے" اس شعری مجموعے کی ایک منفرد نظم ہے۔ اس میں شاعر نے
 خود سے باہر نکل کر نہ صرف اپنے آپ کو دیکھا ہے بلکہ بدن اور روح، زندگی اور موت،
 وجود اور عدم کے انتہائی نازک اور لطیف رشتوں کا اوداک بھی کیا ہے۔ یہ انسان اپنے
 وجود کو خود سے باہر نکل کر دیکھ سکے تو اسے وہ تجربہ حاصل ہوتا ہے جسے Anstrol
 Feeling کہا گیا ہے۔

علم "بہت" اور لگائی رہی ٹوٹنے "انفرادی توبہ کی طالب ہے۔ علم دیکھے

دھوپ

آنے میں بہت دیر لگادی ٹوٹنے

اب سواکت جرا کرنے کو پھا کوئی نہیں

نہ پرے ہی سلامت ہیں کہ اذتے، اذکر

تیری کرلوں میں بہاتے، گاتے

بھول تک باقی نہیں ہیں

کہ اذتے ہوئے شہم کے تجھوں کو

تھیلی پہ سجا کر لاتے

تیری کرلوں سے یہ کہتے، ایسے بھو کر دیکھو

ایسے گتار بھا، آقا

تو ہوتے تو تیری نرم شعاعوں کے جنگ

اپنے ماتھے پہ بہاتے

تیری بجا کرتے

دردِ غم
 گروہ میں تو آپ سب کی باتیں ہیں نکلا
 جی سب میں بگھل چکے ہیں، مٹی بگھل چکی
 دھوپ آنے میں بہت دیر لگانی پڑے گی؟
 وہ ایک بڑا سردا غم ہے۔ میں اس سردی کی گروہ کشی کا آغاز ان سوالوں سے کروں گا جو
 دھوپ لیا ہے؟ یہ کس غم سے آئی ہے اور کب تک رہے گی؟ اس نے آنے میں دیر
 کیوں کر لی؟

ان غم میں دھوپ کرہوں، لڑتے ہوئے شہنم کے گلہنوں اور نرم شعاعوں کے
 بجلی کی صورت میں آئی ہے۔ اس غم کو اس مجھے کی "لڑتی کوئی نئے پانوں کی"
 کی ان باتوں کے ساتھ کہ پڑھیں تو دھوپ کی بڑا سردیت کھٹا شروع ہو جاتی ہے۔

لڑتی کوئی نئے پانوں کی
 تیرے کانوں کے اندر آئی ہے
 ہزاروں باروں کے
 تھوڑے جھک گئے ہیں
 پہلے غولن ڈا آئی پندے
 تیرے ہاتھوں طرف اڑتے گئے ہیں
 طہر کی دست لے لیتے ہیں
 تیرا ساکت کرنے آئے ہیں
 دو غولن ہیں، ڈوسٹور میں گیا ہے

(لڑتی کوئی نئے پانوں کی)

ڈوسٹور غم میں "دھوپ" فرقان کا ایک لہو ہے جو آسمان سے شاعر کے ہاتھ میں آ رہا ہے۔

اس کے آنے سے شاعر کی قلب باریت ہو جاتی ہے۔ علم کی قرأت سے یہ بار بھی معلوم ہوتا ہے کہ زندگی کی ایک طویل مسافت طے کرنے کے بعد cosmic consciousness کو self consciousness کا حصہ بنا کر زندگی گزارنا آسان نہیں ہے۔ اب اس امر اور کونکلیت کا باطن بنا کر ہی پیش کیا جاسکتا ہے۔

قرأت کے دوران قاری علم کے آخری کڑے میں پہنچتا ہے تو اداسی کا ایک ہواں اس کو اپنی پیٹ میں لے لیتا ہے۔ احوال کا سوتی بیڑا اور توانی کا ہلزام اس اداسی کو اور زیادہ شوخ اور گہرا کر دیتا ہے۔ اس علم میں پندے، پھول اور جڑ شاعر کی تخلیقیت کے مظہر ہیں اور علم "کرزتی کوچ نیلے پائوں کی" سے اس کی شہادت بھی ملتی ہے۔ اس علم میں ایک سرمدی آواز شاعر کے کانوں میں آ کر پہنچی ہے تو جڑ اس پر جھک جاتے ہیں اور پندے اس کے چاروں طرف اُڑنے لگتے ہیں۔ میرا یہ احساس ہے کہ ذریعہ مطالعہ علم میں "دھوپ" اور "سرزدتی کوچ نیلے پائوں کی" میں "کوچ" ایک ہی کیفیت کے دو مختلف نام ہیں۔ اگر دھوپ دیر نہ کرتی، پہلے آجاتی تو یہ پندے، پھول اور جڑ جو کچھ کرنے کے آئندہ بندھے، اس سے زندگی ایک انوکھی گلگتی شکل میں ظاہر ہوتی!

شاعر انتظار میں تھا کہ دھوپ آئے اور وہ اس موجودگی "موجودگی" میں زندگی کرے لیکن خدا جانے اس نے دیر کیوں کر دی۔ بہر حال ایک بات تو معلوم ہے کہ عرفان ذات خدا کی دین ہے؟ دھوپ کے دیر سے آنے کی گواہی "آخری کوشش" کے ان مصرعوں سے بھی ملتی ہے:

کوئی آتا نہیں، جاتا نہیں ہے

اللہ دیر سے غنڈا چڑا ہے

ذریعہ مطالعہ علم کا یہ مصرع "مگر ہم بھی تو آپ برف کی تاشیں ہیں غنڈا" متذکرہ بالا مصرعوں کی مستعدگی میں اپنی داخلی مسافت کو زیادہ شدت سے ظاہر کرتا ہے۔ غنڈا اللہ اللہ اللہ برف کی تاشیں

ایک دوسرے کے مطالعے آتے ہیں تو انسان کو کائنات کے رشتوں کی گہری سمجھ شروٹ ہو جاتی ہے اور ہند بہ ہند جلتے رہتے ہیں۔ کیونکہ دُور آگاہی کے ہیں ایک شعری کلام کی تخلیق میں ہے اس لیے میرا یہ خیال ہے کہ ان کی نظموں کو inter-connectivity کے ذریعے ہی بہتر طور پر سمجھا جاسکتا ہے۔

اب یہ سوال کہ دھوپ کب تک رہے گی۔ مرقان کا لہو جو اپنی کن میں غیر مرنی اور بے وقت ہوتا ہے جسے ایک لہو کے لیے ہی آتا ہے۔ لیکن میرا یہ احساس ہے کہ زہر مطہر علم کے ساحل میں یہ شاعری داخلیت کا جزو بن کر تازہ چلتی اشکال میں ظاہر ہوتا رہے گا۔ نام علم کی زہری سُلج سے جہاں ایک طرف کائنات کی demystification کے عمل کا انکشاف ہوتا ہے وہاں کائنات کے انہدام پذیر ہونے کی جہت بھی نمایاں ہوتی ہے اور یہ شعری جہت دُور آگاہی کی بہت سی نظموں سے مترشح ہوتی ہے۔ اس طرح کی کتب آمیز اور سر آفرین نظم ہے اور علم میں کم ہی پڑھنے کو ملتی ہے۔

اس علم کے علاوہ علم "شہر میں آتے ہی" میں دھوپ کی علامت ایک مختلف ناظر میں کھلتی ہوئی ہے۔ یہ اپنے آپ کو ایک لڑا دینے والی "سوجودگی" میں آشکار کرتی، موت میں صلب ہوتی دکھائی دیتی ہے:

بھر جب دھوپ

مخڑروں سے نیچے آتی ہے

سرخ عالی چھینٹوں میں

بنے گئی ہے

شام کی آنکھیں، روشنیوں سے

چھینے والی روشنیوں سے

بھر جاتی ہیں۔

سائنس اکتزلے لگتی ہے!!

(شعر میں آتے ہی)

علم "گوار سے انزوا" میں دھوپ، ہالے کی شرکیل دھوپ کی صورت میں
سورج ہوئی ہے۔ اس علم میں دھوپ اپنی سائنس میں تو ظہور کے ایک منظر کے طور پر ہی
رہے آپ کو رہنا کرتی ہے لیکن شاعر اپنے میدان طبعی کے ہامت، اس سے کام کر کے
پاکستان کے عمل سے گزارتا ہوا اکتزلے رہا ہے۔

میزبان آقا کے لیے کبھی کبھی نظموں میں بزرگ آقا نے ایک انوکھے انداز میں
دروازت کیا ہے۔ علم "خاک" اور "چلو، اک بار بھر ہم" میں خاک کی علامت میزبان آقا کے
لیے استعمال ہوئی ہے۔ علم "خاک" سے شاعر کے وجود لگتی شعور کی نگاہی ہوئی ہے۔
اس کی یہ باتیں دیکھیے

کچھ دیکھو جگہ سہانے لگے ہیں

سارے سرنگوں ہیں

اس کی بوندوں میں داخل کر

سوچے کی آواز کھلی گلیوں پر گرتے

اک سے نپ نپ پتے

خاک ہے

غرضوں کی تہہ بنے لگے ہیں

خاک، مٹی ہاں کو پیوں سے بچھ کر

پہنچتی ہے کون ہو تم؟

(خاک)

علم "آخری بات" میں شاعر نے اپنی ہم سفر کی علامت کے دوران آخری لحاظ

کی کہہ جس مطلب میں ہزیمت کی ہے اور کمال ہزیمت سے لیں گزرا کر ہی کے جاننے
 سے چھٹی میں کو ہی مختلف کر دیا ہے

تو ذرا ب کے خاک پہ بنا تھا جس کو بات
 پہنچی ہوئی تھی اتنی کہ کچھ بھی نہ بن سکی
 بچے سے نکل دیکھ سے بھی کبھی تھی رہی
 شہر کی ایک بند ہی تھی ، مگر نہیں
 تم بیلے کی توں کا تھی ، مگر نہیں
 لڑے تے ب کہ چھ وہ پہ کا پلے گے
 انا تو ہم کو یاد ہے ، پھر کچھ پائیں ا

علم سے علم میں رہائی کی یہ باتیں بھی ہزیمت آگاہ کی اہلی شاعرانہ حیرت

ہر حال میں

یہ کہیں تھی فرماں کہ تو نے بات کے
 نظر اٹھا کے اسے ایک بار دیکھا تھا
 حصار صبح کا غم تھا کہ تیری بکوں نے
 اسے سنبھال لیا تھا کمال تھی سے
 بگرنے خاک پہ کرتا تو خاک ہو جاتا

(میرے علم میں رہائی)

”ہنگلی بھر روٹھی“ کی آخری علم ”تو آزاد کیسے ہوئی“ کی پہلی نظموں میں
 جنہوں نے پہلی علم ”علم“ کی نظموں کے انداز پر ہوئی ہے، جس کا تذکرہ اس علموں نے
 آغاز میں کیا گیا ہے۔ اس علم میں سوں آگاہ کی ”سدا“ آزاد کی تقریبی ہند ہی گزرا تھا
 علم ہوئی ہوئی ہزیمت کے نظموں میں کرتی سے تو شاعر عالم حیرت میں ڈوب جاتا ہے

صلیہ آقا کے لیے نظمیں مکی یہ نظمیں وزیر آقا کی بااختتام نہت کا مشرب نظمیں ہیں اور ساتھ ہی وزیر آقا کے لیے صلیہ آقا کی "خاک" میں ہاشیہ، چنگاری کا اظہار بھی آجنگی بجز روشنی کی نظموں کے texture میں ارضیت اور آقاہیت کا لمس پہری طرح رچا ہوا ہے۔ شاعر نے نظموں کے شعور کے دریاں میں جس احساس اور شعور کو گرفت میں لینے کی کوشش کی ہے، اس میں اندر اور باہر، داخل اور خارج، موجود اور باور، وجود اور عدم باہم آمیز ہو کر یک جان ہو گئے ہیں۔

یہ نظمیں ایک مخصوص فہمی اور احساسی نظام کی زائید ہونے کے ناطے وزیر آقا کے ہاں ایک شعری نظام کی موجودگی پر سرور کرتی ہیں اور اپنے structure کے اعتبار سے بھی مرتب اور نظم سے الگ ہیں۔ ان میں شعری مواد structuring کے عمل سے گزار کر شکل کی سطح پر آجاتا ہے اور یہ وزیر آقا کی نظم کا ایک نمایاں وصف ہے۔ اس شعری مجموعے کی زبان زیادہ تر سبک اور بھلے ہوگاتے سبک کے بغیر وجود میں آئی ہے۔ دونوں صورتوں میں لفظ کو از سر نو لفظ کیا گیا ہے۔ لیکن اسکا کی موجودگی اور عدم موجودگی سے شعری تجربے کی تاثیر میں فرق پیدا ہے۔ سبک کی صورت میں تجربے کی تسلسل، احساس کی تکمیل کے ذریعے ہوتی ہے جس سے تجربے کی متاثراتی قوت میں اضافہ ہوا ہے۔ سبک کے بغیر احساس "روشنی" کے گولے کی طرح پھلتا ہے لیکن اس کی تب و تاب باہر عالم نہیں رہتی۔

ان نظموں میں ہوا، ہول، موسم، صوب، سندر، پندے، پھول، چل، شہنم، دھوا، پہاڑ، آواز، جھت، مکان، خوشبو، دھل، منڈیر، سدرے، گھاس، راکھ، کولے، شراب، آئینہ، قصہ، جوہر، اور آواز کو جس طرح شعری تجربے کا جزو بنایا گیا ہے اس سے ان اشیاء اور مظاہر نے ایک نیا روپ و حاد لیا ہے۔ اب آزاد نظم کے بیکر میں شاعری اس صورت میں ہی رہا ہو سکتی ہے کہ شاعر بالوں اشیاء اور بیروز کے دیکھے ہوئے مظاہر کو نظم میں لے

اور سے آپ کر سکتا
 جو یہ اور نظم میں وزیر آغا نے اپنا تخلیقی ماحول خود دریافت کیا ہے۔ اگرچہ اس
 سے مراد تجزیہ نہیں ہے بلکہ اس کی آغوش کی شاعری میں بھی ملتا ہے لیکن وزیر آغا
 کے ہاں اس تجزیہ کی ترقی زیادہ اچھی کے ساتھ ہوئی ہے۔ جب تک شاعری وزیر آغا کے
 تخلیقی تجربے کے ساتھ آکر اپنا اثبات نہیں کر پاتا، شاعر کے تخلیقی مدار میں داخل نہیں ہو
 سکتا اور نہ ہی اس احساس کی تہ تک پہنچ سکتا ہے جو ان نظموں کی نئی ہیئتیں تخلیق کا سبب بنا
 ہے۔ ان نظموں سے وزیر آغا کا ایک یا شعری تشخص قائم ہوتا ہے اور ان کا یہ شعری تجربہ
 نئے علم نگاروں کے لیے ایک نکتہ کی حیثیت رکھتا ہے۔

•••••

جنت کی تلاش کا تجزیاتی مطالعہ

مہم گل کاٹنا، بلاشبہ ایسے ناول نگاروں کی صف میں آتا ہے جو روایت کے نام لہر غلوں میں بندھنے کی بجائے نکل کے زور پر نئے امکانات دریافت کرتے دکھائی دیتے ہیں اور فرد کو، شعور ذات، عرفان کائنات اور ادراک نفس کے سلسلے میں ارتقا اور کائنات سے رابطے کی اہمیت کا احساس دلاتے ہیں۔

ان کے ناول "جنت کی سماں" کو ان کی دیگر تخلیقات کے مقابلے میں اہمیت اہمیت حاصل ہے۔ اس کا مرکزی خیال، شعور ذات اور عرفان کائنات ہے۔ جس کی حوالہ بطور کے اقرار اور ارتقا سے رابطے میں پیشہ ہیں۔ مجموعی طور پر، ناول "جنت کی سماں" اہمیت اور اس کے لوازمات کی سماں کا استعارہ ہے۔ جس کا سربہت حد تک، خدائی لوازمات کے بغیر، اپنے انجام کو نہیں پہنچ پاتا۔

مصنف اسے بے گنہ ادعا کا سزا قرار دیتا ہے۔ (۱) لیکن حقیقت میں یہ گناہ عیب اور حقیقی خوشی کی علامت ہے۔ جس کی خاطر، مصنف کو، بہت سے مقامات پر سے گزرتا چلا جو داخلی اور خدائی، برہنہ اعتبار سے فلسفیانہ نقطہ نظر میں غلوں دکھائی دیتے کے باوجود بہت حقیقی اور اصلیت سے بھرپور ہے۔

"جنت کی سماں" کا یہ سزا، سزا کے آدک ہنگ سے شروع ہوتا ہے مختلف مقامات پر چلا جانے کے بعد، نجات کے سربہنگ، ہنگ پھاڑوں اور ہزہ زاروں میں اچھا جمیل کو پہنچتا ہے۔ (۲) تخلیق کے اس سفر میں مرکزی اور منطقی کرداروں کے ساتھ ساتھ ظہری اور شہابیاتی اسلوب بھی اہم کردار ادا کرتا ہے۔

صنف ہال کے آغاز میں ہماری طاقت اپنے مرکزی و مثالی کردار اجمل سے
 کر رہی ہے اور شعوری طور پر اس کردار کے حوالے سے اپنے مکالمات تخلیق کرتا ہے جو
 ہال کے آغاز میں تو گارجن کو اپنے صدار میں لے لیتے ہیں لیکن بعد ازاں وہیم کا مشاہدہ
 اور آنسو آنے والے حالات و واقعات ذکورہ لیبل کی تکذیب کرتے ہوئے گارجن کو
 اس کردار کے سر سے آزاد کرتے ہیں اور ہال کو اپنے مثبت انداز فکر کی بدولت حتمی شکل
 عطا کرتے ہیں۔

صنف اپنے مثالی کردار "اجمل" کو غیر معمولی ثابت کرنے کے لیے دیگر
 کرداروں کو اس کے مقابلے میں معمولی ثابت کرتا ہے اور شعوری طور پر ایسی کیفیت پیدا کر
 رہتا ہے کہ جس سے دیگر مرکزی اور ضمنی کردار اس سے متاثر ہوتے چلے جاتے ہیں۔ خاص
 طور پر ہال کے آغاز ہی میں یہ مثالی کردار ایسے مکالمات اپنی زبان سے ادا کرتا ہے کہ
 جس سے اس کے غیر معمولی ہونے کا احساس شدید ہو جاتا ہے۔

ہال کے طور پر ماسمو کے ڈاک ہنگے میں تنظیم وہیم کے ساتھ جب یہ بڑائی
 کے ڈاک ہنگے میں پہنچتی ہے تو وہیم اس سے یہ سوال کرتا ہے کہ کیا وہ اس کے ساتھ آئیے
 آئے، گھبرائی نہیں۔ اس پر اجمل کا جواب نفی میں سن کر وہ اس سے کہتا ہے کہ
 "آپ ایک گزردہ گری اور میں ایک طاقت ور مرد۔" (۳)

جو معمولی طور پر ہمارے روایتی معاشرے کا عکاس بن کر سامنے آتا ہے۔ لیکن اس بات کا
 رد عمل انتہائی حیران کن طور پر دکھانے والا ثابت ہوتا ہے جب وہ یہ کہتی ہے کہ
 "گو یا آپ کو گھنٹا ہے کہ آپ میری عزت لوٹ سکتے ہیں۔ ہرگز
 نہیں، آپ طاقت کے ذریعے شاید ایسا کر سکتے ہوں لیکن جس
 حرکت میں میری مرضی شامل نہیں اسے آپ ہرگز مکمل نہیں کر سکتے،
 ایک طرف کارروائی سے میرا کچھ نہیں بگڑتا۔" (۴)

کار نہیں، اصل کی اس بات پر عمل ان ہوتے ہوئے اس میں دل نہیں لینا شروع کر دیتے ہیں اور اس کردار کی تہ تک پہنچنے کے لیے مصنف کے ساتھ ساتھ سفر کی کیفیت میں رہتے ہیں۔ مجموعی طور پر شعوری و لاشعوری طور پر مذکورہ بالا کردار کی کیفیت کو تسلیم کر لینے کے بعد اس سے بہت حد تک متاثر ہو جاتے ہیں۔ لیکن ماسمو کے ریٹ اس میں چار دن گزرنے کے بعد، اچانک منظر بدلنے لگتا ہے اور بخار میں مبتلا اس غیر معمولی لڑکی کے ماتھے کا بوسا لینے پر وہ کراچی جانے کا حتمی فیصلہ کر لیتی ہے۔

یہاں تک تو اصل اپنے حب و فریب کردار کا ایک رخ معلوم ہوتی ہے۔ لیکن نئی دن کے بعد جب وہیم کراچی کے ہوٹل سے اس سے فون پر براہ راست بات کرتا ہے تو یہ اسے اپنے گھر غمیرنے کی دولت دیتی ہے اور اس سلسلے میں اپنی ذاتی گاڑی بھیجتی ہے۔ ہاں سے اس کردار کا دوسرا رخ شروع ہو جاتا ہے اور ہم دیکھتے ہیں کہ وہ ان میں لیتے ہوئے اس کا انتظار کرتی ہے اور وہیم سے معافی کرنے کے بعد بیڑی کے تمام فریض سرانجام دیتی ہے۔ (۵)

یہ تمام واقعات قاری کے لیے ایک جگہ کے کی مشیت رکھتے ہیں اور قاری جو اس مثالی کردار سے اس حد تک چمک کا متوجع نہ تھا، اچانک اپنے خیالات بدلنے پر مجبور ہو جاتا ہے اور "انسان" کو اس کے اصلی روپ میں دیکھنے کو تیار ہو جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قاری جو وہیم کے ساتھ داخل کے ساتھ تمام تر سفر میں شریک رہتا ہے اور وہیم کی طرح اپنے مطالبے اور اس کے مکالمات کے نتیجے میں اس کردار کی گہرائیوں تک اترتا جاتا ہے اور جان جاتا ہے کہ اس کردار کا تمام تر اضطراب اس کے گزشتہ تجربات کے عکس رجحانوں کے ساتھ اور نہیں۔

مجموعی طور پر، مصنف کراچی میں اصل کی وہیم سے ملاقات کے بعد اس کی باتوں کی اپنی زبان کی کون شروع کر جاتا ہے اور وہ شعوری طور پر وہیم اور بعض واقعات غمیری

کرداروں سے واقفیت کے وقت اپنے خیالات کا اظہار کر رہی ہے کہ جس سے اس کی
 دماغ میں مثبت کے رد عمل میں بیگانگی محسوس ہو سکے اور اس کی واضح نشان دہی ہوتی
 ہے۔ لیکن اس نشان دہی کے باوجود اس کردار سے گریز کی بجائے اس سے یہی اظہار
 کہ وہاں راحت ہے اور قاری غیر محسوس انداز میں وہیم کی طرح اس میں زندگی سے دلچسپی کا
 مہیاں دیکھنے کا حتمی اظہار ہے۔

مصنف نے ناول کے آغاز میں اپنے اس مثالی کردار کے لیے جو واقعات
 تشکیل دیے ہیں وہ وہیم کی کردار میں آمد کے بعد بظاہر ریت کر گھروندوں کی طرح اظہار
 کرتے ہیں اور اس امر کا احساس شدت اختیار کر جاتا ہے کہ مصنف شعوری طور پر اس کردار
 کی اہمیت کو برقرار رکھنے کے لیے اس کی زبانی ایسے مکالمات ادا کرتا ہے جو بہت حد تک
 طبیعت پر بوجھ کا باعث بنتے ہیں لیکن درحقیقت مصنف جیسے تک پہنچنے کے لیے ایسا ناول
 تشکیل دینے میں مصروف رہا ہے کہ جس کے لیے قاری اور مرکزی کردار وہیم خود کو اپنی طور
 پر تیار کر لیں۔ یہی وجہ ہے کہ اصل ایک ایسے زندگی اور اس کے حقیقت کے ساتھ ساتھ
 رشتوں کے خطوط کا انکار کرتی ہے۔ لیکن دوسرے ہی لمحے وہ ان کی سہاٹی کی بھی سوز
 دکھائی دیتی ہے جو مجموعی طور پر اس کی زندگی کے انکار کے ساتھ اس کے اقرار کی شدت کی
 جانب واضح اشارے چھوڑتے ہیں۔

اس مثالی کردار میں وہیم کے علاوہ "مائی حوا" (۶) "دوڑی خان کی بیوی" (۷)
 تبت کے ریٹ ہاؤس میں مقیم کراچی کا آئی سیٹلسٹ اور اس کی بیوی سلطانہ (۸) ہے
 کردار مجموعی طور پر شکاف پیدا کرتے ہیں اور حتمی طور پر نفل کے ریٹ ہاؤس میں ۹
 اصل کے پانچوں ختم لینے والی چوکیدار کی جینی (۹) اس کردار کو اپنی طور پر جانے تک
 کردار لدا کرتے ہیں اور یہ کردار اس امر کی جانب اپنی توجہ مبذول کر لیتا ہے کہ شعور
 اور عرفان کا نکات کی منازل کا حصول ضروری اجتماع سے فرار میں پیشہ نہیں لگتا

قول کرنے کا نتیجہ ہے۔ (۱۰)

مجموعی طور پر اس قول کے مضمون سے تجزیے سے اس امر کا احساس ہوتا ہے کہ مصنف نے "حیثیت کی عکاسی" کو مشہور ذات اور مکان کا نکات سے تعبیر کیا ہے۔ جس کا سطر کلمات میں آتے ہوئے فرد کے فراء سے باہمی رابطے اور ایک دوسرے کو اس کی خاموشی سمیت قول کے بغیر مکمل نہیں ہے۔ معاف کر دینا کوئی نہ کرنا عبات کا رہاں یہاں ہے اور اس سے گریز کا نتیجہ نفسیاتی مسائل کی صورت میں نکلتا ہے اور فرد در عمل کے طور پر حریت کا تصور ہو کر اجتماع سے دور بھاگتا ہے۔

اصل کی وہی کہ سطر کے درست ہاؤس میں قیام کے دوران وہم کا ہونا لینے کے بعد مکمل ہوتی ہے ہاں اس کی تمام الجھنیں اور سناٹے آئینہ ہو جاتی ہیں جس کی سب سے بڑا کہ احساس گناہ یعنی پشیمانی سے مہارت ہے۔ مجموعی طور پر اس سطر میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ بعض اوقات گناہ یا غلط فعل اتنی نفسیاتی الجھنوں کو جنم دیتے ہیں جتنے مسائل پھرتا ہے اور پشیمانی کا نتیجہ ہوتے ہیں۔ کیا سب سے کہ اصل سطر کے درست ہاؤس میں وہم کو اپنی صحت کے نتیجے میں سچا کے جذبات کے ہاتھوں گھبر ہونے کا باعث بنتی ہے تو گنتی ہے کہ

..... اس نے خود گنتی کر لی تھی اور اسارا غصہ اتر چکا تھا۔ کم

بخت اگا ٹرسار تھا کہ سچ کا انگار بھی نہ کر سکا اور اصل اس میں

سامنا کرنے کی بہت نہ رہی تھی۔ وہ نہ کہہ سکتا تھا کہ میں اسے

معاف کر دیتی، کیونکہ نیت اور فطرت تو ہر مرد کی ایک ہی ہوتی ہے۔

پھر کیا ضرورت ہے کہ میں فریختنے کی عکاسی میں رہتی۔ (۱۱)

مصلوب ہوا انہماں میں 'میرا سارا غصہ اتر چکا تھا' کم بخت — میں اسے معاف

کر دیتی، جیسے فطرت جہاں ایک طرف اس کے پھرتا ہے اور مسلسل پشیمانی کی عکاسی

کرتے ہیں، وہاں بہت گنتے ہیں کہ پہلی ملاقات میں ہارک صورت حال گلاب
 ہونے کی بنا پر وہ جذبات کا سہلی نہ رہتا ہے جس کے رد عمل میں لہر دوسرے فرد سے
 یعنی باخبریت کا اظہار کرتا ہے جو نہ صرف فرد کو اپنی پہچان سے سے ہٹکا کر دیتا ہے بلکہ
 اس کی دماغی ایسے ڈرم لگا دیتے کہ سنا بہار پردوں کی طرح انسان کو اپنے ہونے کا
 احساس دلاتا رہتا ہے اور یوں انسان میاں دوست کی گفتگو میں اضطراب اور غراب
 مسئلہ کا دھند رہتا ہے۔

بھری طور پر یہ کہا جاسکتا ہے کہ ریم گل اپنے ناول "بنت کی عواش" کے لڑکے
 یہ پیغام دینا چاہتے ہیں کہ انسان ہر عمل ہے یہی قرب اسے شعور کی منازل سے ہم کنار
 کرتا ہے۔ لہذا فرد کو فرد سے گریز کی بجائے ایک دوسرے کے قریب رہنے کی نصیحت کو اپنا کر
 کرتے ہیں جس کا نتیجہ وہ انسان کا ذات اور شعور ذات کی صورت میں اخذ کرتے ہیں۔

۰۰۰۰۰۰۰۰۰

حوالہ جات

- ۱۔ ریم گل "بنت کی عواش" (ریپا سے ماخوذ) لاہور، راہور بک ہاؤس، ۲۰۰۳ء
- ۲۔ ایضاً، ص ۱۵
- ۳۔ ایضاً، ص ۲۳
- ۴۔ ایضاً، ص ۲۳
- ۵۔ ایضاً، ص ۱۰۶
- ۶۔ ایضاً، ص ۲۳، ۲۴
- ۷۔ ایضاً، ص ۲۴، ۲۵
- ۸۔ ایضاً، ص ۲۵، ۲۶
- ۹۔ ایضاً، ص ۲۳، ۲۴
- ۱۰۔ ایضاً، ص ۲۳
- ۱۱۔ ایضاً، ص ۲۳

کیمپ ۳۵ - ایک جائزہ

”قید بند“ کی روداد لکھنے کا دستور دنیا کی تقریباً ہر قابل ذکر زبان میں حقوق سے راجح رہا ہے۔ یہ رودادیں زیادہ تر قیدیوں کے روزمرہوں یعنی ”ضمیر کے قیدیوں“ اور ”جنگی قیدیوں“ نے قلم بند کی ہیں۔ جرائم کی سزا پانے والے قیدیوں کی آپ بیتیوں کا نام لکھن کے طور پر اپنا وجود رکھتی ہوں تو ہوں اور حقیقی طور پر ان کا وجود مشکوک لگتا ہے۔ ضمیر کے قیدیوں نے زیادہ تر اپنی سوائے عمریں تحریر کی ہیں اور وہ بھی دوران قید۔ اس کے برعکس جنگی قیدیوں نے آزادی کے بعد قید و بند کی داستانیں رقم کی ہیں یا دوسرے لوگوں نے ان کی روایات کو جمع کیا۔ جنگ کے خاتمے سے سب سے زیادہ سواد جنگ عظیم اول و دوم کے حالات و واقعات پر مشتمل ہے۔ جنگ عظیم کے واقعات اور اس کے دوران قائم کردہ قیدی کیمپوں کی کہانیوں پر تو خیر لاتعداد مضمینیں بھی بن چکی ہیں اور قلم کی دنیا میں تو جنگی قلم کی اصطلاح ایک مستقل صنف کے طور پر اپنی پہچان بھی رکھتی ہے۔ اس طرح دنیا کے ہر جنگی ادب کا ایک معتد بہ حصہ جنگ اور اس سے متعلقہ واقعات پر مشتمل ہے۔

لاصفیر کی جنگی تاریخ میں اب تک ہونے والے واقعات میں ”سٹوٹ گارٹن“ اپنی نوعیت کا ایسا منفرد اور افسوسناک واقعہ ہے جس کے نتیجے کے طور پر پاکستان کے تقریباً ایک لاکھ انسانوں کو بھارت نے قیدی بنا لیا تھا۔ سن انہتر کی پاک بھارت جنگ کے خاتمے سے کئی کتابیں لکھی گئی ہیں جن میں بریگیڈ بر صدیق سالک مرحوم کی تصنیف ”میں نے اٹماک ڈوہے دیکھا“ کافی مشہور ہوئی۔ اسی طرح جنرل امیر عبداللہ خان تھاری کی کتاب ”سٹوٹ مشرقی پاکستان - تصویر کا دوسرا رخ“ ہے جو انہوں نے زیادہ تر اپنے اور

ملاحظہ کرنا ضروری ہے کہ اس کتاب کی نگارش اور اس میں گفتگو کی وجہ سے
 کا ہمارے لیے اس کے لیے عام طور پر اس کی نگارش کے متعلقہ جات کو متعلق
 ہمارے ساتھ رکھنے کا جتن کرنے والے عملوں کی تمام تر کوششوں کے باوجود اس کتاب
 کو غلط اور نام لگانا ضروری ہو کر رہا۔ یہ غلطی ترمیم کے لیے لکھی گئی ہے کہ اس وقت
 میرے پاس نثر کتاب کا تعلق بھی اس موضوع سے ہے۔

کرنل (ر) جنرل حسین کی تصنیف "ایمپ ۲۵" سن ۱۹۷۵ء کی پاک بھارت جنگ
 کے نتیجے میں قید ہونے والے پاکستانی فوجیوں کے ایک گروپ میں گزارے گئے شب و
 روز کی داستان اور وہاں سے فرار ہونے کی کوششوں کی روداد پر مشتمل ہے۔ کرنل صاحب
 کی خود نوشت سوانح "زندہ رہے گا پاکستان" میں اس طرف کافی اشارات اور مہذب مضمون
 ہے مگر یہ مضمون اس بات کا متکافی تھا کہ اس پر ایک مستقل کتاب تصنیف کی جائے۔ لہذا
 دوستوں کے اصرار پر وہ اس فرض سے بھی مہذب برآ ہونے میں کامیاب ہو گئے۔

"ایمپ ۲۵" میں واقعات کی دلچسپ تفصیل کے علاوہ مجھے خصوصیت کے ساتھ
 جن دو باتوں نے جا بجا اپنی طرف توجہ دینا چاہی ان میں سے ایک تو اس سانحے کے اسباب و
 ممال کی تلاش و جستجو کا عمل ہے جو کرنل صاحب نے اپنے ظہور پر اہتمام دینے کی کوشش کی
 ہے۔ کرنل صاحب کی بعض توجیہات تو اتنی گہری اور ڈھونڈی ہیں کہ وہ سیاسی کی بجائے
 سماجیات اور سیاسی عدتہ کر رہے دکھاتے نظر آتے ہیں۔ دوسری اہم بات جو قابل ذکر ہے
 اس کا تعلق ان کے گہرے مشاہدے اور قیدیوں کی نفسیات سے ہے۔ کرنل صاحب نے
 بعض ممال کی توجیہ اور قید کے دوران اپنے ساتھیوں کے رویوں کی توضیح کچھ اس طرح
 سے کی ہے کہ ان کی طرف لکھی کا خاکل ہونا چاہتا ہے۔ دوران مطالعہ میں نے کچھ نئے
 ہی اگر ان نشان زد کئے تھے ان میں سے بغیر کسی ترتیب اور ربط کے (at random)
 کچھ حصے آپ کی خدمت میں پیش کیے جاتے ہیں۔ ملاحظہ کیجئے:

”گمان اور اللہ کی یاد سے سب کے چہروں پر سکون اور دلوں میں اطمینان کی لہر دکھائی دینے لگی۔ لڑائی بھگڑے کم ہو گئے اور ایک دوسرے سے بھدائی بڑھ گئی۔۔۔ انہوں کی یادیں گرم ہو جائیں اور اسپرٹی کا مقابلہ کرنے کی نئی قوت ہم میں پروان چڑھتی۔“

”آڈٹری کے مشران کا خسر ہے کہ وہ ہر چیز کو ہارکے بنی سے دیکھتے ہیں۔ تنقید میں قوی قوی رہتے ہیں۔ ہر موضوع کو بڑھا چڑھا کر بیان کرتے ہیں۔ تجربہ نگاری میں یکتا اور تنگ ذہنوں نکلتے ہیں۔ بحث مباحث میں اتنے کھنک کہ ہار نہیں مانتے۔ جنگ میں گولہ ہاری کبھی ہارکے پر نہیں کرتے بلکہ ان کا خسر ہے کہ پہلے آگے بچھے، اٹنی ہائیں گولے گراتے ہیں۔ پھر ان کو correction سے کر گولے ہارکے پر ہوتے ہیں۔ اس وقت تک ہارکے یا تو آگے بچھے ہو جاتا ہے یا دشمن سے نکلتا۔“

”بہاری جو محمد پر اور میر پر میں قید ہو کر رہ گئے ان کے خاندان مشرقی اور مغربی پاکستان میں بٹ کر رہ گئے۔ ان کو نہ تو اب بنگلہ دیش اپنا شہری مانا ہے اور نہ ہی مغربی پاکستان۔ وہ اصل یہ لوگ قیام پاکستان کے وقت مسلمان شہریوں کی حیثیت سے اسلام کے ہم پر ہجرت کر کے مشرقی اور مغربی پاکستان منتقل ہو گئے۔ اب اس ناگہانی تقسیم کے بعد چونکہ وہ بنگالی نہیں تھے لہذا بنگالی انہیں اپنا شہری نہیں مانتے اور مغربی حصے کے لوگ ان کو مشرقی پاکستان کے شہری گردانتے ہیں۔ چنانچہ ایک معلوم طبقہ کئی سالوں سے پاکستان کے نام پر ہندوستان سے ہجرت کرنے کے بعد اپنی حیثیت کھو بیٹھا ہے اور ظلم کی بجلی میں ڈس رہا ہے۔“

اس مسئلے کا حل لازمی نکلتا ہے۔"

"ہر کیڑوں اور کماڈر اپنی جنگ خود لڑ رہا تھا۔ کسی بھی کیڑوں میں
صلوات ایسے نہ تھے کہ ہتھیار ڈالے جاتے اور نہ ہی ہمارے اس
قدر ادا لے جع کر سکتا تھا کہ ہر کماڈر پر گھسان کی جنگ ہوتی۔ یہ تو
ڈھاکے کے گرد کچھ ویسا سلسلہ چلایا گیا کہ چھاتہ بردار فوج بھی
رکاوٹ کے اتار دی گئی جس نے دائرہ اس قدر تنگ کر دیا کہ پہاڑی
صاحب کے پاس ہتھیار ڈالنے کے سوا کوئی اور چارہ ہی نہ تھا۔"

"ہیپ ڈا" کے بارے میں اگر کنگ صاحب کی اپنی رائے یہاں درج کر دی
جائے تو میرے خیال میں اس سے زیادہ مناسب تعارف اس کتاب کا ممکن نہ ہوگا۔ وہ خود
کہتے ہیں۔ "اس مختصر سی داستان میں ہمیں پاک فوج کے سینئر افسروں کا فوجی انداز سے
گرا ہوا کردار، جنیئر افسروں کی بہادری، جوانوں کی بے جسی اور کزور سوال، پاک
لٹننٹ کا ۲۳ گھنٹے میں بیکار ہونا اور چھوٹے چھوٹے سینئر آموز واقعات کا پتہ چلتا ہے جس
کی روشنی میں ایسے نتائج سامنے آتے ہیں جو ہماری مستقبل کی عسکری تاریخ کے لیے اپنی
سبقت آموز ہیں۔"

یہ کتاب اگرچہ بہت تاخیر سے آئی ہے اور کافی حقائق سے بے مزاجیت کا لہر
بھٹ چکا ہے۔ لیکن یہ ایک ایسے فوجی کی تحریر کردہ زردار ہے جس کا شمار اس وقت کے
جنیئر افسران میں ہوتا ہے اور فیلڈ کے بارے میں ہائی کمانڈ سے زیادہ مستحضر حقائق کا
شاہد ہے۔ اس لیے اس کا ایک ایک حرف اس قابل ہے کہ اسے فور سے پڑھا جائے۔



کچھ نظمیں ایسی ہوتی ہیں - ایک جائزہ

اروب سہیل کا اصل نام سید محمد عبید الحق ہے۔ آپ حکیم سید عبدالرشید کے فرزند اور مجدد ہیں اور ۲۴ جون ۱۹۵۷ء کو موضع چوہدرہ، ضلع موئگیر (پہاڑ) کو پیدا ہوئے۔ ۱۹۳۳ء سے چند برس قبل مولوی عبدالسلام کے مدرسے میں پڑھایا گیا۔ وہیں ہی کی طرف سے پہلے پہلے قرآن شریف ختم کرنے کے بعد انگریزی کی "فرسٹ بک" اور فارسی کی "آداب" اور پہلی کتاب پڑھی اس کے علاوہ نکتہ تفسیر اور دیگر متداول کتب کا مطالعہ بھی کیا اور گلستان و بوستان بھی ختم کر ڈالی۔ یہیں سے انہیں شاعری کا شوق ہوا۔ ثانوی تعلیم کا آغاز ۱۹۳۶ء میں گاؤں کے قریبی شہر شیخوپورہ کے ہائی سکول سے ہوا۔ ۱۹۳۳ء میں "ہائی ڈیگری ہائی سکول" گیا سے بھڑک کا امتحان پاس کیا اور اسی دور میں اپنے گاؤں چوہدرہ سے آٹھ گئے کا ایک قلمی پرچہ "ذوق" نکالا۔ مزید تعلیم کے لیے کلکتہ چلے آئے۔ جلد ہی مگر خوراک میں مداخلت ملازمت مل گئی۔ شام کو "سلی کالج" میں داخلہ لے لیا۔ ۱۹۳۶ء میں دوبارہ کلکتہ آئے اس سے قبل وہی کی ایک فرم میں ملازمت اختیار کر لی تھی۔ یہاں انجمن ترقی پسند مصنفین کے چند وار جلسوں میں ہاتھ دھکی سے شریک ہوتے۔ اس دوران آپ نے بی اے کی ڈگری حاصل کر لی تھی۔

اروب سہیل نے لادھی سفر کا آغاز نثر اور نظم دونوں صنفوں میں طبع آزمائی سے کیا۔ ہندوستان کے مختلف شہروں سے شائع ہونے والے معیاری ادبی جریدوں میں ان کے اہلئے اشاعت پذیر ہونے لگے۔ شروع میں اروب سہیل، ذکی چوہدری کے نام سے لکھتے تھے۔ پھر سہیل اروب اور آخر کو اروب سہیل کے نام سے لکھا گیا کرتے تھے۔ ان کے اہلئے بہت بات کرتے ہوئے بسف نام اپنے مضمون "آئینہ سخن ودی" میں یوں رقم طراز ہوتے ہیں:

”اوسب سبیل سے بھی ہم لوگوں کی توقع پیدا ہو گئی تھی کہ وہ جلد قوی ساج پر ہندو لگاؤ کی حیثیت سے لہاواں بنگہ چلیں گے۔ مگر ان کی انفرادیت میں ضمن کوئی کی صلاحیت زیادہ شدت رکھتی تھی اور وہ جلد ہی ہندو لگاؤ پر حاوی ہو گئی۔ ۱۹۵۴ء کے ان کے ایک افسانہ ”رلم اور قوتہ“ نے ادبی حلقے میں بڑی پذیرائی پائی تھی۔ یہ راجندر سنگھ بیدی، اختر الایمان اور میراجی کی اہمیت میں شائع ہونے والے افسانہ ”خیابان“ سمیٹی میں شائع ہوا تھا اور بیدی نے اس پر اپنی رائے لکھی ہوئے اس طرز کے افسانوں کی طرف افسانہ نگاروں کو توجہ مبذول کرائی تھی۔“ (۱)

گلگت میں قیام کے دوران جس امر، انور، عظیم اور اختر بیدی کی رفاقت نے رشتوں کا پتھر اور دلوں کو آمیز اور اک بٹلا۔ ۱۹۴۳ء کے قند بنگال کے دوران گلگت کی گلیوں اور سڑکوں پر بھوکوں مرنے والوں کی لاشوں، ۱۹۴۶ء کے ہندو مسلم فسادات اور دوسری جنگ عظیم میں جاپان کی گلگت پر بمباری نے ان کے سماجی سیاسی شعور کو کنی رلا دی۔ قیام پاکستان کے بعد مشرقی پاکستان کے ایک چھوٹے شہر سید پور میں ریلوے کی ملازمت کے سبب قیام آباد اس سلسلے میں ایسٹ امام لکھتے ہیں:

”میں گا یہ انتخاب ان کا دانش عمل تھا اس لیے وہ اس نئی سر زمین کی مٹی اور جواہروں سے جلد ہی گہری محبت کرنے لگے تھے۔ ان کی رہائش خیالی اور ہاشور ٹکرو نظر نے ان کی ادبی سرگرمیوں میں دھماکی کی اور ان کے رہا ہوا اس خطے کی زبان (بنگلہ) اور اس کے بولنے اور لکھنے والوں سے گہرے ہوتے گئے۔“ (۲)

۱۹۵۴ء میں سقوط آسام کے نتیجے میں انہیں دوبارہ ہجرت کرنا پڑی۔ بنگال ہجرت قیام پاکستان کے سلسلے میں تھی۔ اس خون کی ہولی میں ان کے حراج کی مراد گلیوں کو کھو کر اسی لیے انہوں نے اپنے ہارے میں ہات کرتے ہوئے مٹی والی ہولی لے

میرا کام ہے۔ میں لکھا ہے۔

"میرا ادبی شعور اسی ماحول کا تربیت یافتہ ہے۔ میں اس تربیت کی بدولت آگے اور آگے بڑھتا چلا گیا۔ اس سفر میں وہ ہجرتوں کے طراب سے بھی گزرنا پڑا۔ پہلا ۱۹۵۷ء میں جب گلگت سے (سواتی) مشرقی پاکستان کے شہر سید پور آیا۔ دوسرا وہ جب ۱۹۷۳ء میں سقوطِ احسا کا کے نتیجے میں کراچی آیا۔ اس تمام عرصے میں میرا شعور و آگے میری پشت چارو رہی جس نے مجھے ہر قسم کے بھید بھاد (فروقِ وحدت) سے دور رکھا اور مجھ میں آفاقی مزاج کی پرورش

کی۔" (۳)

رہنے کی عادت سے رجحانِ مزمن کے بعد بحیثیت ایڈیٹر ماہنامہ "قومی زبان" انجمن ترقی اردو کراچی (پاکستان) سے منسلک ہونے۔ مشرقی پاکستان کے المیہ پر ان کا شعری مجموعہ "انگور کا حرف" شہپ چکا ہے اس بارے میں ڈاکٹر رشید امجد لکھتے ہیں:

"ادب سہیل کی یہ نظمیں ایک نمکت کے بننے اور دولت ہونے کے درمیانی عرصے میں تخلیق ہوئی ہیں۔ اس نمکت کا وجود میں آنا جہاں ایک بڑے خواب کی تکمیل تھا وہاں اس کا دولت ہونا صرف ایک بظرفانی تقسیم کے طبع و طبع ہونے تک محدود نہیں بلکہ ایک خواب اور آدرش کے کرج کرک ہونے سے بھی عبارت ہے۔" (۴)

ادب سہیل کی یہ نظمیں ان کے ذاتی مشاہدے تک محدود نہیں ہیں بلکہ فکری، لسانی اور سماجی سطح پر ایک نوسے کی حیثیت رکھتی ہیں جو شعرِ آشوب میں ڈھلتا ہے۔ تاریخی واقعات ہیں تو قوموں کی فحیر و تخریب میں اہم کردار ادا کرتے ہیں لیکن بعض سطحوں پر دولت مگر ایسے ہیں کہ ان کا تجزیہ مگرے سیاسی اور سماجی شعور کے ساتھ کیا جائے۔ ادب سہیل اس تمام عرصے میں گروہی و لسانی اور مذہبی منافرت میں طوٹ ہوئے بغیر روشن خیال اور ترقی پسند مصنف کی طرح انسان دوستی اور مقامی سطح سے لے کر عالمی سطح تک پھالی

ہارے اور امن کی لٹا کے تھی رہے ہیں۔ انکو رشید احمد لکھتے ہیں:
 "یہ کسی مورخ کی تاریخ نہیں ایک شاعر کی رو دا ہے۔ لیکن کئی
 جگہوں سے زیادہ مستر، درست اور جوشیل ایک بڑی شاعری
 بھی۔" (۵)

اوپر سہیل ایک ایسا ماہر ہے جس نے نہ صرف اوپ بلکہ فنون لطیفہ کی دیگر
 فنون کو بھی زیر ملاحظہ رکھا ہے۔ انہوں نے "علم زمانہ بھی سہیل گزرا" منکوم خود نوشت
 لکھی۔ انہوں نے فریض بھی لکھی۔ اوپ سال بہ سال کے عنوان سے پاکستانی اوپ کا
 جائزہ لکھا جوتی وی پر پیش کیا گیا۔ ان پر ایلم۔ اسے کا مقالہ بعنوان "اوپ سہیل۔ ایک
 مطالعہ" فریضہ بریلی نے سندھ یونیورسٹی جام شہد میں پیش کیا۔ دوسرا مقالہ "اوپ سہیل
 میں اور شخصیت" بہاد ظہیر خان شعبہ اردو جامعہ گراچی نے لکھا۔ موسیقی ان کی شخصیتوں ہے
 اس سلسلہ میں پاکستان کے تمام موثر ادبی جرناڈ میں ان کے مضامین اشاعت پا رہے
 رہے۔ ان ضمن میں پاکستان ٹیلی ویژن کے لیے "جان سین" کے لیے ریسرچ کی۔
 لی وی کے لیے بہت سے نئے لکھے جو مشہور ٹی وی کاروں نے گائے۔ ریڈیو پاکستان راولپنڈی
 کے لیے ایک سال تک ایک ہفتہ وار پروگرام بعنوان "سارا کہتے ہیں" پیش کیا۔ ان کی
 موسیقی کے فن کے بارے میں پوسٹ امام لکھتے ہیں:

"فنون لطیفہ کی ایک اور اہم صنف موسیقی سے بھی اوپ سہیل کی
 دلچسپی اوائل عمر سے ہی رہی۔ انہوں نے کئی سازوں کو بجا سیکھا اور
 تار کی ہنرناہ تعلیم ایک استاد صاحب اللہ خان سے حاصل کی۔
 موسیقی کی مختلف جڑوں، گھرانوں اور سازوں کی تاریخ کا بھی بڑی
 دلچسپی سے گوا ملاحظہ کیا۔" (۶)

علم موسیقی اور نفس اوپ سہیل کی ذات کے دو اہم گوشے ہیں لیکن ان دونوں
 فنون کی پاکستان کی مذہبی معاشرے میں خاص پڑھائی نہیں ہے۔ اوپ سہیل کے بارے
 حضرت لمبات اللہ یحییٰ پاشی کے بہت سے ایک ان تخریف لائے۔ مدد بہر کا وقت تھا

چہوں سے بدلتے جانے کی آوازیں آنے لگیں۔ حضرت صاحب نے دریافت کیا۔ کیا ہو رہا ہے؟ لوگوں نے بتایا کہ شادی ہے۔ حضرت صاحب نے فرمایا کہ شادی اور نکاح سے میں کچھ فرق دونا چاہیے۔ اس کے بعد اویب سہیل کے خاندان میں ہسپتال کی رسومات پوری ہو گئیں۔ میر حسین علی امام اس حوالے سے اویب سہیل کے ساتھ اپنی گفتگو میں رقم کرتے ہیں کہ انہوں نے بتایا

”گھنٹے میں جب تک رہے ہر تہوار، رسم میں ہسپتال کی نگہداشت تھی۔ کھانا بہت اچھا لگتا اور یہاں سے اٹا تھا۔ عموماً یہ دو تین دن کے لیے آتا تھا۔ میں اس کی خدمت کرتا تھا۔ کھانا کھاتا تھا کہ ہم ”تمہاری شادی تک زخمی رہیں گے اور تمہاری شادی میں ضرور ہا ہا بھائی گے۔ اویب سہیل کہتے ہیں کہ ایسا ہی ہوا۔ میری شادی میں کھانے ہا ہا بھایا۔ اس کے کچھ دن بعد انتقال کر گئے۔“ (۷)

اویب سہیل نے ہسپتال کے رات اور راتوں کے حوالے سے دن کے چہرے لکھنے کے تمام رنگوں کا احاطہ کیا ہے۔ مثلاً بھیروی، کچی کچی، رام کچی، اسٹوری، توری، ہڈی، ہانگ وغیرہ۔ رسم کے حوالے سے اقسام بیان کی ہیں۔ جو ان کے مختلف مٹھن میں چھپ چکی ہیں۔ مثلاً اویب کے مٹھن میں کچی، کچھ ہڈی، اڑیر کا شادی، پھل کا مٹی پوری اور پھل سہیل آف ڈانس کے، لیکو اور روٹی ٹنگرہ بھی مٹھن میں تھیلے کیے۔ رسم کی اقسام بیان کیں، انتقال، کیفیت، بھیک لگیں۔ اویب سہیل کی حالت تک نصیحت میں اہم پہلو ان کی نظم نگاری ہے۔ ان کا تازہ ترین نظموں کا مجموعہ ”کچھ لکھی لکھی ہوئی ہیں۔“ (۲۰۰۵ء) میں اشاعت پذیر ہوا ہے۔ اس مجموعے میں تقریباً ۵۵ لکھی ہیں۔ ان نظموں کی سب سے اہم خوبی موسیقیت، آہنگ اور نظم ہے۔ گو اس میں کچھ غزلی لکھی بھی شامل ہیں۔ لیکن ان کا داخلی آہنگ اس قدر مضبوط ہے کہ غزلی کو باہر لے کر آسانی یا مزاحمت کے بغیر بھی مسرت حاصل ہوتی ہے۔ دوسری اہم خوبی جو ان نظموں کا اہم حصہ ہے انہوں نے مسرت حاصل کرتی ہے۔ وہ انسانی انداز ہے۔ بعض نظموں میں معنوی اعتبار

سے دور اور خراب جہاں جن لوگوں میں کوئی وقت نہیں گننا اور دنیا میں نہ رہنا۔ یہ سب سبیل انسانیت سمجھتے ہیں۔ اس لیے ان کی نظموں میں انسانوں کی زندگی کا درد آنا ہیرو اور تپاس نہیں ہے۔ یہ انہیں چھوٹی چھوٹی کہانیاں ہیں ہرگز نہ کہ ایک بڑی کہانی بناتی ہیں۔ ایسی کہانی جو تاریخ و فلسفہ اور تصوف کی آگاہی سے لگتی ہیں۔ ان کا جانشین، سیاسی، سماجی شعور، بلکہ دانش

نہم و فراست اور ان خیالی بڑی پسند کی اور انسانیت کی واضح ہوتی ہے۔ ان نظموں کا اہم موضوع ہیرو کا سفر، وحدت اور ہر دو سادہ ہے جو کسی اپنے ہونے کا وہاں دکھاتا ہے۔ کسی جگہ یا جگہ ہے اور کسی مختلف سیاسی، سماجی، تعلیمی کے شعبے میں اعلیٰ کی عظمت و مسافت، جتنی اور نفسیاتی انہماؤں کو چھی کرتا ہے۔ ان نظموں میں ان کی اہمیت لگتی ہے۔ مگر اور انکار بھی ہے۔ تخلیق انسان بھی ہے اور خدا کی تلاش بھی ہے۔ یہ عمل مندرجہ ذیل نظموں میں بھر پور طریقے سے اظہار پذیر ہوتا ہے۔ "نمود" "پہلو" "بہم" ایک اور ایک "آئینہ دہ آئینہ" "رو ہند کا سفر" "سینہ سنگ میں صورت" "خلفی میں ملی" "شہرہ" "بہم میں بند شہرہ" "نمود" "مسافت" اور "انکار"۔

خدا داخلی حقیقت ہے۔ انسان کی شکل میں اس کا ظہور ہوا ہے اور وہ مراجعت کا ازل سے طلب گزار ہے یہ خدا پر ہی اور ہر کسی مخلوق خدا سے جا ملتی ہے۔ خدا کے کائنات بھی ہے اور کائنات کے ہر رنگ میں نمایاں ہے۔ وہی جلوہ گر ہے۔ سحر آؤں میں درختوں پر، پہلوں کی گولوں کی صورت، پہاڑوں کی شکل میں، ٹھیب و فراز بناتے ہوئے دریاؤں کی صورت، جھیل اور چھیلوں میں، وہی ہے وہ آئینہ ہے اور اس آئینے کا گہن "آئینہ دہ آئینہ" کی صورت کائنات کے تمام مظاہر میں نظر آتا ہے۔ درختوں کا آئینہ چھیلوں میں چھیل کا آئینہ سندھ، سندھ، لامتناہی علامت ہے۔ اس میں ہر شے کا گہن نظر آتا ہے۔ اس گہن میں ہر کسی کو اپنی شبیہ دکھائی دیتی ہے۔ کائنات ایک وحدت کی صورت ہے۔ اس میں سحر آؤں بھی ہے اور گہراؤں کی وحدت حقیقت مطلق ہے۔ یہ سب سلسلہ در سلسلہ کا کڑی کے حصے ہیں۔ جسے ہم گل میں جز اور جز میں گل کی وحدت سے پہچانتے ہیں۔ تجزیہ اب جزوات میں دکھائی جائیں تو اپنی ایک اہمیت ضرور رکھتی ہیں۔ لیکن ان کی خوب

سورنی دراصل چودے منتر کو دیکھنے میں یا اس منتر کا حصہ ہونے میں ہے۔ یہاں منتر
حقیقت کا ابراہم ہے۔ جو منی فراموش کرتا ہے۔ پھر کے اسی طرح کے گروہی ہر گروہی کا
انگ کل رے دیں لیکن وہ پھر بھی اپنی اصل میں پھری رہتا ہے۔ اس سلسلے کے دیگر
انتہاسات ملاحظہ ہوں۔

"خدا ہے اک والی حقیقت

اور اس حقیقت کا آدمی، فعل خدا کی ہے

جو جب بھی مطلوب اس کا اپنا مشاہدہ تو

اسی اور اپنے سے جلو کرتا ہے۔" (صحیح)

"وہ ایک ہے

اور ایک رنگوں میں اپنے جلو سے دکھا رہا ہے۔" (ایک اور ایک)

"آئینے میں دیکھتا ہے ہر کوئی اپنی شے

تو ہے میرا آئینہ

میں ہوں میرا آئینہ" (آئینہ اور آئینہ)

"ہر اک شے کا ایک اک اپنا عالم ہے

اور عالم سے جدا شے کا تصور ہے اور وہ اپنی

میں اس کو اس کے کل میں دیکھنے کا دکھاتا ہے

میں اس کو اس کے کل میں دیکھنے کا کرب سبب ہوں

خوشی اور کرب کی ایسی ہی ایک باوجود کا مسافر ہوں۔" (اور مسافر کا مسافر)

"یہ کس کا گھر میں ملایا ہے؟

مسا آئی یہ تختی سے ابر کر میرے کالوں تک

میں اپنا گھر سالم ہوں۔"

(اور ایک ایک ایک ایک)

"ازل سے ہے وہ گاؤ طالب

ازل سے ہم اس کے رہے ہیں جی

طلب نہ اس کی ہوئی ہے کم تر

(مخفی اور علی اشاروں)

چاک اپنا نہ ہوا نہ تم

وہت الوجودی صوبوں کے ہاں علی اور اثبات، اقرار و انکار تکلیف اور ہتھیار
 کا نکت کے اصرار و رموز کو سمجھنے کے ذریعہ رہی ہے گو کہ قدیم یونان کے فلسفیوں سے سنے
 کر رہے تھے اور پھر تھریک تک یہ مسائل اہمیت کے حامل رہے ہیں۔ آج کے جدید
 فلسفہ جہاں مسائل اور نظریات کی سب سے بہت ترقی کر لی ہے۔ وہاں بھی یہ مسائل ابھی قائم
 ہیں۔ اس سلسلہ میں ادیب سکیل کی متعدد ذیلی تقسیمیں ہمارے شعور اور ادراک کو میسر دیتی
 ہیں۔ "پانچواں" "عقلم" "بہرہ کے" "تعمیر" "سریت" "خلق خدا" "یونان" "مخفی اور علی
 اشارے" "نمود" "بہاں میں بند مشروب" "مساہت" "انکار" وغیرہ شامل ہیں۔ ان
 تقسیموں میں ادیب سکیل کہتے ہیں۔ "یوں تو انسان کی تخلیق اب تک ایک سو ہے۔
 اساطیری زمانوں سے اس مقصد کے حامل آسانی سے مل جاتا ہے لیکن تاریخی مادیت، عقائد
 فطرت کے مقابل انسانی فطرت کی تخلیق کردہ فطرت کو عظمت انسان گمراہی ہیں۔ انسان
 کی ہتھیار است اپنے ہونے کے بارے میں آسانی رہتی ہے۔ مختلف انسانی کردہ اپنے
 ہونے کا ادراک مختلف سطحوں پر کرتے ہیں۔ جس طرح انسانوں کی بہت سی قسمیں ہیں۔
 اسی طرح ہتھیار اور تلاش کے بھی بہت سے رنگ ہیں۔ انسان جہاں روح اور جسم کا مزج
 ہے وہاں داخل اور خارج کے اشتراک سے تخلیق پاتا ہے۔ زندگی مسائل کو حل دیتی ہے۔
 مسائل نظریات کو اور نظریات اسٹھیا ہے اس صورت میں پیدا کرتے ہیں جب کسی طرح پر کسی
 نام رہی ہو۔ وہت الوجودیوں کے ہاں داخل اور خارج کا فرق منہا ہے۔ جب کہ
 ادیب سکیل اسے جزوں میں جاتے قرار دیتے ہیں۔ انہیں وہ "تعمیر" بھی کہتے ہیں۔
 اور اصل تا اید ہونے کی تلاش میں رہنے کے باوجود عقلم کی روشنی کو ترجیح دیتے ہیں۔ یہ ترجیح
 وہت الوجودی صوبوں کی طرح وسیع بشری کی حامل ہے جو بلا رنگ و لیل و شب و حکم
 عقلم انسانیت کی مالا میں پڑتی ہے اس طرح داخلی واردات کے ذریعے خارج سے ہم
 آہنگی پیدا کر کے عظمت انسان کی بنیادیں رکھی جاسکتی ہیں۔ جس سے فرد باخبر ہو

عائشہ کی عقل والگائیاں ہوتی ہے۔

آری کا شرف یہ ہے کہ وہ سریت تک رسائی حاصل کرنا چاہتا ہے۔ کون و مکان
 سے نوازنے کی تلاش ہے، تجسس سے لے کر کولیس تک چاری رہتی ہے جو داخلی سطح پر بدن
 میں جذبہ و احساس کی صورت میں نمایاں ہوتی ہے جس کا ہم صرف لمس محسوس کر سکتے
 ہیں۔ اسے سوچ سکتے ہیں اور وحشی کے نئے باب کو کھول سکتے ہیں۔ خارج میں خالص
 رہائشی ایجادات کی شکل میں اور انکشافات کی صورت جاننے کی کوشش کرتے ہیں۔ یہ عقل
 کی بات، انکار و اقرار، محبت و نفرت میں پوشیدہ ہوتا ہے۔ تکلیف ختم ہوتی ہے اور ہم
 نتیجہ کا پتہ قدم اٹھاتے ہیں۔ انکار و داخل جان لینے کی خواہش ہے یا سمجھ لینے کے بعد کی
 مہربانی نسبت جو پورا تجسس کو آگ چمانے، مقررہ کو دانش کی تقنین کرنے اور محسوس کو
 "جاننے" کی صورت میں بھرا آتی ہے یا "جاننا جاننا کر دی نی میں آپے جاننا ہوتی"
 وہی صورت حال سے دوچار کرتے ہیں۔ یہ انسان کے ہونے کا ثبوت ہے اور نہ انسانی
 پہاڑی گل میں کھینچے بن جاتی ہے اور نئے جہاں معنی اور پابنت نہیں ہو سکتے۔ اگر کائنات
 کے سرور و رموز کو سن و من روایتی انداز میں تسلیم کر لیا جائے اور اساطیر مشہور سے تو پھر
 سائنس برتی نہیں کر سکتی۔ کوہ بیکس، گلیا، سلیمان، ہانگ، ہنم نہیں لے سکتے۔ انسان چاند
 پر پہلا قدم نہیں رکھ سکتا۔ سیاروں اور ستاروں کے بارے میں جان نہ سکتا۔ یہ نئی اور اہمیت
 ہی کا عالم ہے جو اسے گوجتو رکھتا ہے۔ سو یہ عقبت انسان کی دلیل ہے۔ یہ وہی انسان
 ہے جس نے مظاہر نظرت میں سورج کو طلوع ہوتے دیکھا تو اس کے سامنے سجدہ و ریز
 نہ کیا۔ انہوں کی بچا کی اور انسانوں میں وقف دیکھے تو انہیں ہی اویہ اویہ کا حالیا۔
 اساطیر کی مہ سے آج تک کے سفر میں اس باہمف انسان کو اویہ سہیل، سہیل کی سورج
 آواز دیتے ہیں۔ پلنگے کا پھر بن یا مرد کال اور خلق جود کہتے ہیں۔ اویہ سہیل کی نظروں
 کے ہندو اہمیت دیکھتے

"انہی گل کی ہی بات ہے جاننا اک سجدہ تھا
 ان پتھروں کی خاطر جو اس پر فدا تھے

مگر پھر کے اہل سارا کائنات نے
اس جہد کے کہ نہ کہہ سکتے ہیں کہ اس سے

(برشت)

آٹھا کر دیا۔

"ہمیں وہ "فلسفہ جہد" دینا

جس کا خواب بول نے سا اٹھ سال پہلے دیکھا

ہمیں پھر میں اٹھنے کے

(فلسفہ جہد)

خدا ہی صرف مرد کائنات۔"

میں اس کیلئے کاٹھن ہوں

(جمہور کے)

پھر سے اندر نچھوڑا ہوں کارواں ہے

"یہ رسالت اپنے بکرے میں آکر تکلیف کی ہے ہم شہر

کو کیا ہوا۔

یہ فریب مقرر ہے

اقتدار پر طر ہے

"مذہب توئی کا ایک ذریعہ مگر ہے۔"

(مسلک)

"سبھی اللہ۔"

خاند

موتلم

بہا

اسی سے اپنی ہستی میں گزرنا شروع ہوا کا ہے

(انکار)

سے آفاق کارواں ہے یہ تو زمانے کا

ادب کئی گورے سیاہی و سماوی شعور رکھتے ہیں جو ترقی پسندی و سائنس پسندی

انسان فدائی سے ملو ہے۔ گوکہ ان کی گزشتہ کتاب "مکران کا حرف آواز" مشرقی پاکستان

کے اگلے پڑ ہے۔ لیکن یہ جان کارواں اگلی تک انہیں لگا ہوا ہے۔ اسی حالے سے وہ

سوچتے تھے اور آج سمجھتے ہیں۔ اس کے علاوہ ان کی نگہوں میں سرمایہ دہشتناکی، ماحولیات، عالمی اقتصادی آفات، سرمایہ دارانہ نظام کی جڑ و دھڑکیاں اور جتنی شہور مٹا ہے کسی بھی سماجی نظام کے لیے یہ بالکل ہوتا ہے کہ وہ جس عہد میں زندگی گزار رہا ہوتا ہے اس میں ہونے والے مسائل سے صرف نظر کر لے۔

حکومت اور شعور، عقل اور سائنس کی ابتداء کے آفریقائی سے آج کل پہلی آبادی ہے۔ حکمت کو سرمایہ اور طاقت کی تکمیل حاصل ہے۔ قدیم عہد میں ملکیت قائم ہوئی جو ذہنی طاقت میں تبدیل ہوئی۔ ادیب سبیل کی مناسبت کی خدمت کرتے ہیں۔ ان کے نزدیک جہت بہبودی عہد میں بھی حکمت کو استعمال کرنے کا وہی طریقہ سرمایہ دارانہ اہوار اور محاکمہ حسوسا تیسری دنیا میں استعمال کر رہے ہیں جب کہ ان کی دوسری جانب سماجی علم رہا ہے۔ علم و فراست رکھنے والے اہل قلم ہیں لیکن وہ بولتے بھی ہیں سمجھتے ہیں لیکن دیکھا جاتا ہے۔ یہ اہل دانشور اپنی سرشت میں حقائق کے ادراک کو واضح شکل دینے کے متمنی ہیں۔ حقائق بچے اور بچے سطحوں میں گھومتے ہیں۔ مادی سطح پر "دوچار" دیویں "ساک" ہے جو کج جمال تک رسائی نہیں ہونے دیتی اور مطلق زندگی صرف خواب کی شکل میں ہی نظر آتی ہے۔ خواب بھی بے چہرہ ہوتے ہیں کیونکہ بیرونی اور اندرونی طاقتوں کی مساک کے ایسے دائرے بناتے ہیں کہ آدمی ان میں الجھ کر خوابوں کو بے چہرہ دیکھنے کا مادی ہوا ہے۔ آدمی کو ایسی مشقت میں لگا دیا جاتا ہے جو کار بیکاراں جوت جاتی ہے جہاں کہ اس کے اندر قلم کی بھی سبک دہی ہوتی ہے اور ادراک اسے سیز کر رہا ہوتا ہے۔ ادیب سبیل اس آج کو سیز کرنے کے متمنی ہیں تاکہ دیوار درمیان تکمیل کر دیکھی جائے اور کسو کج جمال اور خواب سے اہل زندگی حقیقت میں جانے جس طرح کی آدمی خوابوں میں بھر آتی ہے اور ہر شے میں نظر آتی ہے۔ اسی طرح زندگی میں بھی آدمی اور میں ہو لیکن اس کے برعکس صورت حال یہ ہے کہ زندگی کی گھڑی کو گھولیں تو "ساک در مساک ہے"۔ حاصل جاتی آگہوں میں خواہشوں کی چھین اور دائرہ زندگی اور سطر زندگی ابھریں کرنے والے ہاتھ نہیں ہوتے ہیں۔ انہیں ہاتھوں میں

ارب سبیل کو اور اس دھرتی کو دولت کیا پھر توڑا پھر نہ بھی منافرت، فرقہ واریت، لہائی
 فسادات، گروہی دہشتانی، کشاکش کو تیز کیا یہی ہاتھ افغانستان، عراق، یونیا اور روس کے
 گلوے کرنے میں کارفرما ہے۔ معاشی بالادستی حاصل کرنے کے لیے وہ کبھی بھی اور ہر
 بھی کر سکتا ہے۔ وہ صدیوں اور سرحدیں توڑتا ہے۔ علم، مہارت، فن، ہوسے کھڑا رہ جاتا ہے۔
 تاریخ اس کے سائنات لکھتے لکھتے تھک گئی ہے۔ آدمی تو حیرت ہے کہ وہ دھرتی جو نظریات
 پر قائم ہوئی تھی۔ اندرونی اور بیرونی تضادات کے نتیجے میں پاش پاش ہو گئی ہے۔ یہ ایسے
 اشتراکیت پسند ملک رہا ہے۔ جو فکر و نظریات کی بنیاد پر قائم ہوا۔ ارب سبیل لکھتے ہیں
 کہ ان نظریات پر عمل کرنے والے ارتقاء پر یقین رکھتے ہیں لیکن یہ ارتقاء کی کون سی شکل
 ہے۔ کیا اس ترقی میں کوئی تغیر مضر ہے۔ دنیا بھر ہنگامہ کے عہد میں دو دھڑوں میں بنی
 ہوئی تھی۔ سرمایہ داری اور اشتراکیت لیکن اب سرمایہ داری کا بل پالا ہے جس کے نتیجے
 میں لہائی، گروہی فسادات بڑھ رہے ہیں گو کہ شاعر کے نزدیک تمام دنیا کے نظریات اس
 آئینے سے نکلتے ہیں لیکن یہاں معاملہ مختلف ہے۔ یہاں سرمایہ کی خواہش یونیا، عراق،
 افغانستان میں مظالم کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے تو شاعر کا خیر سے یقین اٹھنے لگتا ہے گو کہ
 وہ خیر اور شریوں کو نازل سے ہی تضاد کی شکل میں دیکھتا ہے لیکن یونیا کی اجڑی بستیاں
 اور جائزہ (شاعر یونیا) کی صورت میں اسے شرط ڈھاکہ میں کھینچ لے جاتی ہے۔ آدمی
 پھر اسے آزادی کی بجائے شرط اور قید نظر آتا ہے۔ جیسے الف لیلہ کے شہزادے کی جان
 طوطے میں تھی۔ اسی طرح عہد رنڈ کی کل انسانیت کی جان سرمایہ داری کے طوطے میں ہے
 اور یہ طوطا امریکہ، جیسے عالم و جاہز ایک آنکھ والے درج کے قبضے میں ہے۔ "لمود بھیج
 جمال" ہے مائی کھمالی "خواب" "ہوائے خواب" "نوت" "لیو پکارے گا" "ہر
 زمانے کا بلا کو" "الف لیلہ کا شہزادہ" "داش آہ پکار" "مراں ابلاد" اسی طرح کی نظمیں
 ہیں۔ آئیے دیکھ لیں۔

"وہ ہوں کہان کے لوگ یاہوں کہار میں ان بسنے والے"

سبھی ہیں ان کے اثر میں ایسے

(سودھ جہاں)

کہ ان لہروں کو اچھا سب کچھ ہی مانتے ہیں
 "بے مغزلی مغزول رہی۔"

ہم مائل اس کو نہیں

(بے مائی کا مائل)

پا بے مائی کا مائل آ"

"خواب میں مویا ہے

ہر طرح کی آزادی

خواب آزادی کی بھی

(خواب)

اک مبین علامت ہے۔"

"ورائے خواب و نپائے حقیقت ایک گھڑی ہے

ایسے جو نہ چھوئے، چھوئے کی خواہش میں وہ مرتا ہے

اسے جو چھوئے

چھو لینے کا خیال، ہلکتا ہے

اسے جو ہاں حکمت سے کھوا

مساکی در مساکی در مساکی در مساکی ہے"

(ورائے خواب)

"بکریب نوٹ کا سلسلہ ہے ا

اور تعمیر، تخریب میں اصل رہی ہے

سب حدی، سرحدی، اورجہ اورجہ ہو گئی"

(نوٹ)

"کاسٹل پر کھڑا ہے جہاں

دشمنی میں سے لیتے تھے سب اپنی صورت گری میں

سرخ حالت میں اب ڈھیر ہے وہ زمین پر"

(نوٹ)

— مردوں کی خاک پر ہاتھ سے

گھسی گئی ہیں

مردوں طرح سے بچوں کی

ہر اک زمانے میں

(ہر زمانے کے ہاکو)

توں آٹھم ہاتھ میں

”سوتے میں کسی گولی کی صدا سے پارہ پارہ کرتی ہے

جو جہانگتے میں ہوتے رہتے ہیں شاہروہوں پر، گلیاؤں میں

ذرا آگ لگے تو تیرے میں بھی وہ غوغائی کھیل رہی تھی“ (مردوں الجھڑ)

ہر وہ کھل جھڑا دم کے کھل نہیں ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ زندگی کا آواز و انگلیاں اتنا ہی

دماغ سے سمجھ پارہ ہوتے ہیں فرد واحد اس کے لیے کوئی خاص اہمیت نہیں رکھتا۔ وہ اصل

حالات پہلے سے موجود ہوتے ہیں۔ اور اندر ہی اندر گھسی چک رہا ہوتا ہے فرد اس میں

لوٹ ہوتا ہے۔ وہ پہنتا ہے تو بہت ہوتا ہے کوئی آکر اسے رستہ اسے درج ترتیب

باندھتا ہے۔ وہ ہر وہ قسم کا ہے۔ زندگی میں ترتیب ہر اس کی عام نشے ہے بے کار اشیاء سے

لے کر پکار لوگوں تک اگر ترتیب اسے دیا جائے تو کارآمد ہوتے ہیں۔ ”کوئی“ ”تک“ ”اک

کتاب ہے“ ”بیان“ ”خبروری کا جمال“ اسی قسم کی قسمیں ہیں۔

لیٹی لے کہا تھا کہ ”ہل کہ لب آزاد ہیں تیرے“ اس لیے کہ سکتے تو نہ

ہونے کا ثبوت سمجھو۔ بیان پیدا ہو۔ بیان سے تو اذن قائم ہو جائے تو اذن زندگی میں

فصلیت میں عالمی سطح پر نظر میں نظم نگار کا مسئلہ ہے۔ اگر ہم بے وقت اشیاء کو

خاص ترتیب و تو اذن اسے کر لیں پارہ بنا سکتے ہیں اور واسطہ کے نظریے کھاداس کے ذریعے

فصل کو نظم کی اتحاد گوارا نہیں سے باہر نکال سکتے ہیں تو بیان کے ذریعے خبروری کا جمال بنا

ہے کہ ترتیب و تو اذن سے حسن و جمال کو ذاتی سطح سے لے کر عالمی سطح پر ہم دیں۔

ادب سبکی کی نگہوں میں چکر نفسیاتی داخلی کیفیات کا اظہار بھی ملتا ہے۔

”تیرا“ ”ہیں کو ایک کچھ“ ”ہاگونی۔“ ”ہاگونی۔“ ”ہاگونی۔“ ”ہاگونی۔“ کی صورت میں ملتا ہے

آتے ہیں۔ ان ٹکڑوں میں مراب، خواب کی ہی کیفیت در آتی ہے جہاں حقیقتیں مراب بدل بدل کر دکھائی دیتی ہیں۔ جہاں پانی سے اسیار پر نئی صیغے ملائ کے پھول۔ پان کی بیک۔ آسمان پر پائل اور شوق پر لگے پائین کے تکانے حتیٰ کہ خود آجینے میں اپنی اکل بگ سے بھوکھائی دیتی ہے۔ جہاں کراں میں ٹکڑے ہوتی ہے۔ ہانکویاں ضروری ہو جاتی ہیں یہ ہانکویاں وسائل ہائیں سے خارج کا سطر ہیں۔ علم نگار زندگی کو عمومی سطر کی داستان نہیں سمجھتا بلکہ دائرہ دور دائرہ عمل سمجھتا ہے جس سے انحصار پیدا ہوتا ہے سطر کی اذیت بدہ جاتی ہے نئے عالم کے ماحول محدود ہو جاتے ہیں۔ طبعی فنکاروں کے رنگ نہیں کھلتے۔ اوراک جو اصل نیا ہے حاصل نہیں ہوتا تو انسان اپنی پہچان اپنا آپ بھوان شروع ہو جاتا ہے پھر انکی ٹھنسی ساتھ دیتی ہیں۔

اساطیری حوالے ہندی تو ہائی اہرنی دہلی سمیحات اورب سہیل کی ٹکڑوں کا لازمی جز ہے۔ مظاہر طہرت کے ساتھ ساتھ جدید دنیا کے استعارے بھی ان ٹکڑوں میں درج ہوتے ہیں۔ قدیم جذبہ ہجر کے دور سے شروع ہوتی ہے اس کا مطالعہ نہیں ہوتا ہے۔ کیونکہ ہجر ہی انسان کا سب سے پہلا معاون مددگار ناوازار اور پناہ گاہ ٹھہرا ہے۔ ۳۰۰۰ دین و حرم تک مراہت کر گیا ہے اور بت تراشی کا فن بھی بنا ہے۔ آذربائیجان کی، کونم سب ہی ہجروں کی تاریخ میں مکتوب ہیں۔ وسطیاتی سطر پر یہ ٹھنسیں مہادو ہوا ہے اور باداوست پین کا شعور ضرور ہوتی ہیں مگر بجلی گئی ہیں۔

اورب سہیل کی یہ ٹھنسیں متنوع موضوعات اور بیان و زبان کی بہترین مثال ہیں۔ اس ٹکڑے کی شامت نے ان کے قد میں مزید اضافہ کیا ہے اور سرور علم کے دامن کو آگیا کیا ہے۔ یہ ٹھنسیں فکر و عمل، فہم و فراست، دانش و عقل اور شعور و آگہی کو ہمیز دیتی ہیں۔ ان کے مطالعہ سے ظہور مسرت ہی حاصل نہیں ہوتی بلکہ بصیرت افزائی کی طبع بھی پائے ہوئی ہے۔ خود کو جلا کرنے کے ساتھ جذبہ و احساس کو چھونے والی شاعری بہت مت بھر آتی ہے۔

حوالہ جات

- ۱۔ پروف ایف ایم، آئیڈیٹڈ ٹیکسٹ بکس، "بچہ ایسی نظمیں ہوتی ہیں"، زمین پبلی کیشنز، کراچی، ۲۰۰۵ء، جنوری میں ۱۸
- ۲۔ ایضاً میں ۱۹
- ۳۔ ادیب سکیل، میں وہی ہوں جو میرا کلام ہے، "بچہ ایسی نظمیں ہوتی ہیں"، زمین پبلی کیشنز، کراچی، جنوری ۲۰۰۵ء، میں ۲۸
- ۴۔ رشید امجد، ڈاکٹر، نگراناؤ کا حرف آخر، "بچہ ایسی نظمیں ہوتی ہیں"، جلد ۲، شمارہ ۲، اپریل ۲ جون ۲۰۰۱ء، کراچی میں ۱۲۶
- ۵۔ ایضاً میں ۱۲۷
- ۶۔ پروف ایف ایم، آئیڈیٹڈ ٹیکسٹ بکس، "بچہ ایسی نظمیں ہوتی ہیں"، زمین پبلی کیشنز، کراچی، ۲۰۰۵ء، جنوری میں ۲۳
- ۷۔ میر حسین علی امام، ادیب سکیل کا ادبی وطنی سفر، "بچہ ایسی نظمیں ہوتی ہیں"، جلد ۲، شمارہ ۲، اپریل ۲ جون ۲۰۰۱ء

کتابیات

- ۱۔ ادیب سکیل، "بچہ ایسی نظمیں ہوتی ہیں"، زمین پبلی کیشنز، کراچی، جنوری ۲۰۰۵ء

رسائل

- ۱۔ "بچہ ایسی نظمیں ہوتی ہیں"، جلد ۲، شمارہ ۲، کراچی، اپریل ۲ جون ۲۰۰۱ء

جمیل آذر اور انکشافیے

اردو انکشافیے سے جمیل آذر کی وابستگی اتنی گہری اور دیرینہ ہے کہ جمیل آذر کا نام اور انکشافیے دونوں کے طالب علم کے لیے لازم و ملزوم کی حیثیت رکھتے ہیں۔ انہوں نے ایک نیا نظریہ، انکشافیے اور انکشافیے کے فروغ، ہر محاذ پر اپنی تحریروں کے ذریعے اپنی موجودگی کا احساس دلایا ہے۔ وہ اردو کے ان معدودے چند لوگوں میں شامل ہیں جنہوں نے انکشافیے کی صنف سے خود کو اس وقت وابستہ کیا جب اس صنف کی مقبولیت اور امکانات کے متعلق بہت سے سوالات زیر بحث تھے۔ ایسے وقت میں خود کو اس صنف سے وابستہ کرنے صرف ان کی خود اعتمادی کی دلیل ہے بلکہ اس سے ان کی تنقیدی بصیرت کا بھی اندازہ لگا ہے کہ انہوں نے اس وقت اس نوزائیدہ صنف کے امکانات کا درست اندازہ لگا دیا۔ بعد ازاں انہوں نے بعض نہایت اعلیٰ درجے کے انکشافیے لکھ کر ثابت کیا کہ ان کا نیا راستہ تھا اور یہی وہ میدان تھا جو ان کے قلم کی کج جولان گاہ ہو سکتا تھا۔

جمیل آذر کے انکشافیوں کے دو مجموعے "شبانِ زہرا" اور "گرت کے مہمان" اعلیٰ درجے سے آراستہ ہو کر بلبلِ ادب سے دور پانچکے ہیں۔ ان مجموعوں کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ انکشافیے کے فنی اور فکری لوازمات کا گہرا شعور رکھتے والے انکشافیے نگار تھے۔ انہوں نے اپنے ڈیڑھ انکشافیوں میں اس ہارک لٹریچر کو ملحوظ رکھا ہے جو انکشافیے اور اس کے قریب کی دیگر صنف ادب میں موجود ہے۔ خیال کی آزاد روی، اشیاء و مظاہر پر نگاہ کرنے کے زاویے کی انفرادیت اور اسلوب کی روانی، برہنہ نگاری اور بے ساختگی ان کے نیا نیا انکشافیوں میں نہایت آرازاں اور مناسب کے ساتھ موجود ہیں۔ "تلم پلٹ" اور

”ذرا نگہ روم میں گھوڑا“، ”شہزادے“، ”بھلی کا گھر“ جیسے ان کے اکتالیسے باب اس صبح ادب کے اعلیٰ سواروں کے طور پر پیش کیے جانے کے لائق ہیں۔ ”بھلی کا گھر“ سے یہ اقتباس ملاحظہ ہو:

”ایک بڑی بھلی رخصت ہوئی کرتی ہوئی مٹی بھلی کاٹنے میں پھنسی تھی۔ عالم ناموجود سے عالم موجود میں آتی ہوئی بھلی کو دیکھ کر فریاد سزت سے ایک فریاد مستانہ بلند کیا۔ میرا شعور لاشعور کے ساتھ ہم آہنگ ہو کر فطرت کے عرواں صحن کا مشاہدہ کر رہا تھا۔ مٹی مٹی ہی پیاری بھلی میرے ہاتھ میں تھی جو مٹی مٹی اور تڑپ تڑپ رہی تھی، ہار ہار مت کھول رہی تھی جیسے کہ رہی ہو۔“

”تو نے یہ کیا غضب کیا مجھ کو بھی فاش کر دیا
میں ہی تو ایک راز تھی سینہ کا نکات میں“

میں اس کی بے قراری اور اضطراب باطنی کو زیادہ دیر تک آزما نہیں چاہتا تھا اور نہ ہی اس کی جان کنی کی اہلیت سے لطف اٹھا رہا تھا۔ چاہتا تھا۔ میں نے اپنی مٹی کھول دی۔ ایک برق رفتار چھلانگ کے ساتھ چشم زدن میں ”راز کا نکات“ دو بارہ پانی کے اندر عالم ناموجود میں چلی گئی۔“

انکاتیہ نگاری کے ساتھ انکاتیہ کی تفہیم و ترویج کے سلسلے میں بھی جمیل آرد کی مساعی گراماں تعداد ہیں۔ دو گزشتہ چالیس سال سے زائد عرصے سے انکاتیہ نگاری کے لطف پہلوؤں پر مضامین لکھ رہے ہیں۔ ان مضامین میں سے 23 مضامین کا انتخاب کر کے انہوں نے اسے ”انکاتیہ اور انفرادی سوچ“ کے نام سے کتابی صورت میں شائع کیا ہے۔ اردو تنقید میں کسی ایک موضوع پر مربوط اور بیسوط تنقیدی کتب لکھنے کا رواج متاثر کم ہے۔

عام طور پر مختلف موضوعات پر لکھا جاتا ہے۔ اس کے مضامین کو مجموعے کی صورت میں ہی
چلی جاتا ہے۔ کتاب بھی اگرچہ مختلف اوقات میں لکھے گئے مضامین کا مجموعہ ہے مگر
موضوعات کا اہم مرکز ہوا نہیں ایک لڑی میں پڑتا ہے جس سے ایک تسلسل اور داخلی ربط

کا احساس ہوتا ہے۔

پہلی بار نے اپنے مضامین میں انکشاف کے داخلی اور خارجی حدود مثال اہاگر
کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ انکشاف زندگی سے کئی قربت رکھتا ہے، اس میں تخلیقی کار
کی اطراف اور آزادی فکر کے اظہار کے کتنے وسیع امکانات موجود ہیں، انکشاف فکر کا
چراغ اور مظاہر کو دیکھنے کا مادہ۔ کس قدر جواگانہ اور پھر روانہ ہوتا ہے، یہ اور ایسی دیگر داخلی
سہولت کے ساتھ ساتھ انکشاف کی زبان کی لطافت اور شگفتگی، اسلوب بیان کی تازگی
اور ایک باری باری تحریری سہولت پر سیر حاصل بحث کی گئی ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ
اس مضامین کی ایک خوبی یہ ہے کہ ان کی زبان ایسی ہے جس میں بھاری بھرم الفاظ اور
اسطوانات سے بچ کر طبعی مضمون کو سادہ، سہل اور زیادہ سہل فہم انداز میں پیش کیا گیا
ہے۔ جہاں یہ مضامین انکشافی فہمی کے تمام تقاضے پورے کرتے ہیں اور ڈاکٹر وزیر آغا کے
تقریباً یہ کتاب انکشاف کے طالب علموں کے لیے حیرانہ طور کی حیثیت رکھتی ہے۔

اس کتاب کا ایک مضمون اردو انکشافی نظریے کے پچاس سال ایک تاریخی دستاویز
کی حیثیت رکھتا ہے۔ یہ مضمون "مضمون" کے اردو ادب کے پچاس سال کے حوالے سے
شائع ہونے والے جولائی اگست ۱۹۹۷ء کے شمارے میں شائع ہوا تھا۔ یہ مضمون اردو
انکشافی کے آغاز سے لے کر موجودہ عہد تک لکھے جانے والے اہم انکشافی اور
انکشافی نظریوں کے گہرائی کا جائزہ پیش کرتا ہے۔ اپنے مندرجات کے لحاظ سے یہ ایک ایسا
مضمون ہے کہ اردو انکشاف کے طلبہ و محققین اس ایک مضمون سے انکشافی کی پوری تاریخ
سے اگلی بات چیت حاصل کر سکتے ہیں۔

اس کتاب میں تنقید کے نظری اور عملی دونوں پہلوؤں کو پیش نظر رکھا گیا ہے۔
 یہاں مصنف نے انکشافی کی نظری و فنی حدود اور امکانات کی نکال دینی کی ہے وہیں انکشافی
 نگاروں کی تین نسلوں کے نمائندہ لکھنے والوں کی تخلیق کاری کے جائزے بھی پیش کیے ہیں۔
 پہلی نسل میں ڈاکٹر وزیر آغا، غلام بیگانی، اصغر، غلام اشفاق، فتویٰ وغیرہ، دوسری نسل میں
 انور سعید، اکبر سعیدی، انجم نیازی وغیرہ اور تیسری نسل میں سلیم آغا، قزلباش، ناصر عباس، خیر
 پروین طارق، جاوید سعید جونی، شطیح ہدم وغیرہ شامل ہیں۔

بمیل آڈر چونکہ خود انکشافی نگاری کی تاریخ کے چشم دید گواہ ہیں اس لیے ان
 کے مضامین میں وہی بے ساختگی اور اور سچائی پائی جاتی ہے جو خود تجربہ کی ہوئی چیز میں
 موجود ہوتی ہے۔ یہ مضامین پڑھ کر یہاں نہیں لگتا کہ انہوں نے چند کتابیں پڑھ کر ان کے
 جوہر کو اپنے الفاظ میں بیان کرنے کی سعی کی ہے بلکہ ان کے نظریات، خیالات اور
 محسوسات اسی طرح اور بیکل ہیں جیسے ایک انکشافی نگار کے ہونے چاہئیں۔ یوں ان کی
 انکشافی نگاری کا یہ خوبصورت رنگ ان کی تنقید میں بھی جھلکتا ہے اور وہ انکشافی نگار اور
 انکشافی کا نامزد دونوں حیثیتوں میں نمایاں مقام کے حامل قرار پاتے ہیں۔

•••••

ماخذات

- ۱۔ بمیل آڈر، "شاخ زعفران" مکتبہ اردو زبان، سرگودھا، ۱۹۸۱ء
- ۲۔ بمیل آڈر، "انکشافی اور نظری سوچ"، نقش گری بی کیشنز، راولپنڈی، ۲۰۰۲ء
- ۳۔ ماہنامہ "اوراق" لاہور، مدیر آغا، سہ ماہی فتویٰ، شمارہ نمبر ۸، جلد ۳۳،
 جولائی اگست ۱۹۹۷ء

شیم ہاں

قرۃ العین حیدر سے ایک ملاقات

قرۃ العین حیدر ۲۰ جنوری ۱۹۴۷ء کو سہارہ حیدر (پندرہ ماہی افسانہ نگار) اور
 ڈا. اہاتر (ہولی نگار) کے ہاں ملی گزرتے میں پیدا ہوئیں۔ وہ اردو ادب کا اصول سرمایہ ہیں،
 انہوں نے ہول، ہولت، افسانہ، سطر نامہ اور تراجم میں اپنا لوہا منوایا ہے اور ان کی شخصیت
 ادبی دنیا میں ایک خاص مقام رکھتی ہے۔ انہوں نے سات ہول تحریر کیے ہیں۔ جن کے
 ہم دست لڑی ہیں۔ "میرے بھی ستم خانے"، "سینہ تم دل"، "آگ کا دریا"، "گردش
 رنگ چمن"، "آتش کے ہم سفر"، "کار جہاں دراز ہے" اور "چاندنی جگمگ" چھ ہولت
 "لہجہ"، "سیتا ہرن"، "چائے کے باغ"، "انگلے جنم سو ہے جینا نہ کچھ" اور "ہاؤسنگ
 سوانحی" تحریر کیے ہیں۔ انہوں نے ہول نگاری سے قبل افسانہ نگاری میں قدم رکھا۔ ان
 کے افسانوی نمونے "ستاروں سے آگے"، "شیشے کے گھر"، "پادوں کی آگ دھنک
 جیٹ"، "توتے پوتے"، "فصل گل آئی پاجل آئی"، "پت پھڑکی آواز" اور "مدھنی کی
 بلانڈ" ایک خاص ادبی شہرت کے حامل ہیں۔ قرۃ العین حیدر نے سفر نامے اور رپورٹاژ بھی
 تحریر کیے، جن کے نام "سندھ لیلہ"، "کوہ دماوند"، "پیکر گیلری" بھی تحریر کیا تاکہ اپنی اچھی
 ادبی کے لیے اپنی رجسٹریشن کروا سکیں مگر نہایت کن حالات کی بنا پر وہ رجسٹریشن نہ
 کروا سکیں۔ ادبی دنیا کے بلا سے بلا سے انہوں کی مانند انہوں نے بھی بہوں کا ادب تخلیق
 کرنے کے ساتھ ساتھ مختلف زبانوں کے ماہلوں بالخصوص روسی ماہلوں کا اردو زبان میں
 ترجمہ کیا، جن میں "ہمیں چراغ"، "ہمیں پردائے"، "ڈان بہتا رہا"، "آدلی کا مقدر"،
 "توہ کی"، "آبھی کے گیت"، "سٹار"، "کیسا میں تلی"، "ماں کی کھیتی"، "ڈنگو" اور "خیالی

چلاؤ" ایک خاص اہمیت رکھتے ہیں۔

قرۃ العین حیدر نے مندرجہ بالا تصانیف کی باہم اردو ادب میں نہ صرف مقام حاصل کیا ہے بلکہ اعزازات بھی حاصل کیے۔ جن میں افسانوں کے مجموعے "پت بھڑکی آواز" پر سابقہ اکادمی ایوارڈ، ۱۹۶۷ء میں وصول کیا۔ تراجم پر انہیں روس کی جانب سے "سوویت لیبر ایوارڈ" ۱۹۶۹ء میں دیا گیا۔ ۱۹۸۳ء میں انہیں "پدم شری" اور "غالب ایوارڈ" سے نوازا گیا۔ ۱۹۸۹-۹۰ء میں ہندوستان کا سب سے بڑا اعزاز "کیان پیچہ ایوارڈ" دیا گیا۔ ۱۹۸۸ء میں قرۃ العین حیدر کی "اقبال شاعری" کو مد نظر رکھتے ہوئے انہیں قومی ایوارڈ "اقبال سان" سے بھی نوازا گیا۔

قرۃ العین حیدر کی انہی ادبی خدمات اور انعامات کو مد نظر رکھتے ہوئے ۵ نومبر ۲۰۰۰ء کو نئے مدارس اقبال اورینٹل یونیورسٹی اسلام آباد کی جانب سے ایم فل (اقبالیات) کا تحقیقی مقالہ "قرۃ العین حیدر پر مدارس اقبال کے اثرات کا جائزہ" پر کام کرنے کا موقع ملا۔ جسے پبلسٹک ڈاکٹر قرۃ العین حیدر کی اقبالیات سے دلچسپی تھی تو زیادہ مناسب ہوگا۔ قرۃ العین حیدر سے میری یہی دلچسپی ان سے ملاقات کا سب سے بڑا سبب ٹھہری۔

پندرہویں مارچ رات کو کانفرنس میں جو ۱۹ اکتوبر تا ۲۵ اکتوبر ۲۰۰۵ء کو نوردلی (انڈیا) اور پھلی سٹریٹ میں منعقد ہوئی شرکت کرنے کے لیے بہاء الدین ڈاکٹر یونیورسٹی سلطان سے پروفیسر ڈاکٹر انوار احمد ڈاکٹر حلیہ جاوید (شعبہ اردو)، ڈاکٹر امیرہ دلی (تجزیہ و تنقید شعبہ تاریخ) اور اسلامی یونیورسٹی بہاول پور کے ذمہ دار تھیں۔ پروفیسر ڈاکٹر نجیب جلال، جناب سید مسعود الحقی اور سید امجد علی صاحب نے اس کانفرنس میں ماہور سے جناب انصار حسین اور محترمہ شہزادہ سیدہ امجد علی صاحبہ اور ہم ان کے ساتھ ایک ہی کیسٹ ڈاٹس میں قیام فرمایا۔

ڈاکٹر انوار احمد نے میرے ایم فل کے تحقیقی مقالہ کی سبب سے قرۃ العین حیدر

سے میری ملاقات کی دلی خواہش کہ بھاپتے ہوئے کہا کہ میں انگلار حسین اور کشور نامید سے کہوں گا کہ دو قرۃ العین حیدر سے ملاقات کی کوئی راہ نکالیں۔ یہ سن کر میری خوشی سے ہاتھیں کھل گئیں کہ چلو دلی میں آ کر قرۃ العین حیدر سے ملاقات ہی ہو جائے، جس پر میں نے حقیقی کام کیا ہے۔ لہذا ایک ہفتہ دوکان کے مترادف مجھے خوشی ہوئی۔ چنانچہ ڈاکٹر صاحب نے ڈاکٹر شمیم حنفی سے ۱۲ اکتوبر ۲۰۰۵ء کی صبح ۹ بجے قرۃ العین حیدر سے ملاقات کا پروگرام طے کیا۔ چنانچہ ہم لوگ ایک لینڈ کرور پر وقت کو طوطا خاطر رکھتے ہوئے قرۃ العین حیدر کی رہائش گاہ کوٹھی نمبر ۳۳ ای ٹورڈا کالونی، نئی دہلی پہنچے تو ڈاکٹر انوار احمد نے کھنٹی کھائی۔ شمیم حنفی صاحب گیت گھولنے کے لیے باہر آئے اور فرمایا کہ آئیں ماشا اللہ آپ لوگ بروقت تشریف لائے ہیں۔ ہم سے قبل جناب شمیم حنفی اور ان کی اہلیہ ماتنگار حسین اور کشور نامید قرۃ العین حیدر کے گھر پہنچ چکے تھے۔

قرۃ العین حیدر کی رہائش گاہ ایک خوب صورت اور جدید طرز کی کوٹھی نما بلکھ تھی جو تقریباً دوں منزلے پر مشتمل ہوگی۔ کمرے ہوادار اور روشن تھے۔ باہر کی طرف ایک گراس لان تھا، جس میں گھاس اور پھول لگائے ہوئے تھے۔ بیرونی دیوار تقریباً چوٹ اونچی ہوگی۔ ہمیں ڈرائنگ روم میں بٹھایا گیا۔ ڈرائنگ روم میں ٹالین بٹھایا ہوا تھا اور صوفے اور ایک بیڈ بھی لگایا ہوا تھا۔ دیواروں پر پلڈرم اور نذر الہاتر وغیرہ کی تصاویر تھیں۔ یہ وہی تصاویر ہیں، جو "کار جہاں دراز ہے" میں قرۃ العین حیدر نے شامل کی ہیں۔ علاوہ انہیں ایک بک شیلف میں کتب ترتیب کے ساتھ رکھی ہوئی تھیں۔

قرۃ العین حیدر ڈرائنگ روم میں کشور نامید اور سز شمیم حنفی کے سہارے (ان دونوں نے قرۃ العین حیدر کے بازار پکڑے ہوئے تھے) تشریف لائے، جہاں ہم سب ان کی آمد کے منتظر تھے۔ ان کی آمد پر ہم سب احتراماً کھڑے ہو گئے۔ جناب شمیم حنفی نے قرۃ العین حیدر سے ہمارا فردا فردا تعارف کرواتے ہوئے فرمایا کہ لوگ پاکستان سے

"سارک رائٹر کانفرنس" میں شرکت کے لیے تشریف لائے ہیں اور میری طرف اشارہ کرتے ہوئے بتایا کہ شمیم مہاں صاحب نے آپ پر حوالہ اقبال کے حوالے سے کام

کیا ہے جس کا انہوں نے کسی قدر طویل "ایچا" کہہ کر جواب دیا۔
قرۃ العین حیدر (ہم سب کی طرف مخاطب ہو کر) ہیں بھی: آپ سب کو یہاں آنا کیا

۶۵ پہلے بھی دہلی آئے ہو یا نکلی مرتب آنا ہے؟
الوارہ: میں دوسری بار دہلی آیا ہوں، میں نے پچھلے سال بھی "سارک رائٹر کانفرنس" میں شرکت کی تھی، اب یہ دیکر اسباب نکلی مرتب آئے ہیں۔

الوارہ: آج کل آپ کیا کر رہی ہیں؟ آپ نے "سک کھڑی" کے بعد کیا کیا کیا ہے یا آرام کرتی ہیں؟

قرۃ العین حیدر: نہیں بھی، لکھ رہی ہیں۔ کھانا پکانی یا صحتی کا کام جاری و ساری ہے۔
الوارہ: میں ہلوں آپ کا لکھ رہی ہیں؟

قرۃ العین حیدر: وہی "کار جہاں داتا ہے" ہی لکھ رہی ہیں اور لکھا جا رہا ہے۔

الوارہ: آپ نے ایک انٹرویو میں کہا تھا کہ آپ علی گڑھ کے ناظر میں ایک ناول لکھ رہی ہیں، مجھے گمان گزرا کہ سہارن پور کے لیے مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں ریٹائرمنٹ کے حوالے سے ایک سنگین صورت حال پیدا ہوئی تھی۔ شاید وہ آپ کے تحت اشہد میں ہے۔

قرۃ العین حیدر: (برہم ہو کر) سنگین صورت حال؟ کیا مطلب ہے آپ کا؟ انہیں انکار تو کوئی بات نہیں ہوئی تھی۔ آپ کو کس نے بتایا ابھر گزرا یا کوئی دانت نہیں ہوا۔

الوارہ: میرا مطلب تھا کہ دفتری معاملات میں ٹھیک و فرما آتے ہیں، پگھلاؤ (اور تیسرا) پگھلاؤ میں بھی اس کا حوالہ ہے اور آپ نے بھی یہاں جہاں داتا ہے، میں اس کی جانب اشارہ کیا ہے۔

قرہ اہلین میر (نہی سے) نہیں بھی، ایسا کسی قسم کا کوئی واقعہ نہیں ہوا۔ ہاں بھی،
پاکستان میں لوگوں کی بیدارگی میر سے متعلق بھی کوئی اس قسم کی باتیں ہوتی ہوں
یا انہیں پہچانی جاتی ہوں تو مجھے بھی آکاہ بچنے کے لیے ہارے ہارے میں بھی
کوئی تحسین صورت حال موجود ہے۔

انوار احمد میر، مقصد آپ کی دل آزاری نہ تھا میں تو ایک تخلیق کار سے مخاطب ہوں۔
ڈاکٹر نجیب جلال (موضوع بدلتے ہوئے) آپ کے ہاں "آخر شب کے ہم سفر" کا
مطالعہ کیا۔ اس میں آپ نے بگڑا رنگ کی تہذیب و تمدن پر روشنی ڈالی ہے۔
اس کی کوئی خاص چیز ہے؟ جس بارہ آپ نے مشرقی پاکستان کے لوگوں کے
رہنے کو اپنا موضوع منتخب کیا؟

قرہ اہلین میر، اس کی کوئی خاص بات تو نہیں ہے۔ بات چنا کا تک میں میرے ایک کزن
رہے تھے، میں ان سے ملنے وہاں گئی تو جو بگڑا رنگا اس میں نے تحریر کر دیا۔
قرہ اہلین میر، پاکستان میں آپ کی کیا رفتار ہے؟ کیا ہندوستانی اور یوں کی وہاں بگڑا
رہیت ہے؟

انوار احمد میر، پاکستان میں ہمارے ہاں کرشن چھو، ماہندر سنگھ بیدی، پریم چند اور آپ کو بھی
انہی کے نصاب میں شامل کیا ہوا ہے۔

قرہ اہلین میر، (سکراتے ہوئے کہا) یعنی آپ کو بھی سے کیا مراد ہے؟ کیا میں بھی غیر
مسلم ہوں؟

انوار احمد میر، (دشانت کرتے ہوئے) نہیں انہیں، آپ ہندوستانی ادباء میں شمار کی جاتی
تھا، اس لیے میں نے ذکر کیا ہے کہ آپ کو بھی شامل نصاب کیا گیا ہے۔

انوار احمد میر، آپ نے اپنی تصنیف "کار جہاں دوازہ ہے" میں ایک پروفیسر ہلک و پھرا،
کا ذکر کیا ہے۔ کیا وہ صاحب پاکستان سے تعلق رکھتے ہیں؟

قرۃ العین حیدر (مسکراتے ہوئے) نہیں، وہ اکلینڈ میں تھے جو ہر وقت لمبی لمبی چھوڑتے تھے۔

قرۃ العین حیدر (کشور ناہید سے مخاطب ہوتے ہوئے دریافت کرتی ہیں) یعنی وہ اسی عارف اور منو بھائی کا کیا حال ہے؟ وہ بھی کچھ لکھ رہے ہیں یا نہیں؟

کشور ناہید: یعنی آپا وہ ٹھیک ہیں اور لکھتے رہتے ہیں۔

کشور ناہید: یعنی آپا! اس سے کُل آپ مجھ سے پنجابی میں باتیں کرتی تھیں، اب آپ نہ سے پنجابی میں بات چیت کریں۔

قرۃ العین حیدر: (مسکراتے ہوئے) چھوڑو بس! (خاموشی)

اسی اثناء میں ڈاکٹر عقیلہ جاوید نے اپنی نئی تصنیف "اردو میں تائٹھ کی ایک ایک جلد" میں منگلی، انگلار حسین اور کشور ناہید کو پیش کی، کشور ناہید نے فوراً کہا ہم پاکستان سے لے لیتے اور انگلار خاموشی سے پکار کر دہائی کرنے لگے۔

انگلار حسین: (ڈاکٹر عمیرا دہتی سے لفظی نہیں کے ساتھ مخاطب ہوتے ہوئے) آپ نے اپنی تصنیف کا نام اس قدر مشکل کیوں تحریر کیا جب کہ تائٹھ کا ترجمہ سہولیت لسانیت بھی کیا جاسکتا تھا۔

ڈاکٹر عمیرا دہتی: یہ جناب میری تصنیف نہیں ہے بلکہ یہ ڈاکٹر عقیلہ نے تحریر کی ہے۔ وہ اس پیشگی ہیں۔ انگلار حسین نے وہی سوال دوبارہ ڈاکٹر عقیلہ سے دہرایا۔

کشور ناہید: (قرۃ العین حیدر سے مخاطب ہوتے ہوئے) وہ آپ کے شمس الرحمن صاحب نے بھی تو تائٹھ کا لفظ اپنی تحریروں میں بار بار استعمال کیا ہے۔

قرۃ العین حیدر: کون؟ (ڈراما نوپا سٹائی رہنے کے انداز میں)

کشور ناہید: شمس الرحمن قادوقی صاحب۔

قرۃ العین حیدر: (مسکراتے ہوئے) اچھا وہ ہر اظہار اعظم (تمام اجواب ایک ساتھ تھے)

(گاتے ہیں)

قرۃ العین حیدر (علامہ اقبال سے اپنی دلچسپی کا اظہار کرتے ہوئے دریافت کرتی ہیں)
میں نے سنا ہے کہ پاکستان میں "ہانگ ورا" سے "تراوہ بندی" اور "آفتاب
(ترجمہ بھٹری)" والی منظومات حذف کر دی گئی ہیں؟

ڈاکٹر انوار امین، ڈاکٹر نجیب جمال اور میں نے ایک وقت باآواز بلند کہا کہ ایسی
کوئی بات نہیں۔ سب کچھ "ہانگ ورا" میں ایسے ہی موجود ہے۔

قرۃ العین حیدر (انہیں ڈرا اور نچا سٹائی دیتا ہے) دوبارہ دریافت کرتی ہیں۔ کیا کہا؟
میں (راقم الحروف) نے ہارے اور لہرا کر جواب دیا کہ ہیں "ہانگ ورا" اپنی اصلی
حالت میں موجود ہے اور اصلی حالت میں شائع ہو رہی ہے (قرۃ العین حیدر
سے میری ملاقات کا اصل مقصد بھی یہی تھا اور میں یہ جاننا چاہتا تھا کہ ان پر
علامہ اقبال کے اثرات ہیں یا ان کی دلچسپی؟)

ڈاکٹر نجیب جمال (میرے ہارے لہرا لے پر کافی دیر مسکراتے رہے اور میرے جواب کو
میرے دہرے ہارے دہراتے رہے)

اسی عرصے میں قرۃ العین حیدر سے فونو گرافی کی مہارت طلب کی گئی، جسے
باآواز بلند کثرتاً سمیٹنے لے دہرایا کہ یہ لوگ آپ کے ساتھ تصاویر بنانا چاہتے
ہیں۔ ڈراما گروہ میں قرۃ العین حیدر کے ہمراہ تصاویر بنائی گئیں۔ تصاویر
بنانے میں اہم کردار سعد مسعود افغانی نے ادا کیا۔ البتہ میں نے بھی سعد مسعود
افغانی کی وہ تصاویر قرۃ العین حیدر کے ساتھ بنائی تھیں۔ (بدقسمتی سے وہ تمام
تصاویر ناکارہ فلم کی نذر ہو گئیں) لیکن ڈاکٹر سمیرہ دہنی کے کمرے میں جو
تصاویر بنائی تھیں وہ محفوظ رہیں۔

قرۃ العین حیدر یہ تصاویر کسی رسالے وغیرہ میں شائع نہ کرواؤ۔

ہم سب نے انہیں یقین دلانے ہوئے کہا کہ شائع نہیں کروا دیں گے۔ مگر
آہستہ سے کہا اخبار میں ضرور چھپا دیں گے۔

قرۃ العین حیدر: آپ سب کو اطلاع آنا کیسا لگا؟

انور احمد: بہت خوب

قرۃ العین حیدر: کوئی گھوسے مارے بھی ہوا؟

انور احمد: جی ہاں، وہی میں خوب گھوسے پھرے ہیں۔ کل (۱۳ اکتوبر ۲۰۰۵ء) آج

کل (آ کر) بھی دیکھنے جائیں گے۔

قرۃ العین حیدر: آپ میں سے کسی نے لکھنا بھی دیکھا ہے؟

انور احمد: نہیں دیکھا۔

قرۃ العین حیدر: اپنی لکھنا بھی دیکھ آئیں۔

قرۃ العین حیدر: (گھسوی تہذیب و تمدن پر روشنی ڈالتے ہوئے) آج تک لکھنا میں

بندہ مسلم قرار نہیں ہوا۔ شیور میں لٹا تو ہو سکتا ہے۔ لیکن بندہ مسلم نہیں۔ یہاں

لوگ آپس میں بڑی محبت اور چاہت سے رہتے ہیں۔

میرے ہاتھی طرف انتظار مسین تشریف فرما تھے۔ میں نے ان کے کان میں

سرگوشی کرتے ہوئے کہا کہ آپ قرۃ العین حیدر سے اجازت لرائیں کہ انہیں

نے پاکستان سے ہمارے آنا کیوں بند کیا؟ اس کی کوئی خاص وجہ تو بیان کریں۔

انتظار مسین: میں ان سے یہ سوال ہرگز نہ پوچھا جائے کیونکہ اس کی شناخت وہاں

فخریوں میں کر چکی ہیں۔

اس تمام عرصہ میں انتظار مسین خاموش رہے اور انہوں نے قرۃ العین حیدر سے

کوئی بھی سوال نہ پوچھا۔ میں ڈاکٹر انور احمد کے ہاتھی چاہ بچا تھا۔

آہستہ سے کہنے لگے کہ اب چلنے کے لیے اجازت طلب کریں۔ میں سب سے

آگے خاموشی ہے

کئی روز بعد جب ریسلیم نیم وہیں پہنچی تو سکول کے بچے کے بچے سے آنے والی ساری آہیں نکالیں اور صبراً انہیں خاموشی ہو چکی تھیں۔ بچے کچھ سوچنے پر آمادہ نہ تھے، علاج اور خوراک کے لئے اور ابھر ہر جگہ بڑا کرتے۔ لڑکیوں، بھوتوں اور بڑی بڑا بھولوں کے بارہو کو آنسو اور چیلنے چلانے سے گلے لگتے ہوئے تھے۔ وہ بھونکی جیسی دن رات بچے کے ڈبھروں کے پاس رہیں کے بچے ان کے بکر کوٹے اور بھائی اب مجھے تھے کھڑی، روٹی چلاتی اور مرد کے لئے پھارتی رہیں۔ لہذا میں اتنا کوئی میلی کاہر نظر آتا تو چادر میں اور دوپٹے لہرا لہرا کرتے حجب کرتیں مگر جب وہ کسی اور طرف گلی جاتا تو باہر ہو کر رونے لگتے اور سوچ کوئی کرنے لگتیں۔ فریڈ کی اور ہمدانی کے لئے آئی ہوئی عورتیں انہیں بکرا بکرا کر سہاڑا کر رہیں میں دیکھ لاتی مگر انہیں قرار نہ آتا۔ جن ہاؤس کے بچے اور بھائیوں کے بھائی بچے میں رہے چہ سے ہوں اور باتوں کو ان کی دل لڑائی صبراً ہی سہی دیتی ہوں وہ کیسے بکرا کھاتی اور ہو سکتی ہیں۔

ریسلیم نیم کو کچھ کران کاڑھیں ملتا تھا تو بعض انہیں وہ سے آنے پر آمادہ رہی تھیں اور بھینے سے رہی تھیں کیونکہ اب کسی کے ذمہ نہ تھے کا کوئی امکان نہیں رہ گیا تھا مگر بعض اب بھی پر امید تھیں۔ پچھلے چند روز میں وہ کسی طرح کی خبریں سن چکی تھیں۔ بعض بچے اور بچے کی گئی روز بعد کھائے بچے لہذا لہذا باہر ہوتے تھے۔ ساتھ کوئی بھڑو کوئی کراہت ہو جائے اور ان کے دل کا کھرا بھی زندہ گلی آئے۔ مگر ریسلیم پارتی نے ایک ایک کر کے سالم اور بکلی ہوئی لاشوں کے اہار نکالے۔ ہستی میں کوہرام کی کیا سکول کے بھی اساتذہ اور اظہار ابھی نیند سوچتے تھے۔ سکول ایک بہت بڑا شکل ڈاکٹر جان معلوم

ہو رہا تھا۔ لاشیں لٹانے کا کام کئی روز میں مکمل ہوا۔ بعض لاشیں جو بدبو چھوڑ رہی تھیں، انہیں ہلدی لہا دیا گیا۔ لیاہو تر لوگ اپنے بچوں کی ہتھیں اپنے ساتھ لے گئے مگر جن بچوں اور استادوں کے درجہ زلزلے کی بناء کاری کا شکار ہو گئے اور گھر سہا ہو گئے تھے، انہیں کھانا کر لیا اور دیا گیا مگر لمبرنگلی ریسیکیم کے ارکان وکٹانے سے پہلے ریکارڈ کے لئے ان لوگوں کی تصویریں اتار لیتے۔

جب آخری روز لوگوں کے جانے کا اجماعی جواز چاہا گیا اور انہیں قبروں میں اتار دیا گیا، ایک خوب صورت حال پیدا ہوئی۔ ریسیکیم کے فوٹو گرافر نے ایک میٹ کی تصویر اتارنے وقت اس کی آنکھیں بند کرنا چاہیں۔ وہ ہاتھ سے اس کی آنکھیں بند کر کے بیٹھے مگر جب کمرے کی آنکھ میں جھانکا تو وہ پھر مکمل کی تھیں اور بالکل زندہ آنکھوں کی طرح اسے گھور رہی تھیں۔

”کیا تم زندہ ہو؟“ اس نے قریب جا کر پوچھا مگر کوئی جواب ملا نہ ہی میٹ کے چہرے پر کسی رد عمل کے آثار نمایاں ہوئے۔ اس نے نہیں دیکھی اور چھاتی پر کان رکھ کر دل کے دہز گئے کی آواز سنی اور خوشی اور حیرت سے اپنے ساتھیوں کو آواز دی۔ ”ہی از الائن“

تھوڑی سی دیر میں بہت سے لوگ جمع ہو گئے۔ وہ سینٹر لمبرنگلی میں تھے۔ انہیں جانے اور پھیلنے والے انہیں آوازیں دینے لگے مگر شاید ان پر سخت طاری تھا انہوں نے کسی ہتھ کا کوئی جواب نہ دیا۔ وہ بظاہر مردہ نظر آتے تھے مگر زندہ تھے یا شاید اصل میں مر چکے تھے اور زندہ نظر آتے تھے۔ ان کا گاؤں قریب ہی تھا۔ وہاں دوبارہ اطلاع کی گئی مگر ان کی بڑھی وادہ دوبار کے لیے آکر مر چکی تھیں۔ شادی ہوئی تھی مگر جی سے بھاہ نہ ہو سکا اور طبع کی ہوئی تھی۔ اولاد کی خاطر وہ بارہ شادی اس لئے نہ کی کہ وہ اپنے طلباء کو مثل اپنی اولاد کے سمجھتے تھے اور ان میں بہت مقبول تھے۔ ابتدائی طبی امداد اور کوششوں کے باوجود ان کے ہاتھ پاؤں نے حرکت کی نہ انہوں نے کسی سوال کا جواب دیا تو انہیں فوری

ظہور پر نکلی گاٹر میں اسلام آباد کے نئے ہسپتال میں بھیج دیا گیا۔

بڑوں کا علاج اور ٹیف و زہر، بجلی ٹکڑ میں مردہ ہی معلوم ہوتے۔ وہ ایک روز انہیں انگریزی میں رکھو ڈرپ وغیرہ لگائی گئی۔ ان کے جسم پر بہت سی خراشیں اور چھوٹے چھوٹے زخم تھے مگر کوئی بڑا اور گہرا زخم دکھائی نہ دیتا تھا۔ شاہد سر میں بار بار چھ کی ہڈی پر جھٹ آئی تھی۔ ابتدائی ٹسٹوں سے ان کی بیماری کا بہتر سراغ نہ ملا تو انہیں مزید ٹیسٹس اور ٹسٹوں کے لئے سرینگیں دارا میں بھیج دیا گیا۔ سرینگیں دارا میں ان کے مزید ٹیسٹس ہونے مگر ڈاکٹر کسی نتیجے پر نہ پہنچ سکے۔ یوں لگتا تھا جیسے وہ خود کو زندہ نہ سمجھتے ہوں یا زندگی کی طرف واپس نہ آنا چاہتے ہوں۔ انہیں انجکشن ملا کر ٹکوکڑ ڈرپ لگادی گئی مگر وہ بے جان سے بیڈ پر چسے رہے۔ بعض اوقات دیر تک آنکھیں نہ بھینکتے۔ تھک ہا کر انہیں میڈیکل وارڈ میں منتقل کر دیا گیا۔ یوں بھی سرینگیں دارا میں بہت دن سپرد ہوا تھا، رات دن آپریشن۔ جتنے مریض فارغ ہوتے ان سے زیادہ اور آجاتے۔ کئے اور کچے ہوئے امعاء وائل بچے اور بڑے درد سے ٹھہراتے اور چیخے چلاتے رہتے۔ ماحرودین محمد دن رات کئی آنکھوں کے ساتھ چھت کو کھرتے رہتے۔ سونا نہ کھاتا پیتا۔ نہ ہی وہ کسی طرح کی غذا قبول کر رہے تھے۔ دودھ یا جوس جو چیز بھی ان کے منہ میں ڈالی جاتی، وہ باہر آجاتی۔ میڈیکل وارڈ میں بھی انہیں مسلسل ڈرپ کے ذریعے ہی نگہبانی جاتی رہی مگر وہ زندگی کی طرف پلٹنے کے لئے تعاون نہیں کر رہے تھے اور روز بروز مزید کمزور ہوتے جا رہے تھے۔

ماحردین محمد جب کئی دن بعد بھی بہل نہ ہو سکے اور پوری طرح زندگی کی طرف نہ پلٹ سکے تو آخر کار نفسیاتی معالج کو بلوایا گیا۔ جس نے بہت کوشش کی مگر انہوں نے اس کی کسی بات کا جواب دیا نہ کسی مشورے کا کوئی رسپانس۔ دو دن میں تقریباً ایک دو بار بچہ لگاتا اور ان سے یک طرفہ گفتگو کر کے چلا جاتا۔ اسی کے مشورے پر وارڈ میں ٹیلی ویشن بھی رکھوایا گیا۔ شاہد وہ زکریا سے ہونے والی تباہ کاریوں کے مناظر اور پکڑتوں کی

تفصیل میں کر کسی روز مل کا عہدہ کریں۔ ملی ہی آنے سے بارہ کے بہت سے دوسرے
مہینوں کا دل بھی بھل گیا اور اسے اتنی دیکھنے کے ہونے والی برہمچاریوں کے دیکھ
رہے کر نہیں آج ان تم جوں معلوم ہونے کا مگر باختری ہی اس کا پتہ نہ ہوں۔

ایک روز باختری کا ایک شاگرد جیوٹھ انہیں تلاش کرتا ہوا پہنچا آنکھوں
باختری کو زندہ اور سلامت دیکھ کر وہ خوشی سے کھل اٹھا مگر پھر فوراً ہی ان سے پتہ کرنے
پھر نہیں نے اسے منع کر دیا مگر یہ دیکھ کر چونک پڑی کہ ماسٹر صاحب کی آنکھوں سے بھی
آنسو بہنے لگے تھے۔ وہ روز کرگئی اور ان کو یاد کر لئی۔ ماسٹر صاحب کی زندگی کے
بارے میں یہ امید ہو گئی۔ یہی اللہ سے یہ چلا کہ سکول کے خلاف اور لڑکوں میں سے ان
بڑوں کے سوا کوئی زندہ نہیں رہتا تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ ماسٹر صاحب ان کے لئے فرشتہ ثابت
ہوئے تھے کیونکہ انہوں نے ڈالرے سے فوراً پہلے اسے سڑک کے طور پر نکال دیا۔ وہاں سے باہر
نکل دینا ان کے گھر والے نہ چاہتے تھے اور مگر وہاں انہیں اور چاند سب نے میں
تہہ ملے ہوئے تھے۔ مگر وہ اپنے ذاتی صدموں میں گھرا ہوا۔ پھر جب اسے یہ چلا کہ
باختری زندہ اور سلامت ہیں اور انہیں یہیں جھگایا گیا ہے تو وہ ان کی خبر گیری کے لئے
آج اپنے ماسٹر نے یہی اللہ کو اس کے روز دوبارہ سچا کراٹھ کی موجودگی میں آنے کی ہدایت
کی۔ اس کے روز یہی اللہ دوبارہ آتا ہے ان سے ماسٹر صاحب کے قریب اٹھا کر ڈالرے
سے پہلے کی باتیں اور تفصیل پر پتے رہے۔ جنہیں میں کہ ماسٹر صاحب کے ذہن میں یہی
نکا یعنی تم دوبارہ میں پڑی۔ اور انہیں آہستہ آہستہ گزرے ہوئے مناظر یاد آنے
لگے۔ یہی اللہ کو دیکھ کر ڈالرے سے بکو اور پہلے کا مناظر یاد آیا۔

ماضی گوارا کہ غالب ہو جانے والے بعض لڑکوں کی جہ سے انہوں نے بکو
اور سے جلت ہلی ہلی کر ماضی لینا شروع کر دی تھی بلکہ ہر کسی کے مکان کے گوشے
مگر ماضی جہاں اور میں سر ہائی آوازوں کے چرسے دیکھنا ہی ضروری سمجھتے تھے۔ کلاس

میں شور مچا رہا تھا انہوں نے جلد آواز میں ڈالنا۔ "خاموشی۔ خاموشی" اور یہ کہہ کر وہ
 ماضی اپنے گئے۔

"کوئی نہ"

"ماضی جناب"

"کلام اللہ"

"یہی نہ"

"کلام انور"

"ماضی جناب"

"کلام رسول"

"یہی نہ"

نام پکارتے پکارتے وہ رگ گئے۔ تھک کے بیٹھوں کے اوپر سے گلاں کی طرف
 دیکھا۔ ہر طرف خوبصورت چاروں کے پھول کھلے ہوئے اور مسکراہٹوں کی گلیوں چنگی ہوئی
 تھیں۔ وہ بھی مسکرائے اور بولے۔ "جن لڑکوں کے پاسوں کے ساتھ کلام آتا ہے۔ وہ ہاتھ
 کڑتے کرتے"

بہت سے ہاتھ کڑتے ہو گئے۔ وہ بیٹے کے پھر کھتی کر کے بولے "اٹھ سوال
 کہتے۔ آؤ لوگ میں اسے کلام؟"

"سر کلام ملی تو ہے ہی خاندان نکلاہوں سے" "سمیڈاٹھ ہوا" اس کے قریب ۱۹۸۴
 "میں کلام گو ہے اور ہمارا کلام کلام ہی"
 ماری گلاں بیٹے کی۔

"کلام اللہ کلام" بچے کے لڑکوں سے آواز آئی۔ سب پھر بیٹے کے
 "کلام کے بغیر بھی یہ نام بہت خوبصورت اور مکمل ہیں مگر یہ نہیں نکلتے تو ان

کھدای کون پند ہے“
 ”سر میداٹھ کے اپنے باپ دتی اے خان کا اصل نام بھی غلام محمد خان ہے“

غلام علی نے جوابی ملا کیا

”نہیں سر“ میداٹھ بولا ”وہ فخر علی خان ہیں“

”ہاں مجھے معلوم ہے“ انہوں نے کہا ”وہ غلام نہیں فخر ہیں“

”جس کے معنی شیر اور شیر آزادی پند ہوتا ہے“ میداٹھ نے اتر کر کہا

”شیر بچا گھر اور سر کس کے بھی تو ہوتے ہیں سر“ غلام علی بولا

”ہوتے ہیں۔ لیکن اللہ کے شیروں کو آئی نہیں روہی۔ چلو حاضر ہی بولو۔ اقبال

”اگر“

”حاضر جناب“

”تو قہر میں“

”نہیں سر“

”مسلط علی“

”نہیں سر“

”غلام ٹوٹ“

”کی جناب“

”مید“

”اگلا“ میداٹھ کے منہ سے بے اختیار نکلا۔ ساری کلاں تہقہ زار بن گئی۔

میداٹھ کھاتے پیتے متحول خاندان سے تعلق رکھتا تھا مگر ہر جماعت میں دو دو تین

تین بار لگی ہوتا رہا جس کی وجہ سے وہ اپنے کئی ہم جماعتوں میں عمر اور قد میں بڑا تھا اور

بیلوں کے کٹے میں اونٹ لگاتا تھا۔ سینئر کلاسوں کے لڑکے بھی اس سے الجھنے سے

کرتے۔ پھر کی عدم سوزیگی میں دھان پان سے کلاس یا بیڑمہ اور کواکب طرف دیکھیں کر
وہ فوڈی یا بیڑی سنہالی لپٹا اور شور اور شربت کا بہانہ بنا کر اپنے چالاک لڑکوں کی ٹھکانی بھی

کر چاگر اسے سزا دینے میں استرا بھی پائل کرتے تھے۔

بعض اساتذہ کا خیال تھا کہ گھروالے اسے چھٹائی کے لئے نہیں شرارتوں سے

بچنے ضرورت تھی کہ اسے سکول بھیجے تھے۔ چھٹائی کھائی کی اسے زیادہ ضرورت بھی نہ

تھی۔ یہاں جانوروں کا بھی اور والد کی جنگلات کی ٹھیکیداری میں ہاتھ ملانے کے لئے اس

کا نام داخل ہونا کیا ضروری تھا۔ یہ سکول کے تقریباً ہر بچے کا شاگرد و چکا تھا اور شاگردی

کئی استرا ہو جس نے بھی پہلا ستر یا اس کے گھروالوں سے اس کی شکایت نہ کی ہو مگر اس

پر کوئی اثر ہوتا ہی اسے ان 1980ء سے کچھ فرق پڑتا تھا۔ دلچسپ بات یہ تھی کہ ٹیوشن

اور امتحانوں میں اسے نقل کرنے کے مواقع فراہم کئے جاتے یا وہ بد معاشری سے زبردستی

کتابیں پکڑیں اور لاش ساٹھ رکنا گھراس کے باوجود ٹیوشن ہو جاتا۔ بعض اساتذہ گلہ آ کر

اسے اس کہہ دیتے تاکہ وہ انگی نکاس میں چا جائے اور اس سے جان بچوت جاتے۔

ابھی یاد آ رہا تھا کہ ماضی کا کراسیوں نے کلاس کو اردو کی کتاب کھولنے

کہا تھا۔ پھر وہ سب معمول کلاس کے درمیان میں سولا جلتی لپرا لپرا کر بیٹھے اور مختلف

لڑکوں سے چھاوا سنی سننے لگے۔ یہی آموختہ بنانے والا لڑکا کسی ٹیوشن پرانگ جاتا۔ خط

کی لفظی کتاب کا جلد سنی جاتا اور سولا جلتی لپراتے اور لڑکے کی انگی ہوئی زبان پاتو فوراً وہیں

اندھا جاتا یا پھر اسلہ یا وہ انگ اور الجھ جاتی اور وہ گھبراہٹ میں حرف غلطیاں کرتے لگتا۔ کلاس

میں تھمے کہتے تھے اور سولا جلتی کسی تازک اور خوبصورت بھلی پر پائل ہونے جاتے

لگتا۔ سکول میں ہوسانی سزا دینے کی اجازت نہیں تھی مگر باسٹرو میں لگے کا پڑ جاتے اور سزا

دینے کا پائل ہوتا تھا۔ لڑکے اس سے بہت بے لطف اور خوش تھے۔ وہ خود کہتے تھے کہ

انہوں نے غالب طبعی کے کہانے میں اپنے استراوں سے جرمہ کھائی تھی اس کا بدلہ اپنے

ناروں سے ہلاتے اور قرض وصول کرتے ہیں۔ اس پر سب چٹنے لگتے۔ مگر وہ الیحد
 رہنے کے ارادے سے نہیں مارتے تھے۔ نہ ہی وہ سزا دینے وقت کسی ٹھٹھے اور جھگڑاوت
 کا ہتھیار کرتے بلکہ اپنی ذمائی کرتے رہتے۔ لڑکوں نے بھی سوا لٹل کے کئی طرح کے ٹھٹھے
 اور ذمائی بنائے ہوئے تھے بہت دو ایک بار انہوں نے عید اللہ کو کلاس میں ناز یا حرکتوں
 پر ملت سزا دی تھی اور وہ بھی صرف انہی سے ڈرتا اور لڑتا کرتا تھا۔ وہ اکثر اسے اپنے سامنے
 بٹاتے تاکہ اس پر نظر اور کنٹرول رکھ سکیں مگر اسے پیچھے لے سکتوں پر ٹیلی آکٹوں والے
 مصدر علی کے پاس جتنا دھماکا لگتا تھا۔ آج وہ چھوڑا جا رہا تھا اور اسے اپنی سیٹ پر لائیں
 والے کا بیان دہرا رہے تھے۔ اس وقت مگر اور کتاب سے سرسید لکھناں کی "اسیہ کی
 لڑائی" کا پڑھا اور اسے مل گیا تھا۔

اسے ہمیشہ زندہ رہنے والی امید تھی کہ زندگی کا چراغ ٹھٹھا ہے اور وہ کئی
 عیادت کا آفتاب لب۔ نام ہوتا ہے ہاتھ پاؤں میں گرمی نہیں رہتی۔ رنگ فق ہو جاتا ہے۔ بدن
 پر مروتی چھا جاتی ہے۔ ہوا میں ہوائی پانی میں ہلی مٹی میں مٹے کو ہوتی ہے تو میرے ہی
 سہارے سے وہ گھٹن گڑھی آسماں ہوتی ہے۔"

اپنا ک مصدر علی کی آواز سنائی دی "سر یہ مجھے تک گز رہا ہے اس نے میرا گل"
 انہیں یاد آ رہا تھا کہ انہوں نے پلٹ کر ٹھٹھے سے عید اللہ کو دیکھا تھا۔ کلاس روم
 میں شرامت لہرے سے اسے قہقہے گولتے اور سرگوشیاں بھینٹا رہی تھیں۔ انہوں نے
 بلند آواز میں پری کلاس کو ڈانٹا "خاموش۔ خاموش" پھر عید اللہ کی طرف متوجہ ہوئے اور
 اسے کلاس سے باہر لگ جاتے کا حکم دیا تھا مگر جو مٹی اس نے کلاس روم سے باہر قدم رکھا
 لگا جیسے ہی وہ بہت سے انگریزی قلموں کے کسی تخریب کار دھین کی طرح ریپوٹ کنٹرول
 کائن دیا کہ دھماکا گویا ہوا ایک شدید جھکا آیا۔ پورا کلاس روم ڈولنے لگا۔ دیواریں
 ڈلگائیں، کمرے کی ہر چیز لڑنے اور پھولے کھانے لگی اور ایک دھماکے کے ساتھ پھٹیں ان

کے اوپر آکر میں ایک ساتھ بہت سی چٹھیں بلند ہوئی۔ پھر سناٹا چھا گیا۔ پھر جب انہیں وہی آواز آئی تو وہ لمبے کے نیچے اسیے ہوئے تھے اور لڑکوں کی چٹھیں، اگرچہ اور سسکپاں سنائی دے رہی تھیں۔ وہ ان کی بیچ پکارتیں سکتے تھے مگر حرکت کر سکتے تھے نہ جواب ہی اسے دے سکتے تھے۔ ان کے منہ اور آنکھوں میں ریت بھر گئی تھی۔

انہیں یہ تو اندازہ ہو گیا تھا کہ یہ چاہی ڈالنے کی وجہ سے آئی تھی اور یہ ان کی کلاں اور سیکل تک محدود نہ تھی بلکہ ہارے ملک میں قیامت برپا ہو گئی ہوگی اور نہ لوگ ان کی مدد کو ضرور پہنچتے مگر وہ اس اگھاق پر حیران تھے کہ سب اگلے، لڑکی اور معصوم لڑکے ہلاک ہو گئے یا لمبے کے نیچے ڈھکی پڑے چھا چھا کر مہلکے لئے پکار رہے تھے اور کیا امید انہیں اپنی شرمیلوں کی تیر سے بھرتا تھا کیا ہوگا۔ پکارو پکارو بعد وہ منہ میں بھری ریت اٹکنے اور تھوکنے کے بعد لمبے کے قافلہ ہو گئے تو انہوں نے آواز دی

”یہ کون رو رہا ہے؟“

”میں ہوں ماٹرنی“ آواز سنائی دی ”لوڑ“

”ٹھیک تو ہو چکا؟“

”سر میں ٹوٹی ہوئی کرسیوں اور ڈیسکوں کے نیچے پھنسا ہوا ہوں۔ میرے اوپر پتہ

نہیں کیا بھاری چیز پڑا ہے جس کو نہیں سکتا“

”جو ملے رکھو سرے بیٹے“

”سر اپنا تک یہ کیا ہوا؟ کیا جنگ شروع ہو گئی۔ دشمن نے کولہ باری کی؟“

”نہیں چچا۔ یہ ڈالہ تھا۔ بہت شرمیلے“

”سر آپ کہاں ہیں؟ کیسے ہیں؟“

”میں تمہارے پاس ہی ہوں۔ ہاتھ پاؤں کام نہیں کر رہے۔ پتہ نہیں ہیں بھی

خبر۔ تم گھبراؤ نہیں بیٹا۔ ابھی کوئی مدد کو آ جائے گا“

"ہسٹری میں گواہ ہیں" ایک اور آواز سنائی دی۔ "بھت کا پتلا ٹوٹ کر
 میرے لوہے پر گر گیا ہے۔ میں سخت زخمی ہوں۔ لگا ہے خون بہ رہا ہے مگر میں حرکت نہیں
 کر سکتا۔ بٹے بٹے سے کوئی چیز بیٹھ بھانسنے لگی ہے۔"

"تم حرکت نہیں کرو۔ دعا اور انگار کرو مابھی مدد کے لئے لوگ آ جائیں گے۔"
 "سپاچہ ہسٹری کوئی بھانگی ہے کہ نہیں؟"

"مگر کس وقت کسی کو خبردار ہمارے مدد کے لئے بھیجے گا؟"

"اگر تم نے ہمیں پتلا ہونا تو ذرا سی کہیں آنا۔"

"جی ہاں کی باتیں نہیں سوچتے۔"

"سیری ہائیں پھنسی ہوئی ہیں مگر ایک اور آواز آئی۔"

"تم سلام علی ہوا۔"

"کی سز؟"

"بھت سے کام لو سلام علی، ابھی لوگ مدد کو آتے ہی ہو گئے۔"

"سراگر سیری ہائیں ٹوٹ گئیں تو میں فوج میں بھرتی کیسے ہوں گا؟"

"تمہاری ہائیں ٹوٹ کر ہو جائیں گی۔ اور تم ایک بہادر سپاہی ہو گے۔"

"اور کون کون سیری آواز ہی سکتا ہے؟"

"میں ہی سکتا ہوں سر جسے تمہارا۔"

"ٹیک بھانجا؟"

"ٹیک سر میرے سر میں پھنسی آئی ہے تو ان کی بہ رہا ہے۔"

"تم ان کی بھرتی سے کام لو۔ جتنی دعا کی اور سونگنی یاد میں پڑھتے۔"

"اب سب ٹیک ہو جائے گا۔"

"ٹیک ہے سز؟"

"اسیہ کا دامن نہ چھوڑنا ہے"

"نئی سزا"

"نور کوئی ہے؟"

"غلام رسول؟"۔۔۔ "غلام حسین؟"۔۔۔ "غلام دین؟"۔۔۔ "تو قیصر حسین؟"

"؟"۔۔۔ "رشید اختر؟"۔۔۔ "غلام احمد؟"۔۔۔ "غلام اکبر؟"۔۔۔ "مسعود علی؟"

انہوں نے حاضری بولنے کے انداز میں ہاری ہاری سب کو آواز دی مگر کوئی

جواب نہ دیا۔ ان کے سر کا رخ نہ لیج ہو گیا اور وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگے۔

"بھرتے ہو! کیا تم سب چلے گئے؟" انہوں نے گلہ گیر آواز میں کہا "بہت

بار گئے؟ اسیہ کا دامن چھوڑ دیا؟"

"سر مسعود علی یہاں ہے بھرتے ہاں" گھاسیو کی آواز سنائی دی "مگر سر ہیل

نہیں۔"

"تو کیا وہ بھی؟" انہوں نے سسکی روک کر پوچھا

"یہ نہیں سزا"

"انظر دانا علیہ راجھون"

پھر چار کی سوز گمری ہوگی جس سے اندازہ ہو رہا تھا کہ شاید رات ہوگی

تھی۔ مگر کوئی مدد کو نہ آیا تو ہاتھ سب پر پٹان ہو گئے۔ بھرتے مد میں خاک دانہوں نے

دل ہی دل میں سوچا کیا یہ مدد کرنے والا بھی کوئی نہ ہے ہو۔ مگر ڈکوں کا انہوں نے تسلی دی

اور کہا کہ صبح تک ان کے دہانے کوئی رہسکے ہاری ضرور کھلی جائے گی۔ پھر رات کے کسی

پیر محمد امیر نے اطلاع دی

"سر مسعود علی زندہ ہے۔ سات ہوئی آگیا ہے مگر سر وہ بہت فوٹا وہ ہے اور وہ

رہا ہے"

”مصدق علی۔ میرے بچے۔ مت گھبراؤ۔ کچ تک بہت سے لوگ مارا کرتا تھا لیکن کے

اور ہم سب کو مل کر بنا کر نکال لیں گے“

”سر میری ماں پریشان ہوگی اور بچہ نہیں میرے باہر باپ کا کیا حال ہوگا“

”سب ٹھیک ہو جائے گا بیٹا، ہوسلہ رکھو، کھو، دعا لیں پڑھتے رہو“

مگر اگلی صبح اور اس سے اگلی صبح بھی کوئی مددگار نہ آیا تو لپے میں وہ بے ہوش لڑکوں

میں باہمی تھپک لگی۔ بائیس صاحب برادر انہیں آسٹریا لے گئے اور صحت بخش کرنے کے لیے مگر تپ

تھے۔ بائیس صاحب نے بہت تھپی دی مگر مصدق علی نے بلند آواز میں رونا شروع کر دیا اور وہی

کھینٹ میں دو بارہ بے ہوش ہو گیا۔ کچھ امیر اور بائیس لڑکے اسے اگلے وقتے سے اور باری باری

پہارتے رہے مگر اس کے رونے روکنے کی آواز نہ دیا اور سہلی نہ دی۔

”سر مصدق علی کچھ بہت ہار گیا“ کچھ امیر نے کہا، اور لڑنے لگے

”سر میں بھی جا رہا ہوں“ کچھ امیر کی آواز آئی۔ ”بہت درد ہو رہا ہے۔ میرے

ہونٹ میں کچھ جھلس گیا ہے“

”نہیں اور چٹا“ انہوں نے پکارا، بہت کرو۔ یاد کرو۔ ڈنڈے سے پہلے تم

کچھ تھپی مار رہے تھے“

”بہت ہاتھ پاؤں میں گرنی نہیں رہتی، دنگ تھی ہو جاتا ہے، منہ پر مروٹی چھاپتی

ہے۔ ہوا میں پانی پانی میں، ٹٹی ٹٹی میں۔ سر میں پانی ٹٹی سے ملنے والا ہوں۔ خدا حافظ“

ہوا سے پکارتے رہے مگر اس نے کوئی جواب نہ دیا تو وہ سسکنے لگے، اور میرے

بچے۔ تم نے کچھ ایسے کہا میں سمجھ نہ سکا۔

ان کا ہاں گھڑ رہے تھے، مدات اور دن میں کچھ زیادہ فرق نہیں تھا مگر رات کو سہانا

نہاں ہونے کی کھیل جاتی تھی۔ جس سے اندازہ ہو جاتا کہ اب رات ہے یا دن۔ کبھی تھوڑی

دور کے لئے ان کی آنکھ لگ جاتی مگر پھر کسی لڑکے کی چیخ یا خوفناک غوٹاب دیکھ کر پلٹ جاتے۔ کبھی کبھی کہیں دور سے انسانی آوازیں اور آنکھیں بھی سنائی دیتیں اور سیدھے پلٹ جاتے۔ شام لوگ مدد کو آتے ہیں۔ ماسٹری زور زور سے چلاتے اور طرح طرح کی صدائیں سننے کے لئے پھرتے۔

"ہم یہاں ہیں"۔۔۔ "تماری مدد کرو"۔۔۔ ہمیں کالوٹ۔۔۔" سب کہاں پڑ گئے ہو"۔۔۔ "سہیلپ سہیلپ"۔۔۔ "کوئی ہے؟"

مگر وہاں کوئی نہ تھا۔ شام کوئی کہیں نہیں تھا۔ اگر انکار کا لوگ کہیں تھے بھی تو سیٹنگ ٹکڑے کی بھاری بھاری کھاتوں کا کھتہ بہت سا لمبے اٹھاتا تھا ان کے بس کی بات کہاں تھی۔ لڑکے جب زیادہ باہر اور پریشان ہوتے یا کسی کی حالت طیر ہونے لگتی تو مگر ماسٹری زور سے گھاپھلا پھلا کر مدد کے لئے پھرتے تھے۔ یہاں تک کہ ان کا گلہ بندہ جاتا اور وہ تک ہالپ کر چپ ہو جاتے۔

پتہ نہیں کتنے دن اور راتیں اسی کیفیت میں گزر گئیں۔ مرنے والوں کی لاشیں بھٹکے سڑنے لگیں اور بدبو سے زخمی ہونے والوں کے دماغ پھٹنے لگے۔ مدد کے لئے چلا جانا کرسب کے گلے بیڑھ گئے۔ پھر ایک روز تمباکو بھی چپ ہو گیا۔ انہوں نے خود ہی روٹا چلانا شروع کر دیا۔ اب کسی لڑکے کی آواز سنائی نہ دیتی تھی۔ ایک ایک کر کے سب خاموشی کے پاجاموں میں اتر گئے تھے۔ تڑپ تڑپ کر جہاں سینے والے لڑکوں کے مرنے اور مدد کے لئے چلا چلا کر ان کا گلہ بندہ پھلا تھا اور آواز بند ہو چکی۔ وہیں بھی اب ان کے آگے خاموشی تھی۔ اب ان کے لئے مرنے جینا ہے معنی ہو چکا تھا۔ انہوں نے مدد کے لئے پھلنا بھی چھوڑ دیا تھا۔ اپنے آس پاس خاموشی پھا جانے کے بعد وہ ٹانگے سے ہو گئے تھے۔ اب ان کے زخمی ٹکڑے کا کوئی امکان تھا نہ ہی انہیں اس کی خواہش تھی۔ ان پر کھربے غالب آتی جا رہی تھی۔ انہیں موت کا انتظار تھا۔ اسی کیفیت میں ایک روز ان پر فٹنی طاری

ہوئی۔ انہیں یقین تھا کہ یہ موت کی ٹٹھی ہے اور وہ اپنے عزیز عہدہ کے پاس ہارے
 ہیں۔ لیکن انہیں حیرت ہوئی جب انہوں نے فرشتوں جیسے لوگوں کو حساب کتاب لینے کی
 بجائے تصویریں ہمارے اور خود کو ستر چکر پرالتے دیکھا۔

یہ وہ اور ڈاکٹر کی ٹٹھی کی اہواز ہی جب ماہر صاحب ہاتھ اٹھا کر میدان کے
 سر پر رکھے میں کا حساب ہو گئے۔ انہوں نے ہاتھ پونے کی کوشش بھی کی جس میں وہ
 کامیاب نہ ہو سکے۔ نفسیاتی معالج کا خیال تھا کہ بہت دنوں تک ایک ہی پوزیشن میں رہے
 پڑے رہنے اور اپنے عزیز صاحب طہوں کو ایک ایک کر کے موت کے منہ میں جاتا دیکھنے کے
 صدمے سے ان کا ذہن باہمی کا شکار ہو گیا تھا اور زندگی سے ان کی دلچسپی ختم ہو گئی تھی اور
 انہیں کوئی بڑی چھت نہ آئی تھی۔ حیدر اللہ کے آنے کے بعد ان کی طبیعت قدرے سنبھلتی گئی
 اور انہوں نے منہ کے راستے تقابلاً بھی شروع کر دی۔ حیدر اللہ ان کی خدمت میں رہنے
 لگا۔ وہ انہیں خود جوتے پہنا جا اور سہارا دے کر واٹس روم تک لے جاتا مگر تیسرے روز ایک
 عیب واقع ہوا۔ پہرہ کو جب حیدر اللہ ان کے لئے سے کپڑے لینے گیا ہوا تھا، انہیں وہاں
 پانے کے لئے آئی تو یہ دیکھ کر پریشان ہو گئی کہ وہ بے ہوش پڑے تھے۔ اس نے انہیں
 آواز دی، بھیا چلا، مگر وہ ناموشی کے پانال میں اتر چکے تھے۔ اس نے گھبرا کر ڈاکٹر کو
 بلایا جس نے ان کی موت کی تصدیق کر دی۔

ماہرین علم کی اچانک موت کا سبب کسی کی سمجھ میں نہ آ رہا تھا۔ اس پاس کے
 برعینوں سے صرف اتنا پتہ چلا کہ وہ بیڈ پر لیٹے ہوئے لی وی پروگرام دیکھ رہے تھے جس
 میں کوئی دانشور ہونے کے سہا پہر روشنی ڈالتے ہوئے اسے گناہوں کی سزا اور شاہجہ
 اللہ خاں سے ہاتھ۔ ماہری پہلے تو خود سے سختے اور وہ رہے ہار بیڈ کے نیچے ہاتھ
 عمال کرنے کے لئے بچھے مگر بے ہوش ہو کر گر گئے۔

دیدارِ آوازِ تاک

ناگہ سہیگی کی بھلی بھدوں سے لبرج —

تین پالے —

جلت سے اتنی رامت —

لمبہ انداز سے خیر آنا —

قل از لہر بگنی دودھیا سورے کی سیر حیاں چلتا —

شامے پھولے

مگر تھوڑے —

تھوڑے دن —

تھوڑے میں پائی تھوڑے کھلی آنکھوں میں حکیم —

بیٹے جانے حکیم سے کولے آئیں اس کے مقابل —

اور وہ ان پانچوں میں شاداب، ہم عمروں کے ساتھ سیلاب پا کھلا رہا، نظروں کے پھینکتے، رہم غفلتوں میں، کھتا پارا طرف بھین بھکا کے دودھیا سورے میں مل ہوتی سمجھ کی بھلی سڑتی تک آنکھوں کے ہند، بچھا کر کھلتے، مگر کی پھر ملی دودھ سے رکت کھانا گرم کھلنے کے ہتھ شعل ہلی کا کھانا، دست قدموں سے اسے کھانے پر بھونک کر مل کھلتے، بھونکے، دودھیا کے ہنوں کے کھلنے سے لگے اس کی چادر سے من پانچھٹے کھانے کا دودھ، دودھ پھاری ہستی شامی سے ہند نظروں کے ساتھ ہی اسے دیکھتی، دھنا ہنوں کے ہتھ لگتی، ہنوں میں تاک ہاتھ کی پھرتی دیکھوں سے کھنکھن ہاک پھینکتے میں

ہاتھ چاہا، ایک گرم کپڑا، پلٹری میں بخیر کا ٹکڑا، سیب اور خربازہ کی گڑھا، گھن کی ایک چھوٹی سی
تھری یا آدھی چمٹاگ، تھمدانی، ایک کھلی کی بیال میں ڈالنی اور نیم گرم بھیڑ کے دودھ کا
تلاک بھر، ایک لیوان، سب کچھ اندر اجارتے تاکہ کھلی سی ڈکار بھر باہر کی اور اٹھتے قدم
ہوئے حد تک جاتی اور نوامی دینا توں کی جامع مسجد کا مرکزی دروازہ، گھن سے بلند
ہوتی توں لیوان آوازوں میں ٹھٹھ اور بند آوازوں سے بھر، دودھ، دودھو بیٹھے،
یہ قرآن ان کے بچے کرتے دیکھ چھتے، دہتے، یادوں کے تہ خانوں میں جاتے۔۔۔

آوازوں میں زرد ٹھٹھ زرد یا اور کی لہن میں اونچ نیچ ہوتی تو قد کاٹھ اور عمر کے
لہو جاسی لہی جتی کے ساتھ چار پانچ وقتے لہنی سے ہوتی دھنلی، اوپر کا کھانا معطل اور
یہ ما بھگیا سا پھر وہ قدموں کے ساتھ بے آواز، جانوروں کا دم پھٹا، نور اگر کسی بھی
دوبے کا محفل اپنی تھیلی مٹانے سوال پر چھتے کی جرات کرتا تو فراہت میں لہنی گالی،
تک، سطر، زر، کافر اور ما جواب گالیوں کے طومار میں مرغا بیٹنے کی رسم عام پشت پر عصا
سے چار پانچ ضربیں اور ہر ضرب پر لہنا تا لہنا سیدھا ہوتا ہے، ہاتھ جھولتے، گریہ زاری
کرتا، کچھ بوجھ کی گرفت میں نہ سمجھتے تاکہ وہ گناہ کی معافی مانگتا اور آئندہ کی توبہ بھی ساتھ
نہی کرتا مگر خردی فراہوں کی بلکہ میں گریہ زاری کرتا عصا کی ضربوں سے ڈرتا، کاپتا پھر
سے مرغا، ہاں باپ کے دودھ، پلٹری شکلات کھولتے ہی ماں آرزو، کھلی سی منٹا ہٹ میں ملا
کے بے خواہی سر دیش اور بداما، مگر باپ کا جگر کھال تھا، اور وہ ملا کے ہاتھوں اپنی
بے درد، دھنلی کے جھٹک جن گریہ کا دھن، دھن، ہبیار میں سیاہی، اور ہاتھ پر ہاتھ مارے
نور اپنی کھلی شرب کے جوڑے میں ہاتھ ضربوں کو گتے ہار ہا دہراتے قوت برداشت
کھا کرتے ہر شیر بیٹے کی گھن اور اس پر ایک چپ ہی بھلی۔

بعد از ہند تمام لہنے تک، جانوروں کو چھتا، کھتا چتا پھرنا ہوتا یوں کھتا، تانان
کے آگے پیچھے ہڈائی کی مت میں دھا، ہڈات میں مصروف کار، بھلوں اور جانوروں کیارات

دن کا کھولا قریب امام عروسی، کہ سرکار بدل گئی، حیرانی میں دیکھتے سنتے سرگوشیوں میں ہر نام فحشی بجا رہتے، کہ سرکاری احکام دہری نے حکم ناسے کا ذمہ لیتے ڈالا، چھوٹی زمینوں پر چھ لڑتے پہنچ سو، سوائی کا اعلان، دل جوتی سے کارکنان کے پیروں پر خوشی کا ابھی نور چڑھای تھا کہ کٹا دزدی کے آگ غیر ملکی مشیر کا قتل ہو گیا، قاتل کی سزا میں فوجیوں کی پکڑ دھکڑ شروع، سلطان سوائی قرضہ جات اور سود کے چھٹکارے کے حکم ناسے سے مرود تو پہلے ہی سرکار کے خلاف فیکہ و فطرب کا پڑا اوزھے بیٹھا تھا، کہ فوجی دستوں کے ہاتھوں کی دھمک داسے دن مرود کی سرزنش کے ساتھ قاتل کی کھوج میں مدد کا حکم نامہ صادر ہوا تو غصے کو اندر بکرتے، ہاتھ پیرے پر مسکراہٹ لاتے، تائید میں سر جلاتے پانا بگر دابھی کے قدموں تک اندر آتا کھولا و شہید ہوا، کہ اس کا سینہ شکن ہونے کے قریب اپنے گھر سے کے مدد دیکھ کر کھوتے، اسارا قہر مرود نے سرگوشی میں امام مسجد اور خادمین کے کانوں میں اٹھائی دیا، حکم کی تعمیل میں پھرتی، امام مسجد نے قصبے اور خادمین نے اطراف کے دیہاتوں کی ذمہ داری سنبھالی، اور عشاء کے بعد ایک ایک گھر کی کنڈی بجائی، دکنہ لینے کے بجائے سرگوشی میں پہلا پیغام، کافر قرآن حکیم کے جھانے اور مسجدوں کے ڈھانے کا باثبات ہن گھرا اشتہار۔

گدہ لوج کی بیٹھنی پو غیر ملکی صلاح کار کے کشاد دزدی، مال سوبیٹی اور مرطباتی کے تریجی گورنر سے ہر کار کے ناکج میں نمایاں بدھوتری دیکھتے حد درجہ خوش، مگر ما اور مرود کی سچ لوہی سے دم بخور، بولیں تو کیا بولیں قبائلی بزرگوں کے خوف سے زبان پر چاہتوں کا جہا مگر وہ بھی ترک کراتی ہاں کی گود میں چاہا سلا کی ہزل سرائی سنتے ہی اندر ہی اندر مشتہد، خود کھائی کے غیبک و غلطان، سچ بنگلی کے ساحل سے جا گرایا، چند ہی لمحوں میں سارا قہر جتنی اڑتی بھاسپ، وہیں سوالوں کی گھڑی کھل گئی.....

مہاراجت کی پہلی شق.....

مکرم مسہد سارے سوالوں کا تو کیا، ایک بھی سوال کی دھنگ پر وہ کھولنے سے
 چھوڑے، بس سے لہا لب لہر نہ بچانے کی ایک لگاتے ہی ہونٹوں پر چپ کا سرداری ہماری
 ہر کم ہندو مگر مگر ہر کے سارے بزرگوں پر سرداری قبر کی نہ نکلر آتی کڑائی کرتی تباہی
 ہتی غم و اندوہ میں گندھے چروں کی گرج دار آواز میں اسے اقباء لیکن ملا کے بھر میں
 ہی شای غمگن نہ اتری، اس کا چہرہ مجھے سے سرخ بھوکا اور اسے کھرتے، بڑ بڑاتے
 ہوتے تھکا چلا گیا، مگر اس نیک میں لپٹی بڑ بڑاہٹ کی شد زوری صبح صادق کی لڑھکی کے
 ساتھ ہی بل پڑی۔

خفت بدشوں میں بکڑا ہے سدھ تو جوں، خردن کی پہلی شدید ضرب، اس کی
 آہ و بکا میں لپٹی تو جی ہے ہوئی، زمان کے گپ اندھیرے میں گئی کھلی آکھیں، اور
 غریب لگاتے، اسے سرے سے بیت کرنے کے اقرار سے کے لیے، بل پڑتے، جیسے
 چلنے لگی گاویں دیتے سارے مگر بے موجب سزا پر اس کے دلو بے میں نکلوں نکلوں
 میں بگرنے سوال خوروں میں سنی ان سنی یا وہ گوئی مسہد۔

اور وہ لہو لہان ہے حواس۔

سردار کا اپنا ہندی ناز مختلف گوشوں سے اٹھتی حلا کی اور آہ و بکا کی ریم مانگی
 آوازوں کا شور، لیکن جاز اور کا نفس بائبل جدا ہے کی سٹافوں کے پیچھے، چھوٹا سا نیم
 روشن لوطاق نکھیا سا بندش، خفت سمیٹنا بیستہ فرس سے اکڑی تھک ہوئی کر کے ساتھ پہلی
 آواز پر ہی کھلی جھت کے زردی بائبل پر لگی گرفتار آکھیں چھڑاتے ہنہ پھاتے،
 حواس میں سینے کھل مندی سے بیدار ہوتے چہ مردہ، دست و پا، اشمال آنکڑے میں
 لگا قبوی، سانس لیتی زندگی اور سکوت مرگ میں صرف وہی دن کا قاسم۔

خود میں حاصلوں کو طے کرتی قید تباہی۔

لیکن کس اہرام میں؟

وہ اب بھی اپنے دلوں کے جواب کا منتظر

ہیں جو اب میں دشنام کی برتی گولیاں

یا کردہ جرم سے حسد

قتل کے جرم کا قانون کرتا ہے

اک نکل بھری، بھاری بھر کم عدالت

جاری کردہ اک حکم بارود۔

روایتی صفت پر اگندہ حالی میں بیٹھا، کھینچ جان، الزام کے پوسلے میں مڑھا کر

پیلے ہی الفاظ میں اگرتے ہوں، آٹھوں کا تختہ کیت، اتنا درختوں کی گھٹی چھانوسے ہوئے

چھترے پر آئی منت۔

حاکمیت قاہری جمال کی نسل وکیل

جرم۔

انسان قزاق سے بہراڑی کی مسطوری بہروردی میں آویزاں، نسلی و قباکی قوی

میں آئی منت۔

پانچ بان کی کسی ہولی چار پانیاں، اوپر بچے چارخانہ سفید گھریلے سینے سے گھر بھیں

سورتن پر بھا ہوا، ایمان، بظاہر عام مگر علم کی مین سے بھی ناپید نکل پانچ، پانچ قوی بیٹکی،

مسلم اقبوت حکم، جگت رستا پر جاتی ہر گامی و دلیل، ابد وکیل بہت کی لوک پر دھری،

قرو، نصب میں پروردہ تک فرماہوں میں سب یکہ مسترد، بھتی ترتری سے پھوٹی لیٹھی کڑی

ذات، پھولی زبان، آواز لگرت و گراہت میں کم، آگھوں پر چھانکے دودنیاد سے بھٹتی خون

آہام بھتقال ہانت۔

جرم کا فیصلہ حوالگی سرکار۔

گھرا گھرا کمال آوے میں پلٹ، پھانکے ہی گری دم بھید کرناکے، دیا پھانکے

میں آ رہی ہیں۔ آخر کار خبر دہری کی بڑا کامیاب شب خون، قاتل کا گمراہ بچنے، اور پشیمان
 کو سے باہر لگانے میں سرکار سے کیے سرداری کے قول و قرار کی تکمیل۔
 کہ جن دن اور تین دنوں سے سبوں کے جال میں کسا، ایک ایک لمحے کی بار
 ہر تصویر میں ملتا، روکتا، پھر کھولتے جتے اور سے میں جتا جاتا، اور ہلکا کے پتے کے کی
 پہلی ہی طرف اشارہ کیا، بگاڑنا یعنی چپ کی بگی میں سستا سردیوں کے تھکے لگانے دار
 ہر جگہ جھٹ سے چھوٹے سردیوں کی پگھال سے اک لٹا گھونٹ آد کا بھرا کہ انتہائی
 راز داری سے بسا لگی سونے سے ملا لگی پتی جالوں جیسے سرداری تھا چہ چپ انتہائی
 بلی کی چھٹی لہر تو سوچ میں لڑی بند ترنگ کم گنڈ گرن سے بڑا کسب اور پھینکا
 سولوں کے پیچھے ہر شے کی ہی گئی مد بندی اور میں مات کے اندر کھے لہوں کو دیکھتے، رتوں
 کے پیلوں پر عمارت بھیرا، لہنوں میں کھچے سردی اسے چرے اور ٹھوسا ماتھے کی
 پہنوں پر ٹھوس ٹھوس، ہلر سے لگا ہر لگی ٹھوسوں کی دھک، ہواوں کا انہوں پھر سے ۔

ماتھے پیچھے دست و گریبان

ماتھے ٹھوسوں

دہری

ماتھے کار کے قتل پر آ رہا تو تھے ہی

گرنے کے کا فیصلہ

اک بے قصور لاجپار قتل کا اہرام

ہو رہی اہرام میں کھنڈے، یک جا ہوتے، گھٹی بند

داؤد کی حکومت کا اعزاز تھو، ہزارہ حکومت کی تقاریر پر کوہاٹی اصلاح و تعلیمی
 کونج، زمینوں کی آزادی، کونج میں غیر ملکی اصلاح کار کے قتل کی خبر نہ صرف گمران بلکہ
 ساری ولایت ہرات میں پھیل چکی تھی۔ لہذا اسلی طریقے کے بیشتر نو جوان تعلیم کا سورج

طرح ہوتے، کارہائے حکم سیری کے فروعی نتائج کی روشنی بھی ابھرتے دیکھتے، بلوئی سے
 بنے کھنڈے مگر ہر کام پر ملائی حاکمیت کی سکڑتی نارسائی، خصوصاً مدارس مساجد میں حصول
 کی سوز و گم ہوتی تھا اور سرکاری مدارس میں بے بس قربت میں اسلے بچوں کی ملوث
 تعلیم، نصیحا جاگ اٹھا، ملائی حرمیں خواہی کا زوال، سرکاری کارے لیسوں کا فروغ نہ
 آفتاب برداشت سے باہر، اس کے اشارے پر ان کے بزرگ زبردست ناپسندی قہر توڑتے
 گالیاں دیتے، ہر بیچھتری پر ناک بھوں چڑھاتے، مگر گھر میں کفر کا فتویٰ دافعا تو خاتہ
 وہ حالت چڑھائی میں سر جھٹکے، باغات تاک میں جتنا سورج و تجزیے میں غرق، کہ گھر
 میں چانک دلت نہاد سارے باغات میں بیجان برپا ہو گیا۔ کرغ سے اہتمام غنی اور جسے
 کے خصوصیت قید و بند کی خیر تھی اور اک گولے کی طرح ان سب کے سروں پر گری اور
 سب عالم قہر میں مقید۔

اور وہ۔۔۔۔۔

اس کا بگر جان۔۔۔۔۔

ہاں ہاں میں۔۔۔۔۔

اک دوست بگر جان، کہ اس سے بھی بالاتر عزت نفس، تعویذ دل پر کندی
 تھی، بھری منسوب اس کی بسن سید سنگ نشان کہ جسے دشنام کو کانتی تیج ہمیش تیز رہا
 مگر اب داو میں جاگ اٹھا کا فتویٰ سارے رشتے تعلق اور دوستی کو منقطع کرتا، بس ایک ہی
 گلیتی خیر۔۔۔۔۔

گھر میں۔۔۔۔۔

قبیلہ کی عیبت کارہائی بننے سے پہلے ہی، وہاں وہی، یہاں گندی گئی ہاں
 بدش، مگر سے باہر دولت آبادی کلہ دراز سے باہر تھاج، کفن ہاں سر، اہمیت چیلہاں
 تو ایکب تغیر میں گئی۔۔۔۔۔

مگر کبھی سوچوں میں روزانہ حیرتوں کا فراموشی غالب —————

پر ترکیب کی رمل کا تا سوال —————

یہ سہاؤں کا خطو، مجھے گھبرے میں لیے دہرے بھی دور —————

اس قیدی کی بے چارگی رگ و پھل میں اترتے عزم و الجزم —————

اس حواس ہانگی میں سوسے بہاؤں تو یہ دور از امکان —————

مگر اس عالم بھتھار میں عمل کی چالی ہوئی کہاں گم —————

یہیں میں پھر بھی طبع کے کالے مہروں کے پس پشت ڈھالی گھر کی چال

پہلے کا انہماک، دو گھروں کی چھاگک بیدار بیدار گھری، دو اشتہار گیتے، الزامات کی

فرہوں کے سانچے سے چپکنے چپکنے بیگنوں کے ہماری بھرم و جوں، سر جھکانے، ایک ہی

سیدہ میں روزانے دو سے کا بیڑ شوق کرنے، مگر نجا آہوا گھر، دائیں دائیں گھومتے، نقد

شہوات اور تو ہوا، کشت کا دکھانے سے بھی معذور —————

اک پارا ہوا، عالا و بھیر قیدی، کشت ہونے کے لمحات، ماسخان بے بسی میں دھار

کچھ سے مدد ہی، مجروح ہونے کا اندیشہ امداد سے دائیں کرنا کرب —————

اور اسی کرب نے مجھے مہارزت اور جد پر لاکڑا کیا —————

اک مہذبہ مہارزت اور —————

اور اسی شام، چپ چپتے، چار شیریں ساتھی اس کے ہم رکاب، برف سے ڈھکی

براک شے پر گرتی، موسم سرما کی اٹھائی ہلکی ہلکی برف پاری، موسم سے آشنا، گھوڑوں کی

از خود لہارت تھا، ہلکی رفتار پر بگھرائے سے سوئے کرنا —————

ساری راتوں میں اس لہر آگھوں میں کھول ہوتا، بھٹکا، گریبان جھمکوا جاتا، چپ

کے بطنے جھوتے، کبھی کبھی ٹھٹھٹے لار کے شعلہ پاتھوں، جواب کی سماں کیسے سوتی جائے کہ

مگر تو کی چنگ لڑن، گرتا دوراں کے سر سے سرواتے، ہانگی خ بگر اہلی چال ڈھالی گھر

اور میں چپ بھر چکا۔

جرگے کے مصلوب کرنے کے پانچویں دن، شام کے دھندلے میں وہ پانچوں
 صب نیلے پخت، اسی رفتار سے گرج پار کر گئے، اور ہر ایک نے نظر مٹانے کی اڑان کے ساتھ
 ہی ہدف سے صاف شدہ سڑک کے کنارے آگ بڑھائی کانٹے کی روشنی نمودار ہو گئی،
 سفید کوہ کے قریب، جوار کی بھٹی بڑھائی، اور جوار کے دو ٹکیوں سے اندازاً اتنی ہیست
 ہوتی پہنچتی تھی، گھوڑوں سے اسٹیل کے پھر ہی ہم پانچوں بیادہ، ہدف کی ہکی
 تہ داری گھٹن پر حکم پانہ بھانے، ہم نکاب پوٹنگ نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھا، یہ
 جھکانے کے عقب میں بند ہونا چھوٹا سیاق ہے نا، یہ کہہ رہا ہے ہم نکاب کے نزدیک
 ہو، جوں مردی سے بلا خوف قدم ہارتے اور ہنرہ زار میں ہانپو گے تو سچ روشن ہو جائے
 گی، تم تیرے قوس میں برائمان، بے ہنگام ہمارے خطر ہم میں اٹھو اور قیدی سمیت
 لوٹ کر آئے کہ آئے ہم انگار میں منتشر مت ہونا، تو تم لوگ بھٹے ساتھ کون نہیں لے
 جاتے، زیادہ بندوں کی ضرورت نہیں، وہ آجائیں تو جیسا سمجھایا ہے نا، انہیں لے کر
 سڑکان دیر سے تھیال نہیں اب وقت نہیں، ہم آگہ میں سرور سہا کے ٹھہرو۔

میں حیرت۔

مہاراجت سے پہلو ہٹ کر سے مدعاقل۔

ہنرہ زار کی لوٹ میں قدم آدم ہو چھائی کاٹار۔

دیر، توں تاب نگی ہوئی لگر کی لوٹ میں روشن آتش۔

ساتھ بھجایا لڑش۔

طرسی کا ترس کھلا کانٹے سے آئے ہن، لیکن، نچی، کھاب ہر، ہنرہ اور دماغ کی

تاکل ہو۔

لوراک برکل دگر۔

یار آئے تو رکھے گل شراب —

تین شراب کے پیالوں سے لبریز ہو گئی —

وقت فرار پائے ملی آج اور تردد کے اندر صبر کو گرتے چاک —

سرگوشیوں کے چند پیالوں کا آہنگ دل نوا —

صبح کے ہی وقت بیباک شراب کے تین پیالے کہ غم و اندوہ ناک اور پھر سے کی

گداوت و طمان زانگی —

ہو رہا ہے غمگین سے بچنے —

تجسس و استکار میں ہو گیا بسا نا شکر —

بند طبیعتوں کے در بند —

اور کان پوری اعلان پر چلے —

آئے والی ساریوں کی آہٹ پر بھیا، گل و گلزار فرشتے —

بہر لا سماعت بہتہ رنگ —

کہہ دیا کے ہو، کسی دور کے نہ سے آتی مدغم الا ان —

اطلاق صبر —

وقت زوال —

بچے سے آتی آگ گروہ کی آہٹیں —

اور میں —

کمان میں کھنچا جاتا ہوں —

آجدار کچی بوست —

غار سے باہر —

پھر مسلسل گرتی ہوں کی شرمگی —

آئیں گے۔

گھروں کی گتیاں ہیں، دوپٹے دوپٹے راستے، دروازے اور کمرے کی دروازے اور کمرے
 پھر وہاں پر پانچوں سے اگلے اور پانچوں سے پیچھے دروازے کے سربراہ، ایک سچا دستہ دکھائی
 ایک ایک دروازے پر تھوڑی جگہ سے گھومتے، دروازوں سے دروازوں، پانچوں میں
 گھر کے چروان کی حد تک پہنچیں، کہ ہر شے، ہر دروازے، ہر کمرے کی گھڑی، ہر گھر
 کرتے اٹھتے، گھر میں کہا، ہر دروازوں سے سفید، خوبصورتی کے نئے میں اٹھتے، ہر
 فطرت، ہر شے سے سفید، ہر شے کے مطابق آنے کا اندیشہ، ایک ہر اکھڑ، ہر شے
 کا ہر شے، ہر شے کے مطابق آنے کا اندیشہ، ہر شے کے مطابق آنے کا اندیشہ، ہر شے
 میں رہے پانچوں سے اگلے اور پانچوں سے پیچھے دروازے کے سربراہ، ایک سچا دستہ
 گھومتی گھومتی ہر شے، ہر شے کے مطابق آنے کا اندیشہ، ہر شے کے مطابق آنے کا اندیشہ، ہر شے
 کے ہر شے سے ہی اٹھتے، ہر شے کے مطابق آنے کا اندیشہ، ہر شے کے مطابق آنے کا اندیشہ، ہر شے
 شے کے ہر شے سے ہی اٹھتے، ہر شے کے مطابق آنے کا اندیشہ، ہر شے کے مطابق آنے کا اندیشہ، ہر شے
 پنے ہر شے کے ہر شے سے ہی اٹھتے، ہر شے کے مطابق آنے کا اندیشہ، ہر شے کے مطابق آنے کا اندیشہ، ہر شے
 تھوڑی جگہ سے اگلے اور پانچوں سے پیچھے دروازے کے سربراہ، ایک سچا دستہ دکھائی
 گھر میں ہر گھر میں

آنے والے تو آئے اور گئے بھی

اور وہاں کی سوتے سربراہ کے خیال

ہر شے کے ہر شے سے ہی اٹھتے، ہر شے کے مطابق آنے کا اندیشہ، ہر شے کے مطابق آنے کا اندیشہ، ہر شے
 گھر میں ہر گھر میں، ہر شے کے مطابق آنے کا اندیشہ، ہر شے کے مطابق آنے کا اندیشہ، ہر شے
 گھر میں ہر گھر میں

گھر میں ہر گھر میں

وہ تو بچے۔۔۔۔۔

اور میں خطر ہوں۔۔۔۔۔

مقتول پہرے دار ملازموں کا حساب لینے کوئی آئے نہ آئے، بیچھا کر لے
والوں کے لیے راہ میں خاک، داک، ہفت دھاتو، سد سکدری۔

لیکن ساتھ ہی میں سوچتا ہوں کہ اس چوکھی مہارزت میں دو خالی خانوں کو کبے
پھاگوں گا۔۔۔۔۔

گھوڑا تو بچے۔۔۔۔۔

کافے کے اسٹیل میں۔۔۔۔۔

اور وہ۔۔۔۔۔

ہاں ہاں میں۔۔۔۔۔

ختم۔۔۔۔۔

اوپر غار میں۔۔۔۔۔

خوابوں میں بانگیوں سے نبرد آزما۔

•••••

کوئلیس

وہ لاہوری کی بیڑھیوں پر ہیں بیٹھی تھی جیسے بھینٹ کھانے کے بعد وہاں
 بھین پر چند ساتوں کے لیے آن بیٹھی ہو۔ آنکھوں میں حشر مندی اور لبوں پر مسکراہٹ ہیں
 تھی، جیسے غلاموں کا ایک لشکر توجہ اس کے سامنے ٹٹن ہو۔ بے نیازی اس قدر کہ اس
 کے سامنے بیڑوں کا ٹھکانا نظر آئی۔ لیکن اس کے اطراف سے گزرتا ہوا ایک جھوم
 اس کی سوچوں کی سے لاطعی، اپنی دھن میں مست است ہیں کہ جیسے وہ ٹھکانوں میں ہندسوں
 کے بیڑے ملے۔ مجھے یوں لگا جیسے وہ خود ہی قانع تھی اور خود ہی ملتی۔ شاید اس نے کوئی
 جگہ لائی تھی، جو شاید اس کے اندر ہی تھی اور جو اس نے بیت لی تھی۔ میں نے لڑکی کے
 پاس پر نظریں گاڑیں، پھر جھوم کو دیکھا، کسی آنکھ میں لڑکی کی اسیری نہ تھی۔ شاید ایک
 دل تھا، جو لڑکی کی مسکراہٹ کے ساتھ جھڑکتا تھا۔

میں اتنی دیر سے ہی، جتنی دیر سے لڑکی لاہوری کی ۲۷ ویں بیڑھی پر مجھ سے
 پچاس فٹ کے فاصلے پر آ کر بیٹھی تھی، میں بھی بیٹھا ہوا تھا۔ مجھے یاد نہیں رہا کہ میں اس
 سے پہلے یہاں پہنچا تھا یا اس کا پتہ کرتا ہوں۔ اب جو بات مجھے یاد رہ گئی تھی وہ یہ تھی کہ
 تمام حصوں کی بند و بالا کھات، چینی ریستوران کی کھنٹی فضا، ۲۷ ویں اور اب قادری سینٹر
 خرمند، پہلے چلے ہوئے پبلک لاہوری کی ۲۷ ویں بیڑھی پر ایک دوسرے سے پچاس
 فٹ کے فاصلے پر بیٹھے تھے۔ کب سے؟ مجھے یہ بھی یاد نہیں تھا۔ بس جب سورج
 نکل رہا تھا، تو میں نے اسے دیکھا تھا، شام کب وصل گئی، رات کہاں پہنچی گئی، روشنیوں
 نے کب صبح نور شید سنہا، مجھے کچھ بھی یاد نہ تھا۔

وہ کچھ دیر یا شاید بہت دیر سے اپنی کہنی لے اوریں سیرنگی پر نیچے اور پاؤں دھو کر
 اور اوریں سیرنگی پر پھیلائے گزرتے ہوئے جھوم میں گم رہی، پھر وہ سیدھی ہو کر بیٹھی اور
 اپنے دونوں پاؤں سیدھے کر کے ہوں نیچے لٹکا دیے جیسے دریا کے کنارے جھلی پہ
 دونوں پاؤں پانی میں اتارے گزرتے پانی کے لمس کو محسوس کر رہی ہو۔ وہ تھوڑی سی آگے
 جھلی اور اپنے دونوں ہاتھوں کو اپنے گھٹنوں پر رکھ کر کچھ سوچتی رہی، یا اس نے اپنی سرہن
 کو کھول دئے وہی تھی، پھر سیدھی ہو کر بیٹھی گئی اور اپنا سر گھٹنوں پر رکھ کر جوں گم ہوئی کہ
 سارا منظر میری نظروں کے سامنے سے گم ہو گیا۔ میں نے گھبرا کر اپنے چاروں طرف
 دیکھا۔ مجھے حیرت ہوئی کہ آنکھیں اس نے سونہ جیسے اور منظر میری آنکھوں سے گم ہو گیا۔
 میں نے اپنی آنکھیں اپنی آنکھوں پر ملنے ہوئے انہیں الگ کیا، تو سارا منظر پھر لوٹ آیا۔
 شاید لڑکی میری آنکھوں کا پردہ بن گئی تھی۔ پھر یوں بھی جب کوئی آنکھوں میں بسا جاتا ہے
 جاتی دیکھنے کی گنجائش کب رہتی ہے۔ سنا ایک شور سا ہوا، پبلک لائبریری کی تیز دھواں جہاں
 سڑک سے ملتی تھی، ہانگن وہیں ایک سیاہ قام لے پھل دلا کر چا تو کھولے سلید قام ہلکے
 کے لیے ہوں پر تول رہا تھا، جیسے تھا ہوا مرنا بالقابل سے آخری وقار کے لیے چارہ۔
 سیاہ قام کے حذر سے ٹھون بہ رہا تھا۔ پھر کیا ہوا سارا منظر آوازوں اور میروں کے سیلاب
 میں ڈوب گیا۔ مگر وہ اب تک اپنے گھٹنوں میں سر دیے پانی کے لوہے تیر رہی تھی۔ میرے
 اندر ایک خوف نے جنم لیا، کہیں یہ مرنے لگی ہو۔

وہ ٹھکرا کر بس رہی۔

”انہیں۔ ہم جیسے لوگ اتنی جلدی کہاں مرتے ہیں۔ ویسے یہ الگ بات ہے کہ
 معاشرے کی اثر پذیر ہیں مردے ہی سمجھتی ہے۔“
 مجھے اس کی بات پر حیرت ہوئی۔

”پھر اتنا شور بھی تمہیں جگانے کے لیے دکھائی کیوں ہوتا۔“

اس نے حیرت سے لکھے دیکھا۔
 "میں سولی کب تھی۔ میں تو سارا منظر دیکھ رہی تھی۔"
 "اچھا۔۔۔"

وہ پھر کھٹکھٹا پڑی۔

"تم جہیز ہو کر میں نے سرائیا کر سارا منظر کیوں نہ دیکھا یا شوہر من کر تہااری
 طرح جہیز کیوں نہ ہوئی۔ یا جس طرح تم شوہر ہو گئے تھے، میں کیوں نہ تھی۔" اس
 نے ایک ہی سانس میں دو سارے سولی کر دیے جو میں اس سے کرنا چاہتا تھا۔
 "ہاں یہ ہے کہ تم نے ہو۔ آج ہی آئے ہو۔ اس لیے یہ سب کچھ تمہارے
 لیے آیا تھا، اور میں۔۔۔" اس نے ایک زبردست مسکراہٹ کے ساتھ ٹھٹھے سے باہر
 دیکھا، پھر اپنے دہلی بیگ سے سگریٹ کا پیکٹ نکال کر سگریٹ سلکائی، اپنے سامنے رکھے
 ہونے لگاں سے ایک کھونٹ لیا اور اسے ملتی سے لیے اٹار کر میری آنکھوں میں دیکھتے
 ہوئے بولی

"اور میں۔۔۔ اسی دن پاتھ پر پیدا ہوئی تھی۔ یہ میری ماں ہے۔ اس کی گرم و
 سرد ہاتھوں سے پلٹ کر میں نے۔۔۔" اس نے عمارت سے اپنے جسم پر ایک نظر دوڑائی
 اور ہاتھوں کا اشارہ کرتے ہوئے بولی:

"میں نے یہ جوائی اسی دن پاتھ پر اپنا چھین سچ کر حاصل کی ہے۔ آنکھیں
 کھلتی ہی تو لکھے وہی کچھ نظر آتا ہے جو میں آنکھیں بند کر کے دیکھ رہی تھی۔ البتہ منظر
 میں ایک تبدیلی تھی۔"

میں سمجھتے ہی اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔

"تمہارے منظر میں۔۔۔ روز کے منظر میں ایک تبدیلی تھی۔ وہ تم تھے۔ پتہ نہیں
 کیسے منظر میں اس تبدیلی میں بدلے ہوئے تھے۔"

وہ ہنس دی۔ پھر ٹھکسا اٹھی۔

"انگ سے لگ رہے تھے۔ میں منظر دیکھتے ہوئے تمہیں سوچا رہی تھی۔ لیکن

انہی بات انگ ی تھی، ہاتی سب یکجہ وہی تھا۔ روز جیسا۔۔۔ برسوں جیسا۔"

شہر بڑھنے لگا تھا۔ ایک چچا بلند ہوئی، پھر کیے بعد دیگرے کچھ فائر ہوئے، پہلی

کھائی کی طرح پھٹ گیا۔ میں بے اختیار اٹھا، لڑکی کو جھنجھوڑا، اس کا ہاتھ تھاما اور اس طرف

بھاگنے لگا۔ ہر سب بھاگ رہے تھے اور اس وقت وہ میرے سامنے ٹھہری تھی۔ ہاتھ سے ہاتھ لگا

رہی تھی۔ کیسی تھی؟ بس ایسی ہی کہ گزشتہ بارہ کھٹے اس کے تعاقب میں اور نصف گھنٹہ اس

کے ساتھ گزار کر صوبوں کے گزر جانے کا احساس ہوا۔

"کیا سوچتے گئے"

اس نے تیسرے پیگ کا آڈار دیا۔ میرے سامنے جو کچھ بھی تھا، جنوں کا توں

تھا۔ بلکہ میری آنکھوں میں "ا" کھینچنے لگی جو کچھ تھا جنوں کا توں تھا۔ حیرت، استہباب، مشاہدہ

کرتا منظر۔

"سوچ رہا ہوں۔ یہاں پہلے کیوں نہ آ گیا۔"

"پھر کیا ہوتا۔۔۔"

"جو آج ہوا ہے۔"

"پھر کیا ہوتا۔۔۔"

"وہی جو آج ہو گیا ہے۔"

وہ ٹھکسا دی۔

"جو آج ہوتا ہے، آج کے ساتھ ٹھم ہو جاتا ہے۔"

"لیکن گل بھرا جاتا ہے۔"

اس نے سر سے ایک لمبی سا لہری۔

"کل کون ہوتا ہے۔ ہمارا منظر تو آج میں ہے۔"

"تمہارا گھر نہیں ہے۔"

سوال میں کہ اس نے میری طرف یوں دیکھا جیسے اس نے کچھ سنا ہی نہ ہو۔

"تم اکیلی ہو۔ بہت اکیلی۔"

"ہی۔۔۔"

اس نے حیرت سے مجھے دیکھا۔ شاید پہلی بار پوری نظروں سے دیکھا تھا۔

"مجھے تو تم اکیلے نظر آ رہے ہو۔"

"شاید میں بھی اکیلا ہوں۔"

اس نے ایک اور سگریٹ سلکایا۔ ایک لمبا کش لیا۔

"کیا نام ہے تمہارا"

"مسافر۔ اور کیا نام ہو سکتا ہے۔"

وہ پھر نکھلا دی۔

"مسافر۔۔۔ منزل کی تلاش میں پورا اٹلانٹک عبور کر لیا۔۔۔ منزل ملی۔۔۔؟"

میں نے پہلی بار مسکراتے کی کوشش کی۔

"شاید"

"بھوت۔۔۔"

وہ بھر بننے لگی۔ وہ تک ہستی رہی۔ پھر اپنا سامان سمیٹنے لگی۔ سب چیزیں دینی

تک میں رہا کہ دروازے ہاتھوں کے سہارے سے کھڑی ہوئی۔

"کل ملے گی۔۔۔"

"سنیں۔۔۔"

"پلے گی۔"

لالہ جسونت کی حویلی

واگ سے کلیرنس کے بعد جب حکومت ایکسپریس لاہور ریلوے اسٹیشن پہنچی تو
 پروٹی اور کاہر کے ٹکٹ، پان پھالیہ کے قہیلے، بٹاری اور زردوزی کے بھری بندھان
 فیلیوں پر لادے قیوں اور پھیری ہارو کے دھم بلی میں ایک وہ بھی تھا۔
 وہ، جو لاہور میں اپنے پرکوں کی حویلی اور گل محلہ دیکھنے آیا تھا۔ تاکہ ولی واپس
 جا کر اپنے بڑھے اور بیار باج کو بتا سکے کہ اس نے جو کچھ ان کی زبانی سنا تھا سب دیرا ہی
 ہے یا بدل گیا۔ اور چند ایک چھوٹی چھوٹی فرمائشیں تھیں باج کی، جنہیں پورا کرنا تھا۔
 واگ میں کلیرنس کے الجھوڑے از حد تھا دینے والے تھے اور اسے کسی بات کی
 ہڈی نہ تھی۔ گاڑی سے اتر کر وہ لاہور ریلوے اسٹیشن کے دور تک پھیلے ہستی شینے کے ایک
 مڑائی سٹون کے ساتھ لگ کر کھڑا اور تک اپنے باجو کی ہدایات یاد کرتا رہا تھا۔
 دلی ریلوے اسٹیشن پر جب ٹرین کے ڈبے جوڑے جا رہے تھے تو باجو نے تاکید
 کی تھی کہ پاکستان پہنچ کر سب سے پہلے پولیس اسٹیشن میں اپنی آمد کی رپورٹ کرنا، پھر
 ریلوے اسٹیشن سے قریب ہی کسی صاف سترے ہوئی میں کمرہ لینے کے بعد ضرورت کاٹون
 کرنا۔

”ہی“

”مگر وہ آرام کر کے ہی لکھا کہیں۔“

”کیا؟“

”لاہور ریلوے اسٹیشن سے زیادہ دور نہیں ہے اپنی حویلی۔ تمہیں جاگ، جیسی لینے کی

ضرورت نہیں پڑے گی۔ بیول کاراستہ ہے حویلی کا۔"

"ہی"

"اگر ب بھی جاگہ چلتا ہے، تو یہاں لوہاری کی آواز لگائے گا کہ ان۔ ہی جہاں تو
 لینا جاگہ۔ لٹا بازار اور سرائے سلطان والی سڑک کے متوازی ریلے سے دو لگتی ہے۔ وہ
 دو پرے اسلامپہ کالج اور عرب ہوئی۔ چمک برف خانہ سے گولڈنڈی کی طرف دو
 سڑک جاتی ہے۔ تم اترا جانا چمک داگراں میں۔ قریب ہی ہے سرائے سلطان کا پینا
 گیت۔ چمک داگراں سے گزر کر ساری لاریاں سرائے سلطان ہی میں جا کر رکتی ہیں۔
 پھر نکل جاتی ہیں ریلے اسٹیشن، ڈاکھ اور دو سو روپے پل کی طرف۔"

"کیا ہا"

"کسی پانچ گھنٹہ کی طرف نہ نکل جاؤ۔ بعد میں بے شک دوسرے بھی چلے جانا لیکن حویلی
 سے ہو کر۔ دوسرے کوالے رہتے ہیں۔ میرے بار، بالے کا گروہ ہیں تھا۔ چمک داگراں
 سے ہی پوچھ لینا اور ہسوت کی حویلی۔ قریب ہی تو ہے۔ جہ کوئی بھی وہاں رہتا ہو، وہاں
 ہنام، لیستے نہیں۔ سلام کر۔"

ابھی بتا کہ میں لاہ ہسوت کا پوتا ہوں۔ بیٹھے کو کہیں تو بے شک تھوڑی دیر بیٹھتا
 شرماتا تھا۔ مگر اگر وہ اجازت دیں تو گن میں سے ضرور ہو آنا۔ ان دنوں گن میں
 تمام سے کی پانچس کے لیے لگزی کا بھاری تخت پوٹ دھرا رہتا تھا۔ میں جب پہون سا تھا
 تو نام کی اسلے اسکول میں پڑھتا تھا اور تھکتی اسی تخت پوٹ پر بیٹھ کر کھانا کھاتا تھا۔
 میں لاہ والے گھر کی سا بھی وہاں کے مین کے لیے ایک کواں تھا۔ دوسرے ہم چوٹی کی دکان
 سے شعا اول لاتے، دوسرے وہ۔ کون پانی سے ہمراہ اول پہلے کھینچ ڈال ہے اسکا
 کھانا ہوتا ہے تھا، چند لوگوں کے ساتھ۔ سو، نظر ڈال لینا، بیٹھے پر کبوتر ہوئے تو وہاں
 سے نکالی دے جائیں گے۔ ہم نے من دنوں شیرازی ملتا ہے، لہذا۔ لہذا۔ لہذا۔

تھے۔ ہاں ہر چند لوگوں نے بھی ہمارے دیکھا دیکھی پال لیے تھے کہتر۔ اس لیے ہمارے
 وہی ہمیں بھی شاید خانی نہ ہوں کہتروں سے۔ اگر اپنی حویلی کے بیچے پر بیٹھے کہتر دکھائی
 دے ہاں، تو ہاتوں ہاتوں میں حویلی والوں سے یہ ضرور پوچھ لینا کہ کہتروں کو گندی
 میں کھار دیتے ہیں۔ جو کچھ تائیں، کاتر پر کھ لینا۔ ہونا نہیں۔

ی اچھا
 حویلی کسی خانہ دانی آدمی ہی کو کھات ہوتی ہوگی۔ شاید وہ کبھی حسین اپنے ہاں طہرنے کے
 لیے۔ لیکن چنا، ان پر یہ جہ نہ بنا۔ ہوگی ہی میں نہ لینا۔ پیسے ہیں تاہم اور رکھو۔
 ہا، پیسے ہیں میرے پاس۔ آپ غم نہ کریں۔
 پتہ کرنے کی ضرورت نہیں۔ ذرا دلچسپ بھال کر بنا۔ پاسپورٹ کو نہیں کے بچے بھڑی
 میں ہی رکنا، احتیاط سے۔

نہا
 حویلی سے گل کر مٹی بھون بھی ہو آج۔ قریب ہی تو ہے۔ رشتی بھون کی دلچسپ کچھ کہی ہو
 وہی ہے، وہاں ہی پر تھاک۔

ی اچھا
 بہ لڑی نے دل دی تھی تو تکیوں کی بھاگ روز میں اضافہ ہو گیا تھا اور سامان سے
 لہے پختہ رہیں کا شور باجہ گیا تھا۔
 ہا، حویلی آواز میں بات نہ کر سکتے تھے لیکن اس سے اسے شور میں ان کی آواز صاف سنائی
 دے رہی تھی۔

انہوں نے حویلی سے ہو کر گولڈزی کی طرف نکل کے، تا تو رام کی والے اسکول کے سامنے
 سے ہو کر گزرتے۔ بے شک باہر ہی سے ایک نظر ڈال لینا اور ہاں، عرب ہوئی میں ضرور
 لگا لگا لگا، اسے لڑے اسب شام بیٹھتے ہیں وہاں۔ بہت ادب احترام سے چنا۔

گیا ہے

اس وقت آہستہ آہستہ رنگین ہوئی لڑکے ساتھ باپ بڑھ کر چل رہے تھے اور شور بہت تھا۔
 چوک ہلکے ہلکے سے تاک کی سیڑھی میں گوانڈی کی طرف نظر کے ساتھ وہیں پر بہت بڑا
 ہنگ ہنگ رہا ہے۔ والہی ہے اگر کچھ پیسے ہی تھے تو میرے لیے وہیں سے کوئی پانا ہال
 خریدتا۔ تاک کی ہنگ سے تھے۔ ہارے ہارے تھے۔ ہال کے ہال سے نام تھے ہالوں کے ہال
 سے منگوا کر پڑھا کرتے تھے ہر طرح کے ہال۔ بہت سے نام تھے ہالوں کے ہال
 اسی میں سے کوئی ایک۔ ہم گھوم رہے تھے جہیں۔ جی ہاں، سب کچھ کاغذ پر لکھ
 رکھا ہے۔ آپ لکھتے کریں۔

دیکھو، ہو سکے تو لاہور کی ٹھڈی سڑک پر رنگین سینا ہو آتا۔ میں نے رنگین ہی
 میں سہل اور جتنا کی "دو ہاں" دیکھی تھی۔ ٹھڈی سڑک پر جیٹرنگ کر اس۔ ایک
 طرف چڑیا گھر اور دوسری جانب ڈانس رائے کا دفتر۔ اسی چوک میں رکھا ہے۔ ملک انور
 کا بیڑا سا پھل کا ہنس۔ ملک ڈانس رائے کے دفتر کی جانب موہنے کے بیٹھی ہوگی۔ میں
 اکثر گرمیوں کی دوپہروں میں لٹل جاتا تھا اور..... ملک کے قدموں میں لیٹ جاتا تھا۔
 سو جاتا تھا وہیں..... اور گھر والے..... باپ وہی باتیں دوہرا رہے تھے۔ جنہیں وہ بچپن
 سے بار بار سنتا چلا آیا تھا۔ اور ہاں بیٹا.....
 گیا ہے۔

پھر چلتی ہوئی ٹرین کے ساتھ مسلسل دوڑتے چلے آنے سے ان کا سانس پھل
 گیا اور وہ پیچھے رہ گئے۔ کھڑکی سے مڑ کر دیکھا تو وہ سب سے الگ پلیٹ فارم پر اڑھیا
 بیٹھے، جگ کر کھاتے ہوئے صاف دکھائی دے رہے تھے اور پس منظر میں سائبرین
 اللہ اس کہنے والے بقیہ لوگ کھڑے ہاتھ ہمارے تھے۔ اس کے بعد ٹرین نے روانہ کر لیا
 اور سب کچھ پیچھے رہ گیا۔

”تو لڑائی۔۔۔ کراچی سے آنے والی مہم ایکسپریس۔۔۔“
 اس نے اپنا چہرہ تھپا اور سوت کھین اٹھا کر باہر کا رخ کیا۔
 وہاں آہنگ پر کراچی سے لاہور آنے والی کسی گاڑی کے لیٹ ہو جانے کی
 روک تھام ہوئی تھی۔ لاہور روٹ سے آئینوں سے باہر نکلتے ہوئے اس نے ویزا آفس سے
 نئے ویزا پر تکیا دیکھا کہ مہم کر لیا کہ بھارت سے پاکستان آمد کی روک تھام کہاں کرتا ہے۔
 باہر وہی اچھی خاصی روٹنی تھی اور شام سے پہلے پہلے یہ معاملہ نسا ویزا
 لہوئی تھا۔

ہمارے پہلے تھری میں اس نے پانچ سو روپے کی کرنسی تبدیل کر والی تھی، جو
 تھری خرابی کے لیے کافی تھی۔ اس نے آٹو ریکٹ بکڑانے میں دیر نہیں کی اور روپہنگ
 سڑک کے لیے نکل کھڑا ہوا۔

تھری میں ہی آفس، طبع بکھری میں داخل ہوتے وقت وہ قدرے گھبرایا ہوا اور
 تھری لگا رہا۔

اس کے کاغذات ہر طرح سے مکمل تھے۔ پاسپورٹ درست تھا، ویزا کی کاغذ
 اس کے پاس ایک انہماک سا خوف تھا جیسے سڑ پر آسمان موجود نہ ہو۔
 روپہنگ آفس کے سامنے بھی ہوئی جی سی میز کے برابر میں اپنے سامنے رکھا کر
 ایک ٹالی گئی، بیٹو تو کیا لیکن جیسے مہم بیٹھے ہیں۔

روپہنگ آفس نے ٹالی فون پر بات کرتے ہوئے لکھنؤ کے لیے اس کی
 تھری اٹھائی سے دیکھا۔ پھر اس نے فون بند کر دیا اور گری سے اٹھتے ہوئے سرد مہری
 تھری

”تھی۔ لڑائی۔“

”تھی آئی ہی وہی سے لاہور پہنچا ہوں۔“

”جی۔۔۔ دکھائیے کاکڑات۔“

دو رنگ آئیسرنے اٹکا کہا اور باہر نکل گیا۔ کمرے کا دروازہ از خود بند ہو گیا تھا۔
اب وہ کمرے میں چھا تھا اور اس کے لیے اکیلے میں ایک ایک ٹی گزراج مشکل
ہو رہا تھا۔ کچھ دیر بعد کمرے کا دروازہ کھلا تو دو رنگ آئیسرنے جلد ہی سارا کام نکھلا دیا۔
”واہن جاتے ہی آپ کو تین روپے مل کر رہے ہوں گی۔ اس وقت تک آپ کے یہ

کاکڑات ہمارے پاس رہیں گے۔“

”ہاں صاحب۔۔۔ میں تو بہت گھبرایا ہوا تھا آپ کی کرپا ہنسکار۔“

اب وہ دروازہ ریلوے اسٹیشن کی حدود میں پہنچا تو شام گہری ہو چلی تھی۔ لاکھوں
ریلوے اسٹیشن کے سامنے بہت سے چھوٹے بڑے ہوٹل تھے، جن کے نچوں سامنے چل
رہے تھے۔

وہ آگے بڑھ کر ہوٹلوں کا جائزہ لینے کی خاطر پارک کے ساتھ فٹ پاتھ پر
ہو گیا۔ پارک میں بیٹھے اور لینے ہوئے بہت سے لوگ اس وقت ملٹی تھی کہ وہ رہے تھے
اور پارک کے گرد چکر کھاتی ہوئی سوز کاریں اور مٹی بسیں چھا رہی تھیں۔ روشنی کی گندیں بھینکی
ہوئی گزر رہی تھیں۔

”بھائی صاحب۔۔۔ یہاں سے چوک داگھریں گئی دور ہو گا؟“ اس نے پارک کا

رنگ کا سہارا لیتے ہوئے ایک بھلے ہنس سے پوچھا۔

”قرب ہی تو ہے مٹی۔ یہاں ہوٹلوں کے سامنے سے وہ جو سڑک دائیں بائیں

جاری ہے اس پر ہو جائیں۔ چند قدم ہی ہو گا۔“

”جی، ابھی۔“ وہ آگے بڑھ آیا۔

ابھی کہتے تھے۔ کچھ بھی تو نہیں بدلا۔ اسٹیشن سے چند قدم پر چوک داگھریں

مٹی ہون کے قرب لاکھوں کی حویلی۔ وہی سڑک پر سہارا کچھ اور آگے چلے

بہتر۔ سارا پیدل کاراست۔

رہائی کے لیے اس نے جو ہوئی پتاہی کے ساتھ واسے ملی گھر سے اس نے مزید کرنی تہریں گروالی اور ہوئی کارنگ کیا۔ اس وقت پارک میں ملٹی جی کرمانے لڑکوں کے ہاتھوں میں تھامی تیل کی بوتلوں کی جھلکار صاف ستائی دے رہی تھی۔

دوسری نظر پر ہوئی کا کرہ خاصا کشادہ اور صاف سترا تھا۔ فوم کے گدے، کمزریوں پر بھاری پردے، لٹلے سے گرم پانی کی ٹوٹیاں اور جاکٹے ہاتھ۔ یہاں ہوئی تو ہاتھ مسجد کے قریب دیوار میں ایک نہ ہوگا، ہاں جیت کھات پٹس میں ضرور ہوں گے۔ کیا وہ کرہاں میں کہاں کھاتے ہونے اس نے سوچا۔

ہوئی کے باہر اور لاؤنج میں چکاچوند روشنی کے سبب وہ اب تک بھی بکھر رہا تھا کہ دوبارہ وقت نہیں گزرا، لیکن جب اس نے کھائی کی گڑی پر نگاہ کی تو معلوم ہوا کہ رات کے اس بج رہے ہیں۔

بہت دیر ہوگئی۔ ہاتھ تو بچے سو جاتے ہیں اور اس وقت بھارت میں آدھ گھنٹے کا فرق کے ساتھ ساڑھے دس ہوں گے۔ خیریت کافون تو کیا نہیں۔ اس نے سوچا اور تیزی سے نکلا۔ پیگ کال آفس کے آپہٹرنے جب گھر کا نمبر مل کر دیا تو ہاتھ جاگ رہے تھے۔

..... بی بی..... آپ ابھی تک جاگ..... بی بی ہاتھ لیک
ہوں..... آپ پیٹ فادم پر کھائیں رہے تھے، طبیعت تو..... بی بی رپورٹ کر دی..... آپ
تھک کہتے تھے سب ویسے کا دیا ہی ہے..... بی بی ہوئی سے چند قدم کے فاصلے پر..... ماما
بی سے بات..... بی بی کے وارے ہنک دانگراں سے سیدھی سڑک لگے گی..... ہاتھ کبھی،
اسلامی کٹا اور عرب ہوئی پھر ہنک برف جان اور گولڈزی سے پہلے وہاں تاجیم اصل
..... بی بی کے وارے، وہاں شامت..... بی بی ہاتھ..... ہاتھ میں لے سب کچھ کھانڈ پر لکھ رکھا

ہے۔ اب فریج ہی گھوں کا۔ سی سوئی سے ہو کر گھوں کا بھرنے کریں۔ فون لہا ہورہا ہے۔ سب ویسے کا ویسا ہی ہے باپو۔ بس باپو۔

اس نے کرنیل رکھوایا۔ فون کا اچھا خاصا من بن گیا تھا۔
خیر کوئی بات نہیں۔ باپو کی پریشانی تو ختم ہوئی۔ چیک کال آفس سے ہوئی تھی
آئے آئے اس نے سوچا۔

کمرے میں آیا تو دروازے کا انگوٹھ سے لاک کرنے کے بعد وہ چکھوہر کے لیے
آنکھیں کی جانب کھٹے والے کھڑکی کے قریب کھڑا ہو گیا۔

رات کے گیارہ بجتے والے تھے۔ اب لیے سڑک پر ٹریفک کم ہو گئی تھی اور
آنکھیں کے سامنے والے پارک کے گرد روشنی کی کنوئیں چڑھ رہی تھیں۔ پڑا پارک تک کہ
ہوا تک اس کی نظریں پارک کی چھین سچ ایسا وہ روشنی پہاڑ پر جم گئی۔
اسے یہ کیا ہے؟

پارک کے سچ روشنی پہاڑ تھا اور اس کے برابر میں ایک بڑا سبز رنگ آسمان کی
سب سے اونچے کھڑا تھا۔ یہ سب دن کے اجپارے میں تو نہیں تھا۔ یہاں۔ یا شاید وہ ایک
ہنگام بہت تھا ان کے گرداگرد اس لیے نظر نہیں چڑھی ان پر۔

دن کو یہ پہاڑ یہاں پر تھا بھی یا نہیں؟ وہ مجھے میں چاہیے۔

پارک میں پہاڑ اور سبز رنگ چہا چہا چہا سے چلنے والی سرجی انکھوں سے دیکھتی
تھی اور پارک کی بدم روشنی میں جو لوگ شام کو چاند میں جانے لگی تھی گھبرا رہے تھے۔
پہاڑ کے سامنے میں بے مس حرکت گھڑیوں کی صورت چلے تھے۔ ٹنگی چلی کرنے والے
لوگوں کے ہاتھوں میں تھامی تھلی کی ہتھکوں کی جھنڈا اب سالی نہیں دے رہی تھی۔ کچھ
سی دیکھتے یہ کیا ہو گیا۔ وہ سخت چکرایا ہوا تھا۔

پھر وہ کھڑکی سے دور ہٹ آیا۔ اس نے کمرے کی لاک بھاری اور پھر

سہو کے سامنے بیٹھا۔
 بھالی گیٹ سے پتلا پاکستان بھول کر آئے اور تھکنہ کی سیر کے بعد وہ
 قدرے تھک سا گیا تھا۔ وہیں پر آٹورسٹ بکارتے ہوئے اس نے اندر گلی بازار اور بھالی
 پر پوروشی جانے کا ارادہ فرمایا۔ بہت عرصہ گزر جانے کی خواہش ضرور تھی۔

”بھالی، صاحب گھر چلو۔“
 وہیں پہنچا تو دیکھا کہ ٹک و ٹکوریہ کا ایک بہت بڑا پتیل کا بوسہ بھالی گھر کے
 اندر رکھا ہے۔ کیا باپ بچپن میں بھالی گھر آیا کرتے تھے یا کوئی اور بوسہ ہے یہ؟ وہ تھوڑا سا
 گزینہ لہا۔ وقت بھی تو بہت گزر گیا ہے۔ بہت عرصہ ہے باپ بھول کر غلط جگہ بتا گئے ہوں۔
 اس نے سوچا۔

”بھالی، دوسرے کا دفتر کہاں ہوگا؟“ اس نے قریب ہی کھڑے صاحب گھر کے ایک اہل
 کار سے پوچھا۔

”دوسرے کا دفتر؟ نہیں معلوم کون سے دفتر کا پوچھ رہے ہیں آپ۔“
 غلطی ہو گئی پہلے کیوں نا ہو یا ٹھنڈی سڑک کے چیئرنگ کر اس سے۔ اس نے انہماکی
 ندامت کے ساتھ سوچا۔

کوئی بات نہیں۔ اب چلتا ہوں ٹھنڈی سڑک کے چیئرنگ کر اس پر۔

اس نے صاحب گھر سے نکل کر آٹورسٹ روکا۔

”ٹھنڈی سڑک جانا ہے بھالی۔ چیئرنگ کر اس لے چلو۔“

”کی؟ ٹھنڈی سڑک کا تو مجھے معلوم نہیں۔ چیئرنگ کر اس پہنچا رہے ہیں آپ کو۔“

وہاں سے معلوم کر لیجئے گا ٹھنڈی سڑک کا بھی۔“

”چلو۔“

ابھی سورج نہیں ڈوبا تھا، اس کے باوجود سڑک کے دونوں اطراف سماجی

رہنویں کا سیلاب اٹھ آیا تھا۔ ٹھیک کر اس پہلے تو وہیں نہ تو غلطی سڑک تھی نہ
 دوسرے کا دفتر۔ ٹھیک کر اس پر کڑے کے اکاؤنٹانوں سے پوچھا۔ کئی اس
 رہنویں کے سیلاب میں نہائی ہوئی بڑی سڑک کو شاہراہ کا نام عظیم یا بال روز داتا تھے اور
 دوسرے کے دفتر کا کئی نام و نشان نہ تھا۔ چڑا گھر کی موجودگی تو ثابت تھی لیکن ٹھیک
 کر اس کی ایک جانب واڈا ہاؤس کی فلک ہوں عمارت تھی اور دوسری جانب پنجاب اسٹی
 ہل۔ ٹھیک کر اس کے ٹھکانے کے محلے میں پارک تو تھا لیکن سرد گرو کالکت وہ نہیں تھا جو
 وہ نے پار پار ڈھن ٹھیک کر دیا تھا۔

پھر اس نے ٹھیک کر اس کے اس ٹیم رہن ٹھکانے نے اٹھ کے اٹھ جا کر
 دیکھا تو ٹک ڈکوریہ کا بھر۔ نائب تھا اور اس کی جگہ سگ مرمی سے تراشی گئی ایک بہت
 بڑی ریل دھری تھی اور اس کے لیے سگ مرمی سے تراشا گیا قرآن۔
 وہ بچے بہت آیا۔

اب وہ اس بات پر حیران تھا کہ اگر ہی ٹھیک کر اس ہے تو غلطی سڑک
 کیا ہوگی جس کے دونوں اطراف میں گئے درخت اور دوسرے کا دفتر کدھر گیا۔
 تو کیا ہم کی یادداشت کڑ بڑ ہو گئی؟

آج کسی طور پر کون کر نہیں پتا۔ اس نے سوچا۔
 غلطی سڑک سگ ڈکوریہ کے ٹھکانے اور دوسرے کے دفتر کا ٹھیک کر اس سے نائب
 ہو جانا چھینان کے صدر سے کا پامٹ ہوگا۔

کل کر اس کا فون۔ کوئی بہانہ بنا دوں گا۔ کہ دوں گا کہ فون کی لائن نہیں لی رہی تھی۔

اس نے سوچا اور دیر تک ٹھیک کر اس پر سلسلہ کڑا رہا۔

بہن کی لہلی میں رات کا کھانا کھاتے ہوئے اس نے بیٹھے بیٹھے ٹھیک کر اس سے کہا:

”بھائی صاحب! مجھے دوسرے کے دفتر جانا تھا، بہت ڈھونڈا پر نہیں ملا۔“

”کہاں جانا تھا؟“

”بھئی ٹھڈی سڑک پر دائرے کا دفتر ہے نا۔“

”جی، کون سا دفتر؟ ابھی معلوم کیے دیتا ہوں۔۔۔۔۔ میں تو یہ نام کبھی یاد ہی نہیں۔“

پھر ٹیبلر نے کام میں منہک ایک ایک دفتر سے پوچھا اور سوچنے میں ڈوبا رہا۔

”مجھے لاہور میں رہتے کرتے آٹھواں درجہ تو ہو گئے، پر اس دفتر کا نام نہیں جانتا۔“

غیر معلوم کر لیں گے اور سنا میں آپ ہو آئے بیٹا پاکستان اور شاہی قلعے سے۔“

”جی، ہو آیا۔۔۔۔۔ کسی طرح معلوم کر کے بتائیے۔ میں نے جانا تھا دھرم۔“

”لیک ہے۔ آپ ٹھہرنے کریں۔“

رات کو سوتے وقت اس خیال نے احساس بندھائی کہ کل سونے کا پتھر لگے گا تو کئی بجے

سونے کی نذر نہیں کر رہا خوش ہو جائیں گے۔ رات سوتے وقت اس نے گزری پر وہ دم کا

دیا تھا تاکہ صبح اٹھنے میں تاخیر نہ ہو اور دھوپ کی شدت بڑھنے سے پہلے ہی سونے سے

ہو آئے۔

صبح اٹھ کر اس نے درہنوں کی۔ دھوپ سے صحت بہت چار ہو کر نکلا اور سونے

کی دکان میں چلا آیا۔ اس وقت ٹیبلر ایٹا سینٹ پر نہیں بیٹھا تھا۔ پھر اس نے پکا سا ہاتھ لگا

اور سونے سے ٹھنک کر باہر کے قاتلے سونے راستے پر ہو گیا۔

باہر کی جاہت کے صحن مطابق اس نے لٹا بازار دہلی سڑک کے چوڑی لگی

جانے والی ریل سے روڑ لگی کو چنا لیکن وہ تک اسے ادھر کو جانا نہ تو کوئی تاکہ دکھائی دیا۔

سڑک کے سطلوں کی جانب سے ریل سے آٹھواں درجہ کی سٹ آتی کوئی لاری دکھائی دی۔ وقت بچا

تو بہت گزر گیا۔ اس نے سوچا۔

اس کے باوجود وہ چلتے دو کئی پارٹیک کر رہا لیکن اس وقت سب جلدی میں تھے

اور کٹ لاکھ کے پاس والی دکانیں بھی کھلی نہ تھیں۔ وہ کس سے پوچھتا۔ اس پتہ کیا۔

اب ایک چدر سے میں نکلا ہے تو ہاں پنے کی رچھی کے گرا کر ہاتھ کرنے
 ہاں کا جوم رکھ کر رک گیا۔

"بھائی صاحب! کیا یہی چوک ڈالگراں ہے؟ میں نے جانا تھا اور۔"
 یہ سن کر ہاتھ کرتے ہوئے ایک بھاری سن و توش و ہاٹھس ٹوش طشی سے بولا
 ہانا نہیں تھا۔ آپ ٹیر سے چوک ڈالگراں بنی گئے۔ آؤ، ہم اللہ، ہاتھ کرو۔"
 "ہی۔ ہی۔ ہی۔ میرا مطلب ہے میرا سلطان کالاری اور قریب ہی ہے کیا؟"
 "میرے سلطان کالاری اور۔"

سب حیرانی سے بڑھائے اور ایک دوسرے کی جانب استہوا سے اشارہ میں دیکھنے لگے۔
 سبھی یہ تاہیچے لال ہسوت کی حویلی کس طرف کہ ہے؟"
 "اور ہسوت کی حویلی؟"

ایک بار ہر سب کے سب حیرانی سے بڑھائے۔
 "ہاں۔۔۔ کوئی بات نہیں۔ رٹی ہوں تو قریب ہی ہوگا۔"
 "رٹی ہوں؟"

اب سارے کے سارے تعجب سے اسے دیکھ رہے تھے۔
 اور کھلا کر تیر قدم اٹھانا آگے بڑھ آیا۔

پھر اب تک چدر سے کی ساری دکائیں نہیں کھل گئیں وہ اسی بدحواسی میں بھی
 ہائیں اور بھی ہائیں اسی ہزار میں بھٹکا پھرا۔ وہ ہارو کسی سے پوچھنے کی ہمت جواب دے
 گا ہی۔

اور ہاں وہ چاہتا تھا کہ اپنا کس اس کی نظریں ایک کہاڑ خانے کے بیچے سے بھرتے
 تہ سے حیرانی گیت پر جم گئیں۔ اس گیت کی کائی زور و جوار پر "میرا سلطان" اور
 فدا اس کے نیچے نہ چڑھی جائے دلی کوئی نہ کھسی تھی۔

ساتھ ہی دم توڑ گئی۔ اس نے تاج کھنی کی گراڈیں ہڈک کی جردنی دیوار پر آویختی

یلائی کا اشتہار پڑھ لیا تھا۔

آگے دائیں ہاتھ اسلام کالج تو موجود تھا لیکن اس کے سامنے عرب ہوٹل کا

لیکن تک نہ تھا۔ جیسی باپ، بیٹری اور بڑ کی دو طرفہ دکانیں تھیں اور بس۔ معلوم کیا تو پتہ

چلا کہ بری دائیں ہو گئے عرب ہوٹل کو ختم ہوئے۔ ساتھ ہی رام گلی تھی۔ وہ اونچی کوڑھیلا

رام گلی کی وہی پرانی پانگوں، جو باج کی یادوں میں آ پڑھیں، اب منہدم ہونے کو تھیں۔

رام گلی میں آگے چل کر ایک اسکول دکھائی دیا، جو اب مسلم ہائی اسکول بن چکا

تھا۔ عمارت پرانی تھی۔

یہاں باج، وہی اسکول میں پالا اور چند لوگوں کے ہم جماعت رہتے ہوں گے۔

اس نے خیال کیا۔ اس وقت اسکول کالج بند تھا اور بچوں کی بھاگا بھاگ سے پیدا ہونے

والی ٹہل پڑی تھی میں عموں کی ہادی تھی۔

چنگ برف خانہ سے آگے دو خانہ عظیم اہمیل خاں تو موجود تھا لیکن دور

نزدیک کسی چنگ بھنڈار کا وجود نہ تھا۔ اس علاقے کے دکان داروں سے معلوم کرنے پر پتہ

چلا کہ گزشتہ برس دارالاشاعت پنجاب کی عمارت گرا دی گئی، جو ایک مدت سے اجاز

پڑی تھی۔

اب دارالاشاعت کی جگہ ایک نو تعمیر شدہ چارہ کھڑا تھا، "موزہ سینٹر" کے نام

سے۔ جس کے اندر جیسی باپ، بیٹری کے سامان اور ریڑ کی شیٹوں کے اہار لگے تھے۔

اراقہ صلے سے کھڑے ہو کر اس نے نو تعمیر شدہ عمارت پر نظر ڈالی تاکہ باج کو تانے کہ

تک کیسی تھی۔ پھر اچانک اس کی نظر میں جزو چارہ کی جردنی دیوار اور بجلی کے کھمبے کے

پھولتے ہوئے کیڑوں کے ایک بہت بڑے اشتہار پر جم گئیں۔ یہ اردو میں کھڑا ہونے کے

سبب اس سے پورا اشتہار پڑھا نہیں گیا۔ لکھا تھا

پلو پلو، مکان پلو

تین روزہ سٹوں بمرا اللہ

شیر شاہ پانی پاس سمرائے عدین مکان

فرزند ان اسلام کے قاتلوں کا سلسلہ جاری ہے۔

”مجھے مجھے قدم اٹھانا ہوگی کی جانب ہٹ جا۔ یہ سوچتے ہوئے کہ آج باج کو فون بھی کرنا ہے۔

اب اس کی مشکلی یہ تھی کہ باج کو کیا تائے اور کیا نہ تائے۔

پہلی کی دلی میں پہنچا تو وہ گہری سوچ میں ڈوبا ہوا تھا۔

”آج تو آپ سورے سورے ہی نکل لے۔ کہاں کہاں کا پتھر لگا؟“ منیمر نے خوش مزاجی سے پوچھا۔

کئی جگہوں سے ہوا یا منیمر صاحب۔ بہت تھک گیا۔ آج بیٹوں کا نہیں۔ کھانا اور ہی بھوکا

ہیجے گا۔“

”طیبت تو لیک ہے نا آپ کی؟“

”ہی۔ لیک ہوں۔ بس ذرا تھک گیا۔“ اس نے کمرے کی چابی وصول کرتے ہوئے اور

کھانا کھا۔

مذاق کرنے ہی میں گزار کر جب وہ بچے آیا تو شام گہری ہو چکی تھی۔

منیمر جیسے دیکھ کر اور سے ہاتھ ہلایا لیکن وہ دلی میں نہیں دکا اور باہر نکل آیا۔

بب بگ کال آفس کے آپرٹر سے اسے دلی فون ملا کر دیا تو گزشتہ کل فون نہ کرنے پر

دعا دہاں ہو رہے تھے۔

لیکن باج، آج میں ہو آیا حویلی سے۔۔۔ سب ویسے کا ویسا ہی ہے باج۔۔۔ ہاں

میں تو حیران ہوں باج کہ چوک داگراں اور رام گلی کے سارے درشت

بے چینی کی دستک

میں شام ہی سے اس کی دستک کے انکار میں ہوں۔

گزشتہ شب جب دستک ہوئی تھی میں اٹھ نہیں سکا تھا۔ میرا خیال تھا کہ اس کی دستک کبھی میرا وہم ہے اور شاید یہاں ہی تھا۔ وہ دستک نہ تھی ہوا کا رعبا تھا۔ کچھ بھی تھا میں بہر حال دانت بھرے کھن ضرور رہا۔ جب بھی کہیں کوئی کھٹکا ہوتا ایک بار یہ خیال ضرور آتا کہ باہر جا کر دیکھوں۔ باہر کیا ہے؟ یا کون ہے؟ کہیں وہ تو نہیں۔۔۔ مگر پھر کم بہتی غالب آجاتی۔۔۔ میں اورو بدل لیتا۔۔۔ منہ سرخلاف میں چھپا لیتا اور اپنے ہاتھ بے سگر جھانک رہا۔۔۔ سردی جو بہت تھی۔

جائے کا زمانہ ہے۔ شام ہی سے ہوا بھلائے پھرتی تھی۔ جب میں سونے کے لیے لیٹا تھا اس وقت طوفانی بادش ہو رہی تھی۔ سولے بجے کا بھی اندیشہ تھا۔ باد کی خشکی تھی۔ جس علاقے میں اب میرا گھر ہے وہ ابھی تک ایک کھلے میدان کی طرح ہے۔ ابھی یہاں تعمیراتی کام شروع ہوئے زیادہ عرصہ نہیں ہوا۔ بس چند مکان ہی مکمل ہو سکے ہیں۔ میرے تو دونوں اطراف ابھی خالی ہیں۔ ایک دو عمارتیں اہلہ میری ہی لائن میں تعمیر کے اعلیٰ مراحل میں ہیں اور عقب میں ایک گھر کی چھت انہی دنوں ڈالی گئی ہے۔ آبادی بھی کم ہے۔ بجیا جہ ہے کہ خشکی کی شدت شہر کے ہر علاقے سے زیادہ ہے پھر چونکہ خود میرا گھر ہے ابھی زیادہ دن نہیں ہوئے اسی لیے دباہریں ابھی کھلی ہیں۔ ڈرا ہوا چلے تو آہلی تو آہلی خود دباہریں ابھی کھپانے لگتی ہیں۔

یہاں گھر میں میرا جائے کا پہلا موسم ہے اس لیے ایک نیا تجربہ ہے۔ چونکہ

چاروں طرف ویرانہ ہے یہی سبب ہے کہ ہوا میں شعلت ہو یا نہ ہو اس کی کوئی وجہ نہ رہتی ہے جیسے طوفان ہو۔ جہاں جہاں کہیں کوئی روزانہ کھلا ہے وہاں سے بیٹھیاں لگتی ہیں۔

بچنے کی آوازیں آتی ہیں۔ میں یہ آوازیں اس وقت سے سن رہا تھا سب سے گمراہ تھا۔ میری دائیں شام ہی کو ہوتی ہے۔ دن بھر دفتر میں مصروف رہتا ہوں۔ مصروفیت کچھ اس نوعیت کی ہے کہ نس نس میں جھکن گھر کر جاتی ہے۔ کچھ سبب ہے کہ جب بستر پر دروازہ ہوتا ہوں تو پھر بے سہمت ہو جاتا ہوں۔ کسی بھی کھنگے پر اٹھنے کوئی نہیں چاہتا۔ ایک تو دن بھر کی مصروفیت۔ اس پر گھر کے کچھ فاضل وقت۔ اصل میں یہ دنوں بھر سے بیوی بچے بھی گھر پر نہیں ہیں۔ کسی تقریب میں شہر سے باہر لگے ہوتے ہیں۔ اس لیے کہتے ہی مجھے اپنے کھانے کا بندوبست بھی خود ہی کرنا ہوتا ہے۔ پھر ہر روز گھری پڑی چیزیں اٹھانا، دروازے کھڑکیاں بند کرنا۔ غرض گھر داری کے ایسے کام ہیں کہ خیال ہی سے الجھن ہوتی ہے کرنا پڑتے ہیں۔ اسی لیے جب ایک مرتبہ چک کر این ہوا ہوں پھر نیند دہریج لیتی ہے۔

دھنگ کی آواز مجھے بستر پر لیٹتے ہی سنائی دی تھی۔ آواز بھی بڑی ہانسی کی تھی۔ پہلے میں نے خیال کیا۔ اٹھوں باہر جاکوں اور دروازہ کھول دوں۔ پھر سوچا نہیں نکلا۔ دھنگ کی آواز نہیں۔۔۔ ہوا ہے جو دروازہ دھکیل رہی ہے۔ یہ سوچ اور یقین کر لیا۔ جانا بھی دھنگ کی آواز دوبارہ نہیں آئی۔۔۔ یا کم از کم میں نے نہیں سنی۔

میں نے نہیں سنی حالانکہ وہ تو مسلسل ہو رہی تھی۔ اس کا اندازہ مجھے اس وقت ہوا جب رات کے کسی بھر میری آنکھ دوبارہ کھلی۔ کون ہو سکتا تھا سوائے اس کے۔ اسی کو تو ہونا تھا۔ میرے دوست آشنا تو ابھی میرے اس سنے گھر کے راستوں سے واپس لگتا تھا۔ میں سوچتا رہا پھر اندازہ کیا کہ نہیں یہ بھی میرا وہم ہی تھا۔ تو اسی دروازہ دھکیل رہا تھی۔ بارش بھی طوفانی تھی۔ چھت سے پانی گرنے کی آوازیں آ رہی تھیں اور کھڑکیوں؟

دلوں کی بھی بوچھاڑ تھی۔ پھر بھی مجھے شک تو دور کرنا چاہیے تھا۔ مگر میں نے نہیں کیا۔
کروٹ بدل لی اور جسم سکیڑ لیا۔

گزشتہ کچھ عرصہ جس مشقت میں گزارا ہے اس نے بھی طبعیت میں بے ڈامی
بیدا کی ہے۔ مجھے مکان بنانے کی اور دوسری سہولتیں لینا چاہیے تھی یا پھر خود گمرانی کرنے کا
پرہیز نہ کرنا۔۔۔ مگر کیا ہو سکتا تھا۔ ایک محدود سی بیج پونجی میرے پاس تھی جو کسی ٹنڈے پر
کنٹر بیٹز کے بوجھ کی تحمل نہیں ہو سکتی تھی۔ میں تو چوکیدار رکھنے کی بھی تو فیملی سے عادی
تھا۔ اس لیے دفتر سے چھ ماہ کی رخصت لے لی۔ کسی کی مدد سے ایک ماہر اور کاشل مسٹری
پتھو آ گیا۔ ٹھیک ٹھیک کاموں کو تو وہی دیکھ سکتا تھا جس میں البتہ اس کی معاونت کے لیے موجود رہتا۔
رات کو میری ضرورت زیادہ ہوتی۔ چوکیداری میں خود ہی کرتا تھا۔

شروع شروع میں سلسلہ بڑا تکلیف دہ تھا۔ مجھے وہ کرنا پڑ رہا تھا جس کی میری
کوئی تربیت تھی نہ مزاج تھا۔ مگر پھر نئے سہول کی نئی ضرورتوں نے اپنا امیر کر لیا۔ تکلیف
تورے کم ہو گئی۔

ہر چند کے چاروں طرف ویرانہ ہی تھا اور اب بھی ہے مگر راتوں کو یہاں عام طور
پر سنا نہیں ہوتا۔ کسی کسی جگہ رات کو بھی یہی کام ہو رہا ہوتا ہے۔ ورنہ سینٹ و بکری ڈھولے
والے لوگوں کا شور بھی کچھ کم نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ یہاں سنا لے کا خوف نہیں تھا۔ میں ایک
طرف چار پہلی ڈال کر یسپ جلا لیتا اور کوئی نہ کوئی کتاب مطالعہ کرتا رہتا۔ ان دنوں ایک
سہولت بھی حاصل ہو گئی تھی کہ ایک مزدور نے میرے پاس رات گزارنے کی اجازت مانگ
لی جو میں نے اسے اس لیے دی کہ ایک تو اس طرح تنہائی رفع ہو سکتی تھی پھر اس کے
فہم لے کا لاکھ بھی تھا کہ اس کے سبب سے چھوٹے سولے کام ہو جاتے تھے۔

یہ مزدور کسی دور دراز کے گاؤں کا باشندہ تھا۔ یہاں کام ختماتے اسے شام ہو جاتی
تھی۔ شو میں کسی بھی جگہ اسے سر پہچانے کو جگہ میر نہیں تھی جبکہ اس مطالعے کے ذریعہ

مکانوں کے چوکیدار کو بھی اپنے ہاں قیام کی اجازت نہیں دیتے تھے۔ ایسا وہ چھٹی چھٹی جگہوں کے اندیشہ سے کرتے تھے۔ یہی وہ مشکل تھی جس کا اس کو سامنا تھا۔ اب معلوم نہیں یہاں کی بچہ کی تھی یا میری فرض مندی۔۔۔ بہر حال میں نے اسے اپنے پاس رکھ لیا۔

میرے ہاں قیام سے اس کی جان میں جان آئی اسی لیے وہ میری خوشنودی کی خاطر میرے ہر طرح کے کام کرنے لگا۔ میرے کھانے کا بندوبست کرنا، ہنتر بچانا اور رات کو کئی مرتبہ اٹھ کر چوکیداروں کی طرح وہاں موجود سناڑ و سامان کی جانچ پڑھال کرنا۔ اسی لیے میری ہر طرح کی فکر مندی کم ہو گئی اور وہ راتیں اطمینان سے بسر ہونے لگیں۔

پچھلے ماہ کی رخصت کچھ زیادہ عرصہ نہ تھا۔ ابھی مکان مکمل نہ ہوا تھا کہ دفتر میں حاضری دینا پڑی۔ لیکن اب اس کے سبب سے مجھے بہت سہولت تھی۔ راتوں کو وہاں اس کے کئی بھی حاجت نہ رہی، وہ سنبھال لیتا۔ ان گزشتہ دنوں نے مجھے اس پر اعتبار کرنا سکھا دیا تھا۔

جب مکان کی تعمیر مکمل ہوئی تو میں جلد ہی اس میں منتقل ہو گیا۔ حالانکہ ابھی اس علاقے میں ایسا ماحول نہیں ہے کہ کتبے کے ساتھ سہولت سے رہائش اختیار کی جاسکے۔ لیکن ایک خواب کی تکمیل ہوئی تھی۔ اب اس کی تعبیر دیکھنے میں کیا حرج تھا۔

میری ساری زندگی کرائے کے کمروں میں ہی بسر ہوئی ہے۔ بیٹھ بچھان آبا علاقوں کی تنگ گلیوں کے کسی پھولے سے تنگ و تاریک گھر کی ہی توفیق رہی ہے۔ اس لیے بیٹھ سے کسی اپنے گھر کے خواب دیکھتا آیا ہوں۔ ایک ایسا گھر جس کے کمرے دو ٹکا اور ہوادار ہوں۔ فرش چمکتا ہو، کھڑکیوں پر خوشبودار پتلیں لگتی ہوں اور جس کی چمکتے سے باہر نکلنے والیوں سے بھلا گنا نہ پڑے۔ میں نے گاڑی کی خرید بھی اسی لیے متوقف کر رکھی تھی۔ کم از کم ایسا گھر تو ہو کہ جس کا اگر کیراج نہ ہو تو پورج کی چھت تو ہو۔ یہی وہ تھی کہ مکان کی تکمیل ہوتے ہی میں اس میں منتقل ہو گیا۔

اس گھر میں منتقل ہونے کے بعد سے فرمت میر نہیں آئی۔ نئے گھر کی ہی

خبر ہوئی تھی۔ اسے سٹار نے کھانے کے جواز مرحلے ہیں۔ میرے بیوی بچوں کو بھی
ایک جھٹ پانچ آ گیا ہے۔ میں بھی شام کو لوٹا ہوں تو اگر اور کچھ نہیں کر سکتا تو اسے رکھ
رکھ کر اڑا ہی لیتا ہوں۔

مے گھر کی نئی زندگی نے فرحت سے بھر دیا ہے۔ یہ بھی ایک ٹیپ تجربہ ہے۔

ہاں لگتا ہے جیسے ایک نئے ڈھنگ کی زندگی آغاز ہوئی ہے۔

ہاں تو ایک نئے ڈھنگ کی زندگی وجود میں آ چکی ہے بس صرف ایک مشکل
ہے۔ وہ مزدور اب بھی ادھر آ لگتا ہے۔ وہی کہ جو مکان کی تعمیر کے وقت راتیں میرے
ہاں بسر کرتا آیا تھا اور جسے سر پھانے کو اور کوئی جگہ میسر نہیں تھی۔

اس میں شبہ نہیں کہ مکان کی تعمیر کے زمانے میں مجھے اس کا بہت سہارا تھا مگر
اس وقت کی بات اور تھی۔ اس میں بھی شبہ نہیں کہ واقعی وہ مشکل میں بھی ہے۔ اسے اس
خانے میں نہیں نہ کہیں کام تو مل ہی جاتا ہے مگر رات بسر کی کوئی صورت نہیں۔ شام
نظر اب وہ فراغت پاتا تو آگے جاڑے کی خشک طویل رات جب آسیب کی طرح اس
کے سر پر منڈلاتی ہے تو وہ اپنے اسباب سمیت میرے گھر میں دو آتا ہے۔ مجھے اس سے
بھلائی تو ہے اس مجھڑی کو بھی سمجھتا ہوں مگر کیا کروں جب وہ میرے لئے گھر کے پورے
گناہ میا کیونہ ہنر کھوتا ہے اور پھر اس پر اپنے گرد و خراب سے آنے جسم کے ساتھ دوا
نہ ہے تو لگے لگتا ہے جیسے میں پھر اپنے اس ماضی میں ہوں جب مجھے گندی مایوں کو
بھانڈ کر گھر کی چمکت پاد کرنا پڑتی تھی۔ کھلا اور کشادہ گھر تنگ نظر آنے لگتا ہے اور
پانچ طرف کوئی بددلی پھیل جاتی ہے۔

لیگا ہے کہ میں اسے آغاز ہی سے سمجھتا آ رہا تھا کہ وہ ادھر آنا ترک کر
سکتا ہے اس کی مجھڑی اس کے قدموں سے بندھی ہے، ویسے میں نے اپنی حد تک
کوشش سے اس پر دوا نہ کھولنا بند کر رکھا تھا مگر میں اپنی بیگم کا کیا کروں جس کی

ہمدردی اس کی سہمی ہوئی دست پر نمودار آتی ہے اور وہ اندر در آتا ہے۔

گزشتہ شب چونکہ میرے اہل خانہ گھر پر نہیں تھے اسی لیے میں نے مزاح
 نصیحت چاہا اور ہمیشہ سے زیادہ تھکسانہ انداز میں گویا اسے آخری سنجیدگی اور تقاضا کیا کہ
 یہ دروازہ اس پر ہمیشہ کے لیے بند ہے۔ طوفان ہوا پھرتی پھر رہی تھی۔ بادشہ کی بادشاہ
 نے اندھیر چار کھینچا۔ ہر گھر کا دروازہ بند تھا۔ مگر میری اپنی مجھوری تھی میں کیا کرتا۔

اس کے چلے جانے کے بعد میں اطمینان سے بستر پر دروازہ ہو گیا۔ دروازہ
 کیا مگر جانے کیوں ہر پہل یہ محسوس ہونے لگا جیسے باہر کہیں دھنگ ہو رہی ہے۔ جب تک یہ
 محسوس ہوتا تو میں اٹھنے کا ارادہ کرتا۔ آخر ہر رات تو طوفانی رات نہیں ہوتی۔ ایک ہی رات کی
 تو بات تھی۔ تشویش یہ بھی تھی کہ اگر کسی اور نے اسے پناہ نہ دی اور وہ اس علاقے سے باز
 بھی نہ جاسکتا تو کہاں سر پہانے گا۔ لیکن جب بھی میں اٹھنے کا ارادہ کرتا یہی لگتا جیسے اس کا
 دھنگ اٹھ کر اہم ہو۔۔۔ یہ سوچتا اور کھٹ بھل لیتا۔۔۔ سردی بھی تو بہت تھی۔

یہ سردی کے سبب سے تھا یا رات بھر کی بے آرامی کے سبب سے کہ مجھے
 آنکھ کھلی تو دن چڑھ آیا تھا۔ گزری پر لکھ کی تو معلوم ہوا کہ بہت تاخیر ہو چکی ہے۔ میرے
 معمول میں تاخیر سے نکلنے کی کبھی گنجائش نہیں رہی۔

تاخیر ہو جانے کے خیال ہی سے وحشت ہوتی۔ میں نے ہر بات کو آزمائش
 کیا۔ جیسے جیسے تیار ہوا۔ گاڑی نکالی، دروازہ منتقل کیا اور پل پڑا۔۔۔ میں تیزی سے نکل
 چلا مگر اچانک سامنے سے ایک آدمی نے آکر راستہ روک دیا۔۔۔ یہ پردی کے ایک
 درخت گھر کا حکیمدار تھا۔

”کیوں صاحب۔۔۔ کچھ پتہ چلا سب کے ایک گھر کی بہت بزرگی ہے۔“
 ”ہاں۔۔۔“ معلوم نہیں کیوں حمدار دل دھنگ سے رو گیا
 ”تھی ہاں۔۔۔“

اس جہت کے لیے کوئی آدمی تو نہیں تھا۔۔۔ میں نے قدمے تشویش سے پوچھا۔
 ”اسی خبر۔۔۔ میں ادھر ہی جا رہا ہوں۔۔۔ آپ بھی چلیے۔۔۔“

یہ کہہ کر وہ تیزی سے نکل گیا۔ میں بھی پہلے اس کے پیچھے سٹیژنگ موزے کی
 پشلی کی گریب گزری پر گلاہ ڈالی تو دفتر کھینچنے کی جلدی نے ادھر نونے نہ دیا۔
 دفتر تو خیر میں وقت پر پہنچا ہی گیا مگر پھر شام کو گھر واپس میں بہت تاخیر ہوئی۔
 مگر یہ تصور آتے ہی ذہن میں معلوم نہیں عقب کا وہ مگر کیوں آجاتا تھا جس کی جہت مگر
 ہانے کی خبر اس وقت ہی تھی جب میں دفتر کے لیے نکلا تھا۔ جب بھی یہ خیال آتا میں
 کڑی پر بیچارہ جاتا۔ اچھے کوئی ہی نہ پاتا۔ کوئی شک، کوئی وہم، کوئی حدیث ضرور رہی تھا
 جو اچھے نہ دیتا۔ لگتا تھا میرے مگر کے ارد گرد کوئی ایسی خبر منڈلاتی پھر رہی ہے جسے میں
 نہیں مٹا پاتا۔

معلوم نہیں میرے مگر کے عقب میں کس کو خطرہ لاحق تھا۔ کس مگر کی جہت
 لگی تھی۔ میں سب ذریعہ مگروں کے انمول سے تو آکاہ نہیں تھا بہت وہ مکان جو ہانگل
 جوت مگر کے عقب میں تھا اس کے ہارے میں یہ تشویش ناک خبر بہت دنوں سے گردش
 میں تھی کہ اسے ہر طرح کے خطرے لاحق تھے۔ یہ جہت جب ڈالی گئی تھی وہ اسی وقت
 تک کی تھی۔ دیہاتوں میں درازیں پڑ گئی تھیں۔ اسی لیے وہاں سے مسز می مزدور اور
 باہد ب رخصت ہو چکے تھے۔ سب کو اس کے کرنے کا انتظار تھا۔

مگر ادھر سے کی جہت کے کرنے کا ایسا مگر افسوس مجھے کس لیے ہونا تھا کہ
 میں خبر میں ہی بیچارہ جاتا اور مگر نہ جا سکتا۔ مجھے اس پر تشویش نہیں تھی کہ کوئی اس
 جہت کے لیے جب کمر گیا تھا۔ مگر اس مگر مندی کا بھی کیا جواز تھا۔ چھتیس مگر تھی رہتی
 تھی۔ یہاں آتے ہیں۔ وہاں بھینگی ہے۔ گولیاں بدلتی ہیں۔ ہم گرتے ہیں۔ آدمی مرتے
 رہتے۔ مگر کوئی مگر گیا ہو گا تو اس میں تشویش کی کیا بات تھی۔

گھٹوں والی حویلی

اس وقت کے سنبھان کر ٹھوڑو سے بازاروں میں پالیس کی مولز کا لا دھوں پھرتی ہوئی جگہ جگہ سپاہی اجارتی پھر رہی تھی۔ کتوالی سے نکل کر وہ مولز ہاں بازار سے گزرتی ہوئی پالیس چمکی نکلی۔ وہاں کچھ سپاہیوں کو اجارت۔ پھر پلٹ کر ہاں بازار کے تاگہ لڑا چمک سے منزل پست آفس کی طرف مزگی اور بھانڈیاں دی گئی میں ایک کچھ سپاہی کو اجارت۔ ادھر سے پہلی تو وہ فریاد کے واسطے پہلے منزلی کے محلے میں ڈاکراں دی گئی میں بریک لگا دی۔ بریک کی آواز سے بارود گرد کے اونچے مکانوں کی چھتوں سے کچھ کھتر اڑے۔ اور مولز کے اجارت کی سمت میں ایک اور بھی پہلی حویلی کی تیسری منزل کی چھت پہ دھار میں بہنے کے بنے گھٹوں میں چھت کے دہی فوارے سے پانی دیتی ہوئی ایک ٹوٹا ٹھل ہاں کھی سی پتی لڑکی نے اجارتیاں اٹھا کے دھار کے اوپر سے گردن جھکا کے نیچے دیکھی ہوئی مولز کو دیکھا۔ کچھ دیر وہ کھڑی دیکھتی رہی۔ اس کے ہاتھ میں بگڑے فوارے سے پانی نہ نہ کر کے دھار سے نیچے اترنے لگا۔ ایک دو بوندیں شاید سڑک تک آئیں اور مولز کے اجارت نے کھڑکی سے سر نکال کے اوپر دیکھا تو لڑکی ہڑبڑا کر پیچھے ہٹ گئی اور ہاتھ میں لگا لگا اجارت اپنی کمر کے پیچھے چھپا کر مولز کو کھڑکی دیکھتی رہی۔

تو وہ سوچ رہی تھی کہ کون اس مولز سے اترتا ہے۔

یا کون اس پہ چڑھتا ہے۔

مولز میں بیٹھے ہوئے صدق کے اس نے صدق کے کندھے پہ ہاتھ رکھا اور اترنے کا اشارہ کیا۔ صدق نے بالکل کندھے پہ لٹکائی اور ساتھ لایا ہوا اپنا تھیلا اٹھا کر مولز سے اتر

آپ۔ جس جگہ وہ اترتا تھا وہاں کوئی پولیس چوکی یا تھا نہ نہیں تھا۔ وہ گلوں والی پہلی حویلی کی
ساتھ ایک کلاس روم تین منزلہ مکان تھا۔ جس کی ڈیوڑھی میں پولیس کے بکو سپاہی ہارپا
بچائے بیٹھے ہوئے تھے۔ موٹر کو رکنا دیکھ کر وہ اٹھ کے موٹر کے پاس آگے۔ موٹر
گڑکی سے سرگالے بیٹھے ایک تھانیدار سے اونچی اونچی آواز میں بکو دیو گڑے کرے
پاتھیں کہیں اور پھر صدر دین سے ہاتھ ملا کے اسے کندھے سے بکڑ کے اپنی ڈیوڑھی کی
طرف لے گئے۔

وہ ایک عارضی پولیس چوکی تھی جو جنگی حالات میں امن و امان کی خاطر رکھی
گئی تھی۔ وہاں تین سپاہی اور ایک حوالدار تھا۔ صدر ان پولیس والوں میں سے تھا۔ وہ
تھا۔ صدر کو اجار کے پولیس کی لاری دھواں چھوڑتی ہوئی آگے چوڑی سڑک کی طرف یہ
گئی جس کے دائیں طرف تھا نہ رام باغ تھا اور دائیں طرف قبرستان کے پاس سے بڑے
پھولنگو برج چوک سے نکلے شریف پورہ کے باہر سے راہ گولڈن ٹیبل کی طرف جاتی تھی۔
صدر کو علم نہیں تھا کہ وہ لاری تھا نہ رام باغ کی طرف مڑی یا پھولنگو برج کی طرف گی۔
موٹر اور جانے سے شور کم ہوا تو صدر دین کا انچارج حوالدار محمد سعید صدر کو حالات کی سمجھی
اور اس کی ذمہ داریاں پہ اسے چھوڑ دینے لگا۔

سنو۔

وہ صدر کو کندھے سے بکڑ کے جھنڈوتے ہوئے ہوا۔

تم شہر میں نہیں میدان جنگ میں ہو۔

میدان جنگ کا ہم سنتے ہی صدر کی ہانچیں کھل گئیں۔ شہروں میں رہتے رہتے
تو وہ کھلا گیا تھا۔ اس نے ڈیوڑھی سے باہر قدم نکال کے چاروں طرف گردن گھما کے
دیکھنا شروع کر دیا۔ جیسے برما کے کھلا ہونے دشمن کے جہاز کو ٹکا کرنا تھا۔ گردن گھماتے ہوئے
اوپر دیکھنے سے اسے سامنے گلوں والی پہلی حویلی کی تیسری منزل اور دوعار کی کچی پائیک

جیسی ہی سٹی ریڈر سے گال کا کے کڑی ایک جوں خوش رنگ جس سے بھی ہوئی لڑکی نظر آئی
 رواج میں صدر دین ریڈر آپ نظر ہوا کرتا تھا۔ ریڈر کی سکرین پر لوگوں کو کسے چمکتے ایک
 بچے کو دیکھ کر اسے پتہ چل جاتا تھا کہ یہ دوست ہے یا دشمن۔ تین منزلوں اور پورے چھتے پر
 کڑی لڑکی کی آنکھوں کی چمکتی تھیں سے خدا جانے صدر نے کیا پڑھا لیا۔ اسے ایک دم
 سے محسوس ہوا جیسے جس رنگ میں اس نے ہاتھ اٹھا کے سرگرد کرنا تھا وہ اس لحاظ پر پہنچ گیا
 ہے۔ اس کے ذہن میں کسی اور رنگ کی آئین ہادی ہونے لگی۔ جن سے پانچوں کی ہر آواز
 کے ساتھ سورج کسی کے بھول بنے تھے۔ کتاب کی چپوں ٹکرتی تھیں اور ٹوٹی ہوئی ڈور
 پر سے لے جاتی تھی۔ وہ اپنے خیالوں میں گویا ہوا گروں اور کبے گلوں والی عربی
 میں ان کے کونگے جا رہا تھا۔ جس کے پاس کڑی لڑکی کب کی پیچھے ہٹ گئی تھی۔ صدر کے
 نے کہا کہ پورے صدر سید نے صدر کی گردن پکار کے اپنی طرف کھائی اور بولا۔

ہوئے تہ آتے ہی کو مہر دیکھنے لگا۔

اسی دہلی، وہ گئے ہیں؟ صدر پوچھنے لگا۔

نہرت ہے سہلی۔

تھے پھر ہاؤس رکھتے ہی گئے نظر آ گئے، وہ ابھی تیسری منزل پر دبیار پہ بنے۔
 لیکن یہی بھٹوں سے کوئی درخت نہیں دکھتا۔ آگ اور دھوئیں سے ساہرا شہر بھرا ہوا ہے۔
 پھر رنگ، ہلکے ہلکے ہیں۔ پھر سے گھوسے جا رہے ہیں۔ مکان چل رہے ہیں۔
 گولیاں مل رہی ہیں۔ بچے اور تو گلوں میں پائی دیے نہیں آیا۔ گلیوں میں مرتے لوگوں
 کو پالنے آ رہے۔ کچھ کہا۔

کی استوری۔

صدر کھینچا ساہو کے پولیس مکان کے اعداد چلا گیا۔ اسے بتایا گیا کہ شہر کی
 آبادی تھیم ہو گئی ہے۔ پھر پھر مسلمانوں اور عسکوں کے مضبوط گڑھ ہیں، پورے بچے

ہیں، دوسرے انہوں نے گلیوں اور بازاروں میں اپنی دروازے لگا کے اپنے اپنے قلموں
 قلموں میں بدل لیا ہے۔ ہفتوں میٹروں کاریشن گھروں میں اکٹھا کر لیا ہے۔ اکا کا جملہ
 خلاف فریق کے ہتھے چڑھا جاتا ہے وہ مارا جاتا ہے۔ ان مضبوط قلموں کے باہر جو نکل نکل
 مکان ہیں ان کے کھین اپنے مکان خالی کر کے انہی قلموں کے اندر بھاگ گئے
 ہیں۔ سامنے کی طرف بگڑ مسلمانوں کے گھر ابھی آباد ہیں کھلے والی حویلی سمیت۔ ہر
 کے اس طرف بندہ وہ سکون کے گھر تھے۔ وہ خالی کر کے چلے گئے۔ جس گھر میں پانچ
 کا ڈیرہ تھا، وہ بھی کسی غیر مسلم کا گھر تھا۔ وہ گھر والا شاید کوئی تالین ہانی کا کارخانہ چلا
 تھا، اوپر چوباروں میں رنگارنگ سوتی اور لونی دھاگوں کے گولوں اور پٹیوں کے ڈھیر لے
 تھے۔ خوشحال گھرانہ ہوگا۔ گھر کے در و در بھاگے ہوئے غیر مسلم کھین کی امداد دیکھتے
 تھے۔ بچے کوفٹروں میں تانبے ہتھکے کے برتنوں کے علاوہ بیسوں چاندی کے ظروف بھی
 تھے۔ فرنیچر کی ترائی تراش اور دروازوں پہ لگے پردوں سے بھی بھاگے ہوئے کھینوں کی
 آسودہ حالی کا اندازہ ہوتا تھا۔ وہ سارا مٹھی مٹھی کھاتے پیتے لوگوں کا لگتا تھا۔ سامنے کی گلیوں
 والی چلی حویلی کے بچے کھسی گھوڑا رکھنے کے لیے گھیرا جاتا ہوا تھا۔ سامنے گھروں کی گلی
 کے چھپے مسلمانوں کا بڑا مٹھ شریف پورہ تھا۔ شریف پورہ کے غیر شریف جنگیوں کی ہونے
 بار کی حد اس گلی تک آتی تھی۔ اس لیے شاید تیل منڈی کی اس ڈبگراں گلی کے غیر مسلم
 کھین بھاگ گئے تھے۔ گلی بازار چڑی تھی۔ سولہ اس میں سے گزر جاتی تھی۔ اب اسی گلی
 پہ مسلمانوں کے اکا کا آباد گھروں پہ غیر مسلم چلے کرتے تھے۔ کبھی کوئی کسی کے گھر کے
 دروازے پہ تھلی کا کسٹر ڈال جاتا اور پیچھے آنے والا ہاتھ جلا کے چتا بنا۔ کبھی چل
 آدوں کا پورا ہٹوں کھوڑوں کو کھتا ہوا نعرے لگاتا دوسرا جاتا اور جو نظر آتا اسے نہ گنا
 کرتا تھا۔ ہولے ہولے اس گلی کے مسلمان کھین بھی چپکے چپکے پیچھے کے بڑے مسلمان
 چلے شریف ہاتھ میں ہتھکے ہولے جا رہے تھے۔ مسلمانوں کے مخلوط قلمے میں قلم بند ہو

رہے تھے۔ مگر گلوں والی پہلی سوزی میں روز رات کوئی بل جاتی اور صبح دم وہی سوزی
بہت کاخوارہ لئے تیسری منزل کی دیوار پہ بیٹے گلوں میں پانی دینے نکلتی جاتی۔ صدر بھی
اس کے اپنی سب سے اونٹنی بہت پہ نکلتی جاتا اور کھنگلی لگا کے اسے گلوں میں پانی دینے
دیکھتا رہتا۔ جسے اسے دیکھے بغیر اس شہر میں صدر کو صبح نظر نہیں آتی۔ لڑکی بھی پانی دینے
دینے بیچ ہی آنکھوں سے صدر پہ اور سے ڈالتی رہتی۔

پہلا شہر قباد کی آگ میں جل رہا تھا اور شہر کے میں نکال ایک محبوب غنیہ معاشرت
شروع ہو رہا تھا۔ غنیہ دیکھتے دیکھتے تیسرا دن ہی ہوا ہوگا کہ صدر نے ہاتھ اٹھا کے گلوں
والی کو آداب عرض کرنے کے انداز میں شاعرانہ سلام کر دیا۔ لڑکی گھبراہٹ میں ایک ہی
کلمے میں پورا غورا اٹھنے کے شرماتی ہوئی بھاگ گئی۔ تھوڑی دیر بعد فواد بھر کے پھر آئی تو
صدر نے انہیں ٹھیک ہو کے فوری سیٹ کر دیا۔ لڑکی کے ہاتھ سے کڑاک سے فواد پھوٹ
گیا۔ پتہ نہیں پائی کتنا گرا، اس کے پاؤں پہ پھوٹ آئی یا نہ آئی۔ بہر حال لڑکی پیچھے ہٹ
گئی۔ پہلے تو دونوں ہاتھوں سے اس نے اپنا چہرہ چھپایا، حیا سے دوہری ہوئی۔ پھر دماغ پہ
بے بہت کے کلمے کے گرد ہانپیں ڈال کے سر نہوڑ کے کھڑی ہو گئی۔ کچھ دیر بعد لڑکی نے
کلمے میں گئے پھولوں میں سے ایک گیندے کا پھول توڑا اور اسے سوکھتی ہوئی دھیرے
دھیرے اس کی ہانگڑوں اپنے گالوں پہ پھیرنے لگی۔ پھر اس نے ہاتھ میں پکڑے پھول کو
اداسی دیر کے لیے اپنے چہرے سے جدا کیا اور پھر کڑاک سے اسی پھول کو ڈنڈی سے
پکڑ کے حکام کرنے کے انداز میں اٹھا کے سر کو لگا لیا اور پھر وہی پھول اپنی گالوں پہ پھیر
کے صدر کی طرف اٹھا کے ہوا میں پھینک دیا۔

صدر تو ہوا میں اڑنے لگا۔

اس کاخوارہ ہوا میں اڑتے ہوئے پھول کی تھر تھرتی ہانگڑوں میں تھا۔ پھول ڈرا سا لڑکی کی
اداسی سے لوہے اٹھا پھر جہاں صدر جہاں سے دماغ کی طرح پھول ہوا نیچے گئی میں گرتے

اور صدر وہاں اور بیڑیوں کی طرف بھاگا۔ اسی لمحہ وہ گڑبگڑ بیڑیوں میں اتر گیا اور وہیں بیڑیوں سے نکل کر گھلوں والی حویلی کے دروازے پر پہنچے گلی میں پہنچ گیا۔ بھول کر وہاں بیڑیوں کے سڑک تک آیا تھا اس لیے صدر سے پہلے سڑک کو چھو گیا۔ صدر گھلوں والی حویلی کے باہر گلی میں پہنچ کر گڑے ہوئے بھول کو اچھوٹنے لگا۔

اسے زمین پر گرا بھول نظر آیا۔

وہ اسے بھلانے کو بھاگا تو زمین سامنے سے وہ گھوڑوں والی ایک کھٹی لکٹی آئی۔ صدر کھٹی کو روکنے کے لیے بازو اٹھا کے سڑک کے بیچ میں آ گیا۔ اسے مارا ہوا کھٹی کھٹی گھوڑوں کی تاہوں سے بھول نہ سلا جاتے وہ ہاتھ اٹھا کے ، روکو روکو چلتا ہوا کھٹی کے آگے آ گیا۔ کھٹی روک گئی۔ صدر نے ہلکے بھول اٹھا لیا اور اسے سوگت ہوا کھٹی ہانے کے پاس آ کے ہوا۔

”سہیلی تھی“

کھٹی سے ایک غومدہ بچی بچی سو گھنوں والا درمیانے سے قد کا کوئی بیٹا بیٹا بیٹا بیٹا بیٹا سال کا آدمی ہاتھ پر ہل ڈالے اتر آیا اور صدر سے پوچھنے لگا، ”سہیلی کس بات کی۔“

صدر نے کہا ”آپ نے کھٹی روک لی۔“

”وہ تو روک ہی تھی۔“ وہ آدمی بھاری سے ہوا۔

”کیوں، آپ نے بھی اسے دیکھ لیا تھا۔“ صدر ہاتھ میں بھرا ہوا گیندے کا بھول اسے دکھانے کے اپنی پشت کے پیچھے بھپانے لگا۔

”کاش بھپانے سے ہوا۔“ وہ آدمی پوچھنے لگا۔

”کیونکہ میں ہوں۔“ آپ کو کیا۔

”بھولوں آتی سہیلی خود ہی پوچھ رہے تھے، پوچھیں والے ہوں۔“

"ہی ٹی"

"کوئی پھول اٹایا ہے تم نے ادھر سے۔"

"آپ کو کیا۔"

"میں، اپنی چیز کے بارے میں پوچھ نہیں سکتا۔"

"آپ کا کیسے ہو گیا یہ پھول۔" سعد گیندے کا پھول اپنی پشت کی پیچھے سے

اٹائی کر تھنے کی طرح ہر اتار اٹا سے دکھانے کے پوچھنے لگا۔

"سچ نہیں آ جا، گلے سے لوٹ کیسے گیا۔" وہ آدی حویلی کے بیچے کوزہ کے

دو گروں اٹا کے گلے دیکھتے ہوئے جھپٹا پھر اشارے سے کسی میں بیٹھے کوجان کو بھی

روٹی کے بیچے کیروان میں کوزی کرنے کا کہنے لگا۔ کسی گلوں والی حویلی کے کیروان

میں کوزی ہونے لگی تو سعد کو بھڑکی کہ جس آدی سے وہ غائب ہے، وہی تو گلوں والی

روٹی کا ملک ہے۔ سعد نے پھول چھپاتے چھپاتے اسے اپنی خاک کی ٹیکر کی بیب میں ڈال

یا اور کیوانے انداز میں حالت مٹانے کی کوشش میں بولا: "اچھا، آپ یہاں رہتے

ہیں آپ کی حویلی ہے یا؟"

"کیوں کوئی اعتراض ہے، جو سعد آدی گروں کی بھی کر کے ٹھیکران انداز میں ہو۔"

"نہی ہم تو آپ کے پڑوسی ہیں۔ یہ سنائے۔"

"جہ ہے، جس دن سے تم پولیس والے ادھر آئے ہو ہماری جان کو سمیٹ

گیا ہے۔ جو ملک نہیں بھی کرتے تھے، وہ بھی ہمیں مٹھوک بھگے کے گھورتے ہیں جیسے ہم

خالی راگی کے لیے تمہیں سندس سے کر پایا ہو۔"

"کہ تو راگی کے لیے ہی ادھر آئے ہیں۔"

"میں نہیں ضرورت کسی راگی کی۔ چہ پشتوں سے ادھر رہتے آ رہے ہیں، یہاں۔"

"سکھانے پھر پاروں ہوتے ہیں اور ہمیں پڑوسی ہمارے ہو۔ ہمارے گھبران بنے بیٹھے

ہو۔ اس کا پورے وقت کو اسی وقت کوڑی باتیں سن کے صبر کے اندر بھی کڑواہٹ اٹھنے لگی اور وہ کہتا۔

کیوں آپ کا کوئی فریج ہے، ہم پکھنیاں رکھیں گے۔

وہ فریج کس لئے کہا ہے۔

مبارے ٹر میں لٹا رہا ہے، آپ کو نہیں دیکھتا۔

یہ مبارے دیکھنے کی چیز نہیں ہے یہاں۔ تم دیکھو، دو چار دن کا یہ تماشا ہے۔

سب فریج کے بند ہائیں گے۔

کیوں، آپ کو نہیں پتا کہ کتنی کے بن رہ گئے ہیں، مبارے میں۔ آپ مسلمان

ہیں۔

ہاں ہوں۔

تو آپ کو نہیں پتا کتنا ہوتا۔

کیوں، میرا دماغ شراب ہے یہ جو ملی چھوڑ کے، کبھی کبھارے تم جیسے لوگوں کو سب کے چلا ہوا ہے۔ ہاں ہی ہاں۔ چوہ چھوڑنے سے جو کھانا ہے وہ یہاں چھوڑ چکا ہے۔ کچھ ہتھیار ہتھیار ہیں ہاں۔ اپنا سب کھانا اہواز کے اجڑ کے چلا ہوا ہے۔ کیوں۔ کون سا قانون کہتا ہے۔ انڈیا کا پاکستان کا۔ تم بھی مسلمان ہو؟

ہاں مسلمان ہوں۔ اور اپنا گھر بار چھوڑ کے، ان مبارے کے دنوں میں، آپ کے علاقے میں آیا ہوں۔ اس لئے کہ آپ لوگوں کی حفاظت کر سکیں۔

اسی لئے نہیں میں کہے بھول اٹھتا ہوں۔ اس آدھی نے صبر نہ کیا، تھوڑی بڑھتی اور پھر سر اٹھا کے اپنے گلوں کو دیکھتا ہوا ہوا، پتہ نہیں لہو لہو سے بھول کیسے گر کے ٹوٹ گیا۔ دکھاؤ ڈرا پھول۔

کیوں دکھاؤں، اس وقت یہ آپ کے گیلے میں نہیں لگا ہوا۔ بڑا سے بڑا

تو نہیں تو نہیں؟ آپ نے خریدی ہوگی۔
 نہ سڑکیں آپ پاپیس والوں کا خریدنا ہاں ہیں، جو یہی چاہے اللہ۔ پاپیس
 والے نہ ہوتے داتے ہو گئے۔ ہمارے گھر کے سامنے ہی چھاؤنی لگائی تھی، مصیبت۔ وہ
 آدمی بیٹا بنا ہوا اپنی عورتی میں جانے کے لیے مڑتا ہے اور پھر رک کے صدر کو پاس بنا
 کے آگلی سے پڑھتا ہے۔ "تمہارا کیا خیال ہے، حالات درست ہو جائیں گے۔"
 حشک ہے۔ صدر اس کے دوستانہ انداز میں پچھلے سوال سے سادگی کی ایک دم

جواب دیتا ہے۔

کیوں۔ تمہارے گھر کیا کہتے ہیں۔ کبھی والے آدمی کی پریشانی بڑھ جاتی ہے۔
 آپ یہیں کا چاہتے ہوگا۔ امرتسر تو پاکستان میں نہیں جانے دیتے یہ۔

پھر

پھر کیا، دوسروں نے ہم مسلمانوں کو اجھر سے چھڑا کرنا ہے۔
 ہرے ملک میں یہ ہے کتنے کروڑ مسلمان ہیں۔ سارے پاکستان چلے جائیں گے؟
 باتوں کا جگہ پڑھیں،

پھر۔

اجھر پنجاب میں معاملہ اور لگتا ہے۔

کیوں؟

میرے نہیں جسے ہوائی پاپیس میں ہیں۔

میں نے تمہارے بھائیوں کو کیا کرنا ہے۔ باباب کا معاملہ کیا کہہ رہے تھے تم۔
 اسی تو کہنے کا تھا، جسے ہوائی میرے نسل دیکھنے نے اجھر کے عیادوں کی ڈاک پڑھی ہے،
 وہ ڈاک خانے میں مسر ایلوٹی پڑھے۔ لہذا میں۔
 کیا چھوڑنا ہے؟

یہی مادھر انہوں نے غلط وار امیر مسلمان لوگوں کی لہر تھی نکالی ہوئی ہیں غلام
 طور پر جن کی بوہٹی حویلیاں ہیں، گھوڑے گھیاں ہیں، ان کی نشان دہی کر رہی ہے، انہوں
 مار کے لیے۔ رہنے کسی کو نہیں دیا انہوں نے۔ انوں کی بات ہے۔ اب تو کبہ بنا ہی
 شروع ہو گئے ہیں۔ آپ نے سامان نہیں ہاں خدا۔

بھڑ بھڑی بات کرتے ہو۔ کہتے ہو مسلمان ہوں۔ میں پوچھتا ہوں تم جلدی
 طرف ہو یا ان کی طرف۔

آپ کو کیا لگتا ہے۔

مجھے تو سمجھ نہیں آ رہی۔ تو چل، گیارہ بج کا دروازہ بند کر کے تالا لگا دے۔ پہلی
 گھنٹے دس بج۔ وہ آدمی اپنے کچھ ان سے مخاطب ہوتا ہے۔ پھر صدر کی طرف پلٹ کے کہتا
 ہے یہاں جانا سامان بندھنے والا ہے۔ گھیر سے اطروت کی لائی لکڑی کا فریج ہے سنا
 بھری حویلی میں۔ اب کیا تاؤں۔ بیٹیاں بھری ہیں اٹھ کے فضل سے رہتی تھانوں سے۔
 چاندی کے ٹوٹے ہیں اٹھ سے گھر میں۔ تم مسلمان ہو؟

ہاں ہی۔

نام کیا ہے؟

صدر ہیں۔

لہذا جانے کے ہو؟

ہاں ہی۔

لہذا جانے والوں کا بھی اچھا کاروبار ہے شہر میں مگر ہم اس سرسوں کے مطالبے
 کے نہیں وہ۔ ادھر سے ہر لگتے لاہور جاتا تھا میں تمہاری عمر میں ایسا منڈی کاٹا تھے۔
 ادھر بھی ایسا کاروبار تھا۔ چلے لے تھے۔ سرکاری جنگ ادھر بہت تھلے۔ چھاؤنی اور مال
 تاؤں میں۔ اب سارا کاروبار ادھر ہی ہے۔ گولڈن ٹیبل کے گردا گرد آدمی جارتیں، میری

گرائی میں بی بی ہیں۔ ہر دم کہتے ہو میں سداں بانہوں۔ وہ بھی وہ۔ پہلی میرا دل سے
 میں ہے، گیارہ سال سے۔ جہاں نے اور کیا ہوا میری گرائی میں رکھ پھولا۔ سولے
 کے پڑھتوں میں ہر گھر کے اس نے بیٹھے ہیں۔ وہ اس کاہلی ہے۔ اور داری تو یہاں
 میری ہوئی نا۔ پڑھا اس کے علاوہ اس کے بیوی بیٹے بھی اور میرے بہرا ہیں۔ میری دکن
 اور ہے، ساتھ میرے والدین ہیں۔ سب میرے پاس ہیں، اور عربی میں۔ میرے بیٹے
 تو پورے ہیں، دکن بیٹے ہیں۔ وہ ۲۰ سے ۳۰ کے کیا سوہنی کے کہ اپا عربی پھول کے بھاگ
 گیا۔ میں نے نہیں جانا۔ مجھے نہیں ظن۔ میری کس سے دشمنی ہے۔ کسی سے بھی نہیں۔
 تو وہ یاد دہانے تو میرے سکول سے ہیں۔ عمر کے جھڑپے تک سے میری یادگی ہے۔ تمہارا
 کیا ذیل ہے وہ مجھے نکال دیں گے۔ تمہارا رشید احمد شیخ کو۔

رشید نام ہے آپ کا۔

رشید احمد شیخ۔ تم نے اپنا نام بتایا تھا؟

صدا دین۔

ہاں، مجھے دین یاد رہ گیا، صدہ بھول گیا تھا۔ پہلے میں نہیں بھولا تھا نام۔ ایک
 بار سے کاہم میں گیا۔ اس سال بعد بھی وہ نظر آ جاتا تو یاد آ جاتا۔ اب تو دماغ میں کوئی
 چیز رہتی ہی نہیں۔ کھلی ہی رہتی ہے اندر۔ رات کو بید نہیں آتی۔ دن کو بھوک نہیں لگتی۔
 تم وہ سال پہلے لکھے دیکھتے، میں اس تو نہیں تھا۔ بلائی صحت تھی۔

صحت تو مائتا، اب بھی آپ کی۔

نہی دین کی، صدہ دین نام کہا۔

کی۔

اب وہ بات نہیں رہی۔ اس قسمی کیا تھی، دل پڑتا رہتا ہے ہر وقت۔ کان
 دہریاں لگتے رہتے ہیں، یا ہڈی کھس تھی؟

کہیں دھماکا ہوا ہے۔

اس طرف جا۔

ہاں، وہ دیکھیں، دھماکا بھی اٹھنے لگا ہے۔

کس چیز کا دھماکا تھا یہ تم تو پولیس والے ہو۔ پتہ ہوگا۔

شاید گریڈ پیپلا ہو گئی ہے۔

گریڈ بھی پھینکتے ہیں یہ؟

ہاں جی۔

اچھا۔

زیادہ تر مٹی کا تیل یا پٹرول دھماکوں پہ ہلکے کے جلاتے ہیں۔

رشید احمد شیخ پریشانی سے گروں کھما کے اپنی حویلی کا دیوار کی گڑی کاہن لاری

اتنے دھماکے دیکھ کے کہم جاتا ہے اور پھر صدر کے کندھے پہ ہاتھ رکھ کے خود کو غم

اسنے کے انداز میں کہتا ہے۔ آپ لوگوں نے اچھا کیا، ہماری حویلی کے سامنے اچھا

لگا۔ دھماکوں کے دن ہیں۔ انٹھاری میری طرف سے آیا کرے گی۔ کہ دیا ہوا

صاحب کہ

میں کہہ دوں گا جی۔ صدر دوستانہ باتوں دیکھ کر لگ کر جیب میں ہاتھ ڈال کے

کھرا ہوا ہوتا ہے۔ اس کے ہاتھ میں جیب میں ڈالا ہوا گیندے کا پھول آجاتا ہے۔

پھول نکال کے دھواں ہاتھوں سے اس کی ہڈیاں سیدھی کرنے لگتا ہے۔ رشید احمد شیخ پھول

کو دیکھتے ہی پھر گروں سوز کے سوچتا ہوا بڑبڑاتا ہے، گلے سے لگا لگا پھول ٹوٹ کے گر

کیجے کہ

شیخ صاحب، ابھر گیلے ٹوٹ جاتے ہیں، آپ پھول کے ٹوٹنے کا سوچ سوچ کر

پھان بھونے ہاں ہے جی۔

ہاں کتا تو ٹوٹ سکتا ہے۔
 کتا کیا وقت ہلاؤں سے نکل جاتے ہیں۔ جب وقت آتا ہے۔
 کون سا وقت، کس وقت کی بات کرتے ہو؟
 آزادی، عواموں کے وقت ہی صاحب۔
 ہوں۔ کچھ نہیں ہوتا دین ہی، پاروں کا کتا ہے۔
 پاروں کا ہی کتا مگر پاروں ہی اس کے پکر نہیں اترتے۔
 ہی لے لے کہا ہوں تم لوگ وہی والے ہو سبھاؤ، انوں طرف کے بیانوں کو۔
 ہی کو زیادہ ہی ترویج۔ پختہ ہی زیادہ ہی گے اتنی پکر زیادہ چھیں گے۔
 ہر سے ترویج گے۔

انہی میں لے ہوئی کی رنگ میں لے لال پہلے شیشوں والی گڑی کی گڑی
 ایک ہند کول کے تھری منزل سے گیندے کا بھول بھگتے والی لڑکی، سر نکال کے صدر
 کو لہ لے سکتی ہے اور ہر سیدہ ساچرہ ہا کے آواز دیتی ہے، "ہاں ہی"
 رتہ ہونے ایک دم پلے کے گڑی کی طرف دیکھ کے کہتا ہے۔
 آیا ہوں۔

ہاں ہوا، آپ کی۔
 ہاں ہاں ہی ہے میری۔ تمہیں بتایا ہے، ہونگی دولت میں ہے میرا۔ لندن
 ایک ہر ایک کا آپ۔ ہر ایک ایک نیلا تھری ہے۔ ہاں ہاں ہے، ہونگی کا ہاں
 ہاں کے پکے ہیں۔ میرے ہاں سے ہاں ہی، تم کہتے ہو۔ ہاں ہاں ہاں شروع
 کہ کہہ رہے شروع ہوں۔

ہاں ہاں لے لے لے میں ساچرہ سے پھولوں کا یہ کیسے کر۔
 آپ کو اسی تک ایک بھول کا تم کا ہے، ادھر کوئی کتا نہیں پچھا۔ ساری حویلی

چھوڑ کے چلتا ہے۔

خبردار، برے بول منہ سے نہ بول۔ لاوے میں دیکھوں، پھول کی ڈھلی ہو

نوا کیسے ہے۔

بلخ صاحب چھوڑیں، ابھی آپ کے گلوں میں اور پھول ہیں۔

لے باغ تموزی ہے چھت پ۔ گلے ہیں۔ کسی کسی گلے میں اتکا ہوا پھول کی

ہے گونہیں آتی گرا کیسے۔

میں گرا لیتا ہوں۔

تم؟

ہاں۔

کیسا

"خندوں سے۔" صدر چٹنے لگا ہے۔

پولیس والوں کا نکلنا اچھا نہیں ہے۔ تم کون سے فونہی ہو۔

فونہی ہی تو ہوں، دوسری نا لکیر جنگ لڑی ہے برما کے علاقہ پ۔

کا کے تھے جنگ میں۔

آپ کے سامنے کھڑے ہوں۔

میں بھی اب حکیم ہے۔ حوالدار کی کو کینا افطاری کے علاوہ سحری بھی ہمارے

گھر سے آئی کی۔ اچھا پتا ہوں۔ بس ڈرا دھیان رکھنا۔ چاروں اور تیل کے بیچوں سے

بچاؤ رکھنا ہے۔

آپ فراد کریں، میں ہوں۔

شہاں۔ سب رکنا۔

اللہ حافظ ہے۔

کڑی کی روز سے گی، سارو ساری باتیں من کے کڑی منکرانی رانی ہے۔
 صد پختے سے سارو کو دیکھ کے دوبارہ اللہ حافظ کہتا ہے تو سوئی کے دروازے میں داخل
 ہو گیا اور بیچ پخت کے بلر صدر کی طرف دیکھ کے ہاتھ ہلاتا ہے اور زہر لب کہتا ہے، اللہ
 ہی حافظ ہے۔

صدر کے بیوں میں پیسے لگ جاتے ہیں۔ سارا سارا دن وہ کچی چھت پہ لگی
 ہے اپنی لڑائی میں ہزار تازی میں لگا رہتا ہے۔ ایک دن صدر چھت پہ کڑا کڑا سا زہر کو
 ادرے سے لقم اور کاغذ لکھا کے پوچھتا ہے نہیں لکھتا پڑھتا آتا ہے۔
 وہ سڑک پار چھت پہ کڑی، اپنے دونوں ہاتھوں کی انگلیاں گنتے کے انداز میں
 ایک ایک گھومتی ہے۔ پوری دن کی دن انگلیاں گھول کے بنا رہتی ہے کہ دن پڑھی ہوں۔
 صدر کو داخل جاتی ہے۔ کاغذ لکھا کے پریم پڑھنے بیٹھ جاتا ہے۔ پہلے تو اسے یہ کچھ نہیں
 آتی تھاپ کیا تھی۔ آخر سوچ سوچ کے کہتا ہے۔ گلوں والی۔ جب یہ مسئلہ حل
 ہوتا ہے تو لکھا کے صدر جات کی کچھ نہیں آتی۔

تم خود سوچ لو۔

میرا کہاں ہوا ہوا کہ نہیں پیدا لکھتے سے۔ تم نے تو اپنے گلوں سے مجھے کوئی
 بات بھی آرزو کے نہیں دیا تھا۔ میں بلر بھی تیرے گلوں کی منی میں اپنی جزیں ڈبو کے بیٹھ
 گیا۔ لکھے بھی کچھ نہیں آتی تھی کیا لکھوں، اب تک سمجھ نہیں آتی۔ اپنی بات تو کی نہیں۔
 اپنے سے بیٹوں کی باتیں گھول کے بیٹھ گیا کہ جب میری ہاری آئی تو اپنی بات کہہ
 لیں گی۔

صدر نے میرا کہا۔

پچھلے پچھلے میں ہی اپنی کہانی سناتے بیٹھ گیا۔ لکھتے لکھتے وہ برما محاذ کی کہانیاں
 لکھ لکھتے۔ وہاں میں لکھتے ہوئے وہ اپنے گھر کا احوال بھی لکھ دیتا ہے۔ ساتھ یہ بھی کہ

تم تو میرے ہونے کی باتیں ہی، چاندی کے ہونے ہیں، کھلے ہیں۔ گیسٹ کے ہونے ہیں۔ ہمارے گاؤں میں کچا کھانا ہے۔ خطا کے آخر میں لکھتا ہے لیکن لکھا ہے، ہمارا کھانا اور تھری ہوئی اور ہی رہ جاتی ہے۔ ہر حال جدھر تم نے اور میں نے ہوا ہے۔ وہی بیاری جگہ ہے۔ وہاں میں تمہیں بہت یاد کروں گا۔ ہاں وہاں ساتھ ہو گی۔ یہ کہہ کر اپنے لیے نہیں، پاکستان کے لیے تمہارا ہاتھ، ہاتھ، ہاتھوں (یہ فقرہ لکھ کے اوپر میں نے) خوش ہوتا ہے کہ جیسے تیری کو بھانسنے دیا اور اپنے معاملے کے لیے اخلاقی بنیاد قائم کر لی۔ لکھ کے صدر خط کے کاغذ پہ ایک دن روپے کا نوٹ لپیٹ دیتا ہے (شاید وہ اسے دیکھ رہا تھا، میں اتنا بھی غریب نہیں) نوٹ کے اوپر اپنے گھر میں پڑی اون کے ہونے سے ایک پد کھول کے لپیٹ دیتا ہے۔ خط پہ اون لپیٹے ہوئے اشارے سے اسے دکھائی دیتا ہے کہ خط کے اوپر اون ہے۔ ہون کھول کے پڑھ لیتا۔ خط کی گیندی دیکھ کے وہ اس کی بہت پہچان دیتا ہے۔

انگے دن اور سے جواب آجاتا ہے۔

جواب بھی اسی طرح دیا اون کے اپنے کے اندر۔ وہی روپے کے نوٹ کی جاننے سے روپے کے نوٹ کے اندر لپٹا ہوا۔ ساتھ ساتھ جواب پڑھ کے صدر کے ہونے کا جواب دیتے ہیں۔ کیا ہوا۔ پہلے ہی خط میں ساتھ سے وہ سیراں بن گئی۔ لکھی جاتی ہو اس کی۔ گیسٹ سے ملاقات کے لینے نہ ہوں، مجھے نہیں شوق سونے چاندی کے جھنگوں میں گئے گینے بنے گا۔ میں تو تمہارے سبکے کوٹھے میں پڑی لائین بنا چاہتی ہوں۔ ہاں لکھ سالی کر کے۔ ہماری روٹھی ہو گے۔ بس تمہاری ہو گی۔ ماسوں سے نہ ڈرنا، وہ تو میرے ہونے سے ہے۔ ہاں میں ان کی ہونگی ہوں، ان کے گیارہ میں بدھی جیسی کی گولڈن نہیں ہوں۔ کھنگے۔ اگر ہماری بات تمہاری سمجھ میں نہ آئی تو آگے پار تیسری منزل کی بہت پہنچے لکھوں سے پہلے نہیں گھلا لکھ کے ماسوں کی سمجھ آئی!

صدر کے ہاتھوں کے طوطے لاکھے۔ یہ لڑکی ہے یا ماں لیلہ ایک ذرا سی
 پگھلائی سے ہارو کے اجمیر کی طرح چست مگی ہے۔ دھاکے شروع ہوئے۔ صدر کو تو بارہ
 سے کہنے کا پتہ تھا۔ لگا لگا لگا لگا کے اس نے پریس چکی کی گاڑیاں اور ریمز قریب کر دیے۔
 رازو نے بیٹھی بیٹھی ہاتھیں لگا لگا لگا کے اس کے امد ہاہر کے اچھے ہجر ایسے۔ اوپر سے
 پریس چکی کے اٹل کاروں کے بھی مزے ہو گئے۔ اظہاری کے وقت پگھلائے، سونے اور
 گرم گرم جلیبیاں آئیں۔ ساتھ شربت کا بھرا ہوا بک۔

ایک دن صدر کی پوری بچاری گئی۔

حوالدار کو کچھ نہیں آ رہی تھی، کہ سامنے والی حویلی کا رشید ٹھیکیدار ایک دم سے اٹھا
 میراں کے ہو گیا۔ روز شام کو اس کا بھرا ہوا دھڑ خوں اٹھا کے آ جاتا۔ مری کے وقت شیخ
 صاحب کی آٹھی کا کوچہ ان قہال پہ کھانے لگا کے پہنچ جاتا۔ ایک شام کیا ہوا حویلی سے بچ
 دھڑ ٹوان دے کے چلا گیا۔ قنوزی دیر بعد پھر آیا اور ایک بہت ہی نہیں چاندی کی شیشی
 پہ کر دینے کے سلیڈ رومال کے نیچے کوئی خصوصی بکھن اٹھانے پھر آ گیا۔ روزہ کھانے میں
 چند ماٹھیں دھتی تھیں۔ حوالدار اپنے سپاہیوں کو بھی چٹائی پہ لے کر بیٹھا اظہاری سے لیل کی
 اماں داک رہا تھا کہ وہ بچہ تھکتی چاندی کی قہال پہ مٹھائیاں سہانے پہنچ گیا۔ حوالدار نے
 ایک سپاہی کو اشارہ کیا کہ اٹھ کے قہال پگھلائے۔ وہ سپاہی اٹھ کے بچے سے قہال پگھلانے
 لگا تو پہ ایک دم دو قدم پیچھے ہٹ گیا اور بولا آپ کے لیے نہیں ہے۔ صدر دین بھائی
 کے لیے ہے۔ ہائی نے بولا تھا صرف انہیں دے کے آتا۔ یہ کہہ کے وہ دو قدم قدم چٹا
 صدر ایسے کے پاس آیا اور بولا۔ یہ لو بھائی اسے کھانا۔" یہ کہہ کے بچہ تو چلا گیا۔ صدر دین
 شام سے بھاگا ہوا گیا۔ سب سپاہیوں کی آنکھیں چپکنے لگیں۔ حوالدار کی آنکھوں کے ساتھ
 آنکھ کی رگیں بھی پگھلائے لگیں۔ کچھ دیر وہ کھنگلی لگائے صدر دین کو گھورتا رہا۔ پھر بولا
 تھوڑا سا بھائی دیا ہے سارا دن اور چست پہ۔ اسنے میں لڑائی کی آواز آ گئی۔ ایک سپاہی

کہنے لگا استاد جی روزہ کھولیں۔ حوالدار بولا اسے کھلوا جس کا راز آج کھلا ہے۔ وہ بولا ہجرت
 تھی، اپنے صدر کی جگہ سے ہمیں سخری نظاری نکلی جاتی ہے سخری تھی۔ سوچ کر سنے ہیں۔
 تھوڑی سے روزے رہ گئے ہیں۔

ان بھی تھوڑے ہی ہیں بھگ۔

حیرت ہے جی، مجھے تو حوالدار صدر دین کو گھورتا جائے اور سوچتا جائے یہ یہ
 نہ چلے صدر دین کو حوالدار ہمارا ہی ہو رہا ہے یا خوش۔ بہر حال صدر دین کا منہ الٹ ہو گیا تھا
 اور وہ سرخوڑے اپنی آنکھوں میں لٹا اور شرم کی ٹلی تھی چمک لے کر انہوں نے اپنے دائیں
 ہاتھ بیٹھے ہم جریلوں کو بھی بھی نظروں سے دیکھتا جا رہا تھا۔ دسترخوان کے پیچے سارے
 بکوان بھی اس کی ہانسی آنکھوں کی زد میں آتے تو انہیں دیکھ کے صدر ان سے گرا لے
 گھسٹ کے اپنے ساتھیوں کو دیکھتا جیسے کہ رہا ہو نکلا۔ میں کھلا رہا ہوں۔ شاید اسی لیے
 سوسے بکڑے اور سٹاپاں کھاتے ہوئے اس کے ساتھ بیٹھے سپاہی تھوڑی تھوڑی اور پھر
 اس کے کندھوں پہ چھپاں ایسے جانتے۔ جیسے اسے شہادت سے رہے ہوں یا اس کا شہید
 لگا کر رہے ہوں۔ جیسے اس نے کوئی ایسا سڑک مارا ہو جس سے ان کا بھی بھلا ہو گیا ہو اور
 وہ جڑ سے جاتا جاتا صدر کو دیکھ کے سر جھانے لگا۔ جیسے بگ سوچ کے ڈار رہوں۔ شاید
 حوالدار کو یہ دلا کہ ہر صدر کی چوڑی رشید چھیدار تھی نہ بکڑے۔ وہ چاہیں والا تھا۔ کہ
 کیا جس گھر کا پچہ یہاں آ کے ہائی کا نام لے گیا، اس نے اپنے گھر میں کتنی اور زبان نہ
 رکھتی ہے۔ چوڑی بکڑی جاتی ہے۔ پھر شاید یہ نظاروں اور سرخوں کے سڑے گئے۔
 تھی ہوں۔

اور تمہیں ان ہی گڑے تھے کہ چھیدار رشید احمد شیخ حوالدار کے پاس پہنچ گیا اور
 کہنے لگا آپ سے اکیلے میں بگ بات کرنی ہے۔ حوالدار کے پاس وہ سپاہی بیٹھے تھے۔
 اس نے دونوں کی طرف ایسے دیکھا جیسے کہ رہا ہوں انہوں۔ حوالدار نے ہر وقت کہا کہ

سپاہوں سے بڑھا، وہ کومر ہے؟ سپاہی بولے بہت ہے۔ مالدار نے بھی یہ ہوں گے
 مہلایا۔ دونوں سپاہوں کو اٹھنے کا اشارہ کیا اور علیحدہ کے پٹھانے کے لیے لڑی آگے کر دی۔
 علیحدہ رشید اسی طرح کسی پہ چلے گیا تو دودھ سے باہر ہاتھ سپاہوں کی طرف گرتی
 سڑک کے اچھٹے ہونے لگا۔ دودھ بند کرتے چلا۔ دودھ بند ہو گیا۔

"بند دودھ سے کے پیچھے کیا باتیں ہو گیں۔"

دودھ دونوں سپاہوں سے بند میں بار بار پڑتا رہا۔ وہ کہیں نہیں کوئی صف
 ہے۔ علیحدہ نے کیا کہا ہوگا۔ یہ کہے کہو تو تم لوگوں نے جانا ہوگا۔ دودھ سے کان کا
 کے کڑے تھے تم لوگ۔

کڑے تو تھے ہر ساری باتیں تو نہیں تھیں۔

جو نہیں وہ ہوں۔

بس باتیں تو تمہاری ہی تھیں۔

کیا؟

جو تم کرتے رہے۔

میں نے کیا کیا؟

یہ تم بتاؤ ہم سے کیا پوچھ رہے ہو۔

لہذا کہ جان رہی ہے، بولو، کبھی گلی پار کر کے ان کی سوجھی میں گیا؟

چلو تم نے گئے تمہارے رفتے تو گئے۔

اسے پتہ چل گیا؟

کیوں وہ انوکھا تھا۔

پارکی بات بولو، اسے کیسے پتہ چلا؟

پارکیوں سے پوچھا۔ ہم کیسے بتائیں۔

نہیں، اس کے ہاتھ میں کوئی کاغذ تھا اور وہ

تھا۔

وہ تو کوئی بھی لکھ سکتا ہے، کیا ثبوت ہے اس کے پاس کہ وہ ہتھیاروں سے

میا تھا۔

اور ان پولیس روزنامے کی مسئلہ پہ لکھا ہوا جملہ خود تہدار پارٹی کے قتل کیسوں پر
 بوجہ اہمیت میں سپر جی نمبر 315 صدر دین احمد علی لکھو کے بہت سے صحافیوں پر
 تھے۔ اس ایک پولیس چوکی کی سرٹیکس کی تھی۔ اور سر ہے ہی کوئی نہیں، جو تو تو نہیں
 گا اپنے۔ اب پوچھتے ہیں، کیا ثبوت ہے حکیدار کے پاس۔

صدر کارنگ جانا اور گیا۔

اور تم لوگوں، اس کے دل کا ہے، کچھ نہیں کہنا نہیں۔

مجھے کچھ کہنے نہ کہے، اس نے میرے جوتے بھائی کو ساری بات کہہ دی ہے۔
 بھائی فضل دین کی

ہیں۔

ہاں بھئی، انہی کا کوئی دل ہے۔ ان سے اس نے بات نہیں پوچھائی۔

ہاں

تو سولہویں کی سمت کر گیا۔

کہوں گا صبح دو بجے کا

ہم کیا کہہ سکتے ہیں۔

حکیدار دیکھو، انہ کے کہہ گیا ہے

توڑی ہی اور بھئی ہے

اس کے کسی کو

ابھی تک تو نہیں۔

وہ رتہ شیخ ساتھ لے گیا؟

اتھ پائے۔

اسپر کو تو نہیں اسے گیا؟

پارہادی بی بی اسرار سے کی روز سے لکھ نہیں آتی تھیں۔

کیوں میرے دستاویز کیے تھے، خطا ہے نہیں دیکھا گیا؟

تج سے دستاویز لے تھوڑی دیکھے ہیں۔ ان کی باتیں سنیں تھیں۔ وہ کسی کاغذ کو

بکاتے ہوئے اس پر ہاتھ مار کے کہہ رہا تھا یہ دیکھیں، مصدر وہیں لکھنا ہوا تھا کہ کراہے لکھتے

کھلی میں آدھے کاغذ پر پیرا کے دستاویز کے ہوتے ہیں، جیسے اسات صاحب کوئی فرمایا

ہادی کر رہے ہوں۔

یہ پورا تھا اس نے؟

کیوں اب ہم سے تلف لینا ہے۔

یاد رہے ہوگا کیا؟ مصدر ہاتھ ملنے لگا۔

میرا دیکھ لینا۔ گزی تو سیت ہے؟

یہ کہاں پوچھ رہے ہو؟

وہ سبے نام لے گیا کرے گا کاغذی باب منڈا گزی راضی۔ ایک چپا ہی ہوا۔

یہ وہ کاغذی نہیں۔ شیخ رشید لکھ رہا ہے۔ یہ سب دیکھ کر لے گا۔ تمہارا دیکھ کرے نہ کرے

کھانی کھانی سمجھا تو ہادی بند کر دے گا۔ سہری کے وقت بھی تم ہوا کھانا۔ اتھ پیرے

نفس، کتاب۔ اب گروہی کے رومال میں چاندی کی تھالی پہ سہری طرف منٹا نہیں

آئیں۔ آٹھویں روز سے رو گئے تھے، منٹا وہی ہادی کر دیا ہے۔

مصدر کاغذ اور تھا، دوسرے سپاہیوں کا لکھ رہا ہوں۔ مگر منٹا دیکھ رہی ہوں۔ اگلے

دن مولانا سعید نے صدر دینی کو بلا کے کیا تمہارا اس گلی سے چلا کر کے ہم نے
 قراچک دور ہال بازار کی طرف رہا چیزیاں دی گلی والی گارڈ میں بھیج کر رہے ہیں۔
 وہاں تو سارے بندہ سکھ پولیس والے ہیں؟

ہیں۔

ہاں

مسم ہے۔

ہناک ہے؟

اگلی۔

صدر نے اپنا تمہارا اگلیا اور اگلی کنڈھے پہ رکھی اور رہا چیزیاں دی گلی میں لگا
 کیا۔ وہاں صدر کے چہلے کی خبر کے ساتھ ہی صدر کے سر کے کی خبر بھی بھیج گئی تھی۔
 اور رام سنگھ مولانا قراچک دور بندہ پائی تھی اور سکھ۔ صدر کو دیکھ کے بیٹیاں بھانے گئے۔
 اور سبھاں کراچیاں بھی نام حیرا راٹھا ہے۔ یا بھوں۔ بیڑیاں کھنٹی سسٹریوں
 چائیاں شیر نے۔

لو کھرا نہیں ہوں۔ اچھے شیخ دادند نہیں چلاؤ۔

بھائیوں بے مہیاں۔ کبے تو کڑی چک لیا ہے۔

لو کی پتہ۔ مہیچے پچھے ہی میں آجائے۔

سبھاں ہو گھیاں کے، آن رہے۔

صدر سرنگا کے بھٹا گیا۔

وہ چاروں ہنٹے جائیں۔ صدر پر بھوں، اس کی پر بھٹی اور بھج گئی۔ سب

انڈیا کے دقت مظاہری کے لیے بکو اسنگ۔ لاکھالے پنے کو نہ ملے۔ گھیاں پڑا ہوں سبھا

کر لہ لگا۔ دتا تھا۔ سب اور کر لہ میں زنی ہوتی صدر کھیں سے کھانے پنے کی ایشیا ہ کے

مسلان کے مگر کر جلا دیا جاتا ہے۔ کہیں کسی کو ڈانگ سولے سے مار دیا جاتا ہے۔ کسی کے
 میں چھرا لگو کر دیا جاتا ہے۔ کوئی گولی مار کے مار دیا جاتا ہے۔ سب ہم بولتے ہیں۔ مگر ہاں
 کریں۔ وہ نہیں مارتے ہیں تو ہم پائیں۔ کتنی ہم نے پوری رنگی ہے۔ تو رہے اسے
 بچنے سے ہیں بول لینے کے لیے۔
 صدر کو ایک دم خیال آیا۔ اس جتنے کی ساری کہانیاں گلوں والی عورتی لے کر
 وہاں تک بھی جاتی ہوں گی۔ ساڑھ ان من چلوں کے خفیہ قصے سن کے انہیں ہی ہار گئی
 ہو گی۔ کہیں وہ نکلے کم بتا نہ کھ لے۔ ہلا نکلے ساتھ کوں نہیں مانتے۔ میں مسلان
 نہیں ہوں۔

ہو تو سی، مگر کہوں کے کتنا اور ہو۔ تم سے پھر نہیں گونپا جاتے گا۔
 کیوں، عورتی بات میں جانی نہیں ہے۔ مائیکر جنگ لڑی ہے، ردا کے بھاپ
 تم ان گیلوں میں اور پار چڑیاں مار کے پھینے مکن ہے بیٹھے ہو۔ میرا مٹانہ نہیں جانتے۔
 دیکھو، یہاں نہیں بندوں سے کسی کو نہیں مارا، شور نہیں کرنا، چھرے سے مارا ہے۔
 مارا ہے کسی کو چھرے سے؟

صدر نے گورنر کا آدم ٹور پورا کیا، مٹا لاکھوار کی قسم کا اختیار تھا اس سے مارا
 رہا۔ ردا کے بھگلی ہی۔
 تو یہ بھگلی نہیں ہے ردا کا۔ یہ دیکھو، یہ پھر ہے ہسٹ لے اپنے بیٹے سے کرنا
 کہہ کر کٹاؤں والا پورا کھول کے صدر کے آگے کیا اور اسے ٹورتے ہوئے ہوا۔ اسے
 ہلا کر ہے۔

صدر کو یہ نہیں کہیں گھسی ہو رہا تھا، ہنسنے ساڑھ کسی طہرانی آگے سے اس کی
 ساری انہیں کی رہی ہے کسی ہام جیسے نہیں اس سے صدر کی خلیفہ ہوتی تھی، دیکھ رہی
 ہے اسے آکر اس کے ہلا کر اسے چلا کر کیا مٹاؤں ہے۔

اچھا رہی، کے چلاتے ہیں۔

ابھی سامنے گئے اور بار دیا۔ صودہ بولا، اور خیالوں میں کان لگا کے کئی ساڑھ کا

چراغ دیکھا۔

ہے تا بے آفتوں والی بات، سامنے سے نہیں جاتا۔ پیچھے سے جا کے مار کرنا
 ہے۔ مسکن صورت مزور سامی کے۔ قریب پہنچے ہی تو بھر من کرنا، ابھی کے دیکھا،
 ہنس صودہ سے بولا۔ صودہ دوسری طرف من کر کے بھائی انداز میں پلٹے گا ایک دم سے
 ہنس پیچھے آیا۔ قریب آتے ہی لپک کے بائیں ہاتھ کو بلا سا کے صودہ کے من پہ دیکھا اور
 داییں پاؤں والا کھلی کی لپک کی طرح گھما کے اس کے سینے پہ میں دل کی جگہ پہ اس کے دہک
 لیا۔ چاقو کی اتنی دہی دیکھے نہی۔ سب ہنسنے لگے۔ صودہ کے اوسان نظر ہو گئے۔ اسے
 محسوس ہوا ساڑھ بھی کھلکھلا کے شہس پڑی ہے۔ ہنس نے صودہ کے من سے ہاتھ اٹھایا
 اور بولا یہ تو بہت آہنگی سے پاؤں تیری طرف لا رہا میں۔ جب چلا ہوں تو یہ کھلی کی لپک
 سے بھی تیز سینے پہ پٹیوں کے جگ آتا ہے۔ پانچویں اور چھٹی پٹی کے جگ کی جگہ ہے۔
 سید عادل کے اندر۔ اول تک نہیں لگتے دیکھا۔ ہل کر نکلتے تو یہ۔

صودہ کے دماغ میں ٹپٹی ساڑھ تھپتے گا رہی تھی، سو سب کے بھر بولا۔ ہاں،

کروں گا۔

سوفی لے۔

سوفی لیا۔

اچھا پیکس کر لے گا۔

پہرا

آدمی رات کے بعد جھپٹے لے کر جائی گے۔ تیرا اچھا نہیں گے۔

کوہرا

یہ کہنا ہی چھتا ہے آدمی رات ہونے سے۔
آدمی رات ہوگی۔

وہ صدر کے پڑے جدول کو اس کے نیلے گالے سے رنگ کی شہر تھوڑا
پتھرا کے خود بھی اسی طرح کے پڑوں میں ملیں ہو کے اپنے اپنے جہز سے لے کے
ہوتے۔ وہ تین تھے۔ ایک صدر ملازم اسف قیسرا شریف۔ چھپے چھپتے وہ نکل نکل کر
چھپے شریف پرہ کے ایک طرف سے ہوتے ہوئے ایک اور ان قبرستان میں چلے گئے
اور وہ جیر اور کی قبریں تھیں۔ وہ قبرستان کی دیوار کے ساتھ ساتھ سر پہلے کیے جانے کے
میں چلے چلے وہ کچھ نکل گئے۔ دیوار کے برے صدر کو ایک بڑی سی علامت کے پار ایک
کھلی کی جی جلتی نظر آئی۔ ہسٹ نے صدر کے کان میں سرگوشی کی۔ "آدمی طرح یہ جی اور
اس کی راتھی دیکھ لے کہاں تک چاہتا ہے۔ کہاں اندھیرا شروع ہوتا ہے۔"

اور ہے کہا؟

یہ جہلا کچھ کاروبار ہے۔

؟

یہاں پہرے پہ پڑے آدمی کچھ ہوتے ہیں۔ نیرہ ہزار چار چار لکھیں جلی
ہوتی ہیں انہوں نے۔ سب کے آگے کچھ ہاتھ ہوتا ہے روٹی سے بھرنا اعلیٰ کی
خاطر۔ کمر کی دستانوں طرف کھڑی ہوتی ہیں اور ہاتھ میں ٹوکڑا لیا نیرہ ہوتا ہے۔
سورہ دانہ کی بکڑی پہ بھی ٹھن کی لڑتی ہوتی ہے۔

رکے۔

ادار کی گی کے اور سے نکلے کی الٹی جلتی نظر آ رہی ہے۔ اسے دیکھا جا۔
یہ نیرہ آدمی میں سے ایک کے ہاتھ میں ہے۔ دیکھ لے۔ یہ پتھر سے دار ہے۔ چوٹی دار ہے
یہاں پتھر ہے۔ ایک گیا کچھ دوسرا۔ پھر تیسرا۔ کچھ تک یہاں دیوار کے پار نیرہ کی

ہی پہلی نظر آئی رہے گی۔

ایک وقت میں گئے پھر سے دار ہیں؟ صدر پر چلے گا۔

اس وقت ایک ہی ہے یہی جس کا نذرہ نظر آ رہا ہے۔

کتاب کا تو ہے اس کے پھر سے گا؟

خیر سے سامنے ہے اس گجے سے لے کر اس کوئی کوئی تک اس پہلی بار میں

یہ بک کوئی میں گز چھڑی ہے جہاں اندھیرا ہے ملک اندھیرا دھیر سے تو نے دیکھ دیکھتی

ہے اور جاگے پیچھے سے اسے پاؤں اسے دیکھنے کے دار گنا ہے اندھیرے میں۔

تو تو کہتا تھا، اس کے سینے پہ سر ہانگی بندھا ہے!

ہاں بندھا ہے۔

پھر پہا تو دوسرا کدھر گئے گا۔

تو پہلے سر ہانڈ نکال لیا۔

وہ نکالنے اسے گا؟

یہ گھسے گا توں پر پھنسا ہے۔

ابھی یہ بول یہ پھر سے وہاں بچو کا کتا ہوتا ہے۔

یہ سب صدر کا سوال سن کی منہ پہ ہاتھ رکھ کے ہٹنے لگا۔

اس کیوں رہے ہو، صدر سر گوشی میں سمجھو گی سے ہوا۔

یار تم ایسے پر پھر رہے ہو ایسے وہ نذرہ نذرہ میرا مانا ہے۔

نہیں تو جانتا ہوگا۔

ہاں جانتا ہوں۔

تو بیل۔

دیکھو، تمہارا یہ سوال معقول ہے۔ گنا ہے تم نے جگ لڑی ہے، برائیاں۔

تو یہ تو سمجھتا تھا میں انہیں مار رہا ہوں۔

سبھا تو بھی تھا۔

بڑا کنگر ہے۔

نہیں، تیرا سوال اچھا ہے۔

تو جواب بول۔

دیکھ اس نیرہ بردار کے پاس اسلحہ بہت ہے۔ گنوار میں دھاوا دیکھ رہا ہے۔
گزرے گا تو جمن جمن کر کے اس کی جینے میں مہولتی جائیں گی۔ نیرہ بھی بڑا سہا ہے۔ بچے
پہ دہائی سے گھرا بھی بندھا ہے۔ مگر یہ پھر سے دار چو کتا ہرگز نہیں۔ جگ اس نے ہی
ہوتی ہے۔ شاید لٹون بھی کھائی ہوئی ہو۔ اس جیسے تیل آنکھیں بند کر کے اپنے روت پہ
پتھر لگا کر رہتا ہے۔ ہاتھ کے کولہ پہ، اسی طرح اس نے کھسے اور دہائی کے دوہان بھرنے
رہتا ہے۔ سب بھڑی باتیں ہو گئیں اب کچھ کر کے دکھا۔ ہم دونوں تھے وہاں پہ چڑھنا
اور آ کے چھپ کے بیٹھ جائیں گے۔ یہ جگ دیکھ لے، یاد کر لے۔ جب اس نیرہ
کا بچہ ہوا نیرہ اور بیٹے پہ بندھا بھی اٹھا کے تو نے اور پیٹک دیا تو ہم کچھ جائیں گے
نے اپنا کام کر دیا۔ ہم پگ کے بیٹے سے تمہیں وہاں سے اتارنے آ جائیں گے۔
گے۔ گئی اور نیرہ لے کر آ گئے تو بیٹھ گئے۔ پاس ہو گئے۔ ہمارے ساتھی ہو گئے۔ نام
ہو گئے تو گئے۔ پھر تو دار کے پار ہی رہتے۔ اور یاد رکھنا، برج کے اندر بیٹکوں کی تعداد
میں نیرہ رہتا ہے۔ پھر سے دار کے گے میں بیٹی بھی بندھی ہے۔ اس نے بیٹی بھائی تو
پھر نہیں تو پھر ہم تو اور قوموں کے اندر سے کھٹک جائیں گے تو قاتل چاہے کے اپنی قوم
اور نہ لہا۔ کھ گئے۔

کھ گیا سب کھے حساب لگانے کو۔ صدر کے دماغ سے سارے اتار گئی۔ الہ
پہن کے لہنے چاہے۔ وہ دار کے پار چلا ہوا نیرہ دیکھنے لگا۔ اسے نیرہ بردار کو گھسے سے

رہی تھ دو بارہ پہلے ہوئے دیکھا۔ اس کی رفتار دیکھی۔ روشنی کے ہلکے دیکھے اور تھیری
 جگہ کاغذ سے ہوا کیا۔ پھر بولا۔ اب چلو، اب کہیں دیکھے کہ صحن کا سہارا سے گزرا ہے
 چھوڑا۔ اب صدر نے اشارہ کیا، انہوں نے اسے دیکھا ہے چھوڑا، صدر دیکھا ہے
 چھوڑے کے وہ قدموں سے دیکھا سے لگے کے دوسری طرف اتر گیا۔ پھر کے دیکھا کے
 ساتھ لگ کر کوٹ کے بل لیت گیا۔ نیزہ بردار ہونے ہوئے روشنی سے تھیری جگہ میں
 داخل ہو گیا۔ قدم قدم وہ صدر کی طرف بڑھتا آیا۔ ہر قدم پہ وہ نیزے کا ڈنڈا زمین پہ مار
 کے آ رہا تھا اس کی کمر سے بندھی کواڑیں، جن جن کی ری تھیں۔ دم دم زمین پہ
 پڑتے نیزے کی گونج بڑھ رہی تھی۔ کواڑوں کی جن جن بھی تھیری تھی۔ وہ
 وہ کرتے اس کے ہر زمین پہ پڑ رہے تھے۔ قدموں کی آواز بڑھتی آ رہی تھی۔ قدم اٹھ
 اٹھ کے صدر کی طرف بڑھ رہے تھے۔ صدر کے سینے کے اندر دل کی دھمکی بھنے گی۔
 دھک دھک دل اچھلنے لگا۔ اس نے اپنے اپنے پاؤں کو کھل کے منہ ملی سے بکا لیا۔ ایک
 لمحے کو اسے خیال آیا جیسے وہ ساڑھ کے ماسوں سے آنکھ بھا کے اس کی حویلی کی تھیری
 منزل پہ چھا دیکھا ہے لگے گئے سے پھول توڑنے والا جو لیکن اس وقت آدھی رات سے
 اندھیرے میں اس کی طرف پہلوں بھرا گیا لیکن دو کواڑوں سے نہیں، نیزہ بردار بڑھ
 رہا تھا۔ جس کے سینے پہ روٹی سے بھرا تھی بڑھا تھا۔ زمین پہ اپنے ہونے صدر کو اندھیرے
 میں نیزہ بردار کا پہلا پہلو نظر آ رہا تھا۔ ایک طرف سے اس طرف وہ صدر کی طرف بڑھے
 آ رہا تھا۔ بڑھتا بڑھتا وہ صدر کے میں برابر آ گیا۔ وہ قدم کے حاصل پہ پہنچ گیا، اگر وہ
 صدر کو کچھ لیتا تو اسے اپنے نیزے میں پھولتا۔ مگر نیزہ بردار نے صدر کو نہیں دیکھا۔ چن
 چن اسی رفتار سے آگے بڑھنے لگا۔ صدر نے اندھیرے کی صدقہ سے اس کے گزرنے کے
 قدم گئے، اور اپنے اپنے وجود میں انھ کے اس کے پیچھے نیک کے دار کرنے کی قوت تھا
 کی مگر صدر سے اٹھا گیا۔ نیزہ بردار طرف سے اٹھا اٹھا نیزہ زمین پہ مارتا ہوا اندھیرے

کی حدود سے نکل کے روشنی میں چلا گیا۔ صدر کو لینے لینے شرمندگی سے بیڑا اٹھا لیا۔
 اس کے تصور میں جھلی اٹنے ہاتھ کو گھما کے اسے اپنی نگہ میں بڑائی کا طعنہ دے کر بیڑا
 اتر گئی۔ اس کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ دور گھبے کے پاس سے وہ نکل کر صدر
 واپس پلٹا۔ اب پھر قدم قدم پہنا وہ اندھیرے میں آ رہا تھا۔ صدر اندھیرے میں دھڑکے
 پاس لینا لینا کہیوں کے بل کرانگ کر ہوا بکھو آگے بڑھ گیا تاکہ اندھیرے کی حد تک
 آئے ہی پلٹ کے اس کے پیچھے لپکے۔ اس بار صدر پوری طرح تیار تھا۔ جھلی تڑپ کر
 اس کے پاس سے گزر کے وہ قدم آگے بڑھا صدر جھلی کی طرح ہاتھ کے اس کے پیچھے چلا
 اچھل کے ہاتھ بڑھا کے اس کے منہ پہ رکھا اور دائیں ہاتھ میں بکرا ہاتھ پوری
 طاقت سے اس کے سینے پہ مارا۔ نیرہ سردار کے سینے سے دھب کی آواز آئی اور صدر
 ہاتھ جیسے روٹی کی گھڑی میں پھنس کے سب اتر ہو گیا۔ صدر اس کے سینے کے آگے سے
 سر ہٹا کر کان بھول گیا تھا۔ اسی اٹکا میں منہ پہ رکھا اس کا ہاتھ بھی نیرہ سردار کے منہ کی نسبت
 ناک پہ لڑا رہا تھا۔ شاید وہ یہ ہو کہ نیرہ سردار کے چہرے پہ ایسی ایسی موہلیں اور بے رحمی
 دلائی میں صدر کو کھنکھناتی کہ منہ کو مہر ہے۔ پھر صدر شدید بوکھلایا ہوا تھا۔ نیرہ سردار
 بھی شاید آدمی نیند میں چل رہا تھا۔ اس کی جیسے ایک دم آ کر کھل گئی اور وہ بڑبڑا کے ایک
 دم لپٹے گھما کے سر جھٹک کے اپنی ناک میں بولا، اوسے کون اسے بھونکی اور صدر کا ہاتھ
 اٹھی تک اس کی ناک پہ تھا۔ صدر نے بائیں بازو گودا کے اس کا سر کھینچ کے پیچھے اپنے
 سینے کی طرف کھینچا اور اچھل کے اس کے ہاتھوں پہ دائیں گولا مارا۔ اور اپنا منہ میں اس
 کے کان میں لے جانے بولا۔ میں بھونکی دائیں خود بھوت ہوں، بھوت کا نام سنتے ہی نیرہ
 سردار کے پاس سے ہم میں گھب سا ارتعاش ہوا۔ پھر ٹپک اس میں اس کی گردن کے پیچھے
 موڑتے جانے ناک کو دھانے رکھتے اور جھپٹتے پھٹتے ناک کا بھی اتر تھا۔ کہ اس کے
 دونوں طرف جھٹکتے بازو کا پھٹتے گھب دائیں ہاتھ کی اس کی منگی اچھلی ہو گئی اور ہاتھ میں بکرا

اس کا فرٹ کا لہنا نذرہ لیکن لیکن کرنا ہوا سڑک پہ گر گیا۔ رات کے جھوٹے سٹارے
کے زمین پہ گرنے کی آواز سے وہ نذرہ بردار خود ہی خوف زدہ ہو گیا اور پھر رات کے اندر
ہوا بارے بھڑوے میںوں کی لینا میرے کولوں۔

میںوں اپنا تکیہ دے دے۔ صدر نے پھر سرگوشی کی اور پھر خود ہی دائیں ہاتھ
سے اس کے سینے سے یہ بندھا تکیہ پکڑ کے کھینچنے لگا۔ تکیہ سے بندھی ڈاڑھیوں اسی ہاتھ
سے توڑنے ہوئے، صدر نے اس کے سینے سے تکیہ کھینچ کے کر دیا۔ مگر اسی کھینچا کھانچی میں
ہاتھ میں پکڑا ہوا اس کا ہاتھ بھی گر گیا۔

اگلے چانگیہ میںوں بھڑوے۔

تھوڑے کر لے صدر فرمایا۔

نذرہ بردار شاید بہت ڈر گیا تھا یا وہی بھنگ کا اثر نہیں اترتا اس کا اس سے
ہاتھ نہ اٹھائے جائیں، بڑی مشکل سے اس نے ہاتھ دونوں طرف ایسے اٹھائے جیسے جلی
سے جھپٹنا صاف کرانے لگا ہو۔ صدر نے اس کی کمرے ہاتھ مار کے کمرہ والی جلی توڑ لی اور
دونوں کمرہ میں کھینچ کے پکڑ لیں۔ کمرہ میں کمرے سے اترتے ہی وہ نذرہ بردار بے وزن سا
کے زمین پہ گر چکا گیا اور چت پت کے تکیوں کھینچا تے ہوئے لڑتی آواز میں لڑوا
کرنے لگا ہوئے نہ ماریں کمرہ میں بھی لے جا۔

صدر نے دونوں کمرہ میں اٹھا کے اس کی پٹلیوں میں جھپٹیں اور پھر۔

ایک شرط ہے۔

میں اس باتوں کا ہوں۔ اس کی آواز کانپ رہی تھی۔ صدر کو اس وقت احساس
ہوا کہ نذرہ بردار یہاں کمرہ ہے اور اس کے سر پر ہاتھ کا ہم عمر آدمی ہے۔ صدر کہنے لگا۔
چاہا وہی نہیں، ایک ہی شرط ہے۔

پہلے میرا ہتھ۔

صبح تک تو انہوں نہیں اٹھا۔ اچھے ہی لیے رہتا ہے۔ صعد نے کہا اور
 بس یہاں ٹھہر ہے۔

مذہبوں آواز دی نہیں کڑی

بھری تو۔

تیری سنی کدھر ہے؟

اوتے تھے وہی آواز ہی ہوتی ہی۔ کر گئی۔

وہ بھی نہیں اٹھتی۔

لے بیٹوں جانے وہی نہیں دھوا میں نھرے راج کی بھوں۔

یوں لگتا ہے۔

میں پہ آں ہا۔

صعد نے کہاں کو زمین پہ ہا کے سڑک پہ گرانیزہ بھی اٹھا لیا۔ سر ہا نہ ملتا ہا
 ہونے کی ہر سے چمکا نظر آ گیا۔ اسے بکرا اور قبرستان کی دیوار کے پار اٹھا کے بیٹک
 دیا۔ لگے کے پیچھے وہاں گھوڑی بھی اچھا لکے کے ہر بیٹک دی اور ہر بیٹک کو بکرا کے
 دیوار کے ساتھ دھکا دیا، ہلی پہ کسے کے بیٹک کی اتنی سے زمین کو گھوڑے کو اچھا
 اور دیوار کے دوسری طرف چھانک ہا کے اڑ گیا، بیٹک بھی ساتھ لے گیا۔ بس وقت اچھا
 کے قبرستان میں اڑا، صعد کے وہاں ساتھی یوسف اور شریف تھے اور وہاں گھوڑی زمین
 سے اٹھ چکے تھے۔ صعد کو یہاں اچھا لکے کے دیوار پار کرتے دیکھ کر وہ بھی ہم گئے۔ اور کے
 پاس آ کے ہا کے ہم تو اچھے ہی بھاگتی پہ بھاری ہو کھل کر دیا ہے۔ سب چلو، تھو قدم
 اٹھاؤ۔ یہاں قبرستان کی دیوار کے ساتھ ساتھ تھو قدم چلتے ہوئے بھاگتے لگے بس
 وقت وہ قبرستان سے لگے کے پہ لگے کی طرف آ رہے تھے تو انہوں نے بھاگتے ہی بھاگتے
 طرف بیٹوں کی آواز ہی سنیں اور انہوں سے میں بھتی ہوئی صبح کی روشنی کو اور لگے

میں رہیں ہی کرنا اور چاہے۔
 وہی چاہے تو ہے، یہ پائل پدمی ہے پدمی ہی جمع کرواؤں گا۔ لودھیانے

ہاگے۔

جیسے نری مرضی۔

میرے ساتھ چلا وہاں آئے تھے بلکہ چلنے سے۔ کلاہ ہوں گے سارے
 کوڑائی ہاگے یہ کرنا پدمی آگے ہونا ہے سب کا۔

صدر ان سے مل کر رخصت ہو گیا۔ گلوں والی حویلی سے ہو کے چلنے کا
 اسے خیال آیا، پھر اس نے سوچا پہلے اپنے ساتھیوں سے مل لوں کہیں مجھے چھوڑ کے نہ چل
 جائیں۔ ہماگم بھاگ کوڑائی پہنچا۔ دوپہر تک سارے اکٹھے ہو گئے۔ اس دن اگست کی تیر
 تاریخ تھی، چھبیسواں روز تھا۔ صدر کی پریس پارٹی کا امپارچ حوالدار تھی، مسین شاہ بھی
 پہنچ گیا۔ وہاں چلا۔ رات کے آٹھ بجے سے گاڑی بکڑنی ہے مغرب سے پہلے چلے۔ دوپہر
 کے بعد رات کے سٹیشن کی طرف چل پڑے۔ سڑکیں سناں تھیں۔ درانی میں بکو لیب
 سا سکیاں لیتا تھا۔ وہاں میں بکو امرتسر کے مسلمان سپاہی ملے ان کے چروں سے
 خون پڑا ہوا تھا۔ گت پٹی ہوئی تھی۔ ان سے پتہ چلا شہر کے مضاف میں ایک مسلمان
 سادات کی بستی تھی اہلی پور سیداں، اس پر حملہ ہوا ہے۔ سارا گاڑوں لوٹ کے چلا دیا گیا ہے۔
 بیگلوں کو مسلمانوں کے تھے، سب لٹ گئے۔ چل گئے۔ زیادہ تر مسلمان وہیں چل
 کے مر گئے۔ بعد میں کہیں کوئی انگریز انسر موٹر پلاؤ کے ڈھیلوں کو یہیں شہر لے آیا ہے۔
 بیگلوں کی تعداد میں وہ ڈھی مسلمان ہیں۔ سول ہسپتال میں پڑے ہیں۔ یہ فرنگی
 ان پدمی کے چدرہ مسلمان سپاہیوں کے دل کٹ گئے۔ انہوں نے سوچا رات کے سٹیشن کا
 وہاں میں سول ہسپتال ہے۔ مسلمان ڈھیلوں کو دیکھتے جاتے ہیں۔ صدر نے سوچا چلا سول
 ہسپتال میں اگر یہ ساتھی بکو درگ گئے تو یہ بھاگ کے چل سڑکی میں گلوں اہلی

پہلی بار دیکھتے آئے۔ یہ بھی ساڑھ کو سوچنا سوچنا ان کے ساتھ چل چلا۔ اسپتال پہنچے تو
 وہ بڑی بڑی جگہ تھی۔ ڈبلیو کی تعداد اتنی زیادہ تھی کہ کمروں اور مالدوں سے باہر نکلے
 جانے کے لیے وہاں میں ایک سرے سے دوسرے سرے تک ڈبلیو لگے چڑے تھے۔ جگہ
 پہاڑی تھی زیادہ تر بچے کھاس پہ لیتے تھے۔ ان کی حالت اتنی بری تھی کہ گتاتھا ان
 میں سے کئی کئی اکوڑا نکلا رہے۔ زیادہ تر مردوں کے سروں پر گھسے یا کھانچوں کی
 ذریعہ تھیں۔ پورے ان کے خون سے اٹنے ہوئے تھے۔ کپڑوں پہ خون ایسے چاڑھا جیسے
 پتوں میں خون ابل کے انہیں غسل دیا گیا۔ ان کے ڈبلیوں سے خون ابھی تک رہی
 پھر ان کے سروں پہ انہی کی کپڑوں کو کھول کے پانی کی طرح باہر نکالیا تھا۔ کئی خون
 سے اٹنے کی کپڑوں پہ تھے خون پہ گھسے یا کھانچوں تھیں۔ جگہ مردوں کے ہارو کئے
 رہتے تھے۔ کئی کے کھاس سے بچے کئی کے کھاس سے اور۔ انہی ڈبلیوں میں بچے بھی تھے۔
 یہاں بھی جھولے جھولے بچے، کئی پانچ سا کاپڑ کھاس پہ لگا ہوا تھا اور اس کی ہٹلی
 میں دیکھنے کی ہٹلی کی شرب تھی۔ خون دھیرے دھیرے دیکھا تھا۔ وہ بھی وہ بچے نکلا تھا
 ہارو نکلا تھا۔ بچوں کے ہیرے اور ہٹل بچے دیکھوں کے دم تھے اور ان کے پہلے بچے
 بڑوں پہ ٹھنڈی کھلی آنکھیں آسمان پہ منڈلاتے گھوموں کو دیکھتے دیکھتے کھلی کی کھلی روگی
 تھیں۔ ایک سو لاکھ سال کا بچہ لیتا لیتا کھاس پہ لگا ہٹل آواز میں گھب سی اور
 کٹے دوتے گتاتھا۔ ان کے کٹے سے آواز نہ نکلتی تھی۔ ان کے بھول جیسے پورے پہ
 انہی کھل سے ہونے ان کے پیچھے نکلا ہوا ایک بڑی کا دم تھا۔ ان کی آنکھیں گھب
 سے انداز میں دم دھتھیں جیسے سوتے سوتے کئی نے اسے دیکھا تھا۔ وہ نکلا نکلا سے
 اگلے بھڑکی تھی سی کھلی بھر کے گھسوا ان کے کٹے کھل کے دم سے ان کے انداز
 کھانچوں پہنچے سے ان کے ان کے انداز سے پورا اٹھ گیا۔ اسی بچے کے پاس ایک
 کھانچا پہ ایک جگہ میں جوت چڑی تھی۔ پورا ان کا دھتھے ہوئے کھلی کی طرح لگا ہوا

قریب تھا جس میں ہلکی سی بو۔ اس کی آنکھیں بھی قریب لیجئے بیچے کی طرف لگے لگے
 اور نیم وہ تھیں۔ اس کے ہال شورے ہوئے تھے مگر اس کا ہاتھ اس کے پیٹ پر
 خون سے گدھا ہوا تھا۔ وہ سفید سوتی قمیض پہنے ہوئے تھی۔ جو اس کے سچے کے پاس
 سے اپنے ترپہ تر تھی جیسے اس کے جسم کے اندر سے خون کے فوارے اٹھ رہے ہوں۔ وہ
 سانس لیتی تو اس کے سینے پہ چڑی خون میں ات بہت قمیض پہ خون کی بھری پٹھری
 پتھر کے پتھر مسلمان سپاہی اپنی ہاتھیں گدھوں پہ لگائے۔ پولیس کی بھاری سی بھاری
 مہوت ہوئے کھڑے تھے۔ سولہ رتھوں میں شاہ سے کھڑا ہوا گیا وہ بیٹا گیا اور ایک
 بڑھی موت کے گلے بیٹ کے پاس چارپائی کی اٹی پہ سر دھک کے روئے لگا۔ صوبائی
 پولیس سے خون نے چڑھا کر لیا۔ اس کے ہاتھ کھپانے لگے۔ کھانگ ہو گیا۔ وہ تھی
 یہ لنگھ گیاں جم گئی کہ اس کے منہ سے آواز نکلتی تھی۔ اس کے کان میں سانس
 کرنے لگے اس کے پاس سے اپنے قریب سے ایک مرنی ہوئی دم مگر قریب غلطی ہوا
 رکھے والی ایک موت کی آواز آئی۔

”آگے میں تھوڑا بھٹے ایسا ماؤں بہوں گا۔“

صند سے ہٹ کے ایک دم آواز کی طرف گردن موڑی۔ دیکھا چارپائی پہ سٹیج
 لنگھ میں لہوں وہی ہواں موت لگتی ہوئی ہے۔ جس کا اچھا بھلا چہرہ ہلکی رنگت ہوا
 ہوا ہے اور جس کی آنکھیں چپے سے ہوئے خون میں ایسی ات بہت ہے جیسے کسی نے اس کے
 چپے سے لگے کوئی پتھر کیا ہو۔ وہ موت بھری طرف سے لے لے سانس لے رہی
 تھی۔ صند سے ٹوٹ سے دیکھا تو اسے نظر آیا اس موت کی دونوں چھاتیوں بیچے کی ہل
 سے دائیں طرف لگتی تھی۔ اس موت نے صند کو اپنے خون آلود سینے پہ گھر رکھے ہونے
 دیکھا تو اس نے ہلکا ہلکا۔

کی فرسٹاں ہے۔

آج ہے دیکھنے اپنی بھین کی کئی ہولی چھاتیاں۔

دیکھو، دیکھو سے دیکھو۔

وہ بولتے بولتے جوش میں آگئی۔ اس کے ہونے سے اس کے سینے پر
 ہند بگڑتے کے اندر سے خون کی پگھلا ہوا انھو انھو کے اٹنے لگیں۔ پھر اس نے صند
 سے لگری بٹائیں اور آسمان کی طرف دیکھا اور عجیب بے بسی کی انتہا میں نظر پڑی لہجے
 میں تھا سے غائب ہو کے بولا، "میرے مولا، ہمیں کیسے بے بس ہو گیا ہے؟ کیا جس
 میں تو نے کوئی فرسٹاں یا کچھ ہی کام جیسا نہیں رکھا۔ جس تک حیرانم لہنے والی گھاگل
 ہوتی ہوئی صورت کی آواز پگھلے۔ وہ پتہ نہیں اس کے علاوہ بھی کچھ نہ ہی منہ میں کہتی رہی
 برص کے کانوں میں شاں شاں کی آواز آتی جو گئی کہ اس سے کچھ اور سنا نہ گیا۔ اس
 کی آنکھوں کے سامنے اول آنکھی سی آگئی۔ اس کی چھاتیوں والی صورت کے سینے کا سارا
 ہاتھوں آہٹا صند کے اندر میں چڑھ گیا۔ سارا منظر اس کے سامنے لال سرخ ہو گیا۔
 اس کے ہاتھوں میں یوہانی کیفیت میں کچھ پانے لگے۔ اسی انہا میں اس نے اپنے
 کھڑے سے داخل ہونے کے اپنے ہاتھوں میں بکالی۔ اس کے گلے کے اندر کوئی ہاتھ سا
 آئے اس کی سانس کی ہلی کو بکڑ کے کڑا ہو گیا۔ اس سے ولانہ جانے کچھ پاتے پھرتے پ
 آواز کو آہری اپنے اس کے منہ سے عجیب غریب سی آواز لگی۔

میں نے میری بات سنی لی۔

بولی بکن۔

میں تھو ہول ہوں گا۔

تجربے بولے تجربے انہوں کی سات صورتوں کا بھی حال کر رہا گا۔ میں ان کے
 فرسٹاں میں ہول ہوں گا میرا۔ اس کی آواز ایک دم سے آگ لگی سی بن گئی۔ اس

کے چودے کے چودے ساتھی سگی اس کی طرف گردنیں سوز کے خوف زدہ ہوتے اس کی طرف
 بھیجے گئے۔ اس ہڈیوں میں ایک ہندو پارس تھا تیار بھی تھا۔ اس نے صندوق کے کپڑے جسم
 اور اس کے منہ سے لگی ہوئی ڈالیا۔ ہاتھیں نہیں تو اپنی ہتھی سے بندھا ہستوں نکال کے صندوق
 کی طرف نکلا۔ صندوق کے سامنے تو ساری زمین سارا آسمان سرخ ہوا تھا اسے کیسے فکر
 آج۔ یہی نہیں کوئی انگریز ہسپتال کو دیکھتا پھر رہا تھا۔ صندوق کی بنیادی کیفیت ہو کر
 دیکھ رہا تھا۔ پھر صندوق کی طرف بندھا تھا تیار کو ہستوں لے کر چلتے دیکھا تو ایک دم انگریزی
 میں اس تھا تیار کو ڈانکا اور ہک کے اس کے ہاتھ سے ہستوں جا نکلا۔ اس تھا تیار کو پورا
 اسی تھا تیار سے سامنے ایک ہائی ٹیکس، چودہ راتوں میں ہیں تھا تیار سے وہ پورا یہ تو دیکھو، یہاں
 کیفیت کیا ہے۔ پھر اس انگریز ہسپتال نے جو پتہ نہیں ہسپتال کا ڈاکٹر تھا یا شہر کا لڑائی کھڑا
 اس نے تیار حسین شاہ کے کندھے پر تین ٹیپیاں دیکھ کے کہا تم انچارج ہو اس گاڑا کے
 وہ پورا۔ سگی سر۔ انگریز صندوق کی طرف اشارہ کر کے پورا، اسے نکال کے لے جاؤ، پیار سے
 سمجھاؤ۔ یہ ہسپتال لائی کیفیت میں آ گیا ہے۔ اس کا تصور نہیں ہے۔ یہاں تم لوگ آئے
 ہی کیوں۔ اب جاؤ۔ انگریز امر کے کہنے سے پہلے ہی گلی صندوق کے ساتھ سگی اس کے
 کندھوں اور بازوؤں سے چنے ہوئے بھول رہے تھے۔ صندوق مست ہتھی کی طرح پنے
 ہوئے ہاتھوں کے چمچے کو بازو کھول کھول کے دور کر رہا تھا۔ آخر کسی طرح تیار حسین شاہ
 نے صندوق کو پیکار کے سلیقے سے اس جگہ سے نکال لیا۔ تیار حسین شاہ صندوق کے پاس
 بھائی فضل دین کا دوست تھا اور صندوق دین بلا سے بھائی کی طرح اس سے بھی دتا تھا۔
 ہسپتال کے احاطے سے نکلنے سے صندوق نے ایک بار پھر گردن سوز کے چار ہتھی پہنچے تیار
 کئی چھاتیوں والی اجلی صورت کو دیکھا، جو کسی طرح کھینچ کے اپنے دونوں ہاتھ اپنے منہ
 سے بھرتے سینے پر رکھ سکے۔ انہیں دعا مانگنے کے انداز میں کھولے ہوئے ٹھوڑی لہانے
 آسمان پر ہتھی لگائے خدا سے کہو ایسے کرب سے مانگ رہی تھی جیسے وہ خدا سے اس کے

عزیز شاہ

قلبا سانس لیتا ہے!

ہر نفل یا ٹیک ٹیک آنکھ میں ناکام رہے تھے کہ انہوں نے کبھی نہ جھوٹ
 کی تھی۔ رمضان کے میں آغاز میں ہی وہ تہیہ لگا چکے تھے کہ رمضان آگیا پھر سانس
 نہ لیں گے اور ختم القرآن کی نظر یہ قدر کھل ہوگی۔ مگر جوں جوں روزے ایک ایک کرتے
 گئے اور سانس لیتے ان کی ٹھونکیاں بڑھتی جا رہی تھی۔ اس قدر انہیں پڑھنا چاہیے تھا اور
 نہیں پڑھتا ہے تھے اور بعض روز تو یہی ہوتا تھا کہ وہ اپنے تئیں رات بھر کھاتے کھاتے
 تھے مگر ذوق الٹ پلٹ کر دیکھتے تو خود کو کھاتے اور شیطاں تو خود کو پھینک رہا تھا
 دیکھ کر آخر کھاتے کرتے کرتے وہ کہاں چلے جاتے تھے۔
 تو یہی تھا کہ آج بھی وہ کہیں اور تھے۔

رات ٹھونکا سے نولے تو یہی کوئی گھنٹہ پون گھنٹہ ہی گزر سکتی مگر پانے میں
 کے کہ انہیں لگا جیسے کوئی زہریلے جیسے عالم ہاتھوں سے ان کے پاؤں کے ٹھکے سہا ہوا
 اور انہیں حرا آ رہا تھا مگر یاد کر پڑے رہے تھی کہ تراویح میں مسلسل کھڑے رہنے سے
 ہاتھوں میں جھج ہو کر ہم جاتے وہ خون نرم و گدہ لیس کی لطیف حرارت سے ہار رہا ہے
 گیا۔ ایسے میں ہی شاید ناک میں ہاتھوں کے کھوسے کی مین واصلوں میں تو پاؤں جہاں پست
 قہر سے زیادہ اسیل چھانے کی جہ سے جہات سے جگہ میں آجاتے جگہ میں وہ کرسی
 ہوا گیا۔ جگہ میں آئے واسطے پست سے لگے گوشت نے لہر کے قدر اور ایک تھے
 وہ کہہ رہے ہیں میں جھٹک رہا ہوں وہ بڑھا کر اٹھے اور اگلی نظر کا پش عواقب نہ کر پڑتا
 تھے کہ ایک ٹکڑی نفا میں تھی۔ ان کے سلیٹے سلیٹے سہا کر رہی تھی وہاں کے
 پتہ کے ہوا میں سے کوئی نہ تھا۔

گرتے ہیں۔ ہم روٹھی والا باب 'فینس ٹیلڈ کے اندر سے ان کے ہنر سے
 قلم سے اور لہجہ سے ایک دوسرے میں روٹھی پیچک رہا تھا۔ وہ بکھو گئی سوئے بغیر ہنر
 پر ان ہنر سے کہ بہت ہی جگتے رہے حتیٰ کہ خواب میں ہنر کا حصہ ہو جانے والا لطف
 انہوں نے خود بخود معلوم ہو گیا۔ اب انہیں اس ماہ مبارک کی پاکیزہ ساتھیوں کے ہوں ہی گزر
 ہنر کا اسان کر رہا تھا لہذا اگلے اور سیدھے وائس روم میں گھس گئے۔

ہنر کا اسان کر رہا تھا لہذا اگلے اور سیدھے وائس روم میں گھس گئے۔
 ہنر کا اسان کر رہا تھا لہذا اگلے اور سیدھے وائس روم میں گھس گئے۔
 ہنر کا اسان کر رہا تھا لہذا اگلے اور سیدھے وائس روم میں گھس گئے۔
 ہنر کا اسان کر رہا تھا لہذا اگلے اور سیدھے وائس روم میں گھس گئے۔
 ہنر کا اسان کر رہا تھا لہذا اگلے اور سیدھے وائس روم میں گھس گئے۔
 ہنر کا اسان کر رہا تھا لہذا اگلے اور سیدھے وائس روم میں گھس گئے۔

"ہائیں! ہائیں! ہائیں!"

یہ انہوں نے قدم سے لہجے میں کہا تھا اور انہیں تک تھا میں ان کی بات
 ضروری ہوئی تھی کہ انہوں نے قرآن پاک کو دونوں طرف سے اور وسط میں ہر پارہ سے
 اپنے ہونے میں ہائیں انہوں سے گانے کے بعد چھاتی سے ہنر لیا جیسے نصیحت لکھا
 لیا کرتی تھی۔

جب اس کی اولیٰ تھی تو نصیحت جان کو سلوں کا تھا۔ ابراہیٰ کریم صلیا
 نہی ہر گئی نہ تھی۔ تو لکھا ہوا 'نک کھتا ہوا اور آواز میں کہ آوی سے تو مست ہو
 جانتے۔ جب وہ آئی تھی تو اس کا ہم لکھیوں تھا اور اسے بہت ساری باتوں کی کھ گئی نہ
 تھی۔ کھ کھار کی ہے ہنر یعنی 'ہر پاپ کے ساتھ ملی دھرتے اسے گنہ گنہ تھی'
 گنہ گنہ تھی 'یہ وہاں کھائے' تھیں اور ہنر پاک پر چھاتے اور ان کی صورت تھی

جاتے ہوئے اور انکی ہولی جہاں سورت میں داخل کی تھی کہ انکی نظر تھی نہ تھی۔ لہذا خود بھی
 اسے دیکھا تو اس کے پیچھے بہت جاتے تھے۔ لہذا ان کے پیچھے ہونے اور لہذا ان کی ہاں
 کے سر نے کا ہاتھ ایک ساتھ ہوا تھا۔ تب سے اب تک وہ اس کے لیے استخوان تھی۔ اور
 جب اس کا استخوان اس کی ہواشت سے باہر ہو گیا تو خدا نے اس کی مشکل خود ہی آسان
 کر دی۔

یہ مشکل ہیں آسان ہوتی تھی کہ فضل نہ بھی اس کے گھر کے پھرتے لگانے

کا تھا۔

فضل جو وہ بھی خاکوت کے ہاشمی اسکول میں حاضر نہیں کا تھا پھر سے
 لوہانوں کی طرح باسیب کی کئی بار تھی کے جان اور سرامیاں شروع چکا تھا وہ اس کے گھر
 کے پھر کیوں لگا رہا تھا وہ بہت جلد کچھ گیا تھا اور یہ بھی جان گیا تھا کہ وہ یہاں سے جو کچھ
 شروع لے جاتا تھا کرت لے جاتا تھا۔ اگر لے گیا ہوتا تو پیش نام مناسب اور لہائی ملتا
 کو ضرور تک جاتا۔ تاہم وہ بے اس تھا اور اتنا کم مشیت کہ کوئی خدشہ یا کوئی شکایت نہ
 بر لانے کا سوچتا بھی تو اس کی گھر کے پڑے کیلے ہو جاتے تھے۔

واقعات کے اس تسلسل میں جب ججے ماجھی کی اس ایجا کو پہنچ گیا تھا جس میں

خود سے خدشہ ہونے لگا ہے کہ اس روگ سے بچ آ کر کہیں اپنی جان کا نقصان ہی نہ آ
 بیٹھے ایک ایسا واقعہ ہوا کہ ماجھی اس کے جان سے خود بخود بچ گیا۔ واقعہ یہ تھا کہ
 فضل جو گاؤں کے دوسرے لوگوں سے الگ چڑا تھا وہ نہیں پاجتا تھا کہ کوئی اور نہ کی لہذا
 کے پھر لگائے۔ یہ اکیلا تھا اور وہ چار مہدا انہوں نے فضل کو کی لہیاں کٹ کر لگایا
 تھیں۔ یہ واقعہ اگرچہ خوشگوار نہ تھا مگر اس ایک واقعے نے کل تک گاؤں بھر کے پھر
 لوگوں جیسا نظر آنے والے فضل جو کو ان سب سے مختلف ہو کر رہا تھا اس کا کچھ
 فیصلوں پر شرمناک نظر میں گاڑتے اور پ پ راپیں پکانے والے تھے۔

جی نام صاحب جی ہر سو ہاتے نے فضل نوک جگ اتنی ہی بار بہانے
 ہستے کے کر کے پھر سے نا آنا۔ فضل نوک کا باپ گاؤں کی مسجد میں پیش امام تھا
 وہاں کھڑا تھا۔ جیسو کا پانی تو باہر لگا سے لہرتا تھا مگر نمازی وہ عید بقر عید والا تھا
 زون ہستے لے کپڑوں کا لیا ہوا پینے کو لیا جاتا تھا وہ اس کا خیال تھا کہ سنے کپڑے
 ہم اللہ کے بوری حال ہوتے اور نہ پورا عرصے تک پہنچتے تھے۔ کپڑوں کے سنے
 ہستے کی حالت کی بہت سے عرصے کے اندر جا کر باقی ایک آتا تھا مگر پوری یکسوئی سے
 ہوا ہی کے نہ ہوا ہوا کر نکاح میں ہاتے ہوتے یا بھروسہ کرتے ہوتے کپڑوں کا لیا
 ہستے ہی طرف تھوڑا سا لگا ہستے کے ہوسو سے لگنے ہی اسے لگوانا ہو
 ہوا ہی کر بھروسہ کرتے ہوسو میں پہنچتے ہوتے اس کے کپڑے گھنٹوں سے آکر مسک
 لے ہوسو کے دھلی کرنے لے رہے ہیں گی بار جگ کر انکی دیکھا ہاتھوں میں جان کر اور
 ہک کر پہنچتے ہیں کرنے میں وہ اس قدر تھک ہو جاتا تھا کہ اکٹرا کپڑوں سے لگا جاتا
 تو اسے میں اسے تو بہت لڑائی کا سامنا کرنا پڑتا تھا وہ کولی ہی سر کی حالتوں اس پر
 لگنے کی بوجھ کر رہتی تھی۔

گاؤں کی دوسری روایات کی طرف گہرا ہونے کی طبیعت سے اٹھنے کا کام بھی
 اس کے لاکھوں میں شامل کر لیا ہوں کی خدمت کا جذبہ اس کے اندر شاید اس لیے بیجا
 نہ ہو گا تھا کہ سب کا خیال لہرتے لہرتے اس کی کر دہری ہوگی تھی اور جب بھی اس کے
 گناہ پہنچتے تھے یا تو کر سے پہنچتے ہیں وہ سب کھلا کر تھا یا پھر میں گھنٹوں کے ہوسو
 سے انت ویرانہ ہوا کہ پہلے ہوسو کرتے ہستے گھنٹوں سے آکر کپڑا زمین سے
 نکلنا کر پھا ہو گیا تھا اور چھائی میں ہاتے وہ کپڑا تو ایک ہوسو ہی ہوا کرتا ہے۔
 ایسے میں وہ گھنٹوں میں سے تھا کہ اس کا حال وہ اٹھنے نہ ہوا نہ صرف گہرا ہوسو مگر دوسرے
 کو لے لے ہی حالت ہوسو آجاتا تھا کہ ہوسو کے گھنٹوں سے آکر ہی گہرا ہوسو اٹھنے

کہا ہو کہ مسجد کا ماسکی ہونا اسے دراشت میں ملتا تھا۔ اس کا بہت نکتہ چیل
 شہرہ مزدیوں میں ابھی تاروں کی چنگ مدہم نہیں ہوئی تھی اور شہسے باگی سے لڑا
 ان بھی نہیں دی تھی پانی پھر کراتے ہوئے میں مسجد کی پرئی کر کے پاس لٹکا کر لیا
 کے ملی کر گیا۔ یوں کہ پڑوس کی منگ کے سر پر مضبوطی سے عمارت کا پتھر دیا گیا
 اور کڑا کرت پانی نکل کر اسے پوری طرح بھگو گیا تھا۔ اسے کھلنے پر چھت نکل پیند
 اگرچہ زیادہ نہ تھی مگر کسی چھری نوک پر چڑنے سے کھلنے میں اتنی فوری اور شہسے تکلیف ملی
 تھی کہ اس کی آنکھوں کے آگے سرمے مانگ لگے تھے۔ جب تک اس حد کی شدت دم
 ہوئی منگ کا پانی اسے پوری طرح بھگو چکا تھا۔ مگر پہچا تو وہ ظروں ظروں کر رہا تھا۔
 پھر اسے تپ چھا اور اس تپ نے اسے اتنی ہی مہلت دی کہ منگ بیچے کو تھوڑے۔ بیچ
 کی مسس ابھی پوری طرح بھگی نہ تھیں کہ بھگا ہوا باپ نظر کر مر گیا۔ اسے منگ سے لبت
 ہو گی مگر وہ اس غرت کے ساتھ زخم و رہنے پر مجبور تھا۔

تھا اپنے مرنے باپ کی طرح دلو خانے سے ملحق حوش کو پانی سے بھرا دیا
 بر لہذا کے بعد خالی ہو چکا تھا۔ اسے ان لوگوں پر بہت غصہ آتا جو اس کے گمان میں لہا
 پانی خرچ کرتے تھے ان میں سے ہزاروں تھے۔ فیچے مستری اور میر قلیچ کو وہ مسجد سے
 دیکھتے آتے ہوئے ہر بار اس حال میں دیکھا کرتا کہ ان کی لمبوں کے دامن نولاموں یا
 پھر شہاد ہی کھنوں تک نہ نظر آتی تھیں۔ سو سے ان کے ہاتھ میں تو گاؤں لڑا
 لہذا ظہور تھا کہ اسے ایک ایک قسم بھگوانے کے لیے انگ سے بھرا ہوا پانی کا لہا چاہیے
 ہوتا ہے۔

تھا اب بھی خالی مٹھنوں کدھے پر ہٹا کر سامنے سوھے کی جتنی قبر کے بیچ
 سے پڑا ہوا کے ٹھوسے ملی کھا کر گزرتے پھا پانی تک پہنچتا تھا تو اس کے پاؤں کے

پانی اٹھان میں مسلسل اترنے کی وجہ سے اوپر اٹھنا بھول چکے ہوتے تھے۔ اسے وہاں
 سے پھینک دیا، وہاں تھا وہاں پھروں پر آگے ہی آگے بھگتتی پھلتی پلے جانے والی اٹھنے
 پانی والی پانی پانی ہی کر لو بھر کے لیے پانی ظہیرا کر آئینہ بنا لیتی تھی۔

وہ مظہرہ بھر کر اس کا منہ مٹھی میں دبا لیتا اور شیشہ بے پانی میں خاکوت کے
 وہاں کے غصے دیکھتا تو اس کا دل بیٹھ جاتا تھا ایسے میں جھک کر کھڑے ہر مظہرہ
 ہرگز اور بھی مٹھی ہو جاتا۔ تاہم وہ یہ بھول دل کے ساتھ اوپر کو چل دیتا تھا۔ سہہ تک
 پہنچ پہنچے اسے سوئے لوگ سے ہازد جو لاپے تک جو بھی یاد آتا اس کی دل ہی دل میں
 ہی بھی ایک کتا جاتا تاہم وہ واقف نہیں نے اس کے رویے کو تبدیل کر کے رکھ دیا تھا وہ
 فضل کا گاؤں کے دوسرے لوگوں سے مار کھاتا تھا۔ اب وہ اوپر سے پتے پانی تک
 جس طرح برکتا ہوا جاتا تھا اور جیسے پانی سے بھر اس مظہرہ اٹھا کر بچوں کے بل اچھاتا
 تھوہر پہنچتا تھا اس پر ساتھی سوٹھے کی ہنسی تھرہ ہر بار اسے حیرت سے دیکھنے لگتی تھی۔

وہی طرح ہٹ کر ڈھکی ہونے والے فضل کو جب لوگوں نے اس کے گھر پہنچایا
 تو اس کی ماں جو بچیوں کو قرآن پڑھانے کی نسبت سے گاؤں بھر میں محترم تھیں اور سب
 بھگتی بی بی صاحبہ کہتے تھے پہلے تو بیٹے کی حالت دیکھ کر چکرا کر گریں اور جوں ہی ہوش آیا
 کہاں وہ بیٹے کو اپنے سنے پر یہ ظلم ڈھانے والوں کو کوسے لگیں۔ فطیہ امام صاحب مصر
 کے لڑکے بعد سہہ گئے تو وہاں پہلے کی ہوائے اپنے مرشد کے مکتوبات کی کتاب پڑھنے
 کے لیے آئی، گھر سے میں بیٹے گئے تھے 'مکتوبات' معمول اپنی بی بی کی کہنے اعلیٰ آبادی تو
 لڑتا کر گھر سے باہر لگے اور سہہ کے دروازے سے گھر اپنے گھر کے دروازے پہنچا
 بھراؤتی تھے اور گھر میں گئے۔ لوگوں نے اسے قہقہے سے مہربان سے مہربان سے اشارے کر کے اپنے
 گھر سے بیٹے کی حالت دیکھ کر روز بی بی کے جن جن کر انہیں سارا معاملہ سمجھا گئے تھے۔
 تاہم اس کے جب وہ اپنے گھر کے آگے میں کھڑے تھے انہیں وہ توڑی بنا نظر آ رہا تھا

تہ چند دستوں کے درمیان کھڑی پھاتی کھتی اور گالیاں کھتی لی کی کہ وہ تو اپنی اس کہہ رہی
 اور لڑتے کو خاک میں ملا دیکھ رہے تھے جو ٹر ٹر کی ریاضت کا حاصل تھی کہ اسوں نے
 پھاتی کو وہاں زور سے دیا جہاں انہیں بوجھ عسوں ہو رہا تھا ' آنکھوں کے آگے دھڑکیا
 ہوا لے لگا۔ اس خدشے کے باعث کہ کہیں پھکا کر وہ گر ہی نہ جائے گی اس لئے زمین پر
 گئے۔ لی بی صاحب نے بڑی لگام کو میں زمین پر چلتے دیکھا تو میں نے اس کی آواز سنی اور
 میں اسے لگی تھی۔

شام کی نماز سے پہلے پہلے وہ ہواں میں آگئے تھے ' مگر بہت جلد ہی پڑھی تھی
 وہ مسجد جائیں۔ تاہم انہوں نے یہ نماز قضا نہیں ہونے دی۔ اور جب وہ دو روگیاں
 میں گھسوں کی سہانی مانگ رہے تھے جو ان کی پادراشت سے باہر پڑے تھے اور ان کی
 نواز انہیں اس دہائی کی صورت ل رہی تھی تو آنکھوں سے ان کی ملائی ہوئی لگی تھی۔ یہ
 بہت اور بعد پہلے سے اسے زخمی لعل خوں کا ہاتھ تھا ' میں زور سے جھکے کرتے
 چارہائی سے اٹھا کر اگر وہ لڑتا تو ہو سکتا تھا اس کا چارہ ہی کھڑے سے اترتا۔ لی
 بی صاحب نے یہ دیکھا تو ہانگے ہوئے چلے میں آگئے۔ بڑی لگام صاحب نے اسے دھرتے
 ہاتھ سے پتے دیکھی دیا اور بچے کو گلچیتے ہوئے باہر لگی گئے۔ گاؤں والے ایک ہاتھ لاری
 لی صاحب کی بھٹی میں رہے تھے۔

تھا کہ لے آہولی ہو گی تھی۔ بڑی لگام صاحب نے بگو نام لے اور انہیں لانا
 بلانے کو کہہ لیا سب کو اور ہاتھوں کہ یہ سارے وہ لوگ تھے جن کی ملاہیں انہیں
 لائی تھی اور یہ ہیں اسے ہی ہی میں مقلات بچے پر چھوڑ کر ہی نہیں کر رہے وہ ان
 سب کو ان کے پاس اپنی فونٹی ہوئی میں وہ چارہ لاریوں پر بیٹھا دیکھ رہا تھا جن کے حضور ان
 کے گر بیٹے کو بکھری تھی تو یہ بھی دیکھ رہا تھا کہ ان کے چہرے تو زوردارانے نے اہل
 رنگے تھے۔ بڑی لگام سمجھتا یہ سارے لوگ اسے آہوں سے اترتے ہوئے فرماتے تھے

(۲)

بہتر فضل نہ اب ذکر فضیلت کے بارے میں سوچتے تھے تو انہیں ہوں گنا تھا
 جس وقت کے لیے آسمان سے اتاری تھی۔ پھر لگا کر وہاں جہاں بیچ کی آوی تھی۔
 انہا کے اڑان سے چٹا مای کا پھانسی کوٹ ڈالنا لیا کا پکرا کر گس اور پھر گاؤں والوں کا
 یہ وہ پھانسی سے قرآن لگائے فضیلت کو سوچتے گئے تو اسیروں وقت تیزی
 سے سوچ رہا تھا۔ جتنا وقت انہاں نے فضیلت کو سوچتے گزار دیا تھا اتنا تو وہ ان
 کے پاس رہی بھی نہیں تھی۔ جس طرح اسے ہم دیتے ہوئے اس کی پاس سرگئی تھی ہانگی
 اور ان اپنی تہی کے لگ بھگ پورے سال جب کہ ابھی وہ محض انیس سال کی تھی
 بہر فضل نہ کے لیے کو ہم دیتے ہوئے دم توڑ گئی تھی۔ ان چار برسوں کی رفاقت انہاں
 نے کچھ جن کر سکی مگر یہ پھیلائی تھی۔ پیچھے سے چلے جانے والی انہوں کے مل چلی کر
 آج تھی اور سارے میں اجلا کھیل جاتا تھا۔

”فضیلت اور آدھیں پامنا سکھا رہی“
 وہ اسے پاس بلائے ’قرآنی حمد و کھول کر پیلے طرف ہر اہلی رکھتے اور اس کی
 ہول صورت دیکھ کر“ ”آ“ کی تدار لگائے کہتے۔ ”تھکھلا کر نہیں پڑتی۔“
 یہ کیا چمنہ ہوا تھی اس طرح تو میں لہا کے کئے پر شیعہ ہاتھ کی سرٹیاں گھیرا

”کئی تھی“ ”آ“

فضیلت اسے بولیں سے یہ کتنی تھی کہ فضل نہ کی بھی میں جھوٹ جاتی۔
 وہ فریادی چلے گئی کہ اسے اس طرح چمنہ سکھایا جائے جس طرح خود لہک لہک کر ماسٹر
 کی صورت کرتے تھے۔ وہ بھاگ کر جاتی ہوز کارس سے قرآن پاک انھارائی ’جوت سے

اس کا خلاف الگ کرتی اسے دائیں اور بائیں آنکھ سے لگا کر چوتھی اور پانچویں ہاتھوں میں
 یوں بھیجی جاتی تھی جیسے وہ اس کتاب کے ایک ایک لفظ کو اپنے سینے میں ابر لہنا چاہتی ہو
 ہنر نفس نہ کو سمجھ نہیں آتی تھی کہ وہ اپنی بیوی کی اس خواہش کو کس طرح پورا کرے۔ وہ
 شدید خواہش رکھتے ہوئے بھی لفظوں کو پوری صحت کے ساتھ اور صحیح تلفظ سے ادا کر لے
 گا۔ اور بعض اوقات تو وہ سبق دہرانے میں اتنی شدید غلطیاں کر جاتی تھی کہ وہ
 "نور باط" "نور باط" کا اردو کرنے لگتے تھے۔ انہیں ساری عمر افسوس رہا تھا کہ وہ اسے نہ
 اچک سے لہذا چھوٹا سکھا پائے تھے نہ قرآن۔ مگر جس طرح وہ سینے سے قرآن لگا کر
 لپک کر پاتی رہتی تھی اس کی بات سوچتے تو پورے بدن میں ایک جھپ طرح کا کین
 اور سستی بھر جاتی تھی

"اگل کبریٰ اور قرآن

آسوں پاسوں تو رہاں

لوہے دیباں تھیوں تڑاے دے تڑاے

بائی تہاں کراں دانے

کول بھرتے ہن کوئی نہیں تھوڑ

اللہ دانے تھوڑا تیری موت

دائیں دل چڑھی سواری

جہاں تھوڑا دی تھوڑا دی

اپنے باگ کی کی ان تھوڑا دی میں وہ تھوڑا رہتی تھی۔ "جہاں آیت" اور
 "کبریٰ" کے حاور سے اگلا میں وہ صحیح طور پر لہا کر لے رہا تھا نہ تھی۔ "آیت" اور "الی"
 کو لگا کر چوتھی تو "اگل" اور چوتھی "کبریٰ" کی جہاں وہ "کبریٰ" کہتی تھی۔ ہنر
 صاحب کہتے:

کون سے دن کے پہلے میں قرآن نام پور لی لی صاحب کو آپس میں بات کرتے نہ دیکھا
 کون سے دن کے پہلے میں قرآن نام پور لی لی صاحب کو آپس میں بات کرتے نہ دیکھا
 کون سے دن کے پہلے میں قرآن نام پور لی لی صاحب کو آپس میں بات کرتے نہ دیکھا
 کون سے دن کے پہلے میں قرآن نام پور لی لی صاحب کو آپس میں بات کرتے نہ دیکھا

قرآن نام صاحب گھر میں داخل ہونے کے بعد میں جوں پیدار کی طرف جاتے
 قرآن نام صاحب گھر میں داخل ہونے کے بعد میں جوں پیدار کی طرف جاتے
 قرآن نام صاحب گھر میں داخل ہونے کے بعد میں جوں پیدار کی طرف جاتے
 قرآن نام صاحب گھر میں داخل ہونے کے بعد میں جوں پیدار کی طرف جاتے

دوسے دن کے پہلے میں قرآن نام پور لی لی صاحب کو آپس میں بات کرتے نہ دیکھا
 دوسے دن کے پہلے میں قرآن نام پور لی لی صاحب کو آپس میں بات کرتے نہ دیکھا
 دوسے دن کے پہلے میں قرآن نام پور لی لی صاحب کو آپس میں بات کرتے نہ دیکھا
 دوسے دن کے پہلے میں قرآن نام پور لی لی صاحب کو آپس میں بات کرتے نہ دیکھا

جب تک وہ اپنی زندگی میں رہے سب بگڑ بگڑ چکا رہا مگر
 جب تک وہ اپنی زندگی میں رہے سب بگڑ بگڑ چکا رہا مگر
 جب تک وہ اپنی زندگی میں رہے سب بگڑ بگڑ چکا رہا مگر
 جب تک وہ اپنی زندگی میں رہے سب بگڑ بگڑ چکا رہا مگر

ہو کے کسی اور جگہ میں ہوتا ہو وہاں نہیں تھا جہاں ان کا چنا اور ہو رہے تھے۔ وہاں کی سب ہوگا کہ اپنے گھر سے میں انہیں اسے پاس بلائے رکھا خاص کام کسے اور ان کا وہ ہانے میں بہت جنم کرنے ہاتے تھے۔ اگرچہ اس گھر میں اشیاء نے بہت جگہ گھر کی فی جام یہ طلوس سے جنم کرتے تھے تو وہ راہ دانا چلا آتا تھا۔

اس رات کہ جس کے معدوم ہو چکنے کے بعد جو نچال کو پچکے سے آکر سب کو کپٹ کر کے رکھ دیا تھا میں اسی رات کو فضیلت نے آکر باسٹر فضل نام کو بہت سنا تھا۔ وہ چہننے ہوئے بار بار اٹھتے اور اسی اٹھنے میں لہا ٹوٹ کا ہاتے 'یوں جیسے بیگ ہاسے لیتے لیتے ایک لمبی ہست لے اور ہاتوں میں اتر کر واپس آتا بھول جاتے۔ خواب کے اس لیے ہار سے نے جن ہاتوں میں انہیں اتارا تھا وہاں فضیلت تھی جو بار بار پوٹھے ہائی تھی "ماٹری تم من کے لیے کیوں چہننے ہو جو خود چہن سکتے ہیں مگر چہن نہیں چہنے؟"

ماٹری کی پپ سے تو وہ تن کر ان کے سامنے کھڑی ہو گئی۔
 "دیکھیں کیا میں جو ہوں آپ کے سامنے 'پائل گوری' ایک بھی سہانگ تھا
 اٹنگ سے نہ چہن سکتے والی 'مگر ایک ایک فٹا کے لیے اپنے پورے وجود کو سات با
 لینے والی۔۔۔ آپ سہرے لیے کیوں نہیں چہننے؟"
 انہیں کوئی جواب نہ سوجھا تو وہ جڑ بڑا کر اٹھ گئے اور پورے بدن کو جھلا جھلا کر چہننے لگے۔
 کالہ اور تیسرا یا پتلا جھلا ہوگا کہ ایک سرگوشی کی سننا سہٹ پورے گھر سے میں خوراکی
 "کوئی نہیں سن رہا"

انہوں نے اس آہٹ پر اٹھی رکھی تھی چہن سے پورے تھے اور کمرے میں چہنوں
 طرف دیکھا ظہر ظہر کر رہا تھی انہیں یقین ہو کہ وہاں کوئی ہے مگر اپنی ناراضی ظاہر
 کرنے کے لیے ان کی نغروں میں آنے سے بچا رہا۔۔۔

میں نے کہا ابی شہتے کی انگلی پر آکر رکھیں مگر زبان تالو کے ساتھ نہیں رہتی۔
میں نے کہا ابی شہتے کی انگلی پر آکر رکھو اور ہاتھیں سیدھی کر کے ہانگ سے لگائیں
میں نے کہا ابی شہتے کو بچھنے میں لگ گیا جو ایک ہی رخ بیٹھے بیٹھے ہن ہانگوں
میں نے کہا ابی شہتے پر ہوجھ والی کر کڑے ہوئے تو وہ بہت جلد تو ازان
میں نے کہا ابی شہتے تھے۔

میں نے کہا ابی شہتے میں میں نہیں لہروں کو محسوس کیا جو پہلے کبھی بھی
میں نے کہا ابی شہتے کے موسم پر ہیں رہتے نہیں جیسے بی بی تیاں رہتی ہیں
میں نے کہا ابی شہتے کا دل پر بھی خون کا دباؤ بڑھ رہا
میں نے کہا ابی شہتے میں ان کے قدم دروازے کی سمت اٹھنے گئے
میں نے کہا ابی شہتے تھے تو نہیں ہیں گا تھا جیسے میں ان کے عقب میں
میں نے کہا ابی شہتے کی طرح جا رہے تھے میں نے دھونگی کی طرح چلنے والی اس کی
میں نے کہا ابی شہتے پر محسوس کر رہے تھے

"وہاں کوئی نہیں ہے"

میں نے پچھے مڑ کر دیکھا وہاں آواز نہیں ایک سسکاری تھی۔ دل بیٹھنے لگا تھا
میں نے کہا ابی شہتے کے لیے آگے نہ جا کر دروازہ چھوٹ کر رہا۔

وہاں بھی کوئی نہیں تھا۔

میں نے کہا ابی شہتے کی نظریں اپنے بیٹے اور بہو کے بیچ روم کے بند
میں نے کہا ابی شہتے کی ہے یہ وہی وہاں تھری ہوئی تھی۔
میں نے کہا ابی شہتے جب ان کے سوچنے کے لیے بکوا رہا تو باہر
میں نے کہا ابی شہتے میں کڑے کڑے تھے وہاں پچھ گھے کہ
میں نے کہا ابی شہتے میں کڑے کڑے تھے وہاں پچھ گھے کہ
میں نے کہا ابی شہتے میں کڑے کڑے تھے وہاں پچھ گھے کہ

سوائے جتنا پہلا قلمی کمراس کی نسل کے قدموں تھے اب جو زمین تھی وہ

لوہا تھی پہلی تھی۔
اب اس نسل کے لوہے سے بخوبی کوٹ آئے تھے تو ان کا وجود ایک جب طرح کے
لوہے سے لڑتا رہتا تھا۔ یہاں دوسری نسل کی آتی رہتی تھی جو اس کے ٹپ لہ
لوہے سے لڑتا کرتی رہتی۔ پہلی طرح کوہ میں نہ آتے تھے یہ اس میں بھی تو ایک
لوہے کی طرح اور بھی اس سے وہ باغ دیتا تھا۔ اس پر اس پر اس
لوہے کی طرح ہونے کے لیے انہوں نے اپنا کمر کھڑے پر رکھ لیا اور پہلوں کے اندر بھٹکنے
سے بھٹکانے کے لیے انہوں نے اپنا کمر کھڑے پر رکھ لیا اور پہلوں کے اندر بھٹکنے
لوہے کی طرح اس میں گئی کالی جو لوہے تو بھی ہی اس میں چھری تھی کہ وہاں سے
لوہے کے میں نے انہیں اپنے اندر رہا لیا تھا۔ کئی بار چھری میں رہا انہیں اختیار کرنے
کی وجہ سے وہ ایک کمرے میں جو چھری کھاتے رہے مگر وہاں ہوا کہ سب کھسکی کی
پلی دھنوں کی روٹی کا دھینڈہ ہو گیا جس نے ان کا اصل نام سب کے ذہنوں سے مٹا کر

راوند

میں روز بھر چھل گیا تھا اس سدا میں اگلے تک سب یہ کہ رہے تھے کہ اسلام
آپ کے ہاں بڑے میں اس ایک علی سنواری تھوڑا سا تھا وہی میں کے پھلے ٹھوڑے باطن
ٹھوڑے ٹھوڑے کی ٹھوڑے سے قرآن پر پڑنے کے خدشے سے اپنے بڑے آئے تھے
اور قرآن چھتی سے چھو کر وہاں سدا کے کی چھکن میں جا کھڑے ہوئے تھے۔ میں
ان وقت کہ وہ بہت سدا کے کھوں کو گواہ کر سدا کے حکومت اس سدا کے ہے پر
چھو کر وہاں لہا رہے تھے کہ بہت سدا کے کھوں کو گواہ کر سدا کے حکومت اس سدا کے ہے پر
یہاں تھا کہ وہ چھری میں آئی تھی تو اس سے اسے بھی تھی وہاں زمین نے کی پلے کھاتے
تھے وہ چھریوں کے کھوں سے جو کھوں کو اپنے اندر چھو لیا تھا۔ سب کھسکی کے
جسوں میں اس سدا کے کھوں کی چھریوں کے کھوں کی آئی تھی اور وہ سے کھوں

کو دھتے سروں میں ہتے والے پتے پائی اور اس کے کینوں کی ہار سائیں اور مسیبت
سیت۔ اب وہاں یہ کہ بھی نہ تھا۔

گگ بھگ یہ وہی وقت بنا ہے۔ بے کے اور چڑھ کر تھوڑے عورت
والا۔ اور وہ بھی یوں جیسے کوئی شوہاز نکاری پہلے سے مرے ہوئے شیر کو دیکھے اور اس
کے بدن پر پاؤں رکھ کر لوگوں کے دلوں پر دھاگ بٹھانے کے لیے تھوڑے عورت
شروع کرے۔ ہاں میں میں وہی وقت تھا جب اوپر سے کدال پڑنے اور ادا کرے
کی آواز میں آنے والے کے پر پلو کول میں یہ کہ وقت کے لیے معطل ہو گئی تھی اب بہت
اور سر پہ کی گئی تھیں تھے باسٹر فضل جو کو اپنے زعمہ ہونے کا احساس ہوا تھا۔ بہت عورت
زندگی کے اس احساس کو ان کی ادھی سے 'پانگوں' پندلیوں اور کمر سے بازوؤں گھونٹوں
گھٹی سے اٹھنے والے اور نے پھیلا دیا تھا۔ وہ بے بسی اور درد سے جس قدر بھاگتا
تھے بھاگتے اور بھاگتے چلے گئے مگر جب انہیں احساس ہوا کہ ان کی بیخیاں اور
دولے حملے کو سنے والا وہاں کوئی نہیں تھا تو وہ یوں چپ ہو گئے جیسے ازل سے ہلا
ہاتے ہی نہ تھے۔ اب انہیں اپنا بیٹا اور بہو ایک ساتھ یاد آئے۔ اپنے ہنسی ماں باپ کی
طرح انہیں بھی انہوں نے آپس میں کم ہی صلاح کرتے یا کھل کھلا کر ہنستے دیکھا تھا۔ ہم
اس ایک دھم سے کی تاخیر دونوں کے ہاں ڈاکل مختلف اور متضاد ہو جاتی تھی۔ وہ دونوں بڑ
اندھے تھے ان کی آنکھوں کے سامنے والے دروازے کے پیچھے چھینٹا وہ ایک بیل پر ہوں گے
مگر وہ اندازہ کر سکتے تھے کہ مصروفیت کی تھکن نے انہیں دونوں کناروں پر ہی گرا دیا ہوگا
یوں کہ وہ پہلو پہل کر قریب بھی نہ ہو پائے ہوں گے۔ اس فاصلے کو انہوں نے ان کے
ظہر دم کے دروازے پر کھسا ہو دیکھا لایا تھا۔ یہ جو آنے والا وقت ان کی محسوسات پر دھک
دینے لگا تھا اس سے بچنے کے لیے انہوں نے اندازے لگانا بند کر دیے تھے۔
جو ابتدائی اندازے تھے وہ سارے ہی لٹا ہو چکے تھے۔ تیزی کوٹ سے خاکوٹ

نہیں تھکے۔ سب بچو گدگد ہو رہا تھا۔ اس پر وہ انکا پکھلائے کر دیا اور اس پر
 کے ہاتھ سے جھوٹ گیا۔ ایسے میں انہیں احساس ہوا کہ وہاں تو سانس لینے کے لئے
 ہی نہیں تھی۔

اور جب ماسٹر فضل نے اپنے تئیں لینے کے اندر چھٹی ہوئی ہوا کو سمجھنے کے
 لیے آخری میلہ کیا تو ان کی پیٹیاں جھٹکی گئیں۔ یہی وہ لہو تھا جب سینٹ اور سر پین کی ٹنگ
 کاٹ کر فضیلت وہاں پہنچی گئی تھی۔ سارے لئے کو تھوک کر اور ان ساری آوازوں کو ہاتھ سے
 کر جو لینے میں اپنے والوں کے ذمہ سے بوجھل ہو گئی تھیں اور کتنی میں نہ آئے ہوں
 لوگوں کے سینوں سے اٹل اٹل کر رہی ہی مٹکا بہت پیدا کر رہی تھیں یہی ماسٹر فضل کوئی
 جاوت میں خاکوت کے پتے پانی نے بنا رکھی تھی۔ جب ماسٹر صاحب کو یہاں لگا تھا
 جیسے ان کے ہاتھ تو ایسے ہی جکڑے ہوئے تھے مگر ان کے حصار میں موجود ایک دست
 سے خواجہ سارے مہارگ اور رہاں لکھا خود بخود ان کی چھاتی کے اندر مٹھل ہو رہے تھے
 فضیلت نے آتے ہی اپنے ہاتھوں کے ملائم لمس سے ان کے وجود کی ساری گہریوں کو کھنڈ
 اور سارے دروں کو سینا شروع کر دیا تھا۔

وہ اپنی ہی دھن میں تھن رہی تھی کہ اس کی ریاضت قبول ہوئی اور اسے اپنے
 تھکے آنے والی ساری آوازوں کے ساتھ ان کے وجود کے اندر طویل کر جانے کا اذن ہوا
 گیا۔ اس کے ساتھ ہی زندگی کی لذت میں گدھا ہوا جازہ ہوا کا لطیف ہونکا لینے میں
 محسوس کر ان کے قہرے جانے والے وجود کے اندر بہت گہری میں اڑ گیا۔ اب صرف
 وہی سانس لینے تھے پورا مہا سانس لینا تھا۔

پتھر کے لوگ

انسانی سوچ اپنے لیے نئے نئے راستے دھونڈتی اور راہیں نکالتی ہے۔ یہ تو زمین
 پہلے ہی سے ہے کہ وقت کے ساتھ ساتھ اخلاقی اور معاشرتی اقدار بھی بدل جاتی ہیں۔
 نئے نئے پتھروں کے باعث انسانی رشتوں، جذبات، محبت، چاہت، غلوس، شرور و مرضی کی
 روایت بھی بدلتی رہتی ہے۔ وہ انہی فیصلات میں گم تھا۔ مگر کے اس دور میں سب کوئی بھی
 پتھر کو دیکھے گا تو زندگی اسے بہت مختلف نظر آئے گی۔ ایک زمانہ تھا کہ طالب علم
 استاد کی پتھے پتھر کوئی کی۔۔۔ مگر خیر انکا ہی کافی ہے کہ "ایک زمانہ تھا"۔۔۔

باہر بھاگتے اور اپنے گرد و نواں پر نظر ڈالنے پر نظر تو وہی آئے گا جو آج ہے تو
 ہر اپنے احساسات اور جذبات کو کس انداز میں۔۔۔ خیر چھپے یہ بھی جانے دیں۔

آج کی اس دنیا میں بھی تمام تر تبدیلیوں کے باوجود۔۔۔ بہت سارے اچھے
 لوگ۔۔۔ ہم کو اسے تو زیادہ لوگ خفا ہوں گے۔۔۔ پھر بھی معاشرتی رویوں کا معروضی
 نوبت اکثریت کی بنیاد پر۔۔۔ خواہ مخواہ یہ ضروری تو نہیں کہ اپنی سوچ کے انداز کے لیے
 نہیں ہرگز بھی مبرا کیا جائے۔۔۔ تو پھر۔۔۔ بس پھر یہی کہ جو بھی دل چاہے کہہ دیجیے۔۔۔
 اور اس تو کوئی آپ سے نہیں سمجھ سکتا۔۔۔ اگر لوگ۔۔۔!

ہسپتال میں ہر طرف خاموشی تھی۔ سفید کوٹ پہنے بھاری ہتھکڑیاں لگنے والی کھوار
 مائے سے گزر جاتے۔ یہ وہ اصل ہسپتال کا وہ حصہ تھا جہاں ایسے مریضوں کو لایا جاتا ہے
 جن کے لیے امتیاز ضرورت سے زیادہ چاہیے یعنی IUCN۔ کمرے کے سامنے نرسنگ
 ٹیبل تھا جہاں کبھی کبھار عینکی مسائل سے بہت کر وہ لوگ آپس میں ایک آدھ جملہ کہنے کی

ہمت کر لیتیں۔ ہنر پر خاموش لیٹے لیٹے وہ مستقل ہمت کو نگہ رہا تو ایسے شکرگت
 بھی کیا رہ جاتا ہے۔ یہ جو دل ہے اس کی ساخت اور پھر یہ بات کہ یہ دھمکی ستارے
 معقول رفتار سے چڑھتا بھی رہے اور جسم کے مختلف حصوں تک خون کی جھڑکت
 رہے۔ یہ سارا سلسلہ بھی کافی دھبیہ سا ہے۔ کب کہاں اور کیسے کوئی ایک آنسو اٹھتی ہے
 کوئی ہلک سا بین چلے تو بھی ایک غذاب۔ اسے اپنا کئی ویں یا اپنے دل کی بکری
 ہوئی تصویر یاد آ رہی تھی۔ اچھا تو یہ سارا سلسلہ ہے؟ یونہی جیسے گھر کے اندر ہی گھر سے
 بہتا ہوا پانی رکنے لگے تو کسی پلہر سے رجوع کرتا جاتا ہے؟ انسان، انسانی علم
 لوگ جو ایسی ایسی خوبصورت چیزیں تخلیق کرتے ہیں۔ یہ سب لوگ اس اتنی ہی بات پر
 زندگی ختم۔

ان اہمیتوں سے اسے انکسرت ہی ہونے لگی۔ یہ سب کچھ یونہی یاد ہی رہتا
 ہے۔ کہ کیا ہے زندگی اپنے تمام تر حکرواںات اور سمیت ہمیشہ سے اسی ڈار پر چلنا
 رہی ہے اور یہ سلسلہ اسی طرح رہے گا۔

ایک لمحے کے لیے اس نے سوچا یہ جو بیٹے جانتے لوگ ہیں جو سڑکوں پر
 بازاروں میں، کبھی کبھار پرہلا کرتے ہوئے لٹاواں میں، بازاروں کی بھیڑ میں، کبھی تک
 کے میدان میں، یہ سب کچھ کیا تماشا ہے۔ ہاں لگتا ہے جیسے لوگ بس ہاں رو رہی ہیں
 طرح طرحی حرکت کرتے ہیں۔ بات ہو تو سو جاسیے۔ کچھ ہونے پر دفتر کی چوری شروع کر
 لیں۔ ٹھوکانا، کپڑے چھوٹی کرنے، توڑا بہت ہانپنا جیسے کوئی اندر ہی اندر مختلف نئی دہاتا
 چلا جاتے۔ سب یہ کہتا ہے سب ہاں کرنا ہو گا، اب اس کاغذ کو چھتا ہے۔ اس اس پر یہ
 پتہ لگاتا کرے کہ بہت ضروری ہے۔ یہ معاملہ اور جنت ہے۔ سب ہاں گئی کو کہتا ہے۔ اس
 اسی طرح ہر مریطے پر ہاں ہوں ہوتا ہے جیسے ایک قصوں طریقہ کار ہے، ایک پہلے سے
 طے شدہ منصوبہ کہ ہاں ہوتی ہے کہ ہاں ہو گا۔ ایسے جیسے ساری زندگی مسائل سے ختم تھی ہو کہ

ہاں ہونے کی ایک کے بعد دوسرا پھر دیکھ لو۔

ہاں عام طور پر تو یہ سلسلہ چلتا ہی رہتا ہے۔ کچھ نہیں ہوا تو پھر سب فخری ہے۔
 ہاں کوئی حادثہ جو ذرا معمول سے بہت کر ہو۔ کسی علاج یا دوست کا
 نہ کی توجہ کوئی الیہ یا کوئی حادثہ جو ذرا معمول سے بہت کر ہو۔ کسی علاج یا دوست کا
 ہاں ہونے سے تو پھر کیا کرنا ہوگا۔ مرحوم کے لیے دعا کے مغفرت کرنا تو لازم ہے۔ مرنے
 کے بعد دعا کی پھر میں نے کچھ بھی کیا اس سے مکمل طور پر قطع نظر ہے تو ابی رحیم و کریم اور
 اللہ ہی ہے۔ اللہ مرحوم کو جنت الفردوس میں جگہ دے۔ لواحقین کو سب جہیل عطا
 کرے۔ قرآن لٹونی کا احترام بھی ہو گا۔ اگر دفتر اور زندگی کے دوسرے مسائل سے
 اہمیت لگی تو ضرور شرکت کریں گے۔ ہاں گزارنا ہزارہ کسی وقت اور کہاں ہوگی۔ اچھا
 ایک لے کر انہاں سوچا میں چ جا آ ہے۔ جگہ تو بہت دور ہے۔ اس علاقے میں ٹریک میں
 پھر بہت دور ہوتی ہے اور آج شام اسی وقت ایک تقریب بھی ہے۔ شاید جانا ممکن نہ
 ہو وہاں کہتے ہیں کہ بعد میں کسی وقت لال کرا گھر پہ تعزیت کر لیں گے۔ ہاں البتہ اگر
 کسی صورت ہستی کا انتقال ہو جائے تو پھر یہ مشکل اور غمناک ہوتی ہے کہ وہاں تو بے شمار اہم
 لوگ بھی موجود ہوں گے، ان سے ملاقات ہو جانے کی۔ یہ تو اچھی بات ہے۔ ایسے لوگ
 فیضاً آئندہ کام آسکتے ہیں۔ اس لیے شرکت ضروری ہے۔

اسے اہاگ یہ بھی خیال آیا کہ ہم بیٹے کی شاید کبھی یہ نہیں سوچنے کو جانے
 واسطے کے لیے کیا فرق تو نہیں چاہا کہ اس کے جنازے میں کتنے لوگ آئے یا کتنی مجلسیں
 تھیں۔ بس یہ کہ میرا ہی سلسلہ ہے۔ کسی بچے کی سالگرہ ہو یا کسی شادی کی تقریب۔

ہیپتال کے ایک کمرے میں تھا لیجے ہوئے یہ خود کوہ کی بیکاری سوچا اس سے
 کیا حاصل۔ مگر یہ انسانی رشتوں کی نوعیت آخر کیا ہے۔ لوگ، احباب، دوست، عزیز و
 احباب لگنے کار بھی تو پھارے پھول لاتے ہیں۔ اگر یہ دوسری صورتوں کے باعث
 ممکن نہ ہو سکے تو پھر کم از کم سو باگ ہر خون تو ضرور ہی کرتے ہیں یا پھر میں ہو سکتا ہے کہ

اور یہاں بھی آ رہے ہیں۔
 بات کہاں سے کہاں چلی گی۔ مسئلہ تو غیر صرف اہل کی کیفیت کا تھا۔ علاج تو ہو
 گیا ہے۔ وہ جانتے کہ بہت سارے پہلے ہمارے ایک بزرگ دوست جو اپنی گفت و گو طبیعت
 اور فطرت کی عادت کے انہوں مجھ سے بھی نواز جہاز میں شرکت کے لیے جاتے تو
 یہاں گزرتی کرتے کہ ہماری ذرا جلدی نماز پڑھ لیں مجھے بعد میں ایک شادی میں بھی
 جاتے تھے۔ وہ اسی وقت آکر سوچتا تھا کہ ہم سب کیسے لوگ ہیں جن کے پاس شاید
 یہ پہلے سے لے لیا۔ mechanised رہے ہیں۔ میں ہوا تو یہ کہا ہوگا۔ ہر موقع کی
 بات پہلے سے لے لیا۔ کس سے کہے، کہاں
 دیکھتے تھے پہلے سے منتخب کر کے رکھ لیے جاتے ہیں۔ بات کس سے کہے، کہاں
 کہاں کرنی ہے۔ یہ جیتے جاتے، پھر خوش و غم، ہزار سچ، خوش گھر، خوش لباس لوگ
 ہوتے ہیں۔ ہر پر زندگی گزار رہے ہیں۔ کیا وہ سب ہجر کے۔ اسے نہیں
 پتہ کہ وہ ہیں۔ اس کا نام، گھر اور جیت سے ہر پر سفرے میں ایسا ہرگز نہیں۔
 گویا یہ گرا دکھتا ہو۔ لگتا ہے سب کی گھٹن ایک cynical سا رہا ہے۔
 اب تک ایک بھر گوری سوچا، تو میں میں مکمل طور پر فرق ڈاکٹر داخل ہوا
 اب طبیعت کسی ہے۔ ظاہر ہے شراب لیکے۔ یہ چند کہیاں گے دو پہر رات دن میں
 اور نہ کھائے۔ خدا میں یہ روز لازم ہے۔ ایک طویل فرسٹ وہ ظاہر کھانا کھا ہے۔
 ایک ٹیڑھا شعر فرسٹ انکی تھا کہ جو کھانا کھا ہے۔ ہر شام راک کر لازم ہے اور پھر
 اس نے ڈاکٹر صاحب کی ہدایات بہت گور سے نہ صرف سن لیں بلکہ دیکھ بھی کر لیں۔
 آگے زندگی میں یہ سب دیکھ کر بہت ضروری ہوگا۔ مزے کی سال کی زندگی والی ہے۔
 سائنس کے لوگ نہیں بہت ہی لہیاں لگا لگا میں گھرے تھا "یہاں کھنگرے

میں ہے "Silence Please"۔

نچوڑ

رات کی خاموشی میں بیٹھے سے آتے ہوئے قدموں کی چاپ سن کر میں نے مزہ
 کر دیا۔ وہ کوئی لڑکی تھی۔ یہ کوئی نئی بات نہیں تھی۔ بعض لڑکیاں سوئٹل کلب سے تنہائی
 لگتی تھیں۔ اس کلب میں اکثر لوگ محض عورتوں سے دوستی بلا جانے آتے تھے۔ پھر پہلے
 جین سوہا ہوا تھیجے اور چند دن کرتے رہے۔ وہ لڑکی میرے برابر آئی تو میں اسے پہچان
 گیا۔ میں نے اسے کئی مرتبہ کسی نہ کسی کے ساتھ کھاتے پیتے اور رات گئے ساتھ جانے
 دیکھا تھا۔ اس ہانک نہ بیڑے میرے اندر نیا احساس جاگا۔ رات تنہائی اور محبت میں
 ایک روز بیٹا ہے۔ اب یہ تمہیں ساتھ ہوں تو گناہ کو ترغیب ملتی ہے۔ اس نے مجھے
 پچھت سے دیکھا۔ اسی لمحے میں نے ٹیسی روکی تو وہ بھی بے تکلفی سے میرے برابر آ بیٹھی
 ۔ پورے راتے میرے اصحاب پر غریب کیفیت طاری رہی۔ کیوں کہ میری زندگی
 لڑکی لڑکوں سے ابھی تک نا آشنا رہی تھی۔ اسے مظلومہ جگ پہنچا کر میں اپنے گھر آیا تو تمام
 رات میں اسی دہلی دھلائی اور خوشبوؤں میں بسی لڑکی کے ہارے میں سوچ سوچ کر اندر ہی
 اندر لگا رہا۔ کئی جہر جہری لیتا اور کئی میری آنکھوں سے چند گاریاں نکلتیں۔

انگے روز بھی پورے وقت میں بے نکل بے نکل سا رہا۔ اسی کیفیت میں آٹھ
 تمام کو میں آنکس سے سیدھا کلب پہنچا تو وہ لڑکی مجھے کہیں نظر نہ آئی۔ میں ایک میز پر جا
 بیٹھا اور محض وقت گزارنے کے لیے چائے کا آرڈر دے دیا۔ کلب کا ماحول روز ہیسا تھا۔
 مجھے غم ہی نہ ہوسکا کہ جہاں کب رکھ گیا۔ اتنی دیر میں چائے ٹھنڈی ہو چکی تھی۔ میں
 سنے بے لادگی سے گونٹ لیا تو وہاں محسوس ہوا جیسے کسی بوڑھی عورت کا ہوس لیا ہو۔ ہانک

وہاں کی سب بات کسی کو حاشی کرتی ہوئی نمودار ہوئی۔ کسی کو نہ پا کر اس کے چہرے پر
 بھلاہٹ آئی۔ اہلی طرف اس کی توجہ نہ پا کر میرے دل میں مایوسی کی لہر دوڑ گئی۔ اس
 نے لگاؤ کا ارادہ مجھ پر اجنبیت سے لگا دیا تو میں نے اپنے چہرے پر استحباب
 سحریت لپٹی۔ وہ میری نظر پر آ کر بیٹھ گئی اور مجھے سوائے نظروں سے اٹھنے لگی۔ میں بھی
 جلیں لپٹیوں سے اس کے سر پہ کاہانہ لپٹنے لگا۔ اس کے ہم سے اہلی ہوئی تو شو میں
 میری بات کو سمجھ رہی تھی۔ میری کلمہ میں نہیں آ رہا تھا کہ بات کہاں سے شروع
 کریں۔ بات کرنے سے زیادہ وہ محسوس اور چھوٹے چائے والی لڑکی تھی۔ سائے بھی تھی
 وہ ہرے سائوں میں اترنے لگی۔ ایسی لڑکیاں معاشرے کو بھانپ لیتی ہیں۔ اس نے بھی
 ہرے لڑکی کو چھ لیا۔ جس آنکھوں آنکھوں میں سب بگڑے ہو گیا۔ پتا چلے وہ لکھ سے
 اس میں کہہ تیں کرنے لگی اور بات کا کھانا کھا کر میرے ساتھ چلی آئی۔ میری ضمیر ہوئی
 لڑکی میں کوئی طرفان آ گیا۔ میں اپنے ہنرات میں بیٹے لگا۔ ہنگ میں جھل پٹے ہیں تو
 وقت آہیں میں کلمہ کھا ہو پاتے ہیں۔ وہ تو تھی ہی بھوکوں کی روٹی۔

مجھے اپنے آپ میں سب سکون محسوس ہوا۔ گویا اب تک زندگی کی کڑی دھوپ
 ہی تھاپوں اور اب غنڈی چھاؤں میں آ گیا ہوں۔ یہ ظاہر سب کچھ ویرانی تھا۔
 ہرے لڑکی کو نہ کچھ بدل ضرور کیا تھا۔ میں سوچ چڑھا آنے کے یادوں ہستر میں پانہ ہا۔
 دل سے پہلے اللہ بھی تھی۔ چائے کی دو پیالیاں تھامے وہ بیروم میں نمودار ہوئی۔ میں
 گاہ سے اللہ کو آرام وہ ہستر چھوڑنے اور چائے چائے کے کھینچنے سے لگا گیا تھا۔
 لڑکی بے اختیار چاہا کہ کوئی اسی طرح روز مجھے چائے چائے دیا کرے۔ آفس چائے
 لے لیا تو وہ میرے ساتھ رہی۔ میں نے اسے اپنے ساتھ چلی میں بنایا لیا۔ مگر کچھ
 صبر نہ ہو سکے پر اتر گئی۔ نہ میں نے اس سے کچھ دریافت کیا نہ اس نے ہی بتایا۔ اس
 حالت میں لکھ پر غل پی چھا گیا۔ یہی کیفیت سارے وقت دفتر میں بھی رہی۔ چھٹی

کے بعد گھر جانے کے بجائے میں کلب چلا گیا۔ وہاں میں نے دیکھا کہ وہ کسی لڑکے کے ساتھ خوش گپوں میں مصروف تھی۔ اس نے مجھے کوئی توجہ نہیں دی۔ ایسی لڑکیاں کبھی وہ بے کی بنا ہر انسانیت کی چلتی پھرتی فریاد بن جاتی ہیں۔ میں بھی بیٹھا کھانا کھا کر پھر دوسری باتیں کرتا رہا۔ البتہ میرے اندر کھلتی سی مٹی رہی۔ اس کے خلاف میرے دل میں مختلف باتیں آتی رہیں۔ میں اپنے آپ کو قہقہے بھی دینا رہا کہ بھلا میرا دل سے کیا باتیں سر رہا کہ ہونے درخت کے پتے پھل کو بڑھ کر کوئی بھی توڑ سکتا ہے۔ وہ توں روز دیکھے نظر نہیں آتی۔ وہ وہ کر مجھے ہی خیال آتا کہ وہ نہ جانے کہاں اور کس کے ساتھ ہوئی۔

اسی ٹھنڈی میں چھ ماہات کو بستر پر لیٹا ہے وہی سے کوئی کتاب پڑھ رہا تھا۔ اچانک اٹھ کر کھنٹی گئی۔ میں نے اسے اچھا دیکھ کر غصہ اٹھا کر دیا۔ کھنٹی دوبارہ آئی تو میں نے کہا، کربا اٹھ کر نہ لادو کھو۔ میں بھول چکا رہ گیا۔ سامنے وہی کھڑی تھی۔ مٹا ہے اسے کوئی اور نہیں مانتا۔

میں اکثر اپنے آپس کے کام کے سلسلے میں دوسرے پر جاتا تھا۔ وہاں زیادہ سے زیادہ وقت بسر کرتا اور خوب سیر و تفریح کیا کرتا۔ اب دوسرے پر جانے کا آرڈر ملا تو مجھے کوئی فریاد نہیں ہوئی۔ کلب ہی سے گئی رہی۔ تمام وقت یہی سوچتا رہا کہ وہ دوسروں کے ساتھ رہے گی۔ چنانچہ اس بار وہاں میرا ہی نہ لگا۔ اچانک اچانک سا رہا۔ اس لیے جت سے پہلے ہی وہاں چلا آیا۔ آتے ہی جانے کہ جہاں کے قوت اس کے گھر جا رہا۔ میری توقع کے برعکس وہ گھر ہی نہ تھی۔ مگر یہاں پہنچ رہی۔ میں نے بے چینی کے عالم میں اسے کہا کہ تو پھرت پھرت کر رہے گی۔ گویا میرا کائنات ٹوٹ گیا ہے۔ یہ دیکھ کر میرا دل بچھڑا گیا۔ میں نے جہاں بوجھ کی تفصیل نہیں ہو سکی، پھر چند دن صبر کیا تو وہ نہ اپنے گھر ہی اور نہ کلب میں۔ مجھے اس کی ضرورت کے ساتھ کھلاست ہونے لگی۔ البتہ ایک مرتبہ وہ کلب میں تھا جہاں پہنچی ہوئی تھی۔ وہ پریشان تھی۔ میرے ساتھ چلا جاتا کرتے پر...

ہاگ مکان نے اسے مکان فوری طور پر خالی کرنے کا نوٹس دے دیا ہے۔ اس مکان میں دوسرے سے رجسٹرڈ تھی۔ اس کے ایڈوائس کی رقم بھی کم تھی اور گریہ بھی۔ اب اس کے پاس اپنی رقم نہیں تھی کہ زیادہ کرائے پر دوسرا مکان لے سکے اور ایڈوائس کی بھاری رقم دیا کر سکے۔ یہ کہہ کر وہ خاموش ہو گئی۔

اس کے چہرے سے بے قراری ظاہر تھی اور گڑھی گڑھی پہلو بدل رہی تھی۔
یوں معلوم ہوتا تھا جیسے وہ دیکھ کرنا چاہتی ہو۔ میں نے گریہ تو خرابیل گئی۔

”آپ اکثر سرکاری دورے پر جتے ہیں، آپ کا مکان خالی رہتا ہے۔“

میں نے ہاں میں ہاں ملائی تو شاید اسے اپنی بات کہنے کا حوصلہ ہوا۔

”اب تک میرا کوئی دوسرا بندوبست نہیں ہوا۔ کون نہ آپ کے ہاں

آجائیں۔“

میں نے اسے اپنے اور اس کے درمیان مجلس ایک سورا سجا۔ مگر اگلے ہی لمحے ایک ذیلی سناپ کی طرح میرے ذہن میں دھجک گیا۔ اگر کسی کو پتہ چل گیا کہ ایسی بڑی میرے ساتھ رہتی ہے تو لوگ میرے بارے میں کیا ماننے قائم کریں گے۔ میں سوچنے لگا۔ اس دوران وہ بے چینی رہی اور جنس نظروں سے لکھے گئی رہی۔ سنا لکھے اس ذیلی سے سنبھالا جا کہ اس بڑے اور معروف شہر میں کون کسی کی کھوج لگاتا ہے۔ میں نے اس شرط پر ہی بھرنی کہ اس سے ملنے میرے ہاں کوئی نہیں آئے گا۔ وہ خوشی خوشی رہی ہوگی۔

جب وہ میرے گھر آ گئی تو میں نے اسے جانے کو کہا اور اس نے جینا کوئی نہ کرنا چھوڑا۔ وہ روزانہ صبح سویرے اٹھ جاتی، جب ہفتہ خیر کر لیتی تو لکھے اٹھاتی۔ میں کہا دھو کر واپس آتا تو میرے کپڑوں پر استری کر بھی ہوتی۔ میرے چار ہولے کے بعد میرے ساتھ ہی باقی کرتی۔ لکھے تاکہ کرتی کہ کھانا باہر کھانے کے ہالے گھرا کر کھاؤں۔ میں دفتر کے لیے اٹھتا تو وہ بھی میرے ساتھ ہی کھنا چلی جاتی۔ سہ پہر کو دفتر سے لوٹتا تو اسے

پہلے کا طریق برداشت کر لو تو مجھے باہر نہ جانا پڑے۔"

اس کی نگاہ پر میں نے سوچا کہ اگر گھر کی دیکھ بھال، منگنی سخری اور کھانا کھانے کے لیے کئی مہینے رکھا جائے تو اسے خاصی رقم دینی پڑے گی۔ جب میرا دل بھر جانے کا تو اسے کال پر گروں گا۔ اس لیے میں نے اس کی بات مان لی۔ پھر وہ گھر کا تمام کام خود کرنے لگی۔ منگنی کرتی، کھانا پکاتی، اپنے کپڑوں کے ساتھ میرے بھی دھوڑاتی۔ سخری کوئی بڑے گھر کو قریب سے رکھتی۔ اپنے گھر کی اس تھوڑی سی میں مطمئن رہتا۔ بڑی ٹھنکے ہوئے ایک مرتبہ وہ مجھے لے کر ایک ڈیپارٹمنٹ اسٹور میں جا کھسی پھر وہ تیاں دیکھنے لگی۔

"میں نے لپے لریہ رہی ہوں؟" میں نے عدم افسردہ سے پوچھا۔

"تمہارے پاس چند تیاں ہیں جو تم باکھتے رہتے ہو۔"

"لیکن پیسے۔۔۔" میں نے اسے گھبراہ میرے انداز میں اس خیال کے تحت جو تیاں پہنے گئیں کہ وہ اب بھی کسی کے پاس تو نہیں ہوتی۔ اس نے طمانیت سے جواب دیا۔

"تم بردارہ فریق کے جو پیسے دیتے ہو، انہی میں سے پانچا کر کے دے۔"

"کی کہ رہی ہوں؟"

"ج"

میں مطمئن ہو کر جلی غائب کرنے میں اس کی مدد کرنے لگا۔ اب میں دفتر سے سیدھا گھر آنے کا قصد کیا۔ کب جا رہی تھی وہاں دفتر سے آتے وقت میں نے اس کے لیے ایک ساڑھی خریدا لی۔ گھر پہنچ کر جب ٹیکٹ اسے لکھا تو اس نے سخری طرف سوالیہ انداز میں دیکھا۔

"بھی تمہارے لیے لائیں؟"

"میں نے ٹیکٹ کھلی کر ساڑھی آپس تو ہے تمہارا ٹول ہوئی۔"

"گنتی خوب سوت ہے" وہ اٹھا کر کہنے لگی۔

"تم پر خوب ہے گی" میں مسکرایا۔

"تمہاری پسند بہت اچھی ہے" اس نے اہمیت سے کہا اور اس کی طرف
دبھو آئی۔ میں نے اسے لاپس سے لپے تک تھری گاہوں سے دیکھا تو اس نے آہستہ
سے اپنا سر ہٹوے گاٹھے سے نکال دیا۔

اس کی ساری ضرورتیں پوری ہونے لگیں تو وہ مگر سے باہر صرف کھڑے ہو کر
گنتی۔ اس نے مجھے کسی شکایت کا موقع نہ دیا۔ میرا دل بھی اس سے نہ اٹکوا۔ اس وقت
آٹھ بجی کی طرف گزر گیا۔ دفتر میں کام زیادہ ہونے کی وجہ سے ایک روز میں خاصی دیر تک
بھاگا۔ پھر سواری نہ ملنے سے تمام بجے گھر پہنچا۔ وہ دو بجے پر گھڑی بھری ہوئی تھی۔
گنتی۔ مجھے دیکھتے ہی سہارا دیتی ہوئی مگر کے اٹھنے لگی۔

"آج تم نے بہت دیر کر دی"

"آں ہاں" گنتی نے مجھے جھٹکنے لگے میں جواب دیا۔

"میں گئی پر تمہاری خاطر رہی۔"

"تم نے انتظار سے اتنا کرکھا، کھا لیا ہوا"

"بھئی۔ بھلا تمہارے اندر کیسے کھاتی۔"

میں کچھ نہ کہنے لگی اور وہ ہاتھ دھو کر آیا تو وہ کھانا سے ہاتھ لگی۔

"چاہیں پھر چوری تھی۔ کہا تمہارے یہاں کھانا سے پچھلے کھانا"

میرے دماغ میں کئی غور سے کی گنتی کی اور سواری کھلی۔ کینڈم کا نور ہو گیا۔

"تم نے یہ کھانا ہے کہ میں تمہارا حضور ہوں۔"

"ہاں"

وہ میں گنتی نے اسے دیکھا تو اس نے مجھے کے ہاتھ دھو کر مگر سے باہر نکلا اور گنتی

ان نے کسی طرح قدم باہر نہ نکالا۔ میرے چلانے پر لگا کر اٹھے گی۔
 "اچھا مت ڈرنا۔ چوٹی کھینکے کہ ظالم شوہر، بیوی کو مار بیٹا رہا ہے"
 اس بات پر میں لٹکے سے وہ پیمانہ ہو گیا۔ میں نے اہانت پیتے ہوئے کہا۔
 "تو نے میری ہمدردی کا یہ صلہ دیا"
 میرا سانس پھول گیا تھا، میں اسے لاکھن مارنے ہوئے اس پر دھاوا کر۔
 "بھلا بیوی میرے گھسی ہوتی ہے؟"
 اب اس نے مجھے کب نظروں سے دیکھا اور وہ مجھے کبے میں کس اکٹا پر پھلا۔
 "اور کبھی ہوتی ہے؟"

بوڑھی راہبہ

"ہیلو۔ ہاں میں بول رہا ہوں۔" فون کی دوسری طرف خاموشی تھی۔ منہ ہانپتا تھا یہی سنے فون آن تو کیا تھا لیکن شاید اسے میری آواز نہیں پہنچ رہی تھی۔ لوگ اکثر کال میں بس یہی فریابی ہے، خاص طور پر جبکہ دوسری طرف موبائل پر بات سنی جا رہی ہو۔

"ہیلو۔ ہیلو۔ آواز آرہی ہے۔ ہیلو۔"

کافی دیر بعد وہ بولی۔ "ہاں آرہی ہے۔"

"تو بولتی کیوں نہیں۔ جواب دو۔"

"درا تو ہے۔" تبھی مجھے صاف اندازہ ہوا کہ مزاج گرامی بگڑ گئی۔

تھی۔ میرا دھیان فوراً میری بیٹی کی طرف گیا۔ ضرور اسی نے اسے بتایا کیا ہوگا، بڑھتی کی طرح۔

"کیا بات ہے۔"

"بگڑ گئی۔" اس نے ایسے کہا کہ میں نے تکیل کی آنکھ سے صاف دیکھا کہ

مذہب جالے فون کو کان سے لگائے نہیں تھی۔ میری بیٹی ضرور سو بھٹی ہوگی۔ ورنہ آپ تک وہ ضرور ہاں کے ہاتھ سے فون پھینکنے کی کوشش کرتی کہ اسے بھی بات کرنے دی جائے۔

"اس کا فون آیا تھا۔" اس پر آواز چھی ہوئی نہیں تھی، اب اسے ہی تھی۔

"بس لا۔" میں نے کہہ خیراگی سے پرہیز۔

"اسی لا۔"

"اسے کس کا۔" مجھے سمجھا ہٹ ہونے لگی تھی۔

”بہاری سبکی لا۔“

”بہاری۔“

”ہاں۔ جس کے ساتھ تم آج گئی۔۔۔۔۔“ اس سے آگے وہ چکوتہ کر چکی اور یہ لک جاسکتی ہوگی۔ میں البتہ اصل بات تک پہنچی گیا۔ ”میں تمہارا انتظار کر رہی ہوں، وہاں تم۔۔۔“ اس کے بعد لاشن کٹ گئی۔ نہیں ہاں نے فون بند کر دیا۔

میں وہ دن سے رات سے نہیں ملا تھا۔ ضرور اس نے میرے کارڈ پر لکھے موبائل نمبر پر فون کیا ہوگا تاکہ فون تو پاکستان ہی میں تھا، بہاری وہی کے پاس۔

رات سے میری ملاقات باہل اٹھا کا ہوئی۔ میں بس گروڈا سے گونے گاواں ہانے والی بس میں بیٹھا تھا جو لکھے گروڈا کے کیٹ کے باہل سامنے سڑک پر لگی تھی۔ وہاں واقعہ اس سٹاپ تو نہیں تھا لیکن مقامی انتظامیہ نے خاص گروڈا سوشل فورم کے اجلاس کی سہولت کے لیے یہ بس چھانی تھی۔

وہ لوگوں کے کلام میں رات جاتے ہوئے بخاری سے بس میں سوار ہوئی اور میرے ساتھ والی سیٹ پر بیٹھ گئی۔ میں نے اپنی جگہ پر سر نہ مڑا کر اس کے چہلے کے لیے جگہ چالی تو اس نے میری طرف دیکھا اور اشارے اور یہاں وہیں وہ سڑکوں کا چوڑا کنارہ وہ گروے سیاہ پائوں اور سیاہ آنکھوں کے ساتھ کوئی مشرقی لڑکی لگی تھی۔

کچھ دیر بعد اس نے میری کمر میں پاستہ چھپا کر دیکھتے ہوئے پچھا کہ میں اولڈ سوشل فورم کی میٹنگ میں آیا تھا۔ میں نے ہاں میں سر ہلایا۔ میں نے بھی اس سے پچھا یہاں ہی سوشل پچھا تو اس نے بھی ہاں میں سر ہلایا اور اشارے اور یہاں بات کرنے کی ایک دیر اور نکال رہی تھی۔

کچھ دیر تا سوشل کا چوڑا روپ۔ بس میں سوار ہوں گا وہی بہت زیادہ تھا۔ میں نے

اس سے پوچھا کہ وہ کہاں سے آئی ہے۔ تو وہ بولی ٹکڑے سے۔ تمہی تو بھین کی کھوپڑی
میں بند کر لیا گاؤں میں رضا کار کے طور پر کام کرتی تھی۔

”تم بھین سے ٹکڑے ملائی کام کرنے آئی ہو۔ میں نے خاصی خدمت کے طور
اس سے سوا کیا۔ اس نے خاص چھینوں کے انداز میں کہہ سے اپنا کر بولیں اور
اور بھری خدمت سے کھولا ہوتے ہوئے سکرانی۔

”رضا کارانہ کام سے مراد کہ پھر گولہ کے۔“ میں نے ایک ڈال کاٹ لیا
تعلیق نقصان کے پکڑوں میں ابھی سوچ کے ساتھ کہا۔

”ہمیں دو رہنے کی جگہ دیتے ہیں۔ بجی کھار کھا، جی دیتے ہیں۔ ہم یہاں
ایہاں میں جا کر لوگوں کے ساتھ کام کرتے ہیں۔ اس کی کام ہے۔“

میں نے اس کے چہرے پر کام سے حیرت ہوتے ہوئے اس کی طرف توجہ
کی۔

”ہم یہاں انکی دست کی حیثیت سے اٹھتے ہوئے ہیں۔ لیکن اصل انکی
دست تو تم جیسے لوگ ہیں۔ ہمیں بے غرض اور ہاؤس میں واقعی تم سے بہت حیرت
ہوئی۔“ میں نہیں جانتا کہ میں واقعی اس کے انکی دست سے لیا اور حیرت تھا ہاں کے با
تھکانہ اور کھنگرے سے، پاس کی طرف بھرتی سے ہاں ایک ہاتھ اور بھی تھی جو لگے ہاں
کھینچی رہی تھی، اور وہ اس کی دل سو لینے والی رہا، سکرانہ تھی۔

لیکن دو بھری ڈسٹ سے واقعی بہت حیرت ہوئی۔ اس تھی مجھے سکی ہاں کی
آنکھوں میں اچھٹے لگے پھولوں کی لپک لپک ہوئی۔ اس نے بے غرضی سے اچھڑا
نقشہ کی پشت پر لگا لیا اور نہیں لیا، سولہ اور اپنا ہت کے انداز میں لگے سے ہاں
کرنے لگی۔ اس نے بھرتے ہاتھ میں پوچھا۔ بھرتے لگے۔ بھرتے کام اور بھری زندگی
کے ہاتھ میں۔ ہاؤس لگا کے ہاتھ میں ابھی کرنے لگے۔ وہ ٹکڑے کھینچی اور بھرتے

عروں کے بارے میں بتانے لگی جو اس نے دیکھے تھے۔ لکھے یہ بات ہم نہیں ہو رہی تھی
 رہے اور اپنا ہند آیا تھا۔ یہ ملک ہند تو مجھے بھی تھا ہے لیکن ایک یورپی لڑکی کے اس کے
 نے ہند کی کے جذبات میری جگہ سے باہر تھے۔
 "اڑیا کو تم لوگ کیسے دیکھتے ہو۔ ایک جہالت کا گڑھ۔"

"جہالت تو ہر جگہ ہے۔ یورپ میں بھی ہے۔" اس نے ہلکے سے کندھے پر ہاتھ
 میں نے اسے اپنا کارڈ دیا اور بتایا کہ میں یہاں کوئی ہلتا ایک مزید غمروں کو
 میں نے اس سے کارڈ مانگا تو اس نے ہلکے سے کندھے پر ہاتھ دیا۔ "کارڈ کارڈ نہیں ہوتا۔" وہ
 اس کی پشت پر سر ٹکائے اور اسے ہلکا سا سوز سے میری طرف دیکھتے ہوئے مسکرا رہی تھی۔
 میں تازہ اور کھلے مسکراہٹ جو اس کے وجود سے باہر نکلتی اور آس پاس کے مٹھروں کو
 سمیت اپنی لپٹ میں لیتی محسوس ہوتی تھی۔ میں نے اس سے کہا کہ میں اس کی مسکراہٹ
 بھی نہیں بھولوں گا۔ میری اس بات سے وہ لکھے نہیں کرتے ہوئے وہ شرمناک۔ ایک
 یورپی لڑکی کو اسے قریب سے ہیں شرماتے ہوئے میں نے بھی نہیں دیکھا تھا۔
 میرا خیال ہے یہ وہ لڑکی تھی جس نے اسے شرمناک سے ایک گروے تھکن کی
 شرمناک کی صورت اختیار کرنی۔

اس سے لگتے ہوئے اسے کہہ کر کئی لڑکیوں کے لڑکیوں میں تو لکھے کا کارڈ ساتھ
 میں نہیں تک تھا۔ میں نے اس سے ہاتھ ملاتے ہوئے قورے کی انداز میں کہا "اس
 ہار نہیں کے۔ میں تو اس کا وہ میں ہوں گا۔"

میں تو اس لڑکی کی گنت لے کر وہ تو وہ لکھے ہلکے ہلکے سے ایک طرف کڑی دکھائی
 دی۔ اس کے دوست اس کے ساتھ نہیں تھے۔ وہ لکھے ہلکے ہلکے سے وہ لڑکیوں کے پاس
 گنت لپٹے دکھائی دیے۔ ہم دونوں کے وہ لڑکیوں ہلکے سے مسکراہٹ کا چہل چلوا اور اس کے
 پاس پہنچ کر میں کہہ سکتے کی شرمناک کے قورے میں نے کہا "میں بھی اس کی تو نہیں ہوتی اور دکھائی

پھر سے مدد ملے گی۔" وہ پھر سے مسکرائی۔

میں نے اس سے پوچھا کہ وہ کہاں ٹھہری ہوئی ہے تو اس نے ٹھہری ہوئی
 قریب گاؤں پہنچا۔ پھر مجھ سے پوچھنے لگی کہ کیا وہاں جانے کی ٹرین ایک بجے
 ہی ٹرین سارے شیشوں کو ہاتی ہے۔ وہ تو خیر اس ملک کی رہائشی تھی، میں تو اس ملک
 زیادہ اچھی تھا۔ ایک ریلے کا ملازم میرے قریب سے گزرا تو میں نے اسے سہل سہل
 تھما دیا۔ پتہ چلا کہ ایک ہی ٹرین میرے اور اس کے مظلوم شیشوں تک جاتے گی۔
 "تم یہاں کی زبان بھی جانتے ہو۔" اس نے غولگول حیرت کا اظہار کرتے
 ہوئے کہا۔

"ہم ایک ہی زبان بولتے ہیں۔ لیکن کہتے سیکھی ہیں کہ یہ الگ الگ ہیں۔" ہم
 میں نے پتہ لگایا کہ یہ سب اور روکا پیکا لٹریچر اور اسے پٹانے لگا کہ یہ سب
 سہل سہل ہے۔ اگرچہ ان کے ہاتھ لے دلوں میں سے ہاتھ کے پھاگے ہوئے
 ہم اٹھ گھنٹہ پہنچاں ایک ہی ہے۔

ٹرین میں ریل بہت تھا۔ مجھے جگہ ملی تو میں نے اسے چھینے کو کہا۔ وہ نہ نہ
 رہی۔ دوسری ساری ساری اس گھر سے جاڑ آجگی اور انتظار کر رہی تھیں کہ اگر میں
 نہیں چلتا تو ان میں سے کوئی بیٹہ جاتے۔

میں نے اسے کہا کہ "اسے تم ملازم ہی کہو لیکن صورت کے لیے جگہ یاد رہے
 پھر وہاں میں سٹیشن کھا جا رہے۔"

"پھر بھی تم کہتے ہو کہ یہاں جاتے ہے۔" وہ پھینٹے ہوئے ہوئی۔

پھر وہاں کے ساری کی ساری اسی تو میں لگی بیٹھ گیا۔ راستے میں تم
 اسی میں ہو گیا۔ زیادہ تر وہ کڑی سے ہاتھ کے مظلوموں سے دیکھنے میں مشغول رہا
 جبکہ میں اس کے جسم کا لمس نہ کر سکا۔

یہاں وہاں ہر جگہ ہدایت پڑھنے کی کوشش کرتا رہا۔ آہستہ آہستہ ساریوں کا دل اگا
 ہوا گیا کہ ایک صورت مرد کی تیز کے بغیر ایک دوسرے سے لگے کڑے تھے۔ بہت سی
 لگے اگے میں ساریوں کے کھلانے کے لیے لوہے کے کٹے والے ٹھوس تھے۔ جسے
 غروت سے لیا اور گاڑ دیتے تھے ہوں۔ بعد کے دنوں میں ریل میں سڑک کے دوران تھے

علاقوں ہوا کہ ہر شے میں ہزاروں کی جی صورت تھی۔
 پہلے چڑی رولا کا شاہ آیا۔ ہم نے ہاتھ ملایا اور وہ بچے اتر گئی۔ میں کڑی
 کے پاس ہو کر اسے ہرے ہائے دیکھا گیا۔ پھر مجھے اپنا ہی خیال آیا کہ لگے میں چڑیا
 لگے ہاتھ لگنا چاہیے جس پر میرا اور میرے لگے کا نام لکھا تھا۔ میں نے وہ ہاتھ کر اپنے تھے
 میں دیکھا۔ اب میں آس پاس ہونے اور ہجوم کا حصہ تھا۔

وہ وقت سوشل فورم کے ارتقا کی تھک گئی ایک رات میں گئی تھی۔ پوسٹوں تو ہنگ
 اور کانفرنس ہاں تھے جہاں سارا دن مختلف ملکوں کی نظموں کے شعور ملاحظہ ہوا
 یہی ہوا۔ کانفرنس ہوتی تھی۔ ایک ہائے گراؤ میں سو سے زائد پھولی پھولی کانفرنس
 تھی۔ اگلیا پھر کے گھانوں سے آرامت۔ اور پھر کھانا سستا ہی بہت تھا۔ چند روپے کے
 تلف لیکن میرا دل لگے ہائے پانڈی کی بیٹ میں نے کیا جو بہت ہلکے ہونے کے
 ہاں ہوا کہ سے ہونے نہ کھائی گئی۔ پھر کسی کی کانوں پر کھلی لڑائی تھی میں میں
 جگہوں نظموں نے اپنے شان لگانے ہونے تھے۔ دست کاری کے نمونوں کی مثال ہوا
 ایک تھی۔ ایک بہت ہائے ہاں میں لڑائی کے شان تھے۔ لگے ایک سے زائد ہاں لگے
 ہیں تمام ہائے کی تھیلی ہر کرنے تھی۔

سب جگہ کے قریب اب میں ایک جاہلی طالب علم ہنگل دست سے یہ ہنگل کر
 ہاں تھا کہ میں کو دیکھ رہا ہی کالی تھا۔ یہ کیونکہ وہ آگیا تو میں یہ ہاں تمام ان کے
 بھیجے۔ ساریوں کے خلاف غروت لگانے کے ہونے میں تمام کو لقمہ کرنے کے لیے

نعرے لگانے پانچیں جو بلی جیسے کردار پیدا کرنے کا باعث بنتا ہے تو مارنا مجھے دکھانا
 رہی۔ وہ اسی نکل دہلی ساورہ جنور اور فی ٹرٹ میں ملیں تھی۔ بال اہت اس کے گل سے گھر
 انداز میں ایک نئے کپ کی حد سے یوں بانٹھے ہوئے تھے کہ ہندو برہمنوں کی پہلی کی
 طرح پیچھے سے اگرتے ہوئے معلوم ہوتے تھے۔

"تختے سال سے یہاں ہو۔" میں نے کافی کا کپ فریہ کر اسے تھمایا۔ خواجہ
 لیے میں نے ایک غلظا مشروب لیا جو نامعلوم کس شے سے بنا تھا۔ لیکن اس کا ذائقہ
 اہلے کے شربت جیسا تھا۔ ہکا ہکا سا کھانا تھا۔

"پارہاں سے۔"

"واہیں تھیں نہیں گئی۔"

"ایک بار گئی تھی۔" اس نے کھڑے اپکانے اور مجھے غسوں دیا وہ ان سواہوں کو
 بہت سہجی سے نہیں لے رہی تھی۔ جیسے وہ کبھی تھی کہ میں بس چوٹی کوئی نہ کوئی بات
 کرنے کے لیے ہی یہ سب بکو پچھ رہا ہوں۔ حالانکہ مجھے واقعی اس کے بارے میں
 جاننے میں دلچسپی تھی۔

"تمہارے گھر والے کبھی تھیں میں ہیں۔"

"ہاں ہے۔"

"ہاں ہیں بھائی۔"

"پہ لکھتا۔" اس نے گدی چھڑ کر میری طرف غور سے دیکھا۔ جانے کیا
 دیکھا۔ مگر بولی "تو سال پہلے تک کبھی تھیں میں تھے۔" "بھائی اور ایک ہیں۔ لیکن تھیں
 ملے رہتے تھے۔"

"گور تمہارا باپ۔"

"پہ لکھتا" وہ بچوں جیسی دلی ہوئی اور ساورہ ہی آواز میں اگرتے۔ اگرتے۔ اگرتے۔

پہلے ہوتی تھی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ بعض لوگوں کے لیے اپنی وطنی کا اعتراف کرنا
 سہل ہوتا ہے۔ اسے یہ مان لینے میں کوئی عار نہیں تھا کہ وہ اپنے وطن کے بارے میں
 کچھ نہیں جانتی تھی اور یہ کہ اسے اس میں کوئی خاص دلچسپی بھی نہیں تھی۔

جب پہلی بار میں نے صورت کے مشرقی اور مغربی تصور کا ہام موازنہ کیا۔ صورت
 ریشمی کے دھاگوں سے گھڑی ہوتی ہے۔ انہما سے اس کا مہاندرہ بنتا ہے اور اگر یہ نہ
 رہتا تو وہ بھی بگڑ جاتی ہے۔" یہ ہے صورت کے بارے میں نکارا مشرقی تصور۔ لیکن نکارا
 غیر موزوں ہے اگر اس سے ایک مغربی صورت کو بچھنے کی کوشش کی جائے۔ مانا کہ تو اس
 میں کوئی دلچسپی نہیں ہے کہ اس کے بہن بھائی کہاں اور کیسے ہیں۔ وہ دنیا میں ہم جیسی جگہ
 سے رشتوں کے تجربے کرنے نکلے ہوئی ہے۔

جس تیزی سے مشرقی صورت مغربی صورت کے تعلق میں آ کے بڑھ رہی ہے اور اس
 کے اچھٹے میں داخل رہی ہے، وہ وہاں دور نہیں ہے جب ہمیں اس کے بارے میں اپنی پرانی
 مشرقی دانش کو ہارنے کا طاق رکھ کر نئی بیڑی لگانا پڑے گی۔ نکارا مشکل ہوتا ہے سب کچھ
 کے سرے سے شروع کرنا۔ خاص طور پر جب ہمیں یہ پتہ چلے گا کہ اب تک ہم روپ
 صورت کا ہمارے سامنے تھا اور تو بھاری ہی تراشا ہوا تھا۔ آپ ہی ایک چہرہ بنا کر اسے دیا اور
 بھر یہ سمجھا کہ یہی سچا ہے۔ نکلی کتب بات ہے۔

وہاں ایک مثال کسی ٹورسٹ کمپنی نے بھی دکھایا تھا جو غلط انداز میں سوچنے کے
 کہ آپ کو ایک دن میں کتنی شہر کی سیر کروانی تھی۔
 "تم نے کتنی دیکھا ہے" اس نے مجھ سے پوچھا۔
 "نہیں۔ تم نے۔"

"نہیں۔"
 ہم دونوں نے وہاں کا سفر کیا۔ سچے سچے گروہ کے تو ہمیں نے نہیں دیکھیں تھے

اور ہدایت کی کل مساجد ہم اندھیری سٹیشن پر پہنچ جائیں۔ وہیں ان کی بسوں کو بیٹھائیں
 ہوں گی۔ سایہ گہرے ہو رہے تھے جب ہم نہیں گراؤنگ کے گیٹ سے باہر نکلتے ہیں
 سٹیشن پر پہنچ کر میں نے اس سے کہا کہ وہ کھانا میرے ساتھ کھا لے۔ ہم سڑک پر
 گروڈ سٹیٹن پر اتارے اور مارکیٹ کی طرف چل پڑے۔

ہزار خوب ہے ہوئے تھے، اونٹے اونٹے پلانے پلانے پلا صبا صبا کی جوتیا کی گز
 لیکن پھر بھی سارے میں مجھے ایک طرح کی نراغے پن کا سایہ سا کھلی رہا۔ مجھے
 میرا منہب اور ترقی یافتہ ہونے کے باوجود یہ پھر اس اکثر فون، طوطی اور شپ ہاؤس
 محرم تھا جو ہم میں کسی اہلانے برتری کے احساس کے تحت بدادہ اتم موجود رہتا ہے۔
 "انڈیا سے تم لوگوں کی کیوں نہیں بنتی"۔ اس نے ایسے ہی ازراہ گفتگو کہا۔
 "جگ پنے کے بعد وہ کافی خوشگوار سوز میں تھی۔

"تم لوگوں سے تمہاری کیا مراد ہے۔ میری تو خوب بنتی ہے۔ میرے ملک کی
 حکومت کی جہاں تک بات ہے تو یہ لیے تھے ہیں۔ انہیں چھوڑو۔"

اس نے پھر سے کندھے اٹکائے اور مسکرائی جیسے کہہ رہی ہو کہ اچھا چھوڑو۔
 "تم کیا کرتے ہو اپنے ملک میں۔"

"کچھ خاص نہیں"۔ یہ میرا تیسرا ایک تھا۔ میں اچھے سوز میں تھا اور سوجا ہوا
 کتاب اس سے لیا وہ نہیں۔ اس نے وہ کے بعد ہاتھ کھینچ لیا تھا۔

میں نے اٹکھا وہ بہت شور سے میری آنکھوں میں دیکھ رہی تھی۔ کچھ دن بعد
 نے سر میں لہرے لہرے سے حرا لیتے ہوئے کہا "کیا دیکھا۔"

"کہتے آپ آؤ۔ وہ ہالی اور میں نے سوجا کہ اس سے کہیں ہم ایک ایک جگ
 لہر لیتے ہیں۔"

"لیکن مجھے اب آپ تمہاری آنکھوں میں لہر نہیں آ رہی۔"

اس لیے کہ جسیں شاید پڑھ لی ہے۔
 ہم دونوں نے قہقہہ لگایا۔ میں نے سوچا زندگی کبھی بھلا کیسے اچانک اتنی خوشگوار
 ہو جاتی ہے کہ بچپن نہیں آتا، کبھی یہ سچ بھی رہی ہوگی۔ مجھے اس کا اپنے سامنے بیٹھے ہونا،
 پہچانی ہو جانا، یہ سب کچھ بہت یادگار لگ رہا تھا اور مجھے صاف محسوس ہو رہا تھا کہ یہ
 سب کچھ بس اچھی کے اچھی ہے۔ اس کے بعد پھر ایسا کچھ بھی باقی نہیں رہے گا۔

اسم نے بتایا کہ "تو کچھ اور خاموش رہنے کے بعد اچانک ہوئی۔
 "سہی" لیکن مجھے یاد آ گیا کہ وہ کیا پوچھ رہی تھی۔ "میں کچھ بھی نہیں کرتی۔ بس
 ایک رسالہ لیکٹ کرتی ہوں، کہانیاں لکھتی ہوں اور اب واپس جا کر ایک کام کا اور اضافہ ہو
 جاتے گا۔"

اس نے آکھوں کو ہلکا سا بچ کر مسکراتے ہوئے جس کی نگاہ مجھ پر ڈالی تو میں
 نے کہا "جسیں یاد کروں گا"۔ یہ کہتے ہوئے مجھے اپنا دل بہت بھاری محسوس ہوا۔ میں نے
 اتنی مایوسی کی بات کیسے کی۔ میں یہ سب کچھ سوچ تو نہیں رہا تھا۔ یہ بات کہیں میرے
 اندر کنڈل مارے چھپی بیٹھی تھی۔

انگلے دن میں کوئی آدھ گھنٹہ پہلے ہی اندھیری چلی گئی۔ وہ مجھ سے کبھی
 پہلے وہاں ایک طرف بس سٹاپ کے ٹیڈ میں بیٹھی ہوئی تھی۔ یہ تھا کہ ہمیں اگلی ہی
 آکھوں کی اور شاید ہمیں آنے میں کچھ دیر بھی ہو جائے۔ ہم اندھیری کی سیر کرتے رہے۔
 یہ ہمیں کا ایک معروف شاہجگ ایرو اور بولی وا کے ستاروں سے دکھنا ہوا ایک روٹھی علاقہ
 ہے۔ ہر طرف مایشتان شاہجگ سٹرو اور مار کھینچیں ہیں۔ ایک بگ بگ کھادی کپڑے کے ٹیوسٹات
 کا بہت بڑا سٹور تھا۔ درجک ہم اس میں کپڑوں کو ہاتھ لگا لگا کر دیکھتے رہے۔ وہ خاصے
 ستے تھے۔ وہ ایک ٹریس لکھے ہندھی آئیں۔ جن میں سے ایک تو میں نے پہن کر بھی
 دیکھی۔ لیکن اسے خریدنا نہیں۔ بس ایسے ہی کوئی فیصلہ نہیں کر پایا۔ جن جن دن گزر رہے

تھے۔ جب بھی ہوتی جا رہی تھی۔ والٹن بس سٹاپ کی طرف آتے ہوئے اس سٹاپ کی
پکٹ پھری طرف بلا حیا۔ اس میں کھادی کپڑے کی ایک ٹرٹ تھی۔ وہی تھی جس سے
پتہ چل گیا تھا۔

”جس میں ابھی گئی تھی۔ بلا رنگ مجھے پسند ہے۔“

میں نے سوچا پھر یہ ادا کروں لیکن پھر خاموشی رہا۔ بس سٹاپ پر کھڑی ہو کر
اس سے کہوں وہ وہاں اسی دکان میں تھیں۔ میں اسے کچھ فریج کروا چاہتا تھا۔ یہ بات
کچھ عجیب تھی۔ کم از کم تمہیں شکر یہ تو ادا کرنا چاہئے۔ میں نے اپنے آپ سے کہا
وہ کہہ کر ادا کر دیا۔ ”بلا رنگ مجھے بھی پسند ہے۔“

تو سبک ہم بس میں بیٹھے مینٹی کی سیر کرتے رہے۔ ایک لاپٹاپ بائک میں لکھی
کرتا اور وہاں سے دکانی اپنے وہی ہم بچوں کے بارے میں میں بتاتا رہا۔ اس کی
پھر یہی خاصی گفت اور عام تھی لیکن پھر بھی اس کی بات پوری طرح سے ہر کسی کو گوی
آ رہی تھی۔ جو کہ پارک میں بس کوئی آواز نکلتی تھی۔ اس نام کی ایک فلم بھی میں دیکھ چکا
تھا جس کی کہانی اسی پارک سے آغاز ہوتی تھی۔ لیکن یہ بارے اور کے ہر بارے سے
زیادہ جاہل نہ ہوگا۔ اس کی وہ شہرت ایک تو یہ تھی کہ یہ سائل سمندر ہے واضح ہے وہ
اس کی یہی طرف معروف ایکٹروں کی کلبوں میں ہر نام کو عام طور پر آپ کو پائی وہ
کے لٹاواں سارے یہاں پہلے تھی یا جو تک کرتے دکانی دیکھتے ہیں۔ نام اس وقت
جب ہم وہاں پہنچے تو وہاں سے دکانی نہ آیا۔ ہم جیسے کچھ ہلتر ہلتر رہتے وہی اور اور
مذہبت کر رہے تھے۔

ہم وہاں ایک ٹاپ کے۔ ایک ہی وقت میں ہم اس جگہ پہنچے کہ اب وہ
سیر کی خواہی سہانی نہ ہائے گی۔ سو ہلتر ہے اس کو ہائے اس لیکن جب گائیڈ نے بتایا
کہ لٹاواں سہانے گاہے تو ہم نے اپنے اپنے بل لیا۔

یہ سوال سنا دے ایک لمحہ چنگ پٹا ہے۔ ہم نے جوتیاں اتاریں اور گئی
 رات پور تک چلے گئے۔ راتے میں ایک گھوگے سے میں نے اونٹ کے لاکٹ والا
 دھوتے پہ لپا جو گھے کافی سوال کیا، صرف ساٹھ روپے میں۔
 "کیا ہے؟"

"بہت خوبصورت۔"

"تمہارے لیے ہے۔" میں نے اس کی طرف پار دیا۔

"اگر یہ۔" اس نے پار پھینکا تو شاید اس لیے کہ میں نے اسے جھٹکا دیا تھا، وہ

اس پر بہت ہنسا۔

"یہ تمہیں میری پار دلائے گا۔"

"تم لوگ بیٹھ لکی حتی باتوں کے بارے میں کیوں زیادہ سوچتے ہو نہیں
 ہیں ٹھیک انداز کرونا چاہیے۔ ہم جتنی دیر ساتھ ہیں کم از کم اس وقت کو یہ سوچ کر فریب نہ
 کریں کہ چند دن بعد یہ سب جگہ نہ رہے گا۔ کل کس نے دیکھی ہے۔"

"ہاں یہ بھی ٹھیک ہے۔" میں ہنسا دیا۔

بھاری بس کب کی جا چکی تھی۔ پورے گھروں میں سویرا سرخ ہو کر ڈوب رہا
 تھا۔ جڑو مینٹی والوں سے کچا کچا مہری بولی تھی۔ یہ لال کلاں گھرانوں کی یہاں کا لباس
 سے صرف تفرقہ گاڑ ہے۔ رات گہری ہونے لگی تھی جب ہم چاندنی میں لہائے ہوئے
 اس وسیع اور صحرا آسا سطر سے پار گئے۔

میں جوں دن گزار رہے تھے اور لے سوشل فورم کے اجتماع میں لوگوں کا جھم جھم
 رہا تھا۔ سو اگلے دو دن اس سے ملاقات نہ ہوگی۔ میں اپنے گروپ کے ساتھ مختلف
 سرگرمیوں میں مصروف رہا۔ دوسرے دن شام کو میں نے گھر فون کیا تو چہ چلا کہ بارش کا
 فون میری بولی نے ملا تھا۔ اس سے اگلے دنوں میں بارش آکھش کے باوجود میں گھر سے

رہا نہ کر سکا۔ فون شاید مستقل طور پر بند کر دیا گیا تھا۔

انگے دن میں نے اپنے گروپ کے گاؤنٹر سے اڈڈا پتھر پر ایک سے ڈال دیا۔
 اور دن بھر میں مختلف اوقات میں اعلان کر دیا کہ مارنا نامی جیتی خاتون کا شادی کا دن ہے۔
 وہ گاؤنٹر سے رہا کرے۔ شام کو میں نہایت باہمی کے عالم میں سری لنگا کے گروپ
 کا ستای رقص دیکھ رہا تھا۔ جب مجھے مارنا کی آواز سنائی دی وہ گاؤنٹر پر موجود تھی۔
 "میں جانتی تھی یہ تم ہی ہو۔" چلتی ہوئی آنکھوں کے ساتھ وہ بہت خوش ہوئی
 اسے رہی تھی۔ میں نے معاملے کے لیے ہاتھ بڑھایا تو وہ تیزی سے آگے بڑھی اور میری
 سے بٹھکی کر ہوئی۔

"تو تمہارے پاس نہیں ہے کیا؟"

"نہیں۔"

"میں نے۔۔۔"

"مجھے پتا ہے۔ تم نے مجھے فون کیا تھا۔"

"کوئی خاتون تھی۔"

"بھری بیوی۔"

"توہ میں نے ہی سے کہا کہ میں تمہاری دوست بولی رہی ہوں تو شاید۔"

"مجھے اپنا لکنا دکھا دو تاکہ اسکا گم ہو جاو تو نہیں دھوڑ سکوں۔"

وہ ایک دو سٹیپوں کے ساتھ ہوئی کے ایک کمرے میں غمگین ہوئی تھی۔ سارے
 ہی ہوئی، مختلف برائی ملکوں کے لڑکوں لڑکیوں نے ہنسنا دیکھا تھا۔ بہت تلف باحوال
 تھوہوں۔

"تم کلکتہ میں لوگوں کی خدمت کرنے چلتی تھی اور میری نہیں ہو جاتی اس کام
 سے۔ کیا تم خوش ہو؟"

”جین میں نہیں لوں گی۔“

”کیوں۔“

”ابھی نہیں لگتا۔“

”کیا کرتا۔“

”میں اس طرح کچھ لیتا۔“

مجھے اس کی یہ بات اچھی نہ لگی۔ میں نے اسی کی طرح کندھے اٹکائے تو بچی پار مجھے احساس ہوا کہ اس انداز میں فقط بے نیازی کی ادا کار فرما نہیں ہے جیسا کہ میں سمجھتا رہا تھا۔ بلکہ بچی بچی خنکی اور بے زاری کا مٹا جلا تاثر بھی ملتا ہوتا ہے۔

”میں اس کے پیسے دوں گی۔“

”تو کیا تمہارا خیال ہے میں تمہیں مفت دے رہا ہوں۔“

”سکرانی“ سچے۔“

”اگلی دن ہوں۔ پہلے یہ ممکن کر دو لگتا ہے کہ پورا بھی ہے تمہیں کہ نہیں۔“

کچھ دیر بعد کہہ کر وہ بچی کو آئی تو میں نے کہا ”تمہیں بہت اچھا لگتا ہے۔ اسے پتہ رکھو۔“

”سچے کا ہے۔“ اس نے کاغذ پر کھڑے سیکڑے سے پوچھا تو اس نے تاپا کر مل کر ہوا چکا ہے۔

”مجھ سے کہتے لیا ہے تو پہچانی جگہ ہی وہ سیکڑے میں کا کیا تعلق ہمارے سوائے سے اس کے بعد اس نے بھی مجھوں کی طرف کوئی بات نہ کی۔

میں سڑک پار کرنے کے لیے فٹ پاتھ پر کھڑے ٹریکنگ ٹیکسٹ ہیز ہو جانے کا انتظار کر رہے تھے۔ وہ اس کا تھکے لگے سہارے ہی محسوس ہوا۔ میں نے گریٹ بھرا کر سرخ ٹیکسٹ کو دیکھا اور پھر اس کی تھک کی تو مجھے اس کا تھکنا معلوم ہوا۔ اتنی کہ وہ میرے

مٹے سے مٹا چکے ہوں گی۔ وہ بچوں کی ہی مصیبت بھرے شرارتی احوال میں جوئے
 سے سزا دی اور بار بار بچوں کے دل لوبی ہو جاتی تھی۔
 مجھے گاؤں کے ہاں پکے ختم ہو گئے تھے۔ وہ کتابوں کی لڑائی گاؤں میں مختلف
 پہلوؤں اور ہیبت سے حلقہ کتابوں کو جوئے اشتیاق سے اٹھا کر دیکھتی۔ وہ ان کی ہیبت
 پہن کر ہر چہرے پر غامب لہاس کا ہنر لاتے ہوئے ایسے دہلیس شہاب میں رکھ دیتی
 تھی۔ مجھ سے وہ مزہ کوئی تھو نہیں لے گی، اس کے مجھے علم تھا۔ اس نے مجھے بتایا کہ وہ
 بڑھن آتی تو ضرور میں ہی جاتی۔

”اس ختم مذہبی ہوا۔“

میرے اس سوال پر اس نے کہا تھا ”ہر انسان مذہبی ہوتا ہے۔“

”لیکن پھر بھی فرق تو ہوتا ہے۔“

”ہاں ہوتا ہے۔ کبھی بہت مذہبی تھی لیکن اب ایک عام انسان ہوں۔“

”تو کیا مذہبی لوگ عام انسان نہیں ہوتے۔“

”ہوتے ہیں لیکن صرف عام انسان نہیں ہوتے۔“

”یعنی ان سے بہتر ہوتے ہیں۔“

”ہاں۔ مختلف ہوتے ہیں۔“

تب پہلی بار وہ مجھے مجلس ایک عام لڑکی نہ گی، جیسا میں اسے سمجھا تھا۔ مجھے
 اس میں ہوا کہ یہ پورے گاؤں پر چلنے کے مختلف ہوتے ہیں، اسے ہی راج ہو گی۔ اپنے ہی
 کسی سے نہیں کھلتے۔ کسی سے اپنا دل کھولنا ان کے لیے کسی کے ساتھ ہوسکتی کرنے سے
 بھی زیادہ اشتیاق برتنے کے لائق بات ہوتی ہے۔

پھر میں کہنا ملا کہ میری بہتے کی عادت نہیں ہے، میں نے اس سے کہا

”مذہب انسان کو محدود نہیں کرتا کیا۔“

"مجھے تو نہیں کیا۔" اس نے کندھے اچکائے۔

"شاید مذہبی آدمی اس لیے عام آدمی سے مختلف ہوتا ہے کیونکہ عام آدمی انسانوں میں سے نہیں رہتا۔" میں کبھی نہیں جان سکا کہ اس سے ہمراہ طلب کیا تو کبھی بھی کہ نہیں۔ لیکن اسے میری بات پسند نہیں آئی۔ شاید اسے لگا بھیجے میں اس کے سامنے میں ہائے اسے رہا تھا۔ اس نے خاموشی سے میری طرف دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں دلچسپی کی سفیدی دکھائی دی اور ہلکی ہلکی باتوں کے اور اپنے درمیان مائل بچنے کا اشارہ۔

"کیا تم مذہبی آدمی نہیں ہو۔"

"نہیں۔"

"تو پھر کیا ہو۔"

"پہ نہیں۔"

یہ میرا اس کے ساتھ آخری مکالمہ تھا۔

مختلف سوشل فورم کے اجلاس کا آخری دن ہمارے گروپ کا بھی اختتام ہوا۔ دن تھا۔ لیکن گروپ میں عظیم الشان روحانیت منتقل ہوئی۔ اسی جہاز کے گنگ جگنگ ٹوک ہوا موجود تھے۔ میں سارا دن اسے اور گویا رہا اور سوائے بارے کو سناٹا کرنے کے اور کئی کئی اور کاموں سے نہ ہوسکا۔ لیکن وہ مجھے نہیں ملی۔ اس کے گروپ کا ہی کوئی فرد وہاں تکھاں رہا۔ وہ گروپ کے ساتھ نہیں تو نہیں جلی گئی۔ مجھے خیال آیا اور میرا دل تیزی سے تھک تھک کرنے لگا۔ یہاں تو وہ مجھے ضرور ملتی۔ کل ہی تو ہم ساتھ تھے۔ اسی جہاز کے ساتھ ہل چکے ہیں۔

عام گروپ میں تھا۔ کیا تو مجھے خیال آیا کہ وہ پہلے پہل ہی تھی۔ کیا میں نے اس کو مل دیکھا تھا۔ کوئی بات یہی تھی تو وہ مجھے برا بھلا کہہ سکتی تھی۔ خاموشی سے وہاں بیٹھا ہوا تو اس کا دل نہیں تھا۔

دائم آباد

بہت سے پہلازی سوزا نونے کے بعد کوئی جونی انکے اپنے علاقے کی طرف
 میں داخل ہوتی، اس کی بے گلی بڑھ جاتی۔ وہ فوراً کڑکی کا شیشہ پورا کھول دیتا۔ ہاں
 ہوا میں سرشار ہوتے ہوئے سانسوں میں سانس لیتی ہوئی زندگی دھیرے دھیرے اس کے
 سانسے دھڑ میں پھیل جاتی۔ وہ جس طرف بھی دیکھتا کائنات کی دستوں کا پر پھیلاؤ
 اپنے وجود کا حس محسوس ہوتا۔ دائم آباد رہنے کی خوشی حد سے بڑھتی تو وہ آنے والا پروا
 کھتا سے پہلے ہی نونو جاتا۔

کوئی رنگ جاتی تو وہ وہیں رکھا ہوا رہتی کہ وہیں کا وہ اپنا جسم اٹھا کر رہے
 کے اس نئے ہماری غم سے سے کہ جاتا۔ وہ زندگی کے سن کی ہتوں میں محبت کا کوئی
 تھا۔ اور کہا کرتا تھا کہ زندگی کا تسلسلہ حاصل محبت ہی کی ہے کا ایک سلسلہ ہے۔ "محبت
 کے واسطے میں اس کا خیال تھا کہ یہ وہاں میں تھکتی پانے والا ایک لائق جذبہ ہے۔ ان
 کے وہی نئے لوگ ہوتے ہیں۔ بہت ہی افضل، عظیم لوگ۔ وہ اپنے عظیم لوگوں کی
 باتیں کرتے ہوئے اکلڑا ہوا ہوتا اور اس کی آنکھیں نم ہو جاتیں۔ مگر اگلے ہی نئے
 ایک سگراہٹ اس کے ہوتوں پر پھیلی ہوتی۔

وہ اکلڑا کہا کرتا "آج میں اس لوگوں کی باتیں کرتا ہوں۔ کلی کوئی اور انجلی یاد رکھ
 رہا ہوں۔ یہ زہرہ لوگ ہیں۔ زندگی کے سن میں یہی ہوئی خواہو جیسے لوگ۔"
 لوگ اس سے اس کی اپنی محبت کے واسطے میں سوال کرتے تو وہ خاصا سوال دیتا۔
 کہتے ہیں ایک محفل میں کسی کے بے حد صبر پر اس نے کہا تھا

”حسن کے اندر بھی ایک حسن پوشیدہ ہوتا ہے۔ ایک حسن ایک اور حسن کا پتہ دیتا ہے۔ اور یہ ایک انتہائی سلسلہ ہے۔ تم مجھ سے وہ سوال کیوں کرتے ہو جن کے جواب دینے کے لیے میری عمر کافی ہے۔ تم میرے ساتھ میرے پاس بیٹھے ہو اور میں تم سے بیجا تمہاری خوبصورتیوں کے رنگوں کو اپنی دنیاوی کے پرتو سمجھ رہا ہوں۔ تم سب میری بہنوں کے تم سب سے محبت ہے۔“

جب سوال کرنے والے نے کہا

”خدا بخشنے تمہارے ماں باپ کا اخلاق، سلوک اور برہانہ لوگ آج تک یاد کرتے ہیں۔ تمہاری عاجزی، انکساری اور محبت کے نئے رویے تک تو بات ٹھیک ہے، مگر تمہارے لہجے میں سو کی ایک کک نہ ہانے کب کہاں سے شامل ہو گئی۔“

اس نے ایک نظر سوال کرنے والے کی آنکھوں میں مھاٹکا اور کچھ کہتے کہتے کہ کیا۔ پھر اس کے بعد اس نے عام لوگوں میں اٹھنا بیٹھنا بہت کم کر دیا۔ اب وہ وہاں بھی گاؤں آتا اپنے بہت قریبی عزیزوں، رشتہ داروں سے ملنے کے بعد گاؤں سے دور بیٹھوں میں آباد اپنے ان رشتہ داروں کے پاس پہنچ جاتا جو اسے دیکھتے ہی کھل اٹھتے۔ وہ بات گئے تک اس کے ساتھ بیٹھتے۔ مضمون حوصلوں، کمرے بندوں اور گئی ہاتھوں کے ہاتھ کی باتیں کرتے۔ صاف نیلے آسمان پر پھیلے ہوئے غباروں کی چمکڑیاں ملاتے ملاتے اچانک کوئی بزرگ بات بدل رہے تو سب اس کی بات میں اپنی اپنی باتوں کی کڑیاں بھرتے چلے جاتے۔ (موراگر، ہارے، دھیں، وہی تکی، بن کھار کی اچھی فصلیں، دان دانہ بسم اللہ کی برکت، اپنے شعلے، صاف سفید پوشاکیں)۔ وہ سب اپنی اپنی باتیں کر رہے ہوتے کہ اچانک کوئی ایک اپنے باپ دادا سے سنی ہوئی ان کے باتوں کی بات کرتا تو گویا سب کی آنکھیں ایک ہی جگہ کے نور سے بھر جاتیں۔ وہ بہت دور چمکتے ہوئے ستارے بھی ایک دم جتنے جتن آسمان کے وسط میں آجاتے۔ اب وہ بے اختیار اپنے جسم کی

خوبرو

دن کی کی بندگی کی طرح یہ گئی اگرچہ بند نہیں تھی۔ اس کے آگے میں سے
 ہائیں اور دائیں دونوں جانب اور تھیلوں کے دروازے کھلتے تھے اور میں اسٹاپ کیا۔
 چھٹی میڈیوں بھی تھا جس میں عام طور پر گلی کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے لگے ہوئے
 ہیں تو جہاں بھی کرکٹ اور کبھی ہاکی کھیلنے نظر آتے ہیں۔ ان میدانوں کے کھیلوں پر
 پتے بھاری نیم کے درخت بھی جنہیں موما کہتے ہوتے جانور سے ڈانسنے کی اہلیں
 کرتے عام طور پر ان میدانوں میں کون کرکٹ بھی کھرا رہتا ہے کھیلنے والے بھی کھلا ہوا
 کھیل کے دریلے صاف کھیلنے میں کامیاب ہو جاتے۔

آج بھی وہ بھر اور کھڑکی کی کڑی رکاوٹوں کا جوتا مسکرا کر نظر آ رہا ہے۔
 قریب کچھ سے پہلے ہی وہ گھر کے کھلے دروازے میں داخل ہوا۔ چلتی اس وقت کی وہ
 میں دروازے کے میں سامنے موجود تھی۔ وہ قدم کے بعد میں نے اپنے گیت کا گانا
 اور گانے میں جگہ جگہ کر سون کا سانس لیتے ہوئے جوتے پہنتے ہی جگہ ہم
 دروازے ہو گئی۔ گیت سے لے کر اب تک کی ساری فلم میرے انداز میں گون رہی تھی کوئی خاص
 اور ان کی بات نہ ہوئی اس وقت آج کامیاب میں حالات کی سبب چلتی اور پھر سے
 تو بھی میرا فکد تھا وہی۔ فکد یہ کوئی خاص بات نہیں۔ یہ سون کر چیل میں نے اس سے
 ہلکے اور ہلکے پتے کے بعد میں تھوڑی اور سون چلتی تھی۔ یہ بھی کجبات بات ہے کہ
 ہائے خیر ہلکے کے لیے چتے ہیں اور میں تھوڑے خیر کے لیے اس ٹکڑے کو استعمال کرتی
 ہیں۔ خیر کرنے کے بعد کھانا کر معمول کے کام کو میں مشغول ہو گئی۔ کچھ عرصے

کے کام ہوں میں خاص دلچسپی نہیں رہی۔ بھری دکانی اماں کہا کرتی تھیں۔ نہ کھو چتا یہ
 کام کرنے ہنستے ہیں اور جب یہ آئیں بھی نہ اور کرنے بھی نہیں تو بڑی مشکل ہوتی ہے
 ۔ آج کل میں سے کچھ سے دھرتے ہوئے ڈرائنگ کی اسٹاک کرتے ہوئے کئی کاماں
 پہن کرتے ہوئے بھی بات میرے کانوں میں گونجتی رہی۔ یہ سارے کام مجھے عموماً تھا
 اپنے لیکن رات آغوشِ مادر کی طرح مجھے اپنے اندر سمیٹ لیتی تھی مجھ کو ہوتے ہی نئے سرے
 سے معمول کے مطابق چار ہوا ہشت بٹاتا۔ کچھ کتابیں دیکھتا، بکھری اشیاء کا ترتیب دیکھتا
 پھر ایک اپنی کرسی لگا کر گلی میں آجاتا اور پھر اسی خورج پیرے کا سامنا ہوتا وہ کوئی اتوار
 اور دن نہیں تھا۔ مگر اس گلی میں دوست سے آگے اور ہاتھ اس کی بھی نہیں بھی پائی
 طرح میں جلتی تھیں۔ کھتا ہوا چہرا اور مہذب انداز لی شرت اور بیچو یا غلو کہتے یہ سب
 ادا، بچتے تھے۔ میں اکثر ایک گلی میں سے کرسی لگاتی اور وہ مجھے دیکھ کر مسکراتے
 ہوتے سلام کرتے میں جواب سلام کے ساتھ ساتھ اس کا مال چال اور گھر والوں کی خدمت
 میں ضرور پہنچتی ہوں کا جواب وہ عموماً سب ٹیک سے ہاں ہی کہہ کر دیتا اور مشاہدہ حزل
 کی طرف بڑھ جاتی۔ رکشے لے کر کالج چلی سارے وقت کا انتظار کرنے لگی۔ جوتے ہوا
 کلاس روم میں وقت سولہ بجے لڑکی کے سوال نے مجھے ہٹا دیا کہ سلام آج کل کے
 لوگوں کی صحبت کا کھار کون ہو جاتے ہیں۔ میرے دماغ کی فری میں اسی کی قسم گہم
 لگی۔ کہیں کہ جتنی ہستی کے کچھ تو جوں اس گلی میں اس کے پاس بھی کڑے ہوتے۔ کچھ
 کی وقت اس سے قورے تھک ہوتی اور کچھ تو اس کا تھنا ہوتے کھڑے ہو جاتے۔
 پھر لڑکی کے سوال کا پھر جواب دینے سے تیار نہ ہو جاتا تھا وہ اس کی
 کج تربیت نہ ہوتی اور گولے پھول کا سارا کھڑ نہ ہوتا نہ جانتوں کو بڑی صحبت کا کھار
 دیتا ہے اس کے گھر میں کھار دیکھ کر کئی بات نہیں تھی۔ میں اپنی دکان میں کھڑے کئی ایک
 دوسری بھینوں کی رکن ایک کامیاب ڈاکٹر تھا۔ چالی برس کی عمر میں تھیں تھے۔ عموماً اس

کہیں سوچتی تھی۔ اس کا جواب محض یہ تھا کہ اس پوری گلی میں ایک ہی تھا جس کے ہاتھ
 میری سلام دعا تھی اور وہ ویسے بھی اکثر مجھے اپنے منگے بچے کی طرح معلوم ہوا تھا۔
 نے ہاتھوں سے ہلا تھا اور اب میں اس سے بہت دور تھی۔ محض خط و کتابت کے سلسلے
 تعلق تھا۔ آج بھی پارسی بچے پر سامنے کے بعد وہاں اچھائی ملاف ہو رہا تھا۔ سڑکوں کے
 کہنے پر جانے کا ایک کپ بچا اور گھر کی طرف دوڑی گئی کہ آج مجھے بہت سلسلے
 ملتا ہے۔ کچھ سلائی اور کچھ شاپنگ اور پھر صفائی بھرتا بھر کی مٹا دیکھ رہی تھی۔

اور پھر ایک سٹاک شروع کیے ہوئے میون بھر گزر گیا تھا۔ سوچ رہی تھی کہ سلسلے
 کام کرنے کے بعد کچھ کمپنوں کی۔ رکٹ کرنا کہ بازار کی طرف گئی کپڑے کی دکانوں سے
 موسم سرما کے لیے چند سوٹ خریدے اور پریشان رہی کہ قیمتیں کس طرح آسمان کی طرف
 گور رہا ہیں۔ میں ڈیڑھ دو ڈیڑھ شاپنگ کرنے کی عادی نہیں جو نئی ضرورت اور شوق کی
 تکمیل ہوئی گھر کا رستہ دیکھا۔ آج بھی چند اور ضروری چیزیں خرید کر رستے کی طرف توجہ
 ہوئی۔ بڑے شہروں کے غراب بھی بڑے ہوتے ہیں۔ مارکیٹ گھر سے اس قدر دور ہے
 کہ آپ اسی کھانے میں جہاں سے غافل چلے جائیں گھر رستے وہاں پھر بھی بڑا دانا
 ہوتے ہیں اور میں ڈیڑھ میں گھر کے اگلے ہونے کا سون کو سلیمانے لگی۔ سب معمولی گارڈ
 رکھنے والے کو دیکھتے ہی میں نے ایک کی لپ کھولی اور ساتھ ہی قدم بچے یا عیلا۔ پہلی نظر
 ہی اسی تھی کہ اس کا چہرہ بچے اور گھسے لڑکوں میں چمکا نظر آیا۔ وہ ان سے شاید ابھاری
 گھبرات کہ رہا تھا کہ ان کے سر سے وہ چار قدم بلا جاتے ہی وہ تینوں لڑکے لگی کے چلے رہے
 کی طرف بڑھتے گئے۔ وہ میری طرف منکراتے ہوئے بڑھا اور سلام کرنے کے ساتھ
 ساتھ ہی پوچھنے لگا۔ آج آپ مارکیٹ کی تھیں۔ میں نے انہماک میں جواب دینے ہونے
 اس سے گویا کہیں کچھ نہ کہتا تھا وہ شرماتے ہوئے لگی میں سر ہٹا کر بولا نہیں ایسی تو کوئی
 بات نہیں ہے۔ میں نے ساتھ ہی اپنے دل کی بات اس سے بوجھ دیا۔

مجھے تو اسے بھلا سے دانت ہیں؟ تمہیں ان سے کھن نہیں آتی؟ نہیں آتی بھلا تو سنی
 کرتے ہوئے یہ دیکھا جاتا ہے کہ کپڑے اور شیشیں اچھی ہوں ویسے یہ میرے کلاس ٹیچر بھی
 چاہتے ہیں اس کے اس منطقی جواب سے تسلی تو نہ ہوئی مگر میرے خیال میں ایسا کچھ نہیں تھا
 کہ جس کے لیے اس سے کوئی سخت بات کی جاتی۔ میں ساری گفتگو کو بھول کر کام کانا
 میں مشغول ہو گئی۔ یہ وہی وہی وہی مسالہ بیچ کی دہرا رہ کر پڑی ہو کر چلائی تو چاہا کہ میں
 اس سے معذرت ہوں۔ اس کا ہوش کی طرح ایک ہی ٹکڑا تھا۔ کبھی ہماری طرف بھی آئی تم
 کہیں کسی سے ملتی نہیں۔ اب اسے کون تائے کہ یہ من سدا کا پیرا کی جو کہ تھا اس اور خود
 میں مشغول رہنے والا ہے۔ یہ بھلا کہاں سے گی مام یا نہیں پھروں کہنے کے لیے کسی کے
 گھر جانے اور ویسے بھی یہ ہمسائیگی بڑی لمبی اور تنگ برداشت کرنے کا نام ہے جو کچھ جیسا
 یہاں صفت ہوا نہیں سکا۔ میں نے اسے اگلے پلٹے آنے کا کہہ کر حال دیا اور وہ چسکن
 ہی ہو کر نیچے اتر گئی۔ میں آخر میں سوسا سٹائی کا کام مٹا کر فریج صاف کیا کرتی تھی تاکہ
 باغیوں استعمال ہونے والا انکون ساں جائزہ نہ لے کر فریج کا دروازہ کھولتے ہی نہ جانے
 کیوں دل کے اندر کوئی گڑبڑ محسوس ہوئی۔ جیسے کوئی نہیں طاقت مجھے اپنی طرف متوجہ کرتے
 ہوئے کچھ خاص کرنے پر مجبور کر رہی تھی۔ میں کام پھوڑ کر فیض کی کتاب لے کر چلی گئی
 گھوم کر رہا تھا کوئی خاص اور ہی آ رہی ہے۔ خیال چمک کر کتاب میں لو ہو گئی۔ ابھی
 چھ کھینے بھی نہیں گزری ہیں ہوں گے کہ باہر کی میں بلا چاہا اور کھلی کھلی آ رہی جیسے
 زندگی کے جس سے اچھے والی طرف لڑو آ رہی اور قہقہوں کی قہقہ تو انکی محسوس اور ہی
 تھی جیسے لوگ ہاؤں سے چتر ہاتھ کر چل رہے ہوں۔ میں نے دل کی دھڑکن میں اور ہی
 کی تسلی صاف ہی تھی سب تو یہ دل جیتے سے اور آ رہا تھا تھا۔ اراکھ کی چھوٹی کوزی
 جو میں گل میں کھلتی تھی۔ اسے کھوا تاکہ صورت حال واضح ہو سکے۔ ابھی وہاں ہالے کمر
 کے دروازے کے سامنے مورتوں۔ جہوں اور مردوں کا وہم نظر آ رہا۔ کھلی کھلی مٹھی اور کسر

پھر بھی زندگی کی بندگی میں جسمانی تشدد کے باعث ہوا کرتا ہے۔ میں نے سنا ہے کہ
 وہ کرتے ہوئے ان بے انقلم آوازوں کی طرف کان لگا دیے اور سوچنے لگی۔ وہ تو سنا ہی
 نظر آئے تو گیت پر جا کر پوچھوں کہ کیا معاملہ ہے؟

اس کا دلیر مر باپ یا ماں تو کہیں نظر نہیں آ رہے تھے مگر اسی اٹار میں پہنچنے
 کے کئی جہان دلوں کے غم سے لگاتے ہوئے گئی میں سے گزرتے۔ وہ نوجوانوں کو نہیں
 نے پکارا تھا۔ یہ تو وہی میلے گندے لڑکے تھے۔ کیا یہ وہی تھے؟ میں اپنی یادداشتیں کھینچ
 کرتے ہوئے سوچا۔ ہاں یہ وہی ہیں اب میں گیت کے پاس گزرتے ایک لڑکے کا ہوا
 دینے میں کامیاب ہو گئی۔ میں نے اس سے پوچھا جتنا یہ کیا معاملہ ہے؟ کیا ہو گیا ہے۔ یہ
 سب ٹیک کہیں تھی ہے۔ وہ خوف زدہ سا حیرت آمیز سا میری طرف دیکھے بغیر بولا۔ آپ کو معلوم
 نہیں صاحبزادی ہو گیا ہے۔ کون صاحبزادی نام کو میں نے نکلی ہارنا تھا۔ یہ آپ کے بھائی
 والوں کا بیٹا لڑکا نہیں؟ انکڑ سا سب کا بیٹا جتنا میں نے دھڑکتے دل سے پوچھا۔ اس
 نے غصہ جواب دیا کیا وہ صاحبزادی تھا۔ میں نے خود سے سوال کیا؟

ہاں ہو سکتا ہے کہیں کہ میں اس کا نام صرف مشوری بنا تھا۔ یہ سوچتے ہی انکڑ
 سے کئی جھل جھریاں سر سے پانوں میں آن چڑھی اور جیسے آسمان کا رنگ یک دم بگرا گیا اور
 جیسے بھاری کافر زندگی کا سیدھی ڈالے اور جیسے زندہ انسان کو لہر میں تار دیا جائے۔
 میری زبان پر صرف ایک لفظ تھا "اچھا" نہ جانے میں نے اس لفظ کو کتنی مرتبہ دہرایا تھا۔
 قصوری دہر کے بعد جہاں دوست ہوئے تو میں اس غم کی قصہ سنی کے لیے جانا چاہتی تھی
 اور پھر میں نے اپنے لباس پر پہننے کی فکر اٹھائی۔ کہیں کہیں سبز رنگ کے لٹھے لٹھے
 نکالیے ہوئے تھا۔ اسے اچھا لگنے کے لیے میں نے کالی ہار لٹاری سے نکالی۔ اسے ہار کا
 لہر آنے تک ہار میں ہاروں۔ چہ گئے گھر کی دیوار کے اندر قدم رکھا۔ اس کی ماں بگ
 پر بیٹھی ہوئے ہوئے تھی کہ سنی تھی۔ پورا تو جیسے ہار پہنا ہوا تھا۔ میں نے زبان سے

کہ لکھا گیا تھا کہ بہت سی عورتوں کے ساتھ چپکے سے بیٹھی رہی۔ حوصلہ ہی نہ ہوا کہ ہانک
 اچھوں انھوں نے خود ہی میری نظریں گھر کا ہانڈہ لے رہی تھی۔ وہ خوب اور زندہ چہرہ تھے
 بھی اگر کام کرے گا۔ تقریباً پانچ گھنٹے بیشتر کی طرح۔

ایک عورت کرے میں داخل ہوئی اور پوچھنے لگی۔ میں کیا ہوا لڑکے کو کس نے مار
 دیا۔ میں اس کے اس بے وقت سوال کے جواب کا انتہاء کرنے لگی کہ ایک اور عورت جو
 وہ کچھ لڑکے کے ساتھ بیٹھی تھی کہنے لگے۔ ہم صاب کوفن آیا ہے کہ گندے نالے کے
 ہاں ان کا جاتل کیے جا رہے۔ پولیس بھی بھیجی گئی اور لاش ہسپتال میں ہے۔ عاقل تو بچکا
 ہی گیا۔ میں خاموشی کے ساتھ آنسوؤں کی بارش میں باتیں سنتی رہی۔ وہ دن گزر گئے لاش
 کو وہاں ہی جاتل بکھڑے رکھے۔ غسل و کفن و تدفین ہو گیا۔ ماشاء اللہ دوستوں نے کہیں مار
 دیا۔ ہاتھیں کہنے ہیں کہ اس دن سے اوصاف لیا تھا لڑکی کا موطا ہے مگر اس قدر دھنکی کے
 جان لے لی جاتی۔ میں اکثر یہ سوچ سوچ کر پریشان ہو جاتی۔ میں روز بروز ان کے گھر
 اٹھنے کے لیے بھی نہ جا سکی اور پھر اس گلی میں جھانک کر خود لب تھا کہ جس میں خوبرو
 چہرے کو اس قدر بے ہوشی سے ختم کر دیا جائے۔ میں اکثر سوچتی دکھ میں بھی کیا دلچسپ لاش
 ہے۔ اس میں خونی ہڈی رشتوں کی پیمان لہیں رہتی کہ سب پہاڑا گلی نظر میں ہوتی ہے اس
 کے لیے گلی والی کے تمام دروازے کھلے رہتے ہیں۔ آج ہی شام میں سڑ پر لڑکا فون آیا وہ
 کہان ہانڈہ کا پتہ بتائی کہ اس کے زانی گھر میں جا رہی تھیں۔ میں نے وہی دن میں اپنی
 بہنو سہت لی اور اس گلی کی گلا کو کھانا کھانہ کہہ دیا۔

وقت کی دلیخ بڑھی نہیں ہوتی۔ پانچ سال بعد وہ ایک نئے والی سے کام آچا
 اس پہاڑی اگر پر دست آگیا اس گلی کی گلا پر نہ جانے کہیں میں چلا کر دست دیکھے کے لیے
 کہا۔ دیکھے وہاں حیرت سے میری طرف دیکھ رہا تھا اور دست دیک کر ہانڈہ کہ لی لی آپ نے
 تو آگے ہوا ہے۔ میں نے اس کی بات سننی سننی کرتے ہوئے گلی میں جھانکا ایک سالہ

پیشکش نوجوان فی ٹرٹ اور نئی جیڑ پنے ڈی۔ ۹۰ کے سامنے کھڑا مسکرا مسکرا کر کسی بی
 سے چہلیں کر رہا تھا۔ میں نے ایک راہ چلتے ہوئے نوجوان کو روک کر پوچھا۔ اس مکان
 میں اب کون رہتا ہے۔ اس نے سپاٹ لہجے میں جواب دیا۔ کوئی ایس ڈی اور چھڑا آئے
 ہیں۔ یہ سامنے ان کا لڑکا کھڑا ہے۔ آپ اس سے پوچھ لیں مگر میرے آنسو اس بات کی
 اہانت کہاں دیتے تھے کہ میں رنگی ہوئی آواز سے اس کی بات کا جواب دیتی۔ رکٹے
 والے کو اشارے سے چلنے کو کہا اور پھر آج تک اس نگڑ کی طرف نہیں دیکھا۔ کیوں کہ وقت
 خود کو دہراتا ہے۔



آخری خواب کی موت

میرے پاس لنگھوں کا کال پڑ گیا ہے۔ اور جو لفظ موجود ہیں وہ بھی بھوک سے
 ڈھل پڑے ہیں۔ ان کی استخوانیں سوکھ کر پھٹ سے جاگی ہیں۔ لنگھوں کے ترسے ہوئے
 پروانے سے گوشت جمل چکا ہے اور اب بد ذہن چہرہ لے لفظ میرا سراپا ہیں۔

میرے اکتھار کے طالبوں میں بیٹھی بھوک سے بے ہوش لفظ موت کی چاب
 بنے ہی کسی مختصر پتہ کاہ کی طرف رہتے تکتے ہیں اور اس لڑکی کی آنکھوں میں بیٹھی اداسی
 دانہ کے سارے کمروں میں بھر جاتی ہے۔ اتنی اداسی کہ خود اس لڑکی کے لیے بھی سانس
 لین مشکل ہو جاتا ہے۔ اور وہ بھی بکھڑوں کے لیے آنکھیں سوندھتی ہے۔

یہ آنکھوں میں بیٹھی اداسی اس کے اندر پار سے پھیلے گئی ہے اور جب آنکھوں کا
 احساس اس کے اندر بٹھ جاتا ہے تو وہ گری سے اٹھ کر میرے پاس آتی ہے۔

”تم زخمی رہو گے۔ آخر تم مرنا کیوں چاہتے ہو۔۔۔“ اچھکارت اس کے
 سانسے وجود کو بے بسی کے بھنور میں دھکیں اڑتی ہے اور وہ میرے مردہ ہونے لگوں
 پہ اپنے زندگی سے میرے طراوت آمیز لب دکھانا چاہتی ہے۔

”ہاں وہی تم میرے لگوں پہ اپنے کاہنے لب رکھتی ہو تو لگھتی زندگی مل جاتی
 ہے۔ لیکن اب تو سانسوں کی دکھنوت بھی ہے اور اگر یہ آنکھیں سننے، نہ لگا
 ہوتا تو اب تک تمہاری نرم، ہلک اور زندگی سے لبرح نکالیں میں چھٹی کھٹی
 کی رنگ رنگی پتلیوں کوٹ بھی ہوتی۔“

میں یہ سب سوچتا ہوں اور کہتا چاہتا ہوں مگر موت سے کبے ہوتے سزا
 ہوتے لفظ ہونوں تک کی چڑھائی چڑھنے سے پہلے ہی ہاتھ جاتے ہیں۔ اور کہتے ہیں۔
 اندر ہی گر کر گم ہو جاتے ہیں۔ یہ لفظ بھی کتنا جھوٹا اور بے معنی سہارا ہے اور بات کتنا
 کبھی مجھیری ہیں۔

بے چینی اس کے گلابی پاؤں کی ایسی جوتی ہے جو اسے کھاتی بھی ہے اور
 اسے اتار بھی نہیں سکتی۔ یوں لگتا ہے اگلے لمحے اس کی آنکھیں ہریاں بن جائیں گی اور
 سارا کمرہ ہلکے ساری دارا ڈوب جائے گی۔ حتیٰ کہ وہ بھی میں بھی۔ شاید کا یہ سہارا
 ٹوٹ جاتا ہے اور وہ رونے لگتی ہے۔ گویا جھیل کے پانی کو راولنگی سے ملنے لگتی ہے اسے
 سے ملنے بھی نہیں کر سکتا کہ مجھے ان لنگھوں کا ہی سہارا لینا ہے اور لفظ تو آنکھیں بند
 پڑے ہیں۔ بھوک سے ذرا حال لفظ لنگھوں پر ہاتھ رکھ کر بھی نہیں اٹھ سکتے۔ اور میں وہی
 اس کے آنسو پر پلٹے نکلتا ہوں کہ میرے ہاتھ زندگی سے خالی مراد پڑے ہیں۔ اب وہ
 میرے لہولہا ہونے کی بجائے اب بھی نہیں رکھ سکتی کہ ڈاکٹر میرے منہ پر آنکھیں بانگ چڑھا
 گئے ہیں۔ وہ ریلے ہونٹ جن سے میں زندگی کشید کیا کرتا تھا اب اس زندگی سے وہ
 دور ہوں۔

میرے ٹھنڈے ہاتھوں میں اس کی نرم انگلیاں الجھ جاتی ہیں۔ وہی نرم
 نازک انگلیاں اب میرے ہاتھوں میں الجھتی تھیں تو زندگی کی حرارت میرے سارے وجود
 میں دوڑ جاتی تھی۔ اور آج زندگی میرے ہاتھوں سے نکل کر وہاں سے کے ساتھ ہی کڑی
 ہے اگلے کسی لمحے وہاں سے نکلنے پر اسے کبھی کو جاتا ہے۔

اب وہ میری آنکھوں میں جھانک رہی ہے اور میری آنکھیں کہ بے جاں
 جگہ ہیں۔ میری ہاں مسرور ہوتی تو سب کی رضا کچھ کر اب نہیں بند کر دیتی۔ پائل ایسے
 ہی کہ اب میں مگر سے کبھی اور جاننے کے لیے نکل آتا تو کبھی کا سوز مڑتے ہی وہ گور کا

گلاب کا موسم

وہ گلاب کا موسم تھا۔

رات بھر گلاب طرب کا سینا زور میں رہا، لیکن پچھلے پیر کسی ہلکے ہارن آئے۔ تیار ہو کر دفتر جانے کے لیے باہر نکلا تو بجلی بجلی پھول چڑھی تھی۔ گاڑی کا سٹار کھولتے ہوئے نظر اچانک بولٹ پڑی۔ سرخ رنگ کا گلاب سفید بولٹ پڑا تھا۔ تھرا تھرا لہری طور پر اس نے لائن کی طرف دیکھا۔ اس کی بیوی کو سرخ گلاب بہت پسند تھے۔ اس موسم میں روز بچ وہ اسے سرخ گلاب توڑ کر دیتی، لیکن جب سے وہ افسانہ لکھتی تھی، لائن اڑا گیا تھا۔

”یہ سرخ گلاب۔۔۔“ اس نے سوچا، خیال آیا رات گھر آتے ہوئے چاک پڑی ہوں چپتے ہالے کی لڑکے اس کی طرف لپکے تھے، لیکن اس کے لٹی میں سرخ گلاب نہیں تھا۔ گاڑیوں کی طرف چلے گئے۔ شاید ان میں سے کسی کا بھول بولٹ کے برے پڑوا کی جالی میں لڑا گیا ہو۔۔۔ یہ بات ہو گی اس نے اسی زمانے سے سر ہایا اور گاڑی سڑتے گھر کے سڑک پر گھل گیا۔

ان بھر دفتر کے کاموں میں سوچنے کی فرصت ہی نہ ملی۔ تمام کو ایک جگہ کھانے پر بلایا تھا، وہاں دیر ہو گی۔ وہاں ہی چاک پڑی، صرف ایک ہی لڑکا بھول گیا، وہ تھا۔ اس سے پہلے کہ وہ اس کی طرف آ جا، اٹھ کر نکل گیا۔

بگھر دفتر کا افسانہ پڑھا۔ یہ اس کی پہلی ناول تھی۔ بچا چھوٹے بھٹا اور ہو جاتی۔ اس لیے افسانہ نہ جانے تمام کو گھرا کر لکھی اور میں بھی جانتی تھی، وہ

ایک کھال لیتا۔ کسی دن وہ سو رہا تو بستر پر لیٹے لیٹے ایک نظرئی وہی ہے ایک نظر اشہد
 ہوا جس سے ہوتی تھیں وہ ایک وقت اشہد بھی چڑھ لیتا اور لی وہی بھی اکیچ لیتا۔
 اس وقت بھی اشہد اور لی وہی دیکھتے دیکھتے نیند آگئی۔ صبح اٹھا تو طبیعت بد حال
 تھی، دیکھ کر کھانا کو کھانے کے کھانے کے بارے میں بتایا اور سب سے گاڑی کی چابی اٹھا کر
 پھر گاڑی لے گیا وہیں دیکھنے کے لئے ایک باہر۔ یونٹ پر سرخ رنگ کا گلاب مسکرا رہا تھا،
 مسکرا جا رہا تھا۔

سب سے پہلی وہ تھی وہ اسی طرح کھڑا رہا، دیکھنے سے پوچھا۔ "آپ
 کی طبیعت تو یک ہے۔"

وہ بولا۔ "ہاتھ پر پینے کی بندری کی کا احساس وہاں رہی تھی۔"

"یہ۔۔۔" اس نے یونٹ کی طرف اشارہ کیا۔ "گلاب تم نے دکھا ہے۔"

"نہیں تو۔۔۔" دیکھنے اس کے کھسے سے ایک کر یونٹ کی طرف دیکھا۔

"میں نے تو نہیں دکھا۔"

اسے احساس ہوا تو کر یونٹ کی طرف دیکھ رہا ہے، آگے بڑھ کر

اس نے گلاب اٹھا اور گاڑی کھول کر اسے اٹھتی بھرا دیکھا۔

ساتھ گھروں کی آگہوں سے گلاب کو دیکھا رہا، نگ رہا تھا جسے وہاں سے ہوا گیا

ہوا، پلٹر میں کام کرتے ہوئے بار بار گلاب سامنے آجاتا، اور پھر یک سرود سے چلنے لگا۔

اس نے پھر اسے سے سرود کی گلابوں مگھوا گئی اور ایک ساتھ وہ گلابوں پھانے کے ساتھ

پہا کر گھومتا آیا۔

دیکھنے سے دیکھا۔ "بھئی آگے ہی، طبیعت ایک نہیں تھی۔"

"ہاں، اس نے سرود۔۔۔" وہاں گاڑی میں اسے دیکھا ہے۔ کہ وہاں بھی

میں نے نہیں۔"

یام کو سوکر اپنی تو طبیعت بجاٹاں تھی۔ کپڑے بدلے اور گلاب کی طرف نکل گیا
 کی جان پہچان والے مل گئے۔ ہاتھ ہو گئے، کھانا بھی وہی کھایا۔

واپس پر دو تین چوکوں میں پھول بیچنے والے لڑکے اس کی طرف چلے گئے۔ ان
 نے ہر پار سر ہلا کر نئی میں جواب دیا۔ گھر سے پہلے والے چوک میں کچھ زیادہ روکا۔
 ایک چھوٹی سی بچی کھڑکی کی طرف آئی۔

”صاحب کی۔۔۔“ اس نے پھول اس کی طرف بٹھکانے، اس میں سر ہلا
 گلاب بھی تھا۔ بی جا پا کر پھول لے لے لیکن اس سے پہلے کہ کوئی ٹیبلٹ کر پاتا، اس
 نکل گیا۔

گازی پارک گرتے ہوئے اس نے اچھی طرح ہنٹ کا جانکر لپکا، صدارت کا
 نورانی آ گیا۔

”گرتے ہو چھا۔۔۔“ کھانا لگا دیا۔

”نہیں۔۔۔ میں کھا آ رہی ہوں۔“

بیلڈوم میں اظہار بڑی نکاست سے جب کیا سر ہانے پر واقعہ اس نے بی بی کو
 دیا اور اظہار پڑھنے لگا۔ اظہار فتم ہو گیا، لیکن بیلڈوم آئی۔۔۔ سرخ گلاب پار ہاں
 کے سامنے آ جا۔ سر ہٹ کر بی بی سکریں، نظریں جھانے کی آتش کی لیکن سرخ گلاب
 سکریں، لیکن اظہار آ۔۔۔ آہی سے زیادہ بات ہی نکلتی میں گڑبگڑی۔ غلوگی میں آگئیں۔
 بیلڈوم، غلوگی اور ہر چوک کر آگئیں کھولتے۔ بی بی سکریں، تصویریں دیکھ کر گئی تھیں۔
 سرخ رنگ کا گلاب اپنی آپ کتاب کے ساتھ چمک رہا تھا۔ اس نے کئی کھیل بدلے، ہر
 کھیل پر گلاب ہو جاتا تھا۔ آ کر بی بی کے گرد۔ سونے کی آتش کی، بی بی کچھ اور بیجا
 بھی گئی۔ آکر کھلی تو صبح نکلتی لباس اتار دی تھی۔ وہ جیسے کئی چھوٹی کھیل میں ہو جاتا ہے
 کی طرف جھانک رہا تھا۔ سامنے ہنٹ پر تازہ تازہ گلاب، سرخ گلاب۔

اس نے بیچائی انداز میں لپک کر گلاب اٹھایا اور زمین پر پھینک کر پاؤں سے
 لگا رہا۔۔۔ اسی لئے ایک سسکی سنائی دی۔ وہ سہاکت ہو گیا۔ معلوم نہیں کتنا عرصہ یہ
 بات رہی۔۔۔ یہ سسکی، اس سسکی کو وہ بھی نہیں بھول سکتا، رفعت کی ماں اچانک ہی تیار
 ہوئی تھی، اسے فوراً جھنٹی نہیں مل سکتی تھی، اس لئے طے ہوا کہ وہ اکیلی ہی گاڑی پر گاؤں
 چلی جائے، وہ دوسرے دن آ جائے گا۔ سب وہ گاڑی میں بیٹھ رہی تھی تو دیکھا اس سے
 اپنی گار اس کے منہ سے سسکی اٹھی۔۔۔ یہ سسکی۔

لیکن حیرت اور دکھ تو یہ تھا کہ اب تو وہ سب کہو جان لگی ہوگی کہ رات کو
 سولے سے پہلے اس نے انٹرنس کے ایلچ میں گاڑی کے اگلے پہیوں کے منہ ڈھیلے کر
 رہے تھے۔۔۔ ہر جگہ وہ۔۔۔!

یہ گلاب کا موسم ہے!



اور خان کمال

ترجمہ کرلی (۱) مسعود اختر شیخ

پچاس قروش

دوئی کے گالوں کی طرح صرف چاروی ہو، یا رات بھر کے کسبے کے ہونے
پانی کا بہت ہو چکا ہو، دو تھک سوسے ہارے سال سے پاٹا ہے اندھیروں کا طبل ہوا ہے
وہی مسدا کا گلی میں داخل ہوتا

"تازہ ایلہدازہ نمبر ۱"

میں پرکھ کر ہار بے اپنے تاپ داکٹر کے سر ہانے جا بیٹھا تھا اس لیے یہ ہندو، گلی
آواز عرف، ہارش اور کوسے کو لکھتی تھکے تاپ داکٹر کے سر ہانے آ پائی تھی۔ میں ہر دم
ہی ایلہد کے نام پائی ہونے کے ایک کونے میں رکھ دیا کرتا تھا تاکہ اسے میری جوت سے لکھ
تہ کرنا پڑے۔ آواز ملنے ہی میں گلی اسلے ایلہدے کی طرف بھاگتا۔ وہ پہلے ہی میرے
ایلیہد ٹھہر کر کے چار دکھتا۔ فوراً ہاتھ بٹھا کر میرے حوالے کرتا اور پیسے لے کر گلی
بیمب میں ایل لٹاتا۔ اپنی ٹھہر تاک سے اپنی ہوئی، ایک کی طرح بھاپ کے پل ۱۱
کڑائی، زونگی سے میرے مسدا کا گلی، ساری گلی کو مسدود کرتا اور چلا جاتا۔

"تازہ ایلہدازہ نمبر ۱"

اس کے کہنے کے مطابق اس کا والد کسی ایلہد کے ہلڑ میں جلا ہاتھ کی بھولی کا نام
کستے کستے کسی بدقولی دوست کی خاطر اپنا گھر بنا اور استھول چھوڑ چھاڑ کر ایلہد کی
دوسرے ٹھہر چلا گیا تھا۔ اس نے شروع شروع میں اس کی ماں اپنے تاج کو طرب اپنی ہوتی
لیکن پھر بعد میں اپنے تاپ کو وہی اپنی ہوتی۔

”اڑ گیا کری۔ اسے کوئی ہم سے بہتر نہیں ملے گی ہوگی۔ اللہ اسے مہارک کرے۔“
 جی بچے کہتے ہیں اس نے کربانہ گی اور قراچی کے ایک کیسٹ کے ہاں ملازمت شروع کر
 لی۔ وہاں اس کا کام ایک لمبی لٹری والے برش سے دھال کی بوتلیں صاف کرنا تھا۔ ان
 بوتلیں کی تعداد دو چار سو دو سو، یا ہزار دو ہزار تھیں بلکہ لاکھوں کے پھیر میں تھی۔ اگر اس
 دنوں کا کوئی طلبکار ہوتا تو ہائی اس مرے سے اس کی شادی کرنا چکی ہوتی۔ مگر اس کا
 کوئی طلبکار نہ تھا۔ ایک روز وہ اپنے آپ سے کہنے لگی
 ”اب ہر مرد کسی خوبصورت عورت کی تلاش میں رہتا ہے۔ کچھ جیسی کالی کولی کو
 لے کر کوئی کیا کرے گا بھلا۔“

نوبھوں کی تانی اداں عینہ تھیں میں کسی پنہاری کی دکان پر ملازم تھی۔ اس کی اور
 اداں کی کیسٹ کی دکان کی کھالی پر گھر کی گزر لوگات ہو رہی تھی۔ مگر یہ جو آخری پار تھیں
 میں انسانہ ہوا اس نے سارا کام بگاڑ دیا تھا۔ بچاوا پارہ چہاوا پارہ پانچویں عیامت میں ہی
 تعلیم کو اوداع کہہ کر ماں اور تانی اداں کی کھالی میں تھوڑی سی رقم کا انسانہ کرنے پر مجبور ہو
 گیا۔ یہی انسانی رقم خود اس کی اور اس سے تین سال پہلے تانی کی تعلیم جاری رکھنے کا
 وسیلہ بن گئی۔

پہلی تھی اس کے استاد فریڈ بیٹے کی داستان۔

”بھائی جان، میں چھٹا چاہتا ہوں۔ پہلے پرائمری، پھر نال، اور پھر ہینک کا
 امتحان پاس کروں گا۔ ہو سکتا ہے ہینک میں داخلے کے امتحان میں اگلے نمبر لے کر چھٹی
 کے امتحان سے جان چھوٹ جائے مگر میں پڑھوں گا ضرور۔ اور پہلے بھائی کو بھی
 چھٹاوں گا۔ ہم اپنے باپ پر لکھی جائیں گے۔ پھر بھائی کہتا ہے اس وقت تک ملازمت
 ہڈھا ہو چکا ہو گا۔ اس کے سر پر ہڈھی کے اسی پتے ملے ہو گئے ہوں گے۔ وہ کا پتے
 اچھوں سے آکر ہمارے ہاتے ہاتے کہے گا۔ کیا ہم اس پر ڈس کھا لیں گے۔“

موسم سرما بہار میں تبدیل ہو چکا تھا۔ مگر اب بھی سردی تاحی تھی۔
 "تو تم نے بھائی کو کیا جواب دیا؟"

اس نے کندھے جھٹکتے ہوئے کہا

"تو میں تو کھانا چاہیے مگر تمہارے لیے یہ ہاتھیں ہاتھیں بات ہوگی۔" اس نے
 اپنی ماں سے پوچھا تو وہ کہنے لگی وہ تو مری جانے لگے کہے۔ تالی لہان سے کسی صورت
 آگ کے شعلے نکھیرے۔ میں نے اپنے بھائی کو بتا دیا کہ یہ تو ہاتھیں ہاتھیں ہو گا کہ اپنی
 کھانا چاہئے۔ بھائی کو معلوم نہیں تھا کہ ماں اور بھائی ماں نے اس کے پاس سے کہا
 تھا۔"

وہ علی ایسے اٹھتا ہاتھ بھاگتا شروع کر دیا تھا۔ اٹھتا لینے کے لیے لڑائی
 کی دکان پر جاتا۔ یہ بھی کوئی جگہ تھی۔ اٹھ کی بنا۔ ان جیسے سکول کی عمر میں سے لڑنے
 وہاں جمع ہوتے۔ لڑائی لڑتے انہیں اٹھتا دینے میں سونے کہتے سب سے خواب بات و
 تھی کہ تقسیم کرنے کے لیے اٹھاتا لینے سے پہلے وہ چنگی رقم وصول کرتا تھا۔

"بھرتے لہا کا ساری ماں ایک دوست تھا۔ میں اس کے پاس گیا۔ ماں کو یہ
 چنا تو مجھے رونا کر دیتی۔ اور اگر بھائی ماں کو معلوم ہو جاتا تو میں — مجھے بھائی ماں
 کے مرحوم نکالنے پر بھی بنا اٹھتا آتا تھا۔ ان کے مرحوم نکالنے یعنی بھرتے سے آتا تک اور گے
 پر نہیں کاٹھیلی تھے یا شاید تھا بھرتے۔ بھائی ماں کے پاس ان کی ایک چٹیل سے بنی تصویر
 تھی۔ سٹاپٹ موٹوں والے ایک ٹھونڈا انسان تھے۔ بھرتے لہا ان کے مقابلے سما
 نما سے کھڑے تھے۔ رنگ کتے ہیں اور اکثر اپنے سے بڑی ہوتی ہے۔ یہ سب کپ ہے۔ بھرتی
 اور بھرتے بھائی لہان کی کاکھوں ہاتھوں ہی تھی ہنگ ہے۔ اگر آدمی کو جینے بھرتے لہا ہی
 سبب نہ ہوتا تھا — لہجہ ہے نہ بھائی جان"

انسان کے ہاتھوں میں وہ پتھر نما اٹھتا دینے نہ آیا۔ میں مگر سوتھا بھرتے لہا

پتھر اچان کی چوٹی میں مصروف ہو۔ میرا خیال ٹھیک ہی نکلا۔ اگلے ہی روز وہ اپنی کوئی
تذکرے ساتھ آ پہنچا۔ کہاں سے جلا تھا۔

”صاف کن بھائی جان۔ میں جو صاف میں مصروف تھا۔ آدمی آدھی رات تک
پتھر لگا۔ پھر نہ اندھیرے جانے سے بڑی تھکن ہو جاتی تھی۔ دو روز ٹالو کیا۔ خاک دہر
پام نے میرے لیے کہاں کی دوا لکھ کر دی مگر آتی کہاں سے بھلا۔“

”کیوں؟“ میں نے پوچھا۔

”ہانجی ٹیرے میں قریش کی دوا، بھائی جان!“

میرے ذہن میں ایک بات آئی۔

”اگر یہ تم تمہیں میں سے وہ تو؟“

اس نے اپنی گڑبڑ میں دبی آنکھوں، رخسار کی ابھری ہوئی پلکیں، اور غصرتی
ہولی پلکی زرد جلد سے میری طرف ہیں دیکھا جیسے۔ میں نے کہا

”کہاں کسی کی دوا لکھنے کے لیے۔“

”میں کچھ گیا ہوں۔ مگر آپ میرے کا کتے ہیں کہ اس کے بدلے آپ کچھ

سے کچھ کی توقع رکھتے ہیں۔“

میں اور رہا تھا کہ کہیں وہ میری پچھل کو لگا سکتوں میں نہ لے۔ وہ میرا

”میرے لہ کے ایک دوسرے نے بھی ایک دوسرے کے بچے دیے تھے۔ میں

نے وہ رقم اہلہ فریڈا کے کام میں صرف کر دی۔ پھر جب اہلہ کی کالی سے میری بگڑ تم

میں ہوئی تو میں اسے چھپا دیا۔ مگر اس نے نہ لے۔ کہنے لگا ہے وہ۔ ساتھ

ہی اس نے میرے رخسار پر ہانجی کالی۔ میں وہ چھپا اس کے منہ پر اسے دے۔

”مگر میں تو تمہیں کسی سے اسے سے چھپا نہیں دے رہا۔“

”اگر یہ نہیں چلا۔ لہ کے دوسرے نے بھی میری لہے بھی کہا تھا کہ میرا

دن گزارنے لگے۔ وہ جرد تک سویرے آئی۔ مجھے انہدات اپنے کے بعد لگا
 "بھئی جان، اب میرا اجارہ تم پر سے ہٹا دیا گیا ہے۔"

پھر اس کا قرض دو لیرے، پھر ایک لیرہ اور پھر محض پچاس قرش باقی رہ گیا۔
 یہ آخری روز مجھے دو انہدات اپنے کے ساتھ ہی اس کا قرض بالکل ختم ہونے کو تھا۔ مگر وہ نہ
 تپہ میں حیران تھا کہ وہ کیوں نہ آیا۔ میرے ذہن میں بھی یہ بات نہ آسکتی تھی کہ وہ
 میرے پچاس قرش دبا کر بیٹھ سکتا ہے۔ کبھی کسی حادثے کا شکار نہ ہو گیا ہو۔
 سوچ کر کہ کبھی واقعی وہ کسی حادثے کا شکار نہ ہو گیا ہو میرا دل ابل جاتا۔ میرے ذہن
 کے پاس پر کسی ایسے بچے کی لاش ابھرتی جو کسی عجز و غرور جیسی یا ہانپنے گاڑی کے
 بچے آ کر ٹک گیا ہو۔ ایک لوبان، راتوں سے نکال دیا گیا۔

ذہن پر دن، ہفتوں پر ہفتے، اور پھر کیسی مینے گزر گئے۔ میں اسے بھول چکا تھا۔
 اب میرے انہدات کوئی اور لڑکا لایا کرتا تھا۔ یہ لڑکا اس سے بھی نصف تھا۔ پھر ک بار تو آؤ
 جاتا۔ یہ بھی اپنے کانٹوں پر ایک باستان اٹھانے پھرنا تھا جو وہ بھی لڑکا تھا۔
 سو سو سرا کی ایک برفانی صبح تھی۔ میں اپنے باپ رائٹر کے سرانے بیٹھا تھا
 تھا۔ ایک بچے کی سر میں ہی آواز نکالی تھی۔ میں اس آواز سے آشنا تھا۔

"ہارو انہدات آج کی لڑکا لائے۔"

کہا یہ وہی لڑکا ہے؟ لیکن نہیں۔ وہ نہیں ہو سکتا۔ یہ تو میرے ہی سر میں ہے۔"

میری کڑکی کے سامنے آ کر تک گیا۔ لڑکا ہنسنا لگا ہارو تھا۔

"ہارو انہدات آج کی لڑکا لائے۔"

میں بچے کو یاد آ کر بچے کے ہر روز انہدات چھٹی کرنے اور لڑکا اس لڑکا کا انہدات سے
 کر چا چکا تھا۔ میں نے وہ لڑکا کو دیا۔ بھئی ہی ہوں میں نہ لڑکا لڑکا۔ میں اس لڑکی
 سے آواز سے لگے انہدات کا پاس تھا سے قرقر کا پ۔ ا تھا۔

”بھائی جان، انگل نے کہا تھا آپ بمانہ لائے گئے۔“

”یہ کیا ہے؟“ میں نے پوچھا۔

”میں کے ذمے آپ کے پچاس قروش بجا تھے۔“

”مگر وہ خود کہاں ہے؟“

”وہ دوبارہ نہ ہی اس کی گتھی بندھی۔ پھر کی طرح گیا ہوا۔“

”نوٹ ہو گیا ہے۔ ہم نے گل ہی اسے ایڈمنسٹریٹ کے قبرستان میں لٹا کر دیا تھا۔“

یہ کہتے ہوئے اس نے ہاتھ بٹھا کر پچاس قروش میرے حوالے کر دیے۔

وہ پیچھے ہٹا اور جاتے جاتے

’بازو اخبار آج کی بازو خبریں‘

کی صدا لگاتا آگے سے اوجھل ہو گیا۔

♦♦♦♦♦♦♦♦♦♦

(قبرستان کا نوٹ: ترکی لیرے میں سو قروش ہوتے ہیں۔ جس زمانے میں یہ کہانی لکھی گئی تھی

ایک ترکی لیرا ایک پاکستانی روپے سے قدرے کم قیمت کا ہوتا تھا۔ پچاس قروش تقریباً پانچ

پاکستانی روپے کے برابر تھے۔)

ایضاً اللہ
بہت عابدہ خفیہ

خونی بھائی

بھری جاتے ہیں انٹیشن میٹن ہے، میں سال قبل میرے دیکھے بھالے اس قبے کا
 طرز سے زمین میں دھندلا سا گیا ہے۔ اس قبے کی بہت سی جگہیں ایک خواب کی طرح
 ہوتے ساتے موجود ہیں۔ ان دلوں میں اپنے والد (جو کہ اس وقت فوج میں کپتان تھے)
 کے ساتھ بھی دویا پر سیر کرنے جایا کرتا تھا یا کبھی گرم پانی والے حمام میں غسل کرنے جاتا
 تھا۔ لیکن یہ سب کچھ دھند کے گہرے بادلوں میں اپنی اصل رنگت کو مٹانے والی شکل میں
 بھری آنکھوں کے سامنے آجاتے ہیں اور میں ان جگہوں کی اصلیت کو پہچاننے سے انکار
 کرتا ہوں۔ کافی عرصہ دویا پر گھوم کر واپس آنے والا شخص ماہی جاتے ہیں انٹیشن کو کالی دھند
 کے بادلوں میں گم ہو جانے پر جس طرح افسوس کا اظہار کرتا ہے۔ میری بھی کیفیت کچھ اسی
 طرح کی تھی۔ اسی شام ان دھند کے بادلوں میں مجھے اپنا جاتے ہیں انٹیشن میں واقع گاؤں
 اور زمینوں کے ریموڈ کی گزرنے والی پگڈنڈی کالی کی تہ تے جہت پھولے کھڑی کے لیے
 لڑی ہوئی دیوڑوں کی ہلک نظر آ رہی تھی۔

لیکن اپنا سکول اور گھر یہ سب تھری پھولے کے باوجود بھی مجھے ایسی طرح یاد
 ہے جیسا باغ۔ درمیان میں سڑکی کی شکل کاٹا ہوا سلیو گھر، دائیں طرف گولے میں جو
 وقت ہم سب گھر والوں کا بیٹھے والا سلیو پھولے والا گھر، کچا سوہنے میری ماں اس
 کمرے کی کھڑکی کے کنارے مجھے ایک سٹپ کی طرح بٹھا کر مجھے سنی چھوٹی اور گھٹے
 پینے کے لیے دوڑھ دیتی تھی۔ اس کی دوسری طرف، اس کھڑکی سے نظر آنے والی ایک ۱۲
 شہہ عمارت تھی۔ پھر کھلیے دروازوں اور کھڑکیوں کے آسپ اردو ہونے کا نہ ہونا بہت

ہوا جاوے گا۔ ہر مقرر سے سرخ ہالوں کی وجہ سے چار ٹریل کی طرح نظر آتی تھی۔ ہوا
 بہا جاوے گا۔ ایک مقرر تھا جو کہ بڑی استہلی کا بیٹا تھا۔ بچے اس استاد سے ہالوں نہ دانتے
 تھے بلکہ پڑھتا ہے کہ وہ بے وقوف سا ہوتا تھا۔ میں کلاس میں آخری قطار والے ایک
 بچہ تھا کہ ہوا بڑی استہلی کے اٹارے کی پہنچ سے گھوٹا رہ سکوں۔ کیوں کہ وہ آخری
 ہال تک نہیں پہنچ سکتا تھا۔ میرے ہالوں کی سنہری رنگت کی وجہ سے لڑکیاں مجھے کہا کہ ہم
 سے پکارا کرتی تھیں۔ مجھ سے لڑکیوں میں بڑے لڑکے میرا نام پراکتے تھے وہ مجھے کچھ
 صاحب کا بیٹا کہا کرتے تھے۔ کلاس میں ہم سب پہل کر اپنا سٹی اپوریا کرتے تھے۔
 ہمارے سکول میں صرف ایک ہی قسم کی سڑا تھی "ماد" بڑی عقلی ہر روز ہمارے
 ہال کے حتی کہ لڑکیاں بھی اس سڑا سے بچا نہ سکیں تھیں۔ سوا بھل کی ماد سے ڈانٹے ہو
 فرم کر کہیں دلوں میں ہم سب شامل تھے۔ یہوئی عقلی کرنے والوں کے لیے سڑا کو کولی
 پانڈیا کا سب موندو تھا۔ ہمارے استاد کا نام تھا اور بڑی استہلی کا لیا لڈا میں آئی
 پتا اس کی بچہ سوچ جاتی تھی۔ مجھے آج تک بھی نہ ہی بڑی استہلی سے ہر نہ پھرتے
 استاد سے مار پائی تھی۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ وہ میرے والد کے بے سے
 خاکہ تھے۔ ایک دن بڑی استہلی نے بھوتے پانڈے پر ہیر لڑکیاں کن اپنے کہہ پڑیاں
 کے اعصاب ہاتھ سے اس قدر زور سے کھینچا تو کہ لگے دن تک میں رو کی میں تھیں کہ
 وہاں اور ہیرا کان کی دن تک سرخ رہا۔ وہ اس عقلی میری تھی۔ میں نے گا ہوا تھا۔
 پتا کہ باغ والے قتل گاہ کے قتل کو کسی نے اکٹرا پھینکا تھا۔ بڑی استہلی نے کسی
 اکٹرا لے والے کی مٹا دی سارے سکول میں گرا دی تھی۔ اس اکٹرا نے والے بچے کو کسی
 ہاتھ تھا۔ یہ کڑوہ پھیل ایک ہار پڑا تھا۔ میں نے بڑی استہلی کو اس بچے کے ہاتھ میں
 گا ہوا۔ بڑی استہلی نے اسے ہاتھ کے لیے پڑا ہی تھا کہ ایک اور بچہ کڑا ہوا کر سکتے
 تھے۔ یہ تصویر مجھ سے سرور ہوا ہے اس کا کاپی تصویر میں نے ہی لگا کر اکٹرا تھا۔

تھے ہی بڑی استغنی نے چار بچے کو چھوڑ کر دوسرے بچے کو چلا کر زمین پر لایا اور اپنے
 ڈٹے سے خوب چٹکی کی۔ یہ بچے بھی بھیج کر مار گھاتا جا رہا تھا۔ اس وقت ہی استغنی کو
 سے قابض ہوتے ہوئے اور میرا کان زور سے کھینچتے ہوئے کہنے لگی۔

”تم نے کیوں جھوٹ بولا۔ اس بے چارے پر کیوں جھوٹا الزام قویب دے ہو۔“
 میں بہت رووا کیوں کہ میں نے جھوٹ نہیں بولا تھا۔ بلکہ اپنی آنکھوں سے اس
 قی توڑتے ہوئے دیکھا تھا۔ شام کو سکول ختم ہونے کے بعد میں نے مار گھاتے والے بچے
 کو جا پکڑا اور پوچھا۔

”تم نے استغنی کی نظر میں لکے کیوں جھوٹا ثابت کیا ہے۔ تم نے تو قی نہیں توڑا توڑا۔“
 ”میں نے توڑا تھا۔“ بچے نے پھر جھوٹ کا سہارا لے کر کہا۔
 ”تمہیں تم نے نہیں توڑا۔ میں نے اپنی آنکھوں سے اس کو توڑتے ہوتا
 دیکھا ہے۔“ میں نے فیصہ سے کہا۔

شکوہ بچے نے ایسا ہنسنے کا حساب نہ کیا۔ اسے غور سے دیکھنے لگے
 لیے میرے منہ کی طرف دیکھا اور کہا۔ ”اگر تم وعدہ کرو کہ تم بڑی استغنی کو نہیں بتاؤ گے تو
 میں تم سے بگڑا بھی نہیں جھپٹاؤں گا ہر بات تمہیں بتا دوں گا۔“

میں نے جلدی جلدی وعدہ کے ساتھ قسم اٹھائی کیوں کہ میں اس جھوٹ کی
 اصلیت ہانا چاہتا تھا۔ میری طرف سے ہراسید ہونے کے بعد بچے نے کین شروع کیا۔
 ”لکھے یہ ہے کہ میں نے قی توڑا ہے لیکن وہ وعدہ ہونے کے ساتھ ساتھ نہیں
 کرو رہے تمہیں کو ابھی معلوم ہے کہ وہ اس مار گھاتے والے کو کتنا قہقہے دینا ہوتا
 ہے وہاں سے الٹا ہے۔“

”لیکن تم نے اس کی جگہ مار کیوں کھائی۔“ میں نے وہاں پوچھا۔
 ”کیوں نہ کھا۔ ہم سب نے قی کو آٹھن میں ایک جھپٹا لیا ہے۔ وہ چار ہے۔“

تو میرے ساتھ رہتا ہوں۔ بس میں نے اس کی جان بچائی۔ کیونکہ ہم ایک دوسرے کے
 دل بھائی ہیں۔" اس بچے نے میرے سوال کی وضاحت کی۔
 میں بچے کی بات کو نہ سمجھ سکا اس لیے دوبارہ پوچھا۔

"مہر سے تمہاری کیا مراد ہے؟"

"اسی قسمیں نہیں ہوتی" اس نے اٹا بھو سے پوچھا۔

میں نے "مجھے بالکل پتہ نہیں۔" میں نے لاپٹی کا اشارہ کیا۔

میرے انکار پر وہ ہنسا اور مجھ سے دور جاتے ہوئے کہنے لگا۔

"ہم ایک دوسرے کا خون پیتے ہیں" اس کو مہر گنا کہا جاتا ہے۔ اس طرح ہم

ایک دوسرے کے خونی بھائی بن جاتے ہیں۔ میرے دم تک ہم ہر مصیبت میں ایک

دوسرے کی مدد کرتے ہیں اور بڑے وقت میں ساتھ اپنے جاتا۔

اس واقعہ کے بعد مجھے معلوم ہوا کہ اسکول میں تقریباً سب ہی بچے ایک دوسرے

کے خونی بھائی بنے ہوئے ہیں اور کچھ لڑکیاں بھی اس مہر میں بکڑی ہوئی ہیں۔ ایک دن

میں نے دو دوستوں کو خونی بھائی بننے دیکھا۔ میں اپنے دوستوں کے ساتھ ٹاپ و پیٹھوا

تھا۔ چہرہ استوار دیکھ کر نے کے لیے ہنسا گیا ہوا تھا۔ بڑی استانی تھاری طرف کر کے چھٹی

کی ہال سے اپنی تھارت چڑھنے میں مصروف تھی۔ اسٹے میں دو بچوں نے گھڑی کے دستے

والے ہاتھ سے اپنے اپنے بازو دکھائے، ہانسی کی کیر بھیجی۔ اس میں سے نکلے والے سرخ خون

کو ایک دوسرے کے ساتھ ٹاپ کر بازوؤں سے پھینک لیا اور مہر کرتے ہوئے ایک دوسرے

کے خونی بھائی بن گئے ان دنوں کی اس عادت و رسم نے مجھے سوچنے پر مجبور کر دیا اور

میرے دل میں سو گراہیں شدت سے ابھری تھیں کہ میرا بھی کوئی خونی بھائی ہو۔ جی

استانی سے میری کچھ اچا کان سمجھنا لگے۔ ہاں بچے نے میری جان کا تحفظ میں لگے۔ اس وقت

دیکھنے والے سکول میں میں نے اپنے آپ کو نہ دیکھا پھر کسی دوستہ دکانہ کے گھسوں گیا۔

گھر آ کر ہاں کو میں نے ساری بات بتائی اور یہ بھی کہا کہ میں بھی کسی کا نہیں
 بھائی بنا جا رہا ہوں۔ اس نے میری یہ بات سن کر مجھے ڈانٹتے ہوئے کہا۔
 "ان فضول باتوں کو چھوڑو۔ خود ہار جہنم نے انکی حرکت کی۔"
 میں نے ہاں کی بات کو بالکل نظر انداز کر دیا۔ میرے سامنے میں تو ایک ہی اس
 جانی ہوتی تھی۔ لیکن مجھے اسکی تک ٹوٹی بھائی جاننے کے لیے کوئی مستقل وسیلہ نہ تھا
 نظر نہیں آ رہا تھا۔

میں ایک انتہائی سادے لباس نے میری دلی مراد کو پورا کر دیا۔ جس کے دن ہمیں
 سکول سے جاننی ہوا کرتی تھی۔ ہمارے ہمسائے کے بیٹے اگلے گھر کے بارے میں ہم سے
 کھیا کرتے تھے۔ ہماری کچھلی طرف ہمارے ہمسائے کا بھرا ہم ٹر ایک لڑکا تھا۔ اس کا نام
 بنا ٹیب سا ہوا کرتا تھا۔ ہم بیٹے اسے اس کا نام لے کر پھینکا کرتے تھے۔ لیکن کبھی کبھی
 اس لڑکے نے اس بات کا برا نہیں منایا تھا بلکہ ہر وقت مسکراتا ہی رہتا تھا۔ یہ بڑا نام سب
 سے زیادہ طاقت ور ہوتا تھا۔ کئی بھول سا جسم تھا۔ ہم سب سے زیادہ تحقیرات کرنے کی
 چیز سے ملتی تھی۔ ہمیں پھینکا رہتا تھا۔ اس کا نام "مصلح" تھا۔ لڑکیوں نے اس کے نام
 کے ساتھ خالی دایہ لگا کر ایک گاڑی بنا رکھا تھا۔ ایک سر میں گاڑا کر اسے پھینکا
 کرتی تھیں۔ لیکن کہاں سے کہہ سکیں اس کے ہاتھ ہر ایک لہجے میں ہوا ہوتی ہیں۔

ہم بچوں کا ایک ہندو پھیل گھوڑے بنا تھا۔ سب سے اچھا گھوڑا جسے بنا
 کرتا تھا۔ پھیل کے حادثے کی کہانیاں سن کر ہمارے دل سے ان کو دکھانا پڑتا تھا۔
 ہمارے بچوں کے ہاتھوں سے گھوڑے کے اداکان ایک باک بنا کر بالکل گھوڑے کے منہ کی
 منہ سے ادا کرتا تھا۔

ایک دن میں ان لڑکیوں سے گھوڑا بنا رہا تھا۔ مصلح ہر دوسرے بیٹے میرے
 لڑکے کو کھڑے تھے۔ لہجے ہر مصلح لہجے ہر سب کو کہتے ہیں۔ اہاں ایک لہجے کو دیکھ کر

انہی کی آہٹوں میں ہاتھ سے میری شہادت کی انہی ڈنکی ہو گئی۔ رات کی صورت میں سرخ
رنگ لہجہ میں شروع ہو گیا۔ خون دیکھ کر میرے دماغ میں ایک خیال آیا اور میں اپنے
دماغ کی حالت کو بھول کر مصطفیٰ سے مخاطب ہوا۔
"ہاتھ میں مصطفیٰ۔ دیکھ کر میری انہی کت گئی ہے آؤ ہم دونوں کوئی جہلی میں

جانگ۔"
مصطفیٰ نے فوراً نظریں نیچی کر کے تھوڑی دیر سوچ کر کہا۔
"یہ کس طرح ہو سکتا ہے۔ کوئی جہلی بننے کے لیے پارہ کو کاٹا کرتا ہے۔"
"پھوڑو۔ ان ہاتھوں کو پارہ اور انہی کا خون کیا ایک جیسا نہیں ہوتا، میں نے

اسے بھاتے ہوئے کہا۔
میرا ہاتھ سننے کے بعد اس نے بس وہاں کے پھر فوراً میرے ہاتھ سے ہاتھ
لے کر اپنے پارہ پر گھبرائی ہی گھبر گئی فوراً ہی خون اٹلی کر پورا آ گیا، لیکن اس کاٹوں میں
فرد کا لہجہ تھا کہ بچے کی بجائے اس تک پر ایک شخص کی شکل میں آ گیا۔
میں نے اس کے خون کو لے کر اپنی انہی کے خون کے ساتھ انہی طرح ڈالا۔
پلے میں نے اس کے پارہ سے خون پھینکا۔ یہ گرم اور لیکن سا تھا۔ اس نے میری انہی

کے خون کو چاٹ لیا۔
مجھے کچھ پارہ لکھا چاہتا کہ اس پارہ کے بعد شہادہ پوچھنے یا ایک سال کا دورہ گزار
تھا تو ہم دونوں ہی شہادہ کوئی جہلی کے ساتھ کو بھول چکے تھے۔ ہم دونوں آٹھنے ہی کیج
کرتے۔ آٹھنے ہی سکول سے واپس آ کر کرتے تھے۔
ایک دن موسم بہت گرم تھا وہی اسٹاپی نے پارہ دیکھا ہی ہم سب کو بھول دیا
وہی۔ میں اور مصطفیٰ کہ آہو بڑا گرم ہے آہو آہو گھر کی طرف پارہ ہے۔ کچھ میں نے اٹھا
توئی کوئی کے کچھ وہاں دکھا ہوا تھا۔ پلے کی ہم سے سزا سن چکا ہوا تھا۔ کچھ بڑا گرم

کے کنارے ٹوٹی ہوئی دیوار کی بنیادیں تھیں۔ ایک دم دھارے مٹانے سے وہ کھٹکے
 نمودار ہوئے۔ یہ کتے پوری دھار سے بھاگ رہے تھے۔ ان کتوں کے پیچھے بکواسوں
 اڈتے ہاتھ میں لیے بھاگ رہے تھے۔ ہم پر نظر پڑنے ہی انہوں نے ہمیں ایک طرف
 ہونے کو کہا۔ ہم اس اچانک حملے کے لیے تیار نہ تھے۔ کافی دیر تو ہم صفوں بگولہ سے
 حیرانی کی حالت میں کھڑے رہے۔ ہم دونوں بھاگنے کی چوڑی کر رہے تھے کہ کتوں اور
 نے ہانگے اپنے قریب پڑا۔ اس وقت مصطفیٰ نے فوراً مجھے پکڑ کر اپنے پیچھے بٹھا لیا۔
 نے پوری طاقت سے اس پر حملہ کر دیا۔ مصطفیٰ اس کتے سے چھڑک کے لیے ہاتھ پائی
 مارنے لگا۔ اسی ٹکڑوں میں وہ بچے کر گیا۔ سب دونوں میں ہاتھوں ٹھٹکی شروع ہو گئی تھی۔
 اس کی تڑکی ٹوٹی زمین پر گری ہوئی تھی۔ میں پاس کھڑا بیچ کر لوگوں کو دھکے لے رہا
 رہا تھا۔ میرا جسم مار کے مارے کا پ رہا تھا۔

اسکے میں کتوں کا دھبہ کرنے والے وہاں آچکے۔ انہوں نے اپنے اٹھن کی
 خیریاں سے اسے کتے کے ٹپے سے ہٹا لیا۔ کتا اپنی ہانگوں میں سر دھا کر بھاگ کھڑا ہوا۔
 مصطفیٰ کو بچا لیا گیا تھا لیکن اس کے بازوؤں اور ناک سے خون بہ رہا تھا۔ اسے گرنے
 پڑا گیا میں بھی بھاگ کر اپنے گھر آ گیا۔ گھر آ کر میں نے ماں کو سب بتائی۔ آئی
 انہوں نے مجھے دیکھ کر ہی رونے لگا۔ دھا پڑا کر مجھ پر پھوکی۔ مجھے پارے کر اس کے
 سر سے پیاز کی جڑ سے خیر ناک پھٹ گیا تھا۔

اسکے دن مصطفیٰ سکول نہ آیا۔ اس نے اسکے دن بھی میں نے اسے نہ دیکھا۔
 گھر آ کر میں نے ماں سے مصطفیٰ کے گھر جانے کی اجازت پائی لیکن میری ماں نے
 مجھے یہ کہنے ہونے منع کیا کہ وہ پارے بھی اسے سے آرام کرنا مناسب نہیں۔
 اکتا دھتورہ جلد ہی ٹھیک ہو جانے کا اور پھر واپس آ کر کھیلے۔

اس کے بعد میں اس کی صحت یابی کی امید لیے ہونے سکول آ گیا ہاں وہ بھی

میں نے کبھی بھی سکول نہ آیا۔ مجھے پتا چلا کہ اسے پاگل کتے لے گا ہے اسے علاج
کے لیے ہسپتال لے جایا گیا لیکن ایک دن یہ بری خبر سنی کہ وہ مر گیا ہے۔

اب بھی سہانی سچ کا ٹھکانہ اپنے ہونے مجھے اپنا بھیجے بے اختیار یاد آجاتا ہے۔
میں بظاہر بھی اپنی شہادت کی اگلی کر دیکھنے لگا ہوں ابھی تک اس کی ہنسی پر ہر دم کا ٹھکان
ہوتا ہے۔ یہ ٹھکان میرے لیے بہت مفید ہے۔

میری خاطر جان دینے والا صرف مجھے اس خالم پاگل کتے سے بچانے کی کوشش
میں جان کی بازی لگانے والے اس عظیم ثوابی بھائی کے ہونوں کا لطف کس میں آتا ہے۔
پہلیں کرنا ہوں اور میری آنکھوں کے سامنے وہ نظر آجاتا ہے جب وہ اس کالے پاگل
کتے سے مجھے بچا کر اپنے بچے غولی کو مجھ پر بھروسہ کرنا تھا۔

۰۰۰۰۰۰۰۰۰۰۰۰

ہم سب کا ضمیر - سید ضمیر جعفری

سید ضمیر جعفری کا تعلق جہلم سے تھا۔ مگر بے تعلق بھی کسی سے نہیں تھی۔
تھوڑا تھوڑا تعلق انہوں نے پنجاب کے تمام دریاؤں سے رکھا۔ اس تعلق کو اپنے لکھن میں
بھی شامل کیا اور شاعری میں بھی۔

سید ضمیر جعفری نوٹے قد کے بھاری بھر کم جسم کے بظاہر رعب دار شخصیت کے
مالک تھے۔ "بظاہر" میں نے اس لیے کہا کہ جب تک آپ ان سے دور رہیں گے
کی بھاری بھر کم شخصیت کے رعب میں رہیں گے اور اگر ذرا نرم دل بھی واقع ہوئے ہیں
ان کے فونی جاوہ جمال دلی شخصیت سے باقاعدہ لرزہ بر اعظام رہنے کا بھی خاصا امکان ہے
لیکن اگر آپ نے ان کے عذری حصہ کو جو ہر شخص کے گرد احتیاطاً چالایا گیا ہے تو
کہ ان کے علاوہ میں قدم نہ رکھ لیا تب آپ کو معلوم ہوگا یہ سید ضمیر جعفری کم اور شاعر
جعفری زیادہ ہیں۔ پھر وہ آپ کو بات بات پر ہنساتے رہیں گے اور اگر آپ نہیں ہنس
گے تو وہ خود ہی ہنسنے چلے جائیں گے۔ آپ کی تمام تر سنجیدگی ان کی جملہ باتوں اور گفتوں
مندی کو ہلک نہیں سکے گی۔ ایسے میں آپ کو محسوس ہوگا کہ اس طرح کی باتوں اور
شخصیت سے دور نہ کرنا آپ نے بہت دقت خدایا کیا ہے۔

۱۹۸۰ء تک میں کوئی غور نہیں کیا تھا۔ پھر اس وقت سے اب تک اسلام آباد
میں ہوں۔ لیکن ۱۹۸۰ء سے پہلے ہی میرا جہلم کے مشاہروں میں آنا چاہا ہو گیا تھا۔ جہلم
میں کسی مشاعرے میں میری طاقت سید ضمیر جعفری سے ہوئی۔ یہ طاقت سرسری سے
اسی کم تھی کہ جعفری صاحب پر مشاعرے میں "کلام ماشاں" میں گھرے ہوتے تھے۔ وہاں

ہی بھرا ہے بے شکانت آدمی کے لیے اس جہنم میں راستہ طاق بہت مشکل تھا۔ اس لیے ہر آدمی میرے محلے میں صرف "سید" ہی آتے رہے۔ خیر جعفری تو بہت بڑے آدمی ہونے لگے۔ جب میں اسلام آباد آ گیا یہاں بھی یہ شاہیں بڑی مشکل سے ابرہام آباد اس لیے کہ میرے پاس "دام" بھی کوئی اچھا نہیں تھا اور "دام" تو سرے سے ہی نہیں تھا۔

اسلام آباد میں میری پہلی ملاقات جعفری صاحب کے ہاٹ خانہ پر ہوئی۔ یہ واقعی ملاقات میرے ملاقات تھی اور اس میں کامیاب تھی جہاں آ کر میں نے اپنے اہل قلم سے تعلق جوڑنے کے لیے شروع کر رکھی تھی۔ یہاں کی تقریبات میں میرا اہم حصہ تھا جعفری صاحب سے ضرور ہونا رہا مگر تقریباً ملاقات پر میرے نہیں کیا ہوا تھا۔ ہر میں تو باقاعدہ "ٹاکر" چاہتا تھا تاکہ اتفاق اتفاق ہو سکے ہونا ہے ایک ہی بار ہو سکے۔ یہاں ایک بات کی وضاحت میں کرنا چاہتا ہوں کہ تقریبات کا معاملہ اپنی جگہ نہیں ہر اس شخص کے لیے سے محبت کرنا ہوں اور اس سے تعلق چاہتا ہوں ہر شخص اچھا کہتا ہے اور اچھا لگتا ہے سو یہ دونوں باتیں جعفری صاحب میں بہت اہم سمجھتی ہیں۔ جلد ہی میں نے محسوس کر لیا کہ سید خیر جعفری اسلام آباد کے لوگوں اور اہل قلم میں بے حد مقبول و محبوب شخصیت ہیں۔ ہر تقریب میں مجھے یہ احساس ہوتا رہا کہ انہوں نے مجھے کوئی توجہ نہیں دی۔ مگر ملاقات میں بھی مجھے کسی خاص توجہ کی امید نہیں رہی تھی اور وہی میں اپنے اہل جعفری صاحب کو گھوڑے۔ بغیر پائے ہوئے گھوڑے کا ارہاس کرنا رہا کیونکہ میرا ہاٹ میں بے توجہی یا کم توجہ کو زیادہ برداشت کرنے کا مادی نہیں ہوں۔ تمام اسلام آباد میں اہل لوگوں سے اچھے تعلقات کا میں خواہاں تھا ان میں سید خیر جعفری کا نام بہت لمبا تھا۔

ہر شے کے بلے آدمی میں جہاں اور سے باقی کالک لکھا جا بہت ہے اور آگروں کی گلیں اس لکھنے میں انہی رہتی ہے وہاں اس کے سرواہات بھی پھر لکھی ہو جاتی ہیں کہ اس کے لیے اپنے سے بے لوگوں کی طرف جانا رہتا مشکل

ہو جاتا ہے پھر ہر انسان فطری طور پر اوپر ہی یا کم سے کم مساوی سطح پر دیکھتا ہے۔
 بڑے آدمی کا نیچے کی مخلوق کی طرف دیکھنا صدقہ چاہیے سے کم نہیں اور وہ ہم کو بھی یاد
 یہ کوشش رہتی ہے کہ اپنے مزاج کے برعکس اپنے پسندیدہ لوگوں کے ہازن کے ہاں
 ہوں۔ آخر غزل کے محبوب کے ہازن کے بھی تو ہم اٹھا لیتے ہیں۔

چنانچہ ایک روز میں جعفری صاحب سے ان کے گھر پر ملاقات دیکھا تو وہ اپنے
 بالکل مختلف آدمی ہیں۔ غالب نے تو کہا تھا کہ "عاشق ہوں پہ معشوق فریب سے براہم
 مگر جعفری صاحب کے بارے میں مجھے محسوس ہوا کہ معشوق ہیں اور عاشق فریب سے
 کام ہے۔ وہ بہت نرم مزاج پھلے ہوئے، خوش اخلاق، نہایت مہذب، بڑا ایک چلبلی
 ہو سکتا ہے، بڑی قہور اور اہمیت اپنے واسلے کہ ملاقاتی کو اپنے بہت اہم ہونے کا محسوس
 ہونے لگے۔ ایک تشبیہی سا اور ذہنی سا بھی تعارف ہوا مگر مجھے یہ بھی معلوم ہوا کہ میرے
 بارے میں جعفری صاحب بعض ایسی معلومات بھی رکھتے ہیں جو بہت سے کم سے کم ان
 وقت یعنی آج سے کچھ سال پیش نہیں رکھتے تھے۔ یہ ملاقات خاصی طویل رہی۔ جعفری
 صاحب نے مجھے ہازن "فتوح" کا کر دیا۔ جس میں میری غزل بھی تھی۔ یہ شاعر اور زندگی
 ہی آیا تھا اور ابھی میں اسے دیکھ نہیں سکا تھا۔ خاصی دیر بیٹھے رہے۔ میں نے اہدات
 چاہی تو کہا "نہیں ہم اگلے کواہ کا نہیں گے" اس ملاقات سے مجھے اندازہ ہوا کہ میرے
 جعفری بہت سائن طویل، بغیر حسب اور انسانی جذبات کی قدر کرنے والے انسان ہیں۔
 میں نے محسوس کیا کہ ان کے دائرہ نور میں آنے کے لیے صرف غلوں دل ہی ایک سیوا
 ہے۔ چنانچہ بعد کی ملاقاتوں میں ان باتوں میں بیحد اضافہ ہوا ہوا محسوس کرتا مجھے
 اندازہ ہو گیا کہ جعفری صاحب جیسے محبت کرنے والے انسان سے تعلق قائم ہو سکتا ہے۔
 وہ اپنی کم غلوں کے جس کی بات نہیں ہوتی۔ اسے طرف والے لوگ ہی اس سہارے کو اپنے
 آپ میں آگے ہیں۔ جعفری صاحب مجھے ایسی ہی سہارے سوچنے والے صاحب طرف

انسان نظر آئے۔

اس کے بعد جعفری صاحب سے کئی ملاقاتیں ہوئیں۔ اگلے سز بھی کیا۔ مجھے یاد ہے میرے عزیز دوست مقبول عام مرحوم کے پہلے شعر "جھوٹے" دینے کی آگہ کی قریب روزنامی کا جملہ جعفری صاحب کے شعر جہلم میں ہو رہا تھا۔ جعفری صاحب میرے دوست بننا یاد اور میں اس میں شرکت کے لیے ایک ہی گاڑی میں اسلام آباد سے جہلم کے روانہ ہوئے۔ راستے میں خوب گفتگوئیں ہوئیں۔ بحثیں ہوئیں۔ اختلاف ہوئے (کیونکہ منگانی اور میں ملحقہ اور باب ذوق کے جلسوں کی عادت رکھتے ہیں) مگر یہ سب بہت پر لطف رہا۔ ایک تو جعفری صاحب علمی اور معلوماتی سطح پر بہت اپ لوٹتے تھے اور ان سے بھی بڑی بات یہ کہ ان میں گفتگو کرنے اور گفتگو کے دوران لاکھ سہاں سے آنے والی گاڑیوں خصوصاً ترکوں سے بچ بچاؤ کرنے کا یہ پناہ چلا تھا۔ بریک، ٹیورنگ اور اس کے ساتھ ہی ساتھ ایکسپلر کا بہت بروقت استعمال جیسا میں نے جعفری صاحب سے سیکھا دیکھا بہت کم لوگوں میں دیکھا۔ انتکادات کو سنتا۔ انہیں برداشت کرنا بلکہ پوری طرح ہلیم کرنا۔ پھر حوصلہ مندی اور زہری سے ان کا جواب دینا۔ اور کئی اور فریق مخالفت کو جواب نہ بھی دینا اور اس کی بات سے طواہ لڑاؤ اختلاف نہ کرنا اور آخر میں جھٹ کو کسی بہت گفتگو پھلے کے ذریعے ختم کرنا جعفری صاحب کو خوب آتا تھا۔ جہلم میں ہولے والے قریب میں بھی جعفری صاحب نے اپنے طلبہ صدارت میں ادارے معلقان کو سراہا۔

اس سفر سے پہلے بہت سی سی شاکی باتوں کے باعث میرے ذہن میں یہ چلنا تھا کہ جعفری صاحب اختلاف کرتے ہی نہیں اور بیٹہ ہاں میں ہاں ملانے والے کا کردار ادا کرتے رہتے ہیں مگر اس سفر میں مجھے احساس ہوا کہ جعفری صاحب نہ صرف اختلاف کرتے ہیں بلکہ بہت دل بہا یعنی ہر مشورہ اختلاف کرتے ہیں۔ میں نے اندازہ کیا کہ وہ اپنی بات کو اپنے جذبات میں پیچھے نہیں دیتے اور اسے اپنی آواز کا سہا بھی نہیں دیتے۔

مختلفوں میں جب بھی کوئی سخت مقام آنے لگا تو اسے ایک خوبصورت سوا سوا لپکے
 گئے۔ یہ خوبی میں نے بہت کم لوگوں میں دیکھی ہے۔ سب سے لوگوں میں تو ایک شخص ہی
 پیدا ہو جاتی ہے اور یہ کہ اکثر و بیشتر Self Centred ہو جاتے ہیں۔ اپنے آپ کو صرف
 مرکز کائنات سمجھتے گئے ہیں بلکہ اپنی بات کو بھی صرف آخر خیال کر لیتے ہیں۔ جب یہ فکر
 کرتے ہیں تو ان کا مقصد صرف فیض رسانی ہو کر رہ جاتا ہے۔ فیض حاصل کرنا ہی
 صلاحیت ان میں باقی نہیں رہتی۔ ضمیر بھڑکی صاحب کو میں نے اس خالی سے سزا دی
 وہ اختلاف کرنے کا اصول بھی دیکھتے تھے اور اختلافات کو برداشت کرنے کی آہلی بھی
 اختلاف دانے کو ضروری اہمیت دینے کی فرہست اور کشادہ دلی بھی رکھتے تھے۔

تو جانے کیوں — شاید ان کو ہر دل مزاج میں یا دنیاوی کامرواری سے مل کر
 لوگوں نے یہ کہا شروع کر دیا کہ بھڑکی صاحب صرف ہاں میں ہاں مانتے ہیں۔ اختلاف
 اختلاف کر کے فضا کو کندہ کرنے کا خدشہ سہل نہیں لیتے۔ میرے ذہن میں بھی ان کے
 بارے میں جگہ ایسے ہی تاثرات نے چند عرصہ شروع کر رکھا تھا مگر جوئی میں نے بھڑکی
 صاحب کو اور ان کے معرکوں کو ذرا قریب سے دیکھا یہ سچا اور ہو گیا۔ یہاں کے ایک
 جلسے میں ہونے والی ایک بولی تقریب میں یہی ہی ایک چھوٹا سا معرکہ ہوا۔ اسی
 اچھی طرح یاد نہیں رہا کہ وہ قابل تصور قیصر مرحوم تھے یا کوئی اور صاحب تھے۔ بھڑکی
 صاحب سے یہ معرکہ کچھ بڑھا اور بھڑکی صاحب نے اپنے آپ پر لگائے گئے اعتراضات
 کے جوابات بڑی پامردی اور سلی اور احتیاط سے دیے۔ وہ تو ایک انداز میں — مگر
 اسی سیرانگی اور مہذب انداز میں جو بھڑکی صاحب کے مزاج کا حصہ ہے۔

بھڑکی صاحب کی شہری میں بھی ان کا انداز اور انداز بھرا ہوا ہے۔ سادگی
 اور سادگی خاصوں کے علاوہ حکومتوں اور ان کی کارکردگیوں پر بھی انہوں نے اپنے فلسفوں
 پر لکھ انداز میں تنقید کی ہے۔ ان مضمونوں میں میرا موضوع بھڑکی صاحب کی شخصیت اور

میں نہ ہو۔ یہ اس طرح ہے جیسے ضیاء جالندھری صاحب لی ایس ایچٹ بھارتی ایس
 فخر، فخر صدیقی، امیرہ کے بغیر۔ یہ کہ نہیں کہہ سکتے۔ ممتاز ملتی تو دست لگا شہاب کے
 لقمہ نہیں توڑتے۔ کلام علی اور عابدہ پر یہ بات تو چھوڑنا چاہئے بلکہ اب لپٹ لپٹ کر۔ جو اس
 ہے اگر جعفری صاحب پر پابندی لگا دی جاتی کہ آپ نے کسی جتنی ہمارا کام لے کر
 کرنی ہے یا مضمون لکھتا ہے یا پھر خصوصاً نو خیز لکھیوں کے ذکر دل پذیر کے بغیر
 اترا ہے اور خوش دلی کے ساتھ دیکھیں اپنی کری پر آجاتا ہے تو شاید جعفری صاحب کے لیے
 بڑی مشکل پیدا ہو جاتی۔ مگر بننا ہے ہم جعفری صاحب کے لیے کوئی مشکل کھولنا
 کرتے!

جعفری صاحب تقریبات کے بھی مرید ہیں۔ ہر قسم کی صورت حال سے
 نشانہ پائی چھا کر نکل آتا جعفری صاحب کو آتا تھا۔ اکثر تو سڑکوں کو پاروں ٹانے پت
 کر کے آتے۔ مثلاً ایک مشاعرے کے اختتام پر جعفری صاحب کی نہ بھیڑ جیٹا جالندھری
 مرحوم سے ہوگی۔ مرحوم بھی تقریب کے جنگل میں شیر ہر سے کم نہیں تھے مگر اب کے پار
 شیر نری سے پار۔ بہت سے لوگ آس پاس کڑے تھے۔ جیٹا جالندھری۔ جعفری
 صاحب سے ہوں صاحب ہوئے۔ عمر کی بزرگی کا کارہ بھی جیٹا جالندھری کے ہاتھوں
 میں تھا۔

جعفری: جیٹا تم بہت عرصے بعد ملے ہو۔ اتنے روز کہاں رہے؟
 جیٹا: جی حضور حاضر نہ ہوگا۔

جعفری: تم شامی میں ترقی کر رہے ہو۔ اب کے تہذیبی علم ابھی تھی۔
 جیٹا: یہ سب حضور سے دوری کا پیش ہے۔

جعفری صاحب یہ کہہ کر آگے نکل گئے اور جیٹا جالندھری مرحوم بڑی دیر تک
 ایس ایچٹ بھارتیوں سے دیکھتے رہے۔

یہ طبع بظہری کی شخصیت کو اگر ایک لحظہ میں ادا کرنا مقصود ہوتا تو وہ لفظ ہوگا
 جتنا کہ بہت دہن سے بھی اور اہل دہن سے بھی تھی۔ دہن کی نسبت میں جو گیت ہر
 زمانہ بظہری صاحب نے لکھے انہیں چہ کر محسوس ہوتا ہے کہ یہ دل کی گہرائیوں سے لگے
 زبان ایک ایک محسوس جڑا ہوا ہار ہے۔ ان میں علاقائی زبانوں کے تاریک بہار اور
 مہذبہ احساسات لاتے ہیں۔ مگر یہ مہذبہ بظہری صاحب کے دہن میں لہری لگتی
 جلی مہذبہ ہے۔ اہل کے بغیر یہ گیت لکھنے ممکن ہی نہیں تھے۔ ہوا گیتوں میں ادا میں
 رہتی ہوئی یہ مہذبہ کسی کے خوب میں ہے۔ ایک گیت کے ہاتھ بول دیکھئے

مری پاک زمیں۔ مری پاک زمیں

مری نام، مرادم مری ہاں ہے تو

مری بہت مری خوب مری ہاں ہے تو

میرا سکہ میرے۔ میرا خزان میرے

مری پاک زمیں مری پاک زمیں

توے گونگے گراؤں شہروں کو تری تہوں کو تری تہوں کو

چپ رستوں تم میدانوں کو ان کھوں ان کھیلوں کو

کیتوں گروں سے میری کے

چے جھک جھک کر رہی کے

مری پاک زمیں مری پاک زمیں

توے رگے رگے گھاری کے توے رگے رگے گھاری کے

توے گل میں چاند گھری کے توے گل میں چاند گھری کے

مری نام، مرادم مری ہاں ہے تو

مری بہت مری خوب مری ہاں ہے تو

میرا سکہ میرے۔ میرا خزان میرے

مری پاک زمیں مری پاک زمیں

تری ہانگ گھوں سے لہری کے

میری پاک زمین، میری پاک زمین

جعفری صاحب داد سے وہ خوش بخت تھکتی کار جینا تھی سے جس سے جینا
دراغ ایسا لگتی، انہار، ریلے پو نے خوب فائدہ لیا۔ جعفری صاحب نے ہاشم بہت کھوایا
اس سے بھی اہم بات یہ ہے کہ انہوں نے بھی مقدار کو سمیاد، غالب لکھتے تھے۔

جعفری صاحب سے میری ملاقاتیں اگرچہ کم ہوتی تھیں مگر سب کی سب تھیں
لگا کہ میری ان سے بہت ملاقاتیں ہیں۔ انہوں نے بیٹھ بیٹھ سے لے کر نر لکھتے ہیں
ہاتھ پاؤں کے اشارات میں کر لکھتے ہیں یہ سنیں ہوا کہ وہ میری سب کے سب لکھتے ہیں
گو چھوڑ رہے ہیں اور ان کے نام اور کام سے بخوبی آگاہ ہیں۔ ایک لکھنے کے بعد ہی
سے باہر لگاتے جعفری صاحب سے ملاقات ہوگی۔ وہ جیسی کے انکار میں تھے۔

آگے صاحب میں آپ کو آپ کے تیرے مجھ کو کام لکھنے کے بارے
میں یہ وہ دیکھا جانتا ہوں (مجھ پر مجھ لکھتے ہوں پچھا تھا)

بھرنے "جیسی ہی تھا میں تو ان کے اٹھے اشعار میں نے آپ کے مجھ میں پڑے
ہیں۔ اسی ہی تھا میں اٹھے اشعار لکھے آپ کے ہم صبروں میں لکھتے تھے"

اسی طرح جعفری صاحب نے میری کتابوں پر ملاحظہ لکھے۔ میری تقریباً
میں حرکت کی اور میرے لیے اپنی کتابوں میں ملاحظہ لکھی۔ جعفری صاحب کی سادگی
تکریب و پختگی میں منعقد ہوئی تھی۔ لکھے اشعار بہت ناخیر سے ہوئی۔ ہم ان میں
پہلی سے میرا کہ وہ کا کام لکھا جس کے جواب میں جعفری صاحب نے لکھا کہ

میرا صبح و شام لکھتے ہیں صاحب

سلام و ہوا

ساکھو یہ آپ کے صحت سے لے لے شکر گزار ہوں اور آپ سے ہم لکھتے

کہ وہ اسے میرا بان بھرے بہت سے عزیز دوستوں کو امن میں آپ بھی شامل ہیں۔ انکار
 نہ کرے۔ آپ کی دعاؤں سے بڑی تقویت ملی۔ اللہ آپ کو شاد و ہر اور کرے۔

آپ کا عمیر

گزشتہ کچھ عرصے سے پھنری صاحب برادر گلزار ہادیہ کے ساتھ مل کر ایک
 اولیٰ باب نامہ "چند روز" شائع کر رہے تھے۔ پھنری صاحب نے میری کتابوں پر اس پر ہے
 میں نے شائع کیے۔ خود میرے لیے اپنے تجربے بھی شائع کیے۔ میری نوبت سے نوبت
 کے لیے کا آغاز کیا۔ حتیٰ کہ گلزار ہادیہ جیسے عظیم اور عظیم دوست سے میری ملاقات
 کروائی۔ گزشتہ کسی پر ہے میں میرا لکھا ہوا خاک "جدید افسانے کا اکبر اعظم" شائع ہو۔
 جس میں احمد ندیم کاشمی صاحب کا بھی ذکر آیا۔ اگرچہ اس ذکر میں نام کوئی خاطر چلے
 ہوا کوئی جملہ نہیں تھا مگر پھنری صاحب اس قدر عزیزان مرغ انسان تھے کہ اس نوبت سے
 بھی کہ کہیں کسی جملے کے تین اسطور سے بھی اندیم صاحب کے حق ہونے کا امکان نہ تھا
 اگلے شمارے میں "افتخار" شائع کر دیا۔ اس میں جہاں اندیم صاحب سے مطابقت کی وہاں
 میرے لیے بھی یہ لکھا کہ "اگر یہاں ہی کوئی جملہ اکبر میدی کے بارے میں شائع ہوا تو ہم
 اس پر اکبر میدی صاحب سے بھی ایسی لکھاری سے مضرت کریں گے" اس سے ظاہر
 ہوتا ہے کہ وہ کسی قدر "ظاہری خاطر اسباب" رکھنے والے انسان تھے۔ بعض اوقات تو وہ کسی
 چیز آسکتے والے واقعہ کے امکان سے بھی لڑا ہوا نام بولتے تھے۔ اس صورت حال کا
 نفسیاتی تجزیہ کرنے سے میں اراتا ہوں کہ کہیں یہاں نہ ہو کہ میں "صاحب" اور "نوبت"
 ہوتا ہے "کا" "ظاہری" ہوتا ہے "میں فرق کو نہ نہ ہو سکیں۔ پھنری صاحب کے ہاں شاید سنہ قسم
 کی احتیاط کے باعث یہ وہاں بند سے نام لکھا ہو گئے تھے۔ اس قدر کہ نہ نہ ہوں کہ
 کہ نہ ہی رہے رہا ہو سکیں۔ ہاں اگر خبر یہی ہے کہ دوسروں کے جذبات کا انتہائی طور پر
 نواہی رکھنے والوں کے ہاں اس طرح کی صورت حال پیدا ہو جاتی ہے۔

جعفری صاحب نے نظم بھی لکھی نوزل بھی۔ مزاج اور نظریہ شاعری کی بنا پر
 عجیب و شامری بھی کی۔ شخصی مضامین بھی لکھے اور سڑک سے قلم لکھے۔ یہ سب باتیں
 سب باتوں کی اہمیت سے ہر کوئی واقف ہے۔ فن شعر میں جو بڑا کام جعفری صاحب نے
 سر انجام دیا ہے اس سے انکار نہیں، اولیٰ طور پر کلمہ کے حروف سے۔ جوت یہاں تک
 تین باتیں خصوصیت سے کہنا چاہتا ہوں۔ ایک یہ کہ سید ضمیر جعفری کو آج جو مقام حاصل
 ہے وہ محض ان کی ہے پناہ تخلیقی صلاحیتوں اور ان کے کام کے سیرت کی وجہ سے ہے۔
 اولیٰ دنیا میں انہوں نے تمام تر عزت اور شہرت اپنی تخلیقی اہمیت سے کمال اور ان کی ہر
 کوئی چیز شامل نہیں ہوئی۔ فی وی اور رواج وغیرہ انہیں اس وقت حاصل ہوئے جب
 انہوں نے چھپے ہوئے کلام کے ذریعے شعر و ادب میں ایک بڑا کام کیا اور انہوں نے
 رواج ابداع سے خود جعفری صاحب سے عزت و شہرت حاصل کرنے کی کوشش کی۔ یہاں
 میں سمجھتا ہوں دوسرے بہت سے لوگوں کے برعکس جنہوں نے فی وی اور رواج پالیہ سے
 حاصل کی ہوئی شہرت کو ادب میں پیش کر دیا ہے اور اب وہ جانتے اور ناپا کر کھولنے
 لگے ہیں۔ سید ضمیر جعفری نے اولیٰ دنیا میں اپنے حرف کا سکہ چلایا اور اس کے پتھر سے
 کسی میڈیا سے ہر صورتی گوانے کی بھی ضرورت محسوس نہیں کی۔ سیرت اہل سکہ
 محضوں میں تانے اہل نظم نے یہاں لگا کر کسی اپنے لیے وہ شہرت بنا لیا ہے۔ ایک اور بات
 جعفری صاحب کے بارے میں کہنی ہے جو اس سلسلے سے ادا بہت کر ہے مگر زیادہ اہم
 نہیں۔ وہ یہ کہ جعفری صاحب میں ادبی تخلیقات سے متعلق تنقیدی بصیرت بہت اہم کی
 ۔ انہوں نے شخصیت اور اس کے ادبی کام کو جاننا کہ لکھنے مضامین لکھنے کی جو طریقہ اپنی
 بہت پسند کی گئی اور اس طریقہ کار میں بلکہ انداز تنقید نے ایک نئی طرز تنقید کو جنم دیا جو ہماری
 رواجی عالمانہ تنقید کے برعکس صوام و خواص بھی محضوں تک نہیں۔ لکھے محسوس یہ ہوا ہے کہ
 مستعمل میں اس طرز تنقید کو رواج نے گا اور یہ طرز تنقید ہماری رواجی سمجھوتہ انداز میں لکھی

اپنی تہذیب کی جگہ لے لے کر لیا ہو گیا تو اور وہ اب کی کوئی قسمی ہوگی اور ہیں اب
 ہر جہی کے بند بھائیوں کے بارہاں جھگڑوں سے بچا نکلے گا۔ تب امید ہے اور اب کا
 ہر جہی تہذیبی مطالعہ میں بھی پڑھنے لگے گا۔

ان باتوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ جعفری صاحب نے اپنی علم و اثر سے اُن
 دلوں کو متاثر کیا ہے تو اپنی شخصیت کی بے پناہ جھانپسی قوت سے دلوں کی دنگلیوں پر بھی
 اپنے علم برائے ہیں۔ میرے نزدیک علم و اثر کا کوئی بھی کام آسان کام نہیں لیکن شخصیت
 کے ذریعے تفسیر عقوبت کے اور بھی مشکل مرحلے ہیں لوگوں کو پرماتھ کرنی ہوتی ہے۔ ان
 کے لیے ضروری ہے کہ وہ شخصیت کا ہوا بھی دیکھیں۔ لفظ کے ساتھ ساتھ خود بھی دلوں
 میں اثر سے چلے جائیں۔ سید ظہیر جعفری ایسے ہی قابل آواز و تخلیق کار ہیں جو لفظ اور شخصیت
 سمیت دلوں کی پاتالوں میں اترتے چلے ہمارے ہیں۔

مجھے یاد نہیں جعفری صاحب سے میری آخری ملاقات کس سال میں ہوئی؟
 مگر اکا پور سے اسلام آباد میں یہاں کی آخری آمد تھی۔ یوں وہ میرے گھر پر بھی حریف
 آئے۔ میری کتابوں کی تقریبات میں بھی آتے۔ میرے لیے مطالعہ میں بھی لکھے مگر آخری
 دو چار سالوں میں وہ زیادہ تر کراچی اور امریکہ میں رہے جہاں ان کے بیٹے تھے۔ ۱۹۸۴

اب بھی وہ یہاں آتے ہیں ملاقات کے لیے جاتے۔
 جعفری صاحب سے میری آخری ملاقات ان چلے نکلے ہوئی جو اسلام آباد میں
 تھی ان کے اعزاز میں منعقد ہوا۔ وہ ایک پتھم جلسہ تھا۔ صحت و عزم۔ اور ان چلے کا
 کاروبار تھے۔ خصوصیت سے مجھے یاد ہے کہ یہاں ہوا تھا کہ سید ظہیر جعفری صاحب کی
 زندگی کا آخری جلسہ ہو۔ میں اس لیالہ کو یاد دار اپنے اوراق سے ایک کر ۵۰ کرے
 جاتے تھے وہ یاد دار آج بھی ان کلیات کی نویسی کو کسی نہیں کہتا ہے کسی ایسی
 کتاب میں نہیں کر سکا مگر یہ یاد جاتے تھے۔ علم و اثر سے ہی تھی۔ مگر یہ یاد جاتے

سے منکر بھی نہیں رہ سکا۔

بھٹری صاحب گھر پر تو ایسی بود و باش میں رہتے تھے جیسے ہمارے اہل اپنے گھر پر رہا کرتے تھے۔ مگر جلسوں میں خوب تیار ہو کر آتے تھے۔ اس جلسے میں بھی ہمیں پہلی گھر کے آئے تھے۔ میں بھی ہل میں حاضرین میں بیٹھا تھا۔ بہت سے لوگ ہڈ نہ ہوسا کے باعث ادھر ادھر کھڑے تھے۔ کچھ مٹی لادنے میں گریہوں پر بیٹھے تھے اور منکر نے ان سے کہا تھا۔ جو بہت احوال احوال تھیں۔ خاصی دیر کے بعد جلسہ دعوت ہوا اور بہت سے لوگ بھٹری صاحب پر اٹھ چکے۔ وہ کئی ہی دیر اپنے مانتوں میں گھر سے پہنچے کہ وہم چھٹے نکا۔ میں بھی آگے سے بھٹری صاحب چلے آ کر کھڑے ہو کر وہی سے بازو پیٹا رہے۔ گے نکا کر کے اور کئی دل خوشی کی باتیں کیں۔ حکم جانے کی صورت میں صلہ آور تھا۔ بھٹری صاحب نے میرے دائیں بازو میں اپنا ہاتھ پڑا ڈال دیا۔ وہاں اس حالت میں لوگوں سے چلے رہے۔ حتیٰ کہ ہم بھی جانے کی صورتوں کے قریب آ گئے۔ لکھے صاحب کہے کہا "اگر صاحب لکھے جانے کی ایک چوٹی بنا کر دیں؟"

میں چوٹی بنا کر لایا اب وہم خاصا جوت گیا تھا۔ ہم وہیں کھڑے کھڑے جانے بیٹھے رہے۔ میں نے کہا۔

"بھٹری صاحب یہاں سے نکل کر گھر چلے ہیں اور نکا وہ بیٹھے ہیں۔" میں نے ان سے کہا کہ وہاں پہاڑ کا پہاڑی بارگت ہے اسلام آباد ہوئی سے کوئی ٹرولر کے کابیلے پر تھی۔ بھٹری صاحب نے جانے بیٹھے ہی کہا۔ "اگر صاحب اب تو رات جو رہی ہے، لکھے نکا ہی کہہ رہا ہے۔ وہیں سے لے کر ہر ایک پہاڑ اور آگے آئیں گا تو خود آپ کو فون لکھے آئیں گا اور آپ کے گھر پر نہیں لگے۔ آپ کا گھر تو میرا دیکھا ہے۔ میں وہیں آچکا ہوں؟"

میں نے کہا "بھٹری صاحب پاؤں ہے؟"

کہا "کچا دھوا"۔

بہرہ سٹے ہی بھول سے لٹکے اور اپنے اپنے گھروں کو روانہ ہو گئے۔
 مگر جعفری صاحب تو ایسے روانہ ہوئے کہ پھر واپس نہ آئے۔ اور باب
 واپس آئے تو اپنے سب دھوے بھول چکے تھے۔ بچے بھی اور بچے بھی۔
 مگر جعفری صاحب آپ نے تو مجھ سے پھرے مگر آنے کا پکا وعدہ کیا تھا۔
 پھر کیوں بھول گئے؟ آپ سے ایسی توقع تو نہ تھی۔

.....

مجھے اچھا نہیں لگتا

مجھے دن ہی کا اچھا نہیں لگتا

دن کو ہر قدم ہے

لوگوں کا دہن بنا ہے

بھی گاڑی، بھئی ریشما

بھی دن سے گزرتا سا بھلی

تا رنگر کو توڑ دیتا ہے

صدا کا، کان کے کھنکھول تک آتا

بہت دھواں ہوتا ہے

کر سٹے میں جڑاوں توئی پھولی

ہر قدم، ہم توڑتی نکلیں

صدا میں ہے سب آسیر ہوتی ہیں

وہ خوشبو جو گل اتور کے

رہم سے لگی تھی

تک تھنوں کو چھوٹے سے بہت پہلے

تھکی، اچھل کی سر ہڑول کی بو

پھلوں پھولوں کی لاشوں کے تھنوں اور

گھر سے اٹھنے والی لڑکے ہلکوں سے

کے بل کر جب اک چیز مٹی ہے
کہاں خوشبودار مٹی ہے

مجھے دن بھر کا اپنا نہیں لگتا
کہ اس دن لاکھوں بچے
سر بردار ملق کے بچے کے
اعد سے لگتے ہیں
بہینے ہیں

مجھے میرے دن سے نوح لہنا پڑے ہیں !!

◆◆◆◆◆◆◆◆

عجیب کشمیری

جہاں ہم نے گیت بوئے تھے!

نرسا جیروں والے جنگل
 اور کالے پتھر والے تالاب کے آس پاس
 جہاں ایک دلانگہ دریا زور مارتا تھا
 ٹیپڈیاں پانی میں اچھلتی تھیں
 دوسرا کے تارک الوطن ٹھنکی تیر رہے تھے
 ہانگے اسی جگہ
 ایک جھونپڑے کے پاس
 جہاں سبز پان سنگ بھاری تھیں
 اور ایک عورت سر پہ ڈاکری رکھے کھڑی تھی
 ہاں ہاں مکن اسی جگہ
 یا پھر کئی کشتیوں کے آس پاس
 دوسرا ہر قریب ہی کسی جگہ
 ٹھکیں یا ڈاکریوں کے کنارے
 تلوں کے اوپر
 یا لٹھوں کے گھروں کے نیچے
 یا کھار کے گوشوں کے نزدیک
 جہاں گل سال (داگنی سے) پیلے
 ہم رہیں جا کر
 ایک لیے میں سوتے تھے
 وہیں کئی کوئی جگہ تھی
 جہاں ہم نے گیت بوئے تھے!

تہسم کا شیری

دیکھتے رہنا

ایک لہ

اور اس لمحے کی اوت سے
بھاگتے رہنا
ایک عمل کا

دیکھتے رہنا

سہاں ہا سہاں
اس عمل کا
جاننے یا اوجھنے ہونے

رہل گاڑوں، پلٹ گاڑوں

بند کروں
اور توڑ دیکھیں راستوں سے ا

اسے دیکھنا

اور با مطوم سے تک دیکھتے رہنا
اندھروں میں موسم تپاں جا کر
دھبوں میں پڑے گرا کر
اور سرد راتوں میں گیلی اواز گرا

•••••

سونامی

ہری بیٹی
 ہری آنکھوں کا جارا
 تکیٹی آرا
 وہ امریکہ میں رہتی ہے
 رفیقہ زہت اس کے آفتاب اشرف
 جو بن کر روشنی دیا میں اس کی جھکاتے ہیں
 تو اسی صوفی، زارا (جوڑواں)
 ہیں پانچ برسوں کی
 کھی باک پنتے پنتے گھر کے ہیں افراد
 ہر دم شاہ اور آپا رہتے ہیں

ابھی چند دن ہوئے جب صوفی، زارا کو چار فون پر
 تو اس کی امی نے کہا "وہ کبھی منزل میں ہیں، آتی ہیں"
 وہ جب آئیں تو پوچھا میں نے صوفی سے
 "ابھی تم دونوں نہیں کر رہی تھیں کیا؟"
 "نہرا نک بک میں "سوہی" نکالی تھیں"
 سوہی اس طرح چہرے میں آیا ہے
 کہ یہ بچے سے بڑھے تک
 ہر اک ذی روح کے فم میں ملتا ہے

سونا ہی کا عرک زلزلہ ہے
 جب سمندر کے ہون کو گدگدا ہے
 تو آگ طوفان اٹتا ہے
 سونا ہی آگ پانی میں لگانے کا فیلو ہے
 سونا ہی کے مٹا ہون سے
 خنس و خاشاک کی صورت
 سر سامل پہ آہوی کی آہوی
 سمندر نرہ ہوتی ہے

سونا ہی ایسا عنصر ہے سمندر کا
 کہا جاتا ہے جو برسوں میں آتا ہے
 مگر آتا ہے جب تو آگ تیا مت ساتھ آتا ہے
 سونا ہی کے نتیجے میں لقی و حق یہ جو نکلتی
 جو اتر ویشیا میں مشرق پہا کر گئی
 دنیا میں لگا اٹھا گی ہے
 نگر کرنے سے اس پر آگ سے آسمان کے بدلے ٹون لگانا ہے

ہزار خورق کی کھی سونے کے ہون میں
 کیوں کر آئے یہ مگر
 مگر کچھ کم نہیں یہ بھی
 سونا ہی کے ہون سے ہر
 تہہ مدد طلب اس کی ہولی اتنی کہ اپنے طور پر اس نے
 یہی اس جہی کا رقم کرنے کی کوشش کی ا

•••••

اوسب سہیل

ریشم کی ڈور

ہے جھڑے لوگوں میں یاد ریشم کی ڈور

اک دہریا وسالت

اسی وسالت سے

دو دلوں پر لٹائوں گا دور دور ہے قاصد سے

اسی سے آسماں میں دل زدوں پر طراقی لے

میں دیر ہے خوشبوؤں کے چالے کا

اگر یہ ہنسی درمیاں نہ ہو

تو جھڑے لوگ اپنے آپ سے منقطع ہی ہیں

اسی سبب سے جڑا فرسگ پر بھی رو کر

ہے دل سے دل کی محب حضوریٰ

یو کیسے ممکن ہے ہم جسے یاد کر رہے ہیں

اسے نہ ہم یاد آ رہے ہیں

جس یاد کی صورت میں دو طرف

یو آگ دو دلوں طرف برابری ہوئی ہے

♦♦♦♦♦♦♦♦♦♦

بجھتی ہوئی اک شام

اس نے کہا تھا
 دل کی بات سنانے کو
 اپنے اٹک پہانے کو
 اک کافے کی ضرورت ہے
 میں نے کہا تھا
 میں خود ہوں مگر تم
 تمہاری کے روگ کا مارا
 بجھتی ہوئی اک شام کا مارا
 صدیاں گزری
 میں تو خود اک کافے کی محتاجی ہوں
 جہن پار بھی
 اپنے سب کام بھلا کر
 وقت کے کچھ خوشیوں کو بٹا کر
 اس کا دل بہلا سکتا ہوں
 تم سے محفل بنا سکتا ہوں
 کچھ دن تک
 شام ڈھلے ڈاکڑا آؤ گی رات بنا کر

فون چلا کرتی تھی
 بھرے ہرے گھر میں ہو کر بھی
 اکھاڑے کا اور سٹاپا کرتی تھی
 میں انکوں کا مرہم رکھتا
 پیار بھری باتوں کی کوئی شہنہم رکھتا
 وہ کچھ دور میں کھل سی جاتی
 نئی انکوں کے رنگوں میں
 دھڑے سے کھل سی جاتی
 اپنے مساک کے مرکز سے
 تھوڑی دیر کو کھل سی جاتی
 اب کچھ یوں ہے
 کتنی شامیں، ساتھی گزریں
 اس کا خون ابھی نہیں آیا
 اس نے مجھے اب
 اپنا ہم دم، اپنا سہارا، اپنا سہارا نہیں دیا
 شامیں نے جو کئی کام سے پر سرگور رکھا ہے
 کے داسوں کا اس نے
 پاپی ڈاکٹر چکھا ہے
 ♦♦♦♦♦♦♦♦♦♦

مذہبِ جزیر

شامِ بنگامِ توہم ہے
 تصور کے کتلوں پہ بھی
 اسپتالِ اہلاد کے ایام کی
 تصویریں دکھائی ہیں

اپنے لگتا ہے کہ
 زردی سے لگتے تھے نر
 زندگی تھی کساں
 نازیں و شاداب ہوا کرتی تھی
 لمبیاں و ادھ کی جیتی تھی
 بھڑکی ہو
 محفلِ ہست میں
 ہر سوتے رہتے ہیں گت
 سبز و ہلکے پہ کلا کرتے تھے غلوں کے کلاب
 وحشِ آتشِ ہوا کی ملے تو کہا
 کوئی دردِ نامگی کے نام سے واقف بھی نہ تھا

کچھ مہر تھے نہیں ملا کے مہر کے
 روپ کی گہری میں حکمت کے سارے کچھ

آج پڑوں پہ مسرت بھی سراپد ہے
 وحشِ آفتنِ اوقات نے
 اوقات کے شعلے پیچھے
 ہر طرف موت کے جواں نکھی کا لہرا
 سانس لینے سے کھل جاتے ہیں اڑتے بھیجھی
 اڑن تہذیب کے سینے میں سو یافتہ زہریلے جذام
 قافِ گھنٹام کی آہاری کو لے ڈوبے ہیں

وقت کی گواہی سو کے بے
 چار سو گوجے لائے راتے
 نئے پیگیز سے ہمارے شاہ
 آہن ہوشیا کے شب وچ
 کھنکھن تکبِ غلب کے
 فسون کا رنگ لے ہیں کہ
 سرسام کے سرٹھنے ہیں
 گولتے مہرِ آہیب کے غولنی پہ
 آدم خانِ غلرت کے لے
 قفلِ اہو بھی ہیں
 زنجیریں لگا

لہجہ کی گہری مٹی ہیرا پ کے لہجے آئے
 لہجہ لہجوں کے لہجوں کا

ذرہ کھنڈ راحت کے لیے
 چار سو شکلوں کے پٹے بھی گے ہیں دیکھو
 کس قدر خون بہا ہوا ہے
 آنکھیں چھرائی ہیں ماٹوں کی
 نکالنا ہوا رسوم اسوان
 اپنی اگیم کی مسواچ
 کہاں بیٹھے ہیں
 ذرے ذرے سے لگتے ہیں اندھیرے چھوڑا

ندی ماٹوں میں، ہوا میں
 جلو شرق میں
 جب مغرب میں
 روپ کی گری میں
 شہت کے ساگر میں
 میری مسجد میں
 آپ کے صدر میں
 دیکھا نور سے اسے چاہوں
 میری نکل میں
 آپ کی چادر میں
 ❖❖❖❖❖❖❖❖

شاک (Shock)

کتھا بخش

دعہ زبیب، سہا، تیرا پیرا ادا تھا
 سبز پہاڑوں، گتے درختوں
 چٹے، چشموں اور نریے بھرنوں،
 اندر سے ٹوکنی بریا ک
 کتنی خالم، کس درجہ شاک ہوا ہے
 کے فرقی

کے فرقی

ہنٹے نئے گھروں میں پار پختے پتے
 اسکولوں کے بچوں کی آنکھوں میں کھوا مصوم جھنس
 بازاروں میں آگنی بیجان نہ سکا نہیں
 ماؤں کے سوتوں پہ فریڈاں خیر دعا نہیں
 اور مہارت گاؤں میں مہارت کی تیب فریب نہیں
 تیرے سیلے پر ان جا بھاری، بھرتی

نولے آخر

اک شوقالی برہمی

اپنا قریب کہاں آتا رہا ہے

سب سوال لگاؤں آگے

تک میرے ساتھ ہو

پھر وہاں دنیاوں کی

ساری خوشی قال جہاں پہنچے

رہتا رہتا رہتا

دل چاہی کی شوق آواز میں

رہتا رہتا رہتا

♦♦♦♦♦♦♦♦♦♦

علیٰ غازی

خودکش

بیہوشی ہو کر بیسالی

مرے ہوائی

ہندو، مشرک و ملحد کی آدم کے بیٹے ہیں

ارادہ ہی ہات تو سن لو!

میں خالی ہاتھ سوچ کر رہا ہوں

خبر سے دلجو

مرے ہاتھوں کے دیکھناں میں ابر سے تڑپتے

سوت کی واضح علامت ہیں

مجھے معلوم ہے کائنات کی فطرت ابد کے نواز بدلے کی

مگر اس دن کے آنے میں بہت سادقت باقی ہے

گیہری میرے ہاتھوں کی بتاتی ہیں

کہ میں باہلی حاضر ہوں

مجھے جیب ارضی میں قدم رکھنے سے پہلے ہی

پلے ہاتا ہے دلیا سے

جہنم کو بھانسنے کی کہاں مہلت مجھے ہو گے؟

زمین، دن اور سے اٹلی ہی نہیں طاقت

کہ تم نے اس کے دستے میں کی دلیل کا والی!

اترتے ہی پلے جاتے ہو
 درخ میں
 کوئیں سے تلی پانی کی ضرورت تھی
 مگر تم نے چاہیں آگ کی اس سے نکالیں
 اور مرے زخموں کے پانے منوں میں جلا ڈالے
 زمین ہاں کے کوئیں (پانے کو سیراب کرتے) تھے
 امر جہن سے نکالتا
 بیٹھ جس نے ہم دلوں کے پانے کو دیا اور
 تائیں اور ہاں سوئیں جلا کر ہم کوئی میں
 مگر تم نے مجلس ادا ہے
 اس کی درودیا تھی بہت دیر لو اہل زندگی کی سرخ راجت

پست چاہوں گا
 اور اگر آگے جاؤں
 اب مرے ہونوں سے گلوں کے جھانے
 موت کا بارود اپنے گا
 ♦♦♦♦♦♦♦♦♦♦

آفسر شاکس (After Shocks)

اب کے برس بڑے کھو ہیں
ایک عظیم فراق کی برف پڑی ہے
سہاروں نے

کافوری قبریں اڑھکی ہیں
سسی قدم کا نقش

کوئی دھنسا ہوا پاؤں

کوئی پھلکا ٹنڈہ

کوئی کلاہری

کیوں بھی نہیں

کیوں بھی تو نہیں

سارے میں

اک مہر اکی

بے مس جاکے ٹوک

دیکھ رہی جھرتی کے بیچے اوپر

مہر اکی

مٹلیوں کی مری پڑی خاموشی

کش مکش کے دوران

(1)

مجھے یاد ہے، تم لائین ہاؤس میں بھی ڈنچی چڑیا کی طرح گرنی تھیں
میں نے تمہیں ہانڈوں میں ہانڈھا
ہوا میں اڑایا

اور برہمنوں سے کھلتے ہوئے دل کا اسیاں ہوا،
میں نے غم کے دہانے میں ایک دوندے کو طلب کیا
میری اہرتی ہوئی آواز میں بڑوں کی آوازیں سوار تھیں
میں نے اپنے آپ کو ہوا میں معلق کیا
اور بلاستی ہوئی ریوگلی کو کام دی۔

میں نے مضمونوں کو ہوا میں کتے ہوئے انصاف کی ترقی سنبھالی
میں تمہارا کھو گونے والا تھا، قدیم بھوک میری روح سے ہانک اٹھی،
جس نے اترلی سے حساب بفریوں کا تاجہ اڑھا دیا تھا
وہ کور جب میں اپنے لیے کواہل بن گیا تھا، اہلست کی آگ میں جلی رہا تھا۔
میں نے آزادی کی کور سے دکھ کا حرا پھرا
تہذیبی بدگمانیوں کو ٹھٹھے وراجیوں سے دکھاتے ہوئے اور گل آرائیوں

علا کے سارے راستوں سے جہازوں کی طرف کھلتے ہیں۔ میں نے سدا کا زہر

یہ میری راست روی تھی،

میری روح کسی بھی طرح کے موت سے خالی تھی!

ابھی نومبروں شہر کی ہلاکی پر ریل ٹھکن آ رہی، میں ریل کے اگلاڑ میں

پلٹے پانچوں پر تیرا سفید دیکھا، ہوں گا

میں وہ سب دکھ دیکھوں گا جو ایک روشن ضمیر کروڑوں کی دنیا سے گزرتے ہوئے
دیکھا ہے!

میں بے دھڑکی میں وحیدہ ٹکرات کی دنیا میں گھوم جاتا ہوں

رات گئے تنگ ستاروں کو اور یہ وہاں میں اٹارنے کے لئے دیکھا ہوں

میں نومبروں شہر کی تھیلی کا امیر ہوں!

(۳)

میں ابلی ہوئی داروالت کی بنگ لکے کے سے آجک سے لارہا ہوں

غیر مرقوم دریافت کے غلوں سے ادلی تعلق ہے

میں نے، لکھ کی تھیلی سے ہاتھوں کو کسی کا

دکھوں کے خالی جہان کو صدا دی

آہلی راستوں پر سرو کے موتوں سب لکے

میری یاد میں سے آگے سفر نہیں کرتی!

میں لکے کے تمام تر ساز و سامان سے آواز تہاں میں شعریات کی تھیلی کر رہا ہوں

ہر لفظ کروہ یافتہ چاہتا ہے!

میں نے سفید کے ہر کھول دیے

جب تصور میں جدائی کے سچ کو چلنے ہوئے دیکھا، جس نے متحرک دل کو روک لیا تھا
 آنسوؤں کے پیرے شعلوں کی طرح چمک رہے تھے،
 مشتعل ذہن سے رو رو رہا ہے اپنے آپ سے آشنا ہونا ہے،
 میں ہوائی شہر کو الوداع کہہ رہا ہوں
 گم شدہ ساحل سمندر حیر کر مجھ کو، سکھا دیں گے!
 ڈکھتی رنگوں سے بھرا ذہن مقدر ہوا ہے
 میرا سارا دکھ مصیبت کی دین ہے!
 ہوا الوداعی گپ کے بچنے والوں میں میرا کوئی دوست نہیں ہے!
 بچا ہوا ذہن اختر دانوں نے تیری سہمی کو بکڑ لیا ہے
 زہر آلود جہازوں کی بیخبر تانی ہوئی کہیاں غلغلہ کر رہی ہیں
 شعلہ ہار نکالے حیرتے ساتھ دوست ہیں!

موسموں کی طرح گزرتی ہوئی زندگی بدعت کے ساتھ بندھی ہوئی ہے
 میں زندگی کی کمان سے نکلنے ہوئے نظموں کے معانی چھین کرنے والا تھا
 ذات کا اثبات آسیب بن کر پٹ گیا،
 میں نے عیب اقلیت شہر سے محبت کی ہے جو بدبودار دنوں کا وہاں رہا ہے
 دنوں کی دلدل میں نومولود شہر کے قطعی ہمارے دم توڑتے رہے ہیں،
 میں ہوائی شہر کی ہم آغوشی سے بھاگ کر اپنی حفاظت میں ہوں
 میں نے اپنی ڈور پھیروہ مدارج کے حوالے کر دی ہے جو روٹنی کا طواف کر کے لوٹ آتی ہے
 میں اپنے رنگ کا جو جھانکے مشتعل آب دہا میں ذہن رکھ رہا ہوں
 اور دل میں غلطی کی طرح سکوت اختیار کر رہا ہوں

ذنگ توڑنے والی منصوب بندی نے عمل کی قوت مٹا کی ہے
میں سیلاب سے بچ کر نکلا ہوں تو اس میں سے بھٹ کر وہاں کو توڑ گیا ہے

کئی نکتہ کے دوران میں اپنے آپ کو جاگتا ہوا محسوس کرتا ہوں
ستاروں سے چھدی ہوئی رات لفظ کی شاخوں سے نکال رہی ہے
میں اضطراب کی خدای آوازوں کو چھو رہا ہوں
رگوں میں قیام حرکت کے سوا کچھ نہیں
میں بد یقین لہجے سے معمولات کا آغاز کرتا ہوں
میری آواز کے قصورات میں ہر قسم کے جھٹ آوازوں کا لگتے کرتے ہیں!

♦♦♦♦♦♦♦♦♦♦

سليم آغا قرظباش

پچھے مُردا کر نہ دیکھنا

مرشد نے

تکلف شہادت اٹھا کر کیا

اسے ہانا چاہتا ہے

تو پچھے مُردا کر نہ دیکھنا

اس نے یہ چاہتے کہہ میں ہاتھ دلی

پھر ایک ہاتھ دلی رات میں

اس کی کھوج میں لگی ہے

ہر جگہ اس نے

صرف ساتھی کی چیزوں ہی

تھریں ہمارے رہیں

طرز کے دعوائے

سہو جس جہل کے کاغذوں کی طرح

اس کے کھوں میں پیدا کرتی رہیں

تھیلے اور آفتاب

سنگے کے چھانے

سراب کے مانگ

اس کے قدموں پچھے کو سرنگے رہے

گمراہی کی تڑپ نے

اسی کے حوا میں
 کائن کی رنگ آمی
 تاریخ کو اپنے تویا
 دان راست کا ڈونگی چاری رہا
 کبھی انور میرا اجالے کو بڑب کر جا
 کبھی اجالا، انور میرے کا سینہ چاک کر
 راتوں کی بھر میں آتی ہائی رہیں
 گھر میں کا سطر چاری رہا
 پھر معلوم نہیں کس وقت
 آسمانی اور گھسے قوس کی کے پورے
 وہاں چوب رنگ کی طرح کھنڈے کا
 پھر بھی ..
 گرج، اکتا، ڈکڑا
 ڈکڑتی بھرتی سانسوں کا
 لودی میں چہ
 منزل میں ہوم کی چاب
 قدم قدم چہستا رہا
 آخر ایک موڑ پر اچانک
 وہ اپنے اندر پاتے
 بھاری بھر سے لٹوڑ کا کر گر جا
 سو رہے ہوئی ہو گیا

جہاں تھے یک

ہوں ہی بیت گئے

اور پھر ایک جا

یا پھٹے،

اس کی آنکھوں کی پتلیوں

چراغوں کی یہ نکل بسوں سے

آنکھوں کی صورت آگ آئیں

برائی سے ہاں ہوتے ہی

اس نے آنکھوں کے دریا سے

جھاگ کر غور پر نظر دلی

تو اس نے دیکھا

ہر طرف گڑ سے زہنوں کی

لاٹی ہوئی دھول اور مٹی کی

سوتلی مٹی ہوئی مٹی

صحت کر کے وہ اپنے

فلت و جھوک

پانوں میں سینکا ہوا اٹھ بیٹا

جب ایک سرکل سرخائی کوسا کی باٹھ

اس کے دل میں بچے مڑا، بچے کی خواہش

ہاگ اسی

مرشد کی خدمت جہاں ہی اسے پارت رہی

حیف ترین

یاد کے گنبد نورانی کیوں ہوتے ہیں

مجھے تم یاد آتی ہو
 سدا آگے کے گمراہوں میں ڈوب جاتے ہیں
 وہاں آسمان کو
 کسی بھری سی تھالی میں کوئی درد نہیں کر
 درد سا لگ جاتی ہے
 بھاتی ہے... تھکتی ہے
 حسیوں کو کرتی ہے
 کہڑوں دائروں کو زندہ اسود جاتی ہے
 جہانوں کو — زبانوں کی گل کر سکتی ہے
 نور اپنے ہی نور کے گیت گاتی ہے

تمہاری یاد آتی ہے تو خوابی رنگڑوں ہے
 گتہ میں ہی کے کرتی ہے
 ہاں میں تو کتے موسم
 دھنک دنگ ایسے پہلوں میں
 ہی دنگی جاسا کر
 دلت کی ساتوں زہری کی پیر کرتے ہیں

تھیں پانیوں میں لگتے ہیں
 زمینوں آسوں کو گھیلوں میں قید کرتے ہیں
 جب ناریہ منظر، خوشبوؤں میں صید کرتے ہیں

تہاڑی پڑ آتے ہی
 ہوا کی گود میں بیٹھے ہوتے
 خواہیہ ہڈیوں کا نمو آہا ہوتا ہے
 گزرتا وقت، نورانی جہاں میں ہوتا ہے
 مکان ہر لہو سے آگ تہاڑی دین ہوتا ہے

تہاڑی پڑ آتی ہے
 زمیں بے لطف لگتی، آسوں بے نور ہوتا ہے
 وجودی لا وجودی دائروں میں
 خواب پھٹنا پھر ہوتا ہے
 جو کچھ میں سانس لیتا ہے، وہ کچھ سے ذور ہوتا ہے !!

•••••

خواب میں جلتی رہیں آنکھیں

جلی پھر شہر کی گلیوں میں آہستہ ہوا ایسے
کھلے روز

کڑکیاں دابو گئی

ہوا اٹھے ہوتے

دھوئی میں گم

تھکی خواب میں ڈوبی ہوئی آنکھیں

چٹوں کی پلٹ چہرہ میں ہو گئی

جلتے رہتے تھے

ہوا جلتی رہی

اس خواب میں جلتی رہیں آنکھیں

•••••

ابد سرائے میں ایک لمحہ

ہماتے ہیں کی شدت مگر قدم ر
 جن زمانوں کی برتوں پہ چلتے ہیں ہم
 ان میں آئے ہوئے رنگ کھاتے ہوئے
 خواب بچھوں کے آوار ہیں ہر قدم

خواب
 جن کو گناہ تک نہ تھا وہ بھی
 ثبات پار سے بھی اتارا ہوا وقت ہو جائیگی
 خواب جن کو نہیں تھا وہ لوگ زمانہ پہ
 آگ دانی گھٹن بن کر گھسیں جوت ہو جائیگی

منکھاتے جہاں کی حالت میں کہیں
 دانی نام کا کوئی منظر نہیں

دائر سے ہیں غلط
 ایک نکتے کے اطراف بھیلی ہوئی
 سرور صدیوں کے انہار سے بھرتے

دائرہ توڑ کر کوئی راحت زبان و سنان کو بھی
 سلیوں میں دھڑکتے ہوئے کا ناتی اہلے میں سے آئی ہے
 اس ابد سرب راحت کی پرچھا گئی نے
 بھولا ہے ہمیں

مسکراہٹ

دوسرا خوب یا فقیر مسکراہٹ کی
 قسم کی تو یہی ہے توں مسکراہٹ کی
 آتے پڑے ہی نہیں کسی طرف سے ہوتی ہے
 صورت میں فقیر مسکراہٹ کی
 علامت کا تلف نہ سمجھ سے کوئی سوال
 ہی ہوتی ہے وہ تصور مسکراہٹ کی
 جو کل تھا آن ہی ہوں تو کیسے برآمد
 ہوتی تھی پے ہے تاثر مسکراہٹ کی
 طوراً سچ کی مانند لگتی ہوتی ہے
 جب وہاں میں غور مسکراہٹ کی
 کسی کو علم کہاں صرف لب کی جھلک ہے
 کوئی ہنسنے والا جاگہ مسکراہٹ کی
 نہ ہنسنے کوں ہے وہ جس کے میں مقابل ہوں
 کہ مجھ سے لگتا ہے زخم مسکراہٹ کی
 دیکھو کہ جتنا ہی ہنسے وہ تھک پڑا ہے مگر
 ہل نہ ہنسنے کی نظر مسکراہٹ کی
 نظر نہ دیکھوں اس سے کہ وہ ہل ہنسنے
 تصور مرغان ہے توں مسکراہٹ کی

بوجھ

کیا لڑو؟

قرقر کیسی؟

انسانوں کی جان کے دشمن

ہو جاتے ہیں گھر کے اگلے

الت پلٹ دیران

سوچ تو یہ ایسا نہیں ہے

دھرتی تو عداوت کا م

جس کے چلے یہی گتے

انہوں کے کام

ہوتی ہے ہر چیز کی

میر کی

پرہش کی

سے گھر جاتے

سے نہیں ہو کر یہ ہوتا ہے

سے وہ جاتے گھر

توڑی زانیہ جاتے تھی

سے وہ جاتے تھے

ایک برائی، پاپ بڑا ہے
تو جانے بس اور جو تو گی ہے
لہذا جو جاتا ہے چاری
تو قرقر کی گینت طاری
♦♦♦♦♦♦♦♦♦♦

جوانانِ پاکستان

تم نے رہن کیا آج ہم رہن
میں جہاں وہ حسین ، حسن

ہم کہہ گئے کہ ہم جہاں
ہم اپنے رہن کی جہاں

” قوم کی آگ کہ رہتی ہیں “
” ہم کے ہم کہ رہتی ہیں “

” قوم کے ہم کی تم ہی قوم “
” اپنے جہاں کی تم ہی قوم “

.....

وقت کے جوا خانے میں

خواب سے کے دریا —

صدیوں بار بچے ہیں تو کیا

اک ہنزی اور سکی

پانا پھینکیں گے ہم

عین لمبوں کی خاطر

جب کھتوں میں سر پہنائی گندم کی دالی دالی

سورج اہل سے بی اٹھے گی

جواہل کی فصل کڑے پانی کا دائرو پی کر بھوسے گی

خواب سے کے دریا —

خمرے کیے ساحل کی نکلی بار بار سے دیوں میں

اک آگ لگاتی ہے

سو تیری پہاڑت میں

تھیل ہی تھیلوں گے

جو اجوارا مارے کھینچے آئے

پانا پھینکیں گے ہم

اپنی آتی نسلوں کی نوخیز عمروں کا

♦♦♦♦♦♦♦♦♦♦

وقت کی ایک باسی قاش کا قصہ

دو بے انت دستہ کہ جس کا نہ کوئی بدہوش کوئی لڑل ہے
 ہر بڑھے خداؤں کی مکتا سے ماری کہیں لم سے ہمارا اور ہیں کی طرف ۲۰۱۱ جا رہا ہے
 اسی راستے پر زمانہ زمانہ قسم تا یہ کس وقت کے شو میں آ رہا ہوں
 کہ جس کی ولادت کا قصہ ہے وہ ایک زور واپسوں کی اور وہ انکوں میں ہوں
 مگر یہ سنا ہے کہ اب وہ بڑے ہی تقار سے یک رنگ سے اچ رہتے آ رہا ہے
 وہ وہی وقت آج اپنی انکوں رہو اسے کی انکوں میں
 خود اپنے سے ہاتھ کرتا ہے اور قہر پار آ رہا ہے
 خود اپنے انکوں کی شوق میں کھانہ تہی ہر شہنوں کے ہارہ دکھاتا ہے
 یا پھر اپنا تک ہی ہے یہ اپنے حالت ہمارا کر لڑی کی انکوں پر یہ ہاتھ ہے
 ترقی پسندی اور تجارت اور صنعت اور پانی کی ساخت اور پھر یہ انکوں کے ہاتھ ہے
 بھلا وہ بڑے سے آگے تیاروں پر انکوں کے ہاتھ
 انکوں کی پانچ کے نکلے دکھا کر
 ہاں ہی ۱۱ سے ۱۱ آگے ہاتھوں کی صورت ہی ۲۰۱۱ ہے
 کبھی پانچ پانچ کے ہاتھوں کے ہاتھوں پر ہاتھ ہے
 اپنے جوتے ہاتھوں کے ہاتھوں پر ہاتھ ہے
 میں میں ہاتھوں کے ہاتھوں کے ہاتھوں پر ہاتھ ہے
 ہوتی ہیں ہاتھوں کے ہاتھوں کے ہاتھوں پر ہاتھ ہے

بھی اپنی کرسی کے بازو پہ گھونے چلا جا ہوا بڑھئی کے کسی غلطی کو

بڑی ہی شہارت سے اور پلا کرتا ہے

اور پھر بداشت سے اعلان کرتا ہے کہ اب یہ میرا زمانہ ہے، میں اس کا نام نہیں

سواں سیدے کی قسمت میں جو کچھ بھی ہو گا مرے دم سے ہو گا

ہو آئی، گھٹائی مری سختوں کی سزاوار ہوں گی

یہ ایکسویں راتھ اسے ٹیک پر اٹھی مہم کی جیتوں کے جلو میں

گلا فیسوں کی یہ بیگ لگاے نبھائے وہ کیا ہو گے جا رہا ہے

یہ بگ بیگ کا ایک دن ان بچا

یہ کیا جاتا ہے؟

اور پھر کہ یہ وہ ہاتھ کی گلیاں

وہ عطار روپی کا صندوق اور وہی

وہ سونے والی دھتلا

اور پھر وہی اور وہی اور وہی

یہ سب گزریے وقتوں کا الگ کھوکھلا وقت ہے

اسے کیا خبر ہے؟

کہ اس کا یہ ہونے لگا سحرے اسماں کا زائید ہے

+++++

اجنبی

میں چمکتی ہوئی ہیں سڑکوں پر
 چلتی بھرتی ہوئی غلقت سے ہم آجک نہیں
 اجنبی زمین پر قہر کئے ہوئے ہے جس پٹے
 جانے کس دام بدگیر میں بکڑے ہوئے ہیں
 کون ہاتھوں میں ہیں لادریں ان کی
 صبح ہوتے ہی نکل آتے ہیں بازاروں میں

دو ہی آوازیں ہیں
 "سور کور، بھن بھن" (ان کی مرقوب لہذا)
 میں یہاں آیا تھا، کج خواب کے
 نونی ہاتھوں کوڑھے ہوئے گلن کے لیے
 کسی کا جمل کے لیے
 جو کئی قرن سے ہے تاب ہے ان آنکھوں میں رہنے کے لیے
 ہر آہ میں جو رہتی ہیں

کئی چہرہ لاش ہے لکڑے کے آگے
 رنگ لہراتے ہیں اور خوشبو کی دھواں ہیں جب سستی میں
 شب ہے ہا میں یہ روشنیاں

ان گھٹ ساروں کو لاکھوں ستاروں سے فزوں

ایک مدت سے یہاں رہتا ہوں

تیرکا : ہوا پہ شہر پہ لایا ہے انہی تک پھر گئی!

اسے مرے سوز و درد!

کیا انہی کھیتوں، انہی کے گھر و عودوں

کی طرف لوٹ چلوں!

❖❖❖❖❖❖❖

فہم شمس کاظمی

8 اکتوبر

پاکستانی کے سالے میں سولی ہوئی تھی یہی
اور دیکھو ان سے بچے

ساتے ہانگے روئے

گھڑکیوں سے روٹی ترقی رہی لک پانوی

تکسلی تھی نو روایت کا لفظ ہوا

اوپر لے ہر لفظ وہ نہ کر چکا

روٹی کا موٹی سے تھی وہی

وہی عزرائیل نے

کر دیا سب بھوکا

وہ جو سنے میں تو اسے میں دیا

اور تکیں اپنی ہی گھر میں دیا

اور جو اسکول بنا

پھر کسی دیکھ کر آؤ تکیں

وہ تو سب تک اچھا پوچھا گیا

تکوں، پھولوں، پتوں، آجکادوں سے

تکلی تکیں

ہیں آجکادوں میں

توہوں کی تکیں تھیں

دیکھا ہی آجکادوں

آجکادوں میں تکیں تھیں تھیں

ساتے ہانگے روئے

اور تکیں پوچھا گیا

چاندنی کے سائے میں ہولی ہولی تھیں بہنیاں
جاگیں تو جہاں رہ گئی

خون میں ڈوبی تھر

ہیں کرتا لوگو

دھول میں لپٹے ہوئے منظر تمام

اور ہوا میں موت کی خوشبو ایسی تھی

زندگی سفید تھی

مفلون تھی

موت سے کب مر گئی ہے زندگی
پھر بھی

اپنے سہارے سے بھی

پھر بھی

ہر مت لہرا کے بھی

زخمی آنکھوں کو دکھائی اپنے خواب

دلوں پر دکھتی گلاب

شتر سے زخمی نہیں ہے زندگی

کاسم سے تھکنی نہیں ہے زندگی

موت سے مرنی نہیں ہے زندگی

+++++

تہذیب اور تمدن

زُرواد

قرآن کریم

پیکر سے ہم

میں کے وہ پائے تھے

بہت دور نکل کے

پھر کی پڑا ہے

بے زات گلے کی آس ہے

نہالی کے دن رات ہے

تفصیل کی مسلسل روایت ہے

ہمیں سب کو بھلا ہے

وہ جو کما ہوا ہے

کسی سے بڑا ہے

روئے کا نام ہے

بھلا دیا اور — زہر نکل کے

۰۰۰۰۰۰۰۰۰۰۰۰

منظر آباد بہت خوبصورت "تھا"

بڑی جاہ تھی مجھ کو اتنے ہی سے
 کہ خیم کنارے ہوا آسٹیاں ہو
 ہوا سخی گلیوں گھون سے ہوا ہو
 اور سامنے اس کے خیم دہاں ہو
 وہ جہزوں کی جہل اور موجوں کی مستی
 میرے ساتھ چیرے تو میں نظر خواہی ہوں
 بڑی سچ ہو تو اس کے ہوں روشن
 ہوا دن ہو اس کی دہائی کا منظر
 میری شامیں راحت کا سر نہاں ہوں
 ہوا تن بدن اس کے رنگوں کا میدان
 بڑی خاموشی اس کی مدد نہاں ہو
 ہے سدا + زوی اور مجھے بھیلے
 کہ سب سے الگ ہیں ہوا اک جہاں ہو
 میں خیم ہی سوچوں، میں خیم ہی ہوں
 وہ خیم کا کھڑا ہوا تخت ہیں ہو
 خوشی اس کا میں اٹھا وہ میرا جہاں ہو
 ہے کھڑا ہے تھا وہاں کی زبان سے

"بڑی پانچس کم میر ہوتی ہیں
 مگر مجھ کو اسباب آئے میر
 کہ لیلیم نکالے گا میرا اک مگر
 گو دیواریں اس کی نہ تھیں مرمی بھی
 نہ شان اکیڑی تھی نہ رنگ اہری بھی
 وہ مگر تھا ، نہ بھوک کوئی نکال تھا
 نکل گو نہ تھا ، ہے میں لٹا جہاں تھا

بری دانتوں بھی ایک دانتوں ہے
 میں باقی تو ہوں ، ہے برا مگر کہاں ہے
 اسے میں نے دھوڑا تو کہا ، خاک پلا
 بری بہت تیر تھی یا لاشوں پہ سلا
 کہ اب قرب سے اس کے گھبرا رہا ہوں
 میں مگر سے لگی کر گھر جا رہا ہوں
 نہیں بیکہ جا ہے ، لگے بھی تار
 اسے لیلیم کی مہر اسے تم سے گواہ ہے
 ہے کچھ ہوا ہے ، کچھ ہوا ہے

روانی شہادی کی مگر = خدا ہے
 سر میں بھول جانے = ساری کہانی
 سب کا بولینا = ہونے کی جہانی
 ہاں کا وہ خوف آپ کی پانچس

تو سن ۱ میں نہیں بھول پاؤں گا ان کو
 تو اپنی ہی کوشش کیے جا رہا ہوں
 قدمے ساتھ میں بھی ہے جا رہا ہوں
 سو دیکھیں کہ کب چلی آئے ساتھ
 ہو شاید وہی میرے احباب کا گھر

میں تعلیم کتاب کو مگر جانتا تھا
 غلط جانتا تھا ، مگر جانتا تھا
 اسے خوابوں کی بہتی ٹو اک خواب ہے اب
 اسے پڑھوں کے مسکن ٹو خواب ہے اب
 قدمے خواب دیکھوں گا ، مگر نیند آئی
 میں احباب دیکھوں گا مگر نیند آئی

♦♦♦♦♦♦♦♦♦♦

ایک میں اور ایک تو

ایک میں اور ایک تو
 جیسے گل ہوا ہاں کی تہ
 اک گلاب اور ایک تو
 دلوں چہرے نہ ہو
 نور سجوا رکھ کر
 ہوئی ہیں آگسٹیاں ہانہو
 ہاتھ صرف آگسٹیاں لے کی
 راستا ہے تو بہ تو
 میں نے تو نہیں تھی
 ہاتھ بھر گئی ہیں تو
 ہاتھ چپ رہ کر
 میں نظر کی جھنگو
 جی پ جگ جگ
 اور تو تیری سے
 ہارے نظر ہیں تیرے
 ہاں چاہ تو ہی تو

© 2000-2001

زندگی

میں اس قرطاس پر کہے
 سجاؤں لفظوں کی ڈولی
 نہیں ہے ترہاں کوئی
 کہ مجھے یاد کی بولی
 رہتی اس پار کھائے ہیں
 بہن سے زلم کچھ ایسے
 کہ کار میں لگا ہے پھول
 کانٹوں سے بھری مہولی



خاموش کہانی

کبھی ہوں تو

اک سادوں مہری دنیا تھی
 جہاں لٹا نہیں گیت بھی کافی تھی
 بہار گھسار کے اتراتی پھرتی تھی
 تنہائیوں میں بھی آواز تھی۔ پیکر تھی
 اک لہو۔

صرف اک لہو تھا بادلوں کا سبب
 اور اب لٹا میں سانس کی بھکار تھی
 خوشیوں کی بھکار تھی
 لمبے ہے، دھولے ہے
 زندگی ماتم کٹاں ہے
 اور آنکھیں دیران ہیں
 اور صبرے خواب جن میں جم گئے ہیں
 وحشت ہے تنہائی ہے
 خاموشی آہوں کی گہرائی ہے
 دم توڑتی دہا کٹاں ہیں
 اور صبری امید ہیں

ہزاروں کو کاٹتی ہیں

مگر کوئی پاسہاں نہیں

سے اٹھتا ہے، سب بے جان ہے

سوت ناچتی پھرتی ہے مگر

راجہ نہیں رہی نہیں

ساتھی نہیں اور اب

کہانی نہیں، کردار نہیں

♦♦♦♦♦♦♦♦♦♦

ہر شام اداس.....

ہر شام اداس کر کے بھی
 دیرالوں سے اترتے ہو
 غزالیوں سے وہ ہو کر بھی
 پرچھائیوں سے اترتے ہو
 ہاں وہ ہل گیا شہ
 موسم ہل گیا ہو کہ
 تم شوق رہ رہ کر بھی
 بدنامیوں سے اترتے ہو
 وہ نہ تم کو مل سکا چین
 قسمت کا نہ کس سے
 بھٹی تو ابھی حالت ہے
 تم اپنی سے اترتے ہو
 ہاں کہ وہ خوں ہے
 بعد مانتے بھی ہیں کھین
 راہ بیت ہو چلی کر بھی
 ترپٹوں سے اترتے ہو

.....

ربِ عظیم

آرزوئیں کی کڑی گزریں
 جب چاروں اطراف سے گھیر لیتی ہیں
 ان سے چوستے پریشانیوں کے کبرے کاٹے ہاں
 ہر خوشامی کے اندھیرے نکھیر دیتے ہیں
 بے چینی کی بھوار بنانے لگتی ہے
 رستے سب کھو جاتے ہیں
 منزل بھی سراپ ہو جاتی ہے
 تب اپنا کس سے ہی اپنے قریب
 بڑی سوجھ بکھڑ کی کاغذ کی احساس
 اس کاہلی چہار میں چمکا ستارہ ہی کہ
 نکلے رستہ دکھاتا ہے
 اور نکلے رستہ دکھاتا ہے
 اور نکلے رستہ
 آرزوئوں کے آگے
 اٹھ جانے کا یا غمگینوں کے
 ہیبت کی امید دکھاتا ہے۔



موسم ہے بہار ، آب و ہوا اور ہی بہار ہے
 یک طرفہ محبت کا جزو اور ہی بہار ہے

ہاں لے تو کبھی مجھ کو کیا اور ہی بہار تھا
 لہجے ، لب آ کے بنا اور ہی بہار ہے

جیسا اور طرح رنگ تھا گل کے تریبے
 اور ، نواچے پھر تو اور ہی بہار ہے

ہے باغ تو پہلے ہوا دیکھا جا ، لہجے
 گل اور طرح کے ہیں ، کیا اور ہی بہار ہے

جیسا گل سمجھا تو رہا ہوں بہت لب تک
 اس پر مری عورت پا اور ہی بہار ہے

جیسا دھندلا ہوا تھا اسے اور طرح کو
 اور ، اس کی رہائش کا جا اور ہی بہار ہے

کچھ اور کا تھا مجھے وہ یہی شعر میں
دیکھا ہے دوبارہ تو کا اور ہی کچھ ہے

بارش کوئی ہونے کو ہے کچھ اور طرح کی
اس شعر پہ یہ اور اٹھا اور ہی کچھ ہے

مہماں تو ، ظفر ، آتے ہی رہتے ہیں کم و بیش
اس گھر میں ، مگر ، سچی کہا اور ہی کچھ ہے





سارا عالم توڑ کر پھر سے بنا دیا جائے گا
 کون ہو گا، کس کو یہ منظر دکھایا جائے گا

پتلیوں سے بھی زیادہ پست ہو گی یہ زمیں
 آسمان کو لود بھی لود اٹھایا جائے گا

خلاق پر دکھا ہوا ہے جو چرائی دہائی
 کیا اسے بچنے سے پہلے ہی بھلا دیا جائے گا

لود اگر مخلوق آدم پھر سے ابرائی کی
 خود کشی سے کب تک اس کو بھلا دیا جائے گا

بے ہوشی کی اک نئی ہیروئن کی اس کو پہلے سے خبر
 پہلے کیا ہوش سے پہلے چلا دیا جائے گا

اپنے ہی منظر میں خود تصویر بن جائیگی کے لوگ
 آجیہ ہر آنکھ کے اندر لگا دیا جائے گا

دوست کئی بنائے گی ہر سڑک میں دھار سے
 گد ہوا ہے ہم کو نظروں میں ملایا جائے گا

ہم اگر چاہیں کہ لوٹ آئے وہی حیرت کی لہر
 کیے ہاں جو کو داپس بلا جاے گا

کوئی مجھ جیسا نہیں ہے تیری مخلوقات میں
 راز کن میرے ہوا کس کو بتایا جاے گا

دیکھ کر جس آگ کو شہزادہ خوش ہوتے ہو تم
 تم کو بھی اس آگ کا ایسٹن بتایا جاے گا





حکمن زیادہ ہے کہیں ، بس سزا زیادہ نہیں
جنہیں سزا ہے انہیں بھی سزا زیادہ نہیں

وہ راستے ، وہ سزا سزا تو اب ہے کیا
کہی جو آگہ تو دیکھا سزا زیادہ نہیں

ملاں ہی کا گزرتی خواہ سے کیا کہا
ملوں میں کہ جڑ سے ہارے زیادہ نہیں

کلی کہیں ہے مگر کس قدر تکلف سے
نوا کے موسم کھی ، نوا کے زیادہ نہیں

میں نہ ہو کہ قسے میں رو پہ وہ سکر
یکہ ایسی کم بھی نہیں ہے ، اگر زیادہ نہیں

نوا کے جتنا ہے غراب راجوں کے قریب
نوا وہی ہے مگر توں کو زیادہ نہیں

قیال ، دھبہ ہلت آہیں کو چھان بنا
پتہ نام سے ہشت ، وہ زیادہ نہیں

❖

آفتاب اقبال شمیم

ابھی کچھ میں ہوں جو دل میں ہے کہ بھی نہیں سکتا
یہ نظم آگیا تھا ہے میں اسے سہ بھی نہیں سکتا

یہ میری مسکراہٹ تھی وہ آٹھائی ہے
بہت دن صحت گریہ میں نہیں تو وہ بھی نہیں سکتا

یہ کیا لمحہ سا فلم کا آ کر ہے میرے رستے میں
دہلی سے برا دور غم پر بھی نہیں سکتا

وہ چاہے تو اسے اک آن میں زبردستی کر دے
مگر اس سے زیادہ یہ نکال دے بھی نہیں سکتا

ملا خواب ہے اسی گھنٹوں کا چکا ہوں میں
نئے مکان کے پاس میں جگہ کہ بھی نہیں سکتا

•••••

✦

اس کی دھن ہو تو جب شام دگر بنے ہیں
اک نہیں دل میں کی خوب گر بنے ہیں

ہم کہ اک ام کے سانس میں رواں ہیں وہ
اس گلیں دار میں س رنگ کے دار بنے ہیں

وقت ہوا نہیں ہوا یہاں وہ
سوج نہ سوج خسروں کے بند بنے ہیں

شوق دہاؤں میں چھپا نہیں دل آگوں کا
اس مسافت کے چلا بھی سڑ بنے ہیں

اپنے ہونے میں بھی لگا جو نہیں ہے اپنا
س کی تسکین کے لیے مہب اہر بنے ہیں

یہ تو آفت سردی ہی کے لہو کی لڑ ہے
وہ کب کب کھو گات میں نہ بنے ہیں

~~*~*~*

تو ما کوئی صورت نہ دیکھی
م اپنے قریب کیے آئی

ایک اپنے جہاں کی آند میں
وہ وہ کے ہی گئی میں جاگئی

جانے ہی نہ میں کوئی دیا
جہاں مرے دل میں چھائی

اک دم اہلے کی میں میں
جی گئی گئی چھائی

توئی کی غنسی بھی کیا ہیں
م نہ جہاں نہ جاگئی

سہل کے سکوں میں کیا جاگئے
نہا میں ہی سوچ کی جاگئی

نکل ہی طرح م نہ ہوئی
ان پارگی لو کو دیکھ آئی

✦

اسے پانی کی طرح تھو کے مار آ سکتا
جو دکھائی نہیں دے گا وہ کھر آ سکتا

دیکھ سکتا کہ جو دکھ تھا وہی دکھ ہے وہم
کوئی دے گا میں مار مار کر آ سکتا

کھس سڑول کے درپوں کی طرح کھل سکتے
ہاتھ مار آتے وہاں کھر آ سکتا

وہرا تھا جو کھڑا ہری ہستی کی دہلیں
نہیں پھر تو تھا وہ کال کھر آ سکتا

ساتھ رہتا نہیں ضرور اس کی نگہن پہاں کھر
بہتے رہتے ہیں مار کوئی کھر آ سکتا

✦✦✦✦✦✦✦

صدائے آشنا آگیا سے اُسے گئے ہیں
 ہر اک دنگ ہر اک آواز پا سے اُسے گئے ہیں

بھی اُسا ہے سنا ہر اک تار تک جان کو
 بھی پہنچے ہونے شہر خواہ سے اُسے گئے ہیں

لڑتی خواہی ہوئیوں کے لپٹے سے نہیں اتری
 ہر کچھ لگا مرنی دعا سے اُسے گئے ہیں

کوئی ہرزہ خوشیوں کے لہارے میں نہ دلی ہو
 قریب آنے ہوئے سب جہاں سے اُسے گئے ہیں

فنا میں نکل گیا ہے زہرےاں ہاتھاری کا
 مٹل گزری بھی ہو فنا سے اُسے گئے ہیں

•••••

•

ہاں تو حسرتوں کی پہنکی
 زندگی کسی طرف چلی ہی نہیں

آج کل زندگی کہاں ہے تو
 آندھ لے رہی ہے بگول

پھر وہی جڑ بھٹیوں اپنی
 پھر وہی لم ہے وہ بھٹی

پھر کے تو یاد آئے کہ
 تھی کبھی آپ سے شکایتی

جا بے آپ کوئی بات نہیں
 آکر تھی بے غریبی میں میرا

پتھروں میں کیا کمرے تھے
 زندگی کی رہی ہی کبھی

•••••

قبول خانوں میں چکے اپنا وقت ہے کریم
مگر کہ آئی دیکھا تھی تھے ما کریم

اپنا شیوہ ظہر مگر آئے مہمان ہ
استعمال کیا کہنے ہی نہ چاہا کریم

سب سے تھی مری سوا کب تک جاتا ہے
رکھ آئے ہیں تھکنوں میں آیا جا کریم

پوری خاطر آگ سے م نے آگ چلانی کی
آخر تھ گئے آئے اپنا آپ چاہا کریم

آج نہیں نے انگری انگری ہی کہہ پائی گئی
اب سے کب کہیں اسے مگر میں چاہا کریم

میلے آلا پکا اور مہدی اب تم دیکھئے آئے
دل ہی دل میں پھرتے تھے اور سے کریم

.....

۵

رشتوں پہ نہ تھو کی ہوا تک کہنے کی
 چھڑنے ہوئے پیاروں کی صدا تک کہنے کی
 اہصاب پہ چھڑے نہ ملتا کج سطر سے
 لوٹے گا جان لہر تھا تک کہنے کی
 مت لوٹ کے جاہو اسے آواز سطر میں
 چھڑے گا تو اک ایک ہوا تک کہنے کی
 اتنا بھی اسے یاد نہ کر شام گریہاں
 شبے کی فضا نے نہ تک کہنے کی
 کیوں ہونے ہو رہا جان جو رہاں سے
 = جاس کا سوام سے کتا تک کہنے کی
 پر جس شہوں میں ابھی تیری نہیں آتیں
 نیند آئی تو میرا ہا تک کہنے کی
 خون اس کا تھلک سے بے جہاں کہنے کا
 اک نڈا سے اپنی بجا تک کہنے کی
 خون سر سے اگر وہ تو مراد نہ جھلا
 لہو وار اگر ہو تو ہا تک کہنے کی



ہری سرگزشت سمجھ لو میرے مکان سے
میں یقین ہوں جو اچھ گیا ہے مکان سے

کبھی لفظ ، معنی کو ساتھ رکھ کے یہ سوچنا
کہ کہیں کیسے الگ ہوئے ہیں مکان سے

میرے خدا سے وہ مغرب تو نہیں مگر
اُسے خدا ہے کہ کہوں میں اپنی زبان سے

کوئی حل ، کوئی نظیر ، کوئی بدل نہیں
گرتے خداؤں ہی مندر ہیں جہان سے

مجھے آ کے دیکھ لو تیرگی کے ساغر
کہ میں بار بار ہوں روشنی کی گلاب سے

•••••

♦

مجھڑ بھی دو لب اس لئے کہ
 کون کتنا ہے دل جگانے کہ

پہن پیٹھ لیا ہوا آ کر
 دل ترسا ہے سکرانے کہ

ہم روئے سب جگانے اپنے ہی
 آپ کافی ہی جگانے کہ

مٹنے کے کہ وہ جیت رہا
 کس کے نہ ہرے نکلنے کہ

ہم تیرا ہی ساتھ لے لے گیا
 دیا دالے کے جگانے کہ

آپ اپنے ہی جگانے کی طرف
 آ کر دیکھیں دیا نکلنے کہ

کرکل (ر) سید مقبول حسین

سائس لے سکا نہیں ہوں میں تیرے حصار میں
 تو نے مجھ کو جان دیا ہے کوئی ایسا ہی

ان میں رو کے مجھ کو تجھنی کا دکھ ہوتا نہیں
 بس بھی توئی ہے مجھ سے یاد ان ایسا ہی

کون کہا ہے کہ ہاتھوں سے گریوہ دیا کہ
 کوئی بڑھائی بھی ہو سکتی ہے اس ایسا ہی

تو بھی آیا تو کر اپنی تھنی کے لیے
 تھنی دیاں کا نکلتا ہے بل ایسا ہی

لب تو پڑا ہی بھی تھا گھوم کئی ہیں زخمی
 کیا ہی آؤ جا سے ہفت کی رفتار ہی

بند کر دیں دیکھ لاکھ لاکھ ایسی سائس سے ہے
 جیسے مادی کر گیسے کی تھلا سے یاد ہی

۵

نظرت کا کھلا شہر میں بازار کا ہے
 اس جینے کا بازار بھی تو بازار کا ہے
 ہوتی ہیں مہارت اگلی پر تو یہ ہندو
 ہندو جو مانگے ہے تو ان کا ہے
 حق سبھی کسی گلی سے کم نہ تو لگے ہے
 پورا کسی گلی سے بھی یاد کا ہے
 گرتے ہی نہیں دار بھی پیر تو سما
 انہوں سے ملا جب بھی آکر کا ہے
 یہ تھا نادیہ سے کہ پڑھتے ہیں کہ
 ہر ایک گیسے کہے سے ہزار کا ہے
 ہے کون کہے سنا، علم کو جو مہا
 ایک سر ہوئی صاحب ہوا کا ہے
 ان شہر میں انہوں کی کوئی بھی نہیں
 ہر گلی میں ملتے فریاد کا ہے
 حق سبھی کے لینے کی مہارت نہ ہوا
 ان گلی کے ہیں، انکی پڑا کا ہے
 کہ بار سے ملے کی تو ہے شہر تو
 ہندو کہ دیکھ کر سر ہوا کا ہے

۵

اسی گریہ جیم نے لکھے مار دیا ہے
 ہاں دینا ہنم نے لکھے مار دیا ہے
 آنکھوں میں سٹ آیا ہے برسات کا موسم
 اشکوں کی بجائے جیم نے لکھے مار دیا ہے
 مرے لکھے راتی ہے گر موت سے پہلے
 اسے مار اترے تم نے لکھے مار دیا ہے
 بے آپ رہا کرتے تھے جوا بڑے آگے
 اک فقرا جیم نے لکھے مار دیا ہے
 جو کہ تھا بڑا دم کہ تو ساتھ رہے گا
 اپنے اسی دم تم نے لکھے مار دیا ہے
 ہوتی ہے لڑتے ہے سو نام لیا نام
 اسی لکھی نام نے لکھے مار دیا ہے
 اسی لکھی سے جسی نام بڑا چاند بچھا تھا
 لکھی اب نام نے لکھے مار دیا ہے
 لکھی جو بھڑکی سے کسی سے ہو لکھی کیا
 جب لکھی ہی نام نے لکھے مار دیا ہے
 کیا یاد کر کے جوتے دلوں کا جوتا
 کچھ لکھی ہی نام نے لکھے مار دیا ہے
 لکھی ہیں اسی لکھی کے سامنے ہی لکھی لکھی
 ہیں لکھی کے جوتے نام نے لکھے مار دیا ہے
 یاد ہے کہیں لکھی کے آنکھوں کی بھاری
 جوتے جوتے نام نے لکھے مار دیا ہے

۵

جب نظر آتا ہے گلشن میں مہا کا دیکھ
 لڑکھ لیتا ہے دل وہاں مہا کا دیکھ

جو کجی میں بھی کھلی ہائے سر رو شب
 مہا کا ، اڑتے ہوئے دل مہا کا دیکھ

ہم کر لہ جنوں ، ہم ہنسے جیسے عشق
 وہاں کب آیا ہمیں طی مہا کا دیکھ

ظہور شب میں چمکا ہے سرے اندھنگی
 تیرے پاؤں سے ، تیری لہ کا دیکھ

جو کجی مگرے پڑے ہیں گلزارے اسرار کے
 جہ جہ مہا کا اب کے ، مہا کا دیکھ

ہم ساری ، مگر کیا نہیں گنا گنا
 یہ سحر ، یہ پہلی ہے لہ کا دیکھ

اک قطرے سے نوا ، یہ فون سے گونگا
 جاتے جاتے سے گونگا مہا کا دیکھ

•••••



وقت کے سانچوں میں اچھلا جائے آپ زندگی
 گاہے گاہے ہجرت گاہے گاہے آپ کتاب زندگی

پہل کی تھکنیں بھی اور ہجر کی راتیں بھی
 ہیں انہاں اور سرگت ہے کتاب زندگی

کس سے سونوں کو بدلے تیری پہنائی ہے
 آج کہاں ہے رنگ ہوتا ہے کتاب زندگی

جڑوں پر غم سے رستے ہیں کے منظر
 کب کہاں فتح ہو گا یہ سراب زندگی

انقلابی عہد کے کچھ مراحل سے ہوتے
 اب بھی شاہد پھمکی ہے کتاب زندگی

تو کہ زندگی کا کوئی عہد ہی نہیں
 اور یہ ہے کہ یہ ہے کتاب زندگی

زمانے کو دکھانا ہے مگر اس سے نہیں کہا
 اب اس کو بھول جانا ہے مگر اس سے نہیں کہا
 وہ بچہ دھیان کا اس کے لیے لب و لہجہ کیا
 حتم یہ نورا ہے اعلیٰ ہے مگر اس سے نہیں کہا
 اڑانے ہیں پرندے اس کے دل کی منڈیوں سے
 یہ صودہ بھی اعلیٰ ہے مگر اس سے نہیں کہا
 کھرتی اپنے ہیں قرین کے منظر اپنی آنکھوں سے
 اسے بھی آزمانا ہے مگر اس سے نہیں کہا
 اب اس کے سوچے جیسے سے لگتا ہے اسے ہاں
 کہ اس سے دور جانا ہے مگر اس سے نہیں کہا
 مراسم توڑنے جیسا ہے کہ اس کا دل نہیں ٹوٹے
 تعلق بھی کھانا ہے مگر اس سے نہیں کہا
 بے موسم میں اس کو دیکھنا ہے ٹوٹی، توڑی ہو کر
 بڑھا، سمٹا ہے مگر اس سے نہیں کہا
 وہ بھروسے کی تہائی میں دل کے سارے ماحول
 اسیے سنگھار ہے مگر اس سے نہیں کہا

•••••



کہاں تک اور اس دنیا سے ڈرے ہی چلے ہوا
بس اب ہم سے نہیں ہو گا کرتے ہی چلے ہوا

وہ میرے نام کا اک دم جو کئی نے گویا ہے
وہاں جگہ اور ظہور، اس کے بھرتے ہی چلے ہوا

یہاں آنسو ہی آنسو ہیں، کہاں تک ہلکے پھولے
جو اس ہستی سے گزرا تو گزرتے ہی چلے ہوا

وفا، آشنا لوگوں سے ملنا بھی اذیت ہے
جو ایسے ہو، تو بھولنے سے اترتے ہی، چلے ہوا

میں اب تو تم میں اس بات سے بچا ہوا ہوں
تمہارا ذکر کہہ کر کرتے ہی چلے ہوا

کبھی کیا میں تو تمہاراں بات، پھر ان دنوں ہوں
جو بھرا زور ہے لہجہ، اگرتے ہی چلے ہوا



پڑھو

یہاں مرنے کو مجھے نزل بھیجے ہے
 وہاں کی کھال کو اس کا نزل بھیجے ہے

اسے یہ نزل کہ تمہاری بارگاہ ہے نہ کسی
 اس کے تو مجھے وہ نزل بھیجے ہے

پہلے مجھے نہ کسی پہلے نزل کے
 قوم اجاتے ہی بار نزل بھیجے ہے

وہ جاتا ہے ہرے شہر کی دولت کو
 سو دیکھے اسے کب نزل بھیجے ہے

رہتی ہوتی ہیں وہ بھی ہمیں ہی ہے
 نزل کے وہ بھی مجھ کو نزل بھیجے ہے

.....

یہ شب سے جو سو رہے تھے وہ ہے
 کھانا کھا کر اکل گئے وہ ہے
 دل ایک تگ سے تھا مگر لڑائی سے
 جسے جہنم سے اتنے دُشمنی میں اچھا ہے
 یہ جو خاک ہے تم سے جو چلتے ہو
 اتنے سہل سے اس کو اسی نے پا ہے
 جہاں کوراہوں کے ہم جہاں ہیں چرائے
 جہاں سچ سچا کا یہی اچھا ہے
 جو دل کی آگ میں چکا ہے آگ کی آہ
 جہاں سچی کا کوئی جہاں ہے
 وہ جہاں جس سے دل وہاں پہنچ جاتی ہے
 جہاں کا نام اسی جہاں نے اچھا ہے
 وہ ایک لمحہ کو وہ جہاں میں تم تھا
 جب آگ سے لڑا وہ جہاں ہے
 جہاں سے جہاں ہے یہ جہاں کا چکر
 جہاں سے جہاں ہے یہ جہاں کی آگ ہے



لف پہ جتنے ہیں جہ سے شہر سے ہزار
 لگن نہ ہائی کسی ایک عمار سے ہزار

تڑی چوٹی کا موسم بھی خواہت ہے
 کھے لکل رہا ہے شہر سے ہزار

کسی بھی وقت پہ مگر ہنگے وہا ہے
 دکھائی دینے لگا ہے شہر سے ہزار

وہاں اُتے ہے ابھی تک ہرے نقاب بھی
 عریں کے بھول کھلے ہیں بہار سے ہزار

جسے گرم سے تو ہجر بھی ہل چلتے ہیں
 نہیں ہے جگہ بھی وہاں اختیار سے ہزار

ہرے رجز کا گہد ہے لوٹے وہا
 کھلے وہا ہوں میں اسی عمار سے ہزار





یہی نہیں کہ فقط یاد کرنے آئے ہیں
ہم ایک سر کا جوں بھرنے آئے ہیں

وہ ایک رنگ کھلی ہو جی سے جیسا لگا
وہ رنگ ہم جیسے خاکے میں بھرنے آئے ہیں

ظہور نہ پائی ہم اس بگڑ کی بلندی پر
ہم اپنی نگاہ سے بچے اترنے آئے ہیں

یہ وہ فن کی لوح کتاب سنا کے لیے
یہ گل سراب و ریشم بھرنے آئے ہیں

کا وہ ہے یہ بھی لیے تم کی دہلی میں
ہم اس پہلو سے دامن کو بھرنے آئے ہیں

تو ہے ہون کوئی ہے عقلی لوں کی
ہولی انوکھے حصے میں بھرنے آئے ہیں

کہ نہ تو کھولیں ہولی نہ ہی
ہم کھولیں تو نہ کہنے آئے ہیں



رات بھرا بھرتے کوئی بھی نہ تھا، اک اٹھا اک ہوا
 وہیں ہنسنے تر ہی سنھالے ہوا، اک اٹھا اک ہوا

ایک لڑائی میں سب سہم ہو گئے میرے دیوار اور
 اس خرابے میں اب کئی اٹھ بھرا، اک اٹھا اک ہوا

خفت میری تھی شب ہے کسی میں مری طبعِ تسلیم ہے
 ایک آنسو سڑو ہے لگتا ہوا، اک اٹھا اک ہوا

یہ دیکھا ہوا آفتاب اس کی ہے روشنی کا ٹر
 رات بھر بھرتے ساتھ کرتا رہا اک اٹھا، اک اٹھا

دل کی تازگی بھٹتے ہیں گھے عالمِ خاک ہے
 اس میں کے ہے سر کے سے جاوا، اک اٹھا اک اٹھا

ہم ان کے سے ہے، دل و جاوا سے بنا، ہموند سے ہمار
 ایک خاک بھرا، ایک خرقہ بھرا، اک اٹھا، اک اٹھا

❖❖❖❖❖❖



میر تمنا رنگ سے بھرنے والا ہے
 ایک ہی کا تھے اتنے والا ہے

بھی ہوئی جی ناک پہ جہوں کی آنکھیں
 ان رستے سے چاند گزرنے والا ہے

جس بچے کی دل کی تنگ دھڑوں کی
 لہاب سرے بگنوں پر بھرنے والا ہے

دیکھ رہی ہیں اور آنکھیں اور یہ دل
 کوئی کام بچ ہی کرنے والا ہے

امت ہے جی کاشانوں کو سارے ہند
 سورت بھی ان پار اتنے والا ہے

عاشق کے بچے کی آنک بھرا سائیں ا
 مجھ سے وہ کا پائی بھرنے والا ہے

•••••



بٹے میں کیا لطف ہے یہ تو پھر تم بڑانے سے
 وہاں ہیں کیا تھے ہے یہ سارے بڑانے سے

ہو بھنڈ میں آئی ہے اب پتہ ہوا کمال بہت
 جو ہوا ہے سو بلا گا ، کیا ہو گا ہی کو جاننے سے

گر اس ساری عمر میں ایک بھی لو نہیں سرت کا
 کیسے سوچ لیں ہو جائیں گے ختم یہ دکھ جہانے سے

اب بھی بھرا نہیں ہے تمہارا ہی تو کر لو جو ختم
 دل تو ہار نہیں آنے والا ہے ایسے جانے سے

سچی ہر کہا توں نے خیال ہوا مے عالم کو
 کاش کہ چلے لوگ یہ سوچیں نہ وہ ہے کئی بھونے سے



اداکر ملک سکندر حیات خیالی

♦

جہی یادوں کو سینے سے لگا دیا ہے
تو ہر ہر قسم میں کر اٹھایا ہے

نہ کون بھول کر بھی یاد تم مجھ کو
کہ ان یادوں سے بس دل ہی چلایا ہے

وہ بہت کھلے گا کب مقدر تھا
یہ فلم قسمت میں تھا سو اس کو پایا ہے

بہکی جاتی ہیں ماہیں نور تراب تو
کسی نے اس طرح دامن چھڑایا ہے

خیال ایسے رہوں گا پب بھلا کب تک
برا تمام اس فلم نے بھڑایا ہے

♦♦♦♦♦♦♦♦♦♦



دل میں دھڑ دھڑ کے لہا کی جواں میں
میں بے عمل ہوں اپنے عمل کی جواں میں

میں آج کی طلب میں ہوں اس خوف کے سبب
کتنے ہی کلمہ بچے کسی گل کی جواں میں

پڑتے ہیں کہ زمین پہ دیکھو ہرے قدم
لگا ہوں آج روح نزل کی جواں میں

اک سر میں پھرا ہوں زمانے میں ہر وہ
ہر کلمہ گیا ہے اس کے جہل کی جواں میں

پاکیزوں کا کون لڑو تھا اپنے ہاں
بے سہ میں جا ہوں نزل کی جواں میں

ظہنوں کے پہل پیچھے ہیں اس کی طرف بہت
عامر ہی ایک دلیل کی جواں میں





دوگنی ہیں جری باہری یہ جہم سے گزرتے
تیرا دیوان کہاں جائے ، کوہم سے گزرتے

پیشے رتے ہیں جری راہ میں اکڑتے
اکی امید پہ شاہ آہم سے گزرتے

بھیجا رہتا ہوں انہوں میں اکڑتے
کہی تو ہر برا میری نظر سے گزرتے

میرے علم کو نہ بھی دل میں چکے تم دینا
وہاں میرا نہ کہی دینا تر سے گزرتے

آئے گا دیکھنے اک روز بھی ساحل کو
کئے ہوں گے چیزتے جو ہم سے گزرتے



۵

تہا کیا ہے نہیں تم ہوا ، ہوا نہ ہوا
اسے بھی سوچ کر جو تو تھا ہوا ، نہ ہوا !

تہا ہے ہمیں کی رو میں ہی یہ گئی آگیں
پھر اس کے بعد اگر مہلت ہوا ، نہ ہوا

ہر گئی ہے دیکھوں سے شب کی تاریکی
کسی کا کیا ہے کوئی جانتا ہوا ، نہ ہوا

تہا ہے بس کی ہمت تھی زندگی بھری
میں سانس کو ہی مگر تہا ہوا ، نہ ہوا

تر کا نکات کو وہ ایک ہے ہرے غور تہا
کہ جس کے بعد کوئی تہا ہوا ، نہ ہوا

•••••



نہ دیکھو ہے نہ وہ ہے کئے دار گنا ہے
اک کندہ ہے جو لگا آپ کو گر گنا ہے

تو بچے ساتھ تو ہیں ہر میں گنا، جانے گا
جو ہزار کئے سوہوں کا سو گنا ہے

نہ سہا کئے میں ہر سے نکر سکا ہوں
بھ کو اب لگا بہت سے بھی دار گنا ہے

انگراک عمل خیر ہے کوئی بھرتے بہت تو
اں پہ بھرتے سے حدوں کا ٹر گنا ہے

اں خواں دار میں دم کھنے کا ہے آسن
جلد آسے گی بیاہوں کی خیر، گنا ہے



♦

خیر بھی بات کرو کے یوں وہ کے ملی کا
 ہوتی ہم نے سوچ لیا تھا ماں رگو کے ملی کا

دل کی داشت کیا جانو تم ہے میں بھی وہ سہا بھی
 جہوں کے طوفان کے آگے جاں نثار کے ملی کا

آگ سے رشتہ جوڑنے والا تھا نہ ہوں کا
 تم بھی کون ہی کہیں کہ صدمہ کے ملی کا

جی دن ہم نے تمہیں ہی گردن کھایا گدوم کا
 اوپر والا جس کہ ہوا نام ہوا کے ملی کا

شور کے برآگ سوا پتم نے آگ لگائی ملی میں
 خود ہی سوچا کہ تم کہ سے جلاو کے ملی کا

علم میں کہ کھڑا یہ سہا سوں کا ایسا ہے
 اچا آپ کھارو کے جو تو کہ کے ملی کا

♦♦♦♦♦♦♦♦♦♦

♦

اس کے خواب سے آگے جانا اچھا لگتا ہے
 ہم کو چاہتا ، چاہے جانا اچھا لگتا ہے

یہاں اس سے باتیں کرنا جتنے اکیسے میں
 اس کی بار میں بیٹھتے جانا اچھا لگتا ہے

آگے نزل ہے ، پھر ونگب ہے ، اس پر نسیم ہے
 تھک کر دل کے دل جھکانا اچھا لگتا ہے

وقت سنا ، آئی تھی ، اٹھیں ہر ہر کام
 ہم میں مداح کا ہیں توڑنا اچھا لگتا ہے

میں کے دہلی کی ہائی کولی اس میں نہیں جاتا
 اس کو سوچنا ، سوچتے جانا اچھا لگتا ہے

♦♦♦♦♦♦♦♦♦♦



تو جو چارہ ساز جفا کوئی نہ ہی دور دل کو ترس دے
 بری رویتا تیرا نصیب کو بھی سلیب جاں سے اسیار دے

میرے جذب عشق کا ارتقا ہے بری دکا کا بھی سلا
 کتا جس سے جہلی فراق ہے وہی تیرا دل میں اسیار دے

وہ جو خیزیں نہیں بہار کی دے خارے نام نہ ہو سکیں
 کسی جانی کی سوا سہی کسی باتے کا لہار دے

مجھے دشتوں کے حساب میں کوئی قدر میں کی کتاب دے
 مجھے ساطوں سے کہیں نہ ہے کسی درد نم میں اسیار دے

میں یہاں دل کا ہوں طوفانی مجھے کی پہ زہر قبول ہے
 مجھے دہب نم میں تا کر ، مجھے گلن لوح حرار دے

کوئی نفسی بری سوچ میں بھی کھتا ہوں کے نہ کھیل سکی
 میں ہوں آگہی کے خطاب میں ، مجھے ہے خودی کا اسیار دے

جیسی سکراتے درد سدا ، جیسی دکھ اٹھاتے درد سدا
 جیسی سچ درد بھی کت گئی ہوگی شام نم بھی گزیر دے

♦♦♦♦♦♦♦♦♦♦



دب سے بے خود ہونا میں نے سیکھ لیا
ہر نظر میں کھونا میں نے سیکھ لیا

اس نے آنکھیں پھیریں تو یہ کہی لہذا
دل کا تھس ہونا میں نے سیکھ لیا

تجارت کی ہانسی رت کھات گئی
آنکھوں کے سوا میں نے سیکھ لیا

جیسا کہ لب لباب سے مجھ سے ہوا تو
بیتے بیتے خدا میں نے سیکھ لیا

ظہار اب تک میں نے نہیں سیکھا
ہاں سب کچھ کھانا میں نے سیکھ لیا

مجھ سے تم کی رحمت چھوڑ لیا گیا
سب کا سوا میں نے سیکھ لیا



❖

شب کی تھانوں میں بٹکتے ہیں
اب اہاوں کو ہم ترستے ہیں

ہم سے ہم کو ہزار دم لے
یا اہی وہ کیسے بستے ہیں

چو سکوں میں بیچے ہیں صبر
ان کے سپار کئے سے ہیں

ایک مفرد ہم تو روکتا ہیں
ہم بھی وہ ہمار بستے ہیں

ہم سے دروازہ کرتے جو ناگ ا
مخ پ آوازہ اب وہ کتے ہیں

❖❖❖❖❖❖❖

*
 میری آنکھیں تو نہیں داناں ہری ہوں
 تو ان اشپ میں کہاں ہری ہوں

کیا کہیں دم نہ ہو میرا دل
 کیا کہوں ناگہ اور دھوں ہری ہوں

کبھی ہی سولو ہوت ہے
 تھی آزاد کے نکال ہری ہوں

وہ کہتے ہیں تھی ہوتی کہ
 جلتے ہیں یہ گڑبڑ ہری ہوں

کہہ تم انہوں سے کتنا نہیں
 جانتے یہ کہ داناں ہری ہوں

۵

کہا تھا خواب مت دیکھو کہ جتنا بھول جاؤ گے
کہا تھا دل کی مت سننا ، سمجھتا بھول جاؤ گے

کہا تھا پیار کے سحر سے بس تم ندر ہی رہنا
بھی اس اور مت آنا کہ چلتا بھول جاؤ گے

کہا تھا یوں ہمارے آنکھ سے دیکھ نہیں ہونا
کہا تھا سامنے رہنا ورنہ بھول جاؤ گے

کہا تھا حسنِ ظالم ہے ذرا بچ کر ہی تم رہنا
نہ سگن آئے میں ، پھر ستونا بھول جاؤ گے

ہمارا دل کوئی آدم کی جنت تو نہیں ٹھہرا
کہا تھا اس میں آ کر تم کتنا بھول جاؤ گے

کہا تھا رگور یہ عشق کی دھور ہوتی ہے
کھینچو پاؤں پھلا تو سمجھتا بھول جاؤ گے

یہ جرمناں بن ہے شہزاد کی الفت کے دم سے ہے
یہ الفت نہ رہی تو تم سبک بھول جاؤ گے

•••••

سید عاشق کا مکی

❖

کس نے پیدا کوئی انکسار کی صورت کیا
 کتنا مشکل ہے بری جان محبت کیا

آج ہم نے دنیا محب کے ہوتے دیکھے
 کام آیا نہیں رہیں کاروانت کیا

وہ محبت ہوا جو وہ لگا کی تیری
 عشق عشق ہی وہ معلوم شراکت کیا

ہم نے پایا ہے تجھے سب سے تجھے والا ہے
 دل کی حسرت ہے لگا تجھ سے رفاقت کیا

تجھ سے دل تجھ سے امان سے آباد ہے
 اپنی جان کو برے ہم عبادت کیا

ہم نے ہی مانگے ہو اپنا سونے نام کیا
 تجھ سے ہی اسے تو سمجھا ہے سلامت کیا

ہم وہ ہی بھی تعلق کل آنا مالت
 آہن چوتے کر ہم پہ محبت کیا

❖❖❖❖❖❖❖❖❖

♦

ساتھ سب کے نہ لیں گے ہمارا کیا ہے
 سب کے تہائی میں رو لیں گے ہمارا کیا ہے

تم نے ملکوں کے علاوہ کس دیکھا کہ کسی
 ہم تو لٹ پاتھ پہ سو لیں گے ہمارا کیا ہے

گر میرے ہوا وہ سب جانی میرا
 دکھیاں غم میں نہ لیں گے ہمارا کیا ہے

کھنکھن عشق کا ہر بھول تھرا ہی کسی
 ہم کوئی خار بھولیں گے ہمارا کیا ہے

اپنی منزل تو سراہوں کا ستر ہے لیجانا
 ہم کسی راہ کے نہ لیں گے ہمارا کیا ہے

♦♦♦♦♦♦♦♦♦♦



وہی کانا ہے جو کہ بویا تھا
دل دریاں سے دشتیں کیسی

سب کو اپنی فرض سے مطلب ہے
شہر ہے جس ، دشتیں کیسی !

راحتی تو تھے وہاں میں تھی
ہر موسم میں راحت کیسی

اپنی مرضی کے راستے مان کر
دل میں جیسا اب یہ سر نہیں کیسی

پہلو اسے عربیہ ، اورت سون
ہا پکا وقت ، نظر میں کیسی

•••••



زمیں درخت ہے لیکن لب دریا سے لڑی ہے
ترستی بلند کو ، اور کرم کی ہے زمیں بھری

جڑی رحمت کے دریا میں عالم خیر موبہاں ہیں
یہاں قطرے کو درد ہے کیوں جھکتی ہیں بھری

نتیجہ ہے یہ کاری کا یہ پھر اچھا ہے ۔
جدائی نے جڑی ہر اک طس کر دی جڑیں بھری

نہیں سدا پیمانے جڑی محفل میں داد کے
بھروں میں بھی سدا اپنا ، مگر بہت نہیں بھری



♦
 مہت کی غمیں جا کر تو رہو
 المصروفوں سے دامن بھرا کر تو رہو

مصلحتی لاکھ میں کیے جتے ہیں جتے
 مہت کے دھوکے جا کر تو رہو

نکرتے ہیں اُنسا پر دھوکے لگ کے
 یہ نظروں سے نظریں بنا کر تو رہو

بہ مصلحتی ہے کہ حق میں حق نہیں
 مہت میں لہو کو بھرا کر تو رہو

میں ہوں اگلے کا، مل نہیں بھی
 یہ فکر مہت کا جا کر تو رہو

جہاں کے لئے نہ رہا وہاں کے تم
 لگے اپنے دل سے بھرا کر تو رہو

تہذیبی مہت ہے وہاں بھاری
 تم کو بھی لانا کر تو رہو

♦
 یہ آپ جو مسکرا رہے ہیں
 سو ہم یہاں زہر کھا رہے ہیں

ہے اس کی صورت تو آنکھ میں
 سوال سے کیا ہم مٹا رہے ہیں

ہوائے ناموس ابھی ہیں جلد
 تو کیوں نیا زخم کھا رہے ہیں

یاد ہیں بھنٹے بھی، یہ شب بھی
 چرخِ گین جا رہے ہیں

کسی کی جانب جو طوائف نے دیکھا
 تو شاہان ہی کو جا رہے ہیں

•••••

نغمہ ہائے عرفان (ڈاکٹر محمد سرفراز ظفر)

ترے کو ایک طرہی نظر نے صورت سے تصویر دی ہے کہ خوبصورت ہو تو اچھی نہیں ہوتی اور اچھی ہو تو خوبصورت نہیں ہوتی۔ اسی طرح ترے میں اگر زبان کی صحت، لطافت اور ملی بارکیوں کا لحاظ رکھا جائے تو نفسِ عظموں حجاز ہوتا ہے اور اگر نفسِ عظموں کو تڑپ دی جائے تو زبان کی صداکتیں کچھ نہ کچھ بگڑنا ہوتی ہیں۔ تاہم جس طرح انکی جڑیں بھی ہیں جو ذہن بھی ہیں اور خوبصورت بھی، اسی طرح تیرا نام کو نفسِ عظموں سے قریب رکھتے ہوئے بھی نفسِ عظیم اچھے اسلوب میں چلایا گیا ہا سکتا ہے۔ اسی طرح کا ایک قابلِ قدر کام ڈاکٹر محمد سرفراز ظفر کی تازہ کتاب کی صورت میں سامنے آیا ہے۔

ڈاکٹر محمد سرفراز ظفر پختہ پور کے ایک ماہرین لٹریچر اور اسلام آباد کے شعبہ قادی کے صدر ہیں۔ انکی عقل اور دل کی حریت سے ان کی شخصیت چلتی پھرتی ہے۔ ذہنِ فکر کتاب "نغمہ ہائے عرفان" نام میں ان کے "زبانِ نام" میں سے چھائی فزوں کے مجموعہ ترے پر مشتمل ہے۔ اس سے پہلے ڈاکٹر سرفراز ظفر، نام میں ان کی ایک سو ہی فزوں کا مجموعہ "نغمہ ہائے عرفان" کے نام سے مل چکا ہے اور اسے پتے پتے ہیں۔ تازہ کتاب کی خوبصورت یہ ہے کہ یہ تمام مجموعہ ہے اور فزوں کی ایک کتاب میں لکھا گیا ہے۔ اس حوالے سے "پختہ پور" میں لکھتے ہیں:

"ظفر کا شعر میں تیرے آسمان کام میں اور ذہنی شعر کی حقیقی روح کو کسی اور ہی زبان کے شعری قالب میں اس قدر اور عقل کو اس کی ہے۔ پھر بھی اتنی لطافت اور عقل کی گئی ہے کہ نفسِ عظموں سے احوال نہ ہو۔ عطا و عزیزی اور شعر کو قادی شعر کے ذرا ایک ترانے کے لیے اس کا لہجہ اور لہجہ کا استعمال بھی مل گیا اور لکھا گیا ہے تاکہ نام شعری سادگی پائی جائے۔"

اس کتاب کے مطالعے سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ "زبانِ نام" میں مثال
 فزولوں کے اکثر مضامین وہی ہیں جو فارسی اور اردو فزول کی کتاب کی روایت میں ملتے ہیں۔
 تصوف، حسن و عشق، رنگ و زینت کی آویزش، جبر و معاد، درد و غم، سبکی موشومات، اشعار
 ملتے ہیں۔ فزول کے اساتذہ کے اس خصوصاً اس بات کا اہتمام ملتا ہے کہ شعر میں پہلو
 اور جذبے سے مطابقت رکھتا ہوا لہجہ اور لفظ استعمال کیے جائیں۔ امام شیبی کے اشعار میں
 بھی یہ خصوصیت موجود ہے جسے ڈاکٹر سرفراز فطرت نے لہایت خوبی سے ترغیب میں نقل کیا
 ہے۔ مثال کے طور پر یہ شعر اور اس کا ترجمہ دیکھیے۔

فرخ آن روز کہ از این نفس آزاد شوم از غم لندی دلدارم ، شد غم
 مبارک دن وہ جب اس نام سے آزاد ہو جائیں ، غم آنکس غم بھراں سے اور دلدار ہو جائیں
 بعض اشعار کے ترجمے میں فارسی کے الفاظ اور اعداد کو اسی طرح لکھا گیا ہے
 جس سے شعر کا تاثر بھی خوبصورت ہوا ہے اور نئے الفاظ بھی اردو میں داخل ہوئے ہیں۔
 مثلاً یہ شعر اور اس کا ترجمہ دیکھیے۔

سر غم باد سلامت کہ بہ غمزاری آن روز در پدای عشق تو چہ لہارم کم
 ہو سلامت یہ صراحتی تاکہ میں اس کے طفیل عشق کے پدے میں ایک نکتہ کو لہارم کہیں
 "مخپارہ" کا معنی توپ کا گولہ ہے۔ اردو فزول میں، بہت سی جہتوں کو قبول
 کرنے کے باوجود، ابھی تک "توپ کا گولہ" کے الفاظ استعمال کرنا ہی قابل قبول نہیں ہو
 سکتا۔ تاہم "مخپارہ" اس کا اچھا متبادل ہے اور اس کا سوتی جائز فزول کی زبان کے خاصوں
 سے ہم آہنگ ہے۔ اسی طرح ایک مصرعے کا ترجمہ یہاں کیا گیا ہے۔ "بے عشق کے
 سے ہم آہنگ ہے۔ ہم اردو میں مہوا "ناہرانہ مانے"، "آزادانہ اکلہارہ" وغیرہ جیسے
 فعلوں میں غلطیاں ملایا۔ ہم اردو میں مہوا "ناہرانہ مانے"، "آزادانہ اکلہارہ" وغیرہ جیسے
 مرکب تو استعمال کرتے ہیں لیکن "طفیل کی طرح" کے حنون میں "مخپارہ" جیسے الفاظ کا
 مرکب تو استعمال کرتے۔ یہ بھی ایک اچھے اعداد کی زوجہ کی کوشش ہے۔ فزول نے ترجمہ کی
 استعمال نہیں کرتے۔ یہ بھی ایک اچھے اعداد کی زوجہ کی کوشش ہے۔ فزول نے ترجمہ کی
 حوالوں سے ہم اور توپ سے مطالعے کا متقاضی ہے۔

زبانِ نام سے ہم اور توپ سے مطالعے کا متقاضی ہے۔

تجدیدی بصیرت اور تجزیاتی انداز نگارش کی خواہشوں کی ہیں۔

جیمیل ہسٹ کا اسلوب نثر کی حوالوں سے توجہ کھینچتا ہے۔ میری رائے میں ان کے مضامین کی سب سے بڑی خوبی ان کی readability ہے۔ وہ قاری کو دلچسپی بخواتم اور پرمکھل نراکب کا استعمال کر کے الجھانے اور زبر پار کرنے کی بجائے سہل اور سادہ انداز میں اپنا مافی السعیر بیان کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ خاص طور پر مرادیم، غالب، اقبال، سرسید، اختر شیرانی، مجید امجد، حفیظ جالندھری اور خورشید رضوی کے بارے میں لکھے گئے مضامین ان کے تجدیدی بصیرت کے قابل توجہ نمونے ہیں۔ ان شعراء اور ادبا کے فن پر مکتو کرتے ہوئے بھی انہوں نے اپنی تحریر میں ایسی سہولت پیدا کی ہے جس سے ہر ایک لکھنے یا سانی کلمہ میں آتے چلے جاتے ہیں۔

شاعری اور اس کے رموز پر لکھا جیمیل ہسٹ کو مرلوب ہے۔ جیسا کہ اس کتاب کے دیگر مضامین شعراء کے بارے میں ہیں۔ وہ اچھے شعری تجزیاتی قلمسین کا طبقہ رکھتے ہیں اور ہر دو لکے رائے کا اظہار کرتے ہیں۔ ان کے اس انداز کا تذکرہ سید ضمیر اعظمی نے اپنے ایک مضمون میں کیا ہے جس کا اقتباس ذیل نظر کتاب کے پس منظر پر دیا گیا ہے۔

”جیمیل ہسٹ کو نثر یا تمہا جس سے بہت قریب سے دیکھ رہا ہوں۔ طبعاً ہے جو حدود، پامروت، وسیع الشرب مگر جب اس کی آزادی یا اقتدار ہے ااک الا جا رہا ہو تو ہرگز خاموش نہیں رہتا۔ میں نے اس کو آج تک کبھی کوئی کسی غیر فیصلہ کن کیفیت میں نہیں دیکھا۔ یہاں تک نہیں ہوا کہ وہ اگر چاہتا ہو تو کسی چیز کو اقتدار کے ساتھ دہرا کر سکتا۔“

ذیل آقا سید ضمیر اعظمی، مرادیم، اختر پر ان کے مضامین میں یادداشتوں اور خاک نگاری کے محاسن مومور ہیں۔ مزاج کا لحاظ رکھتے ہوئے جیمیل ہسٹ نے ان شخصیات کے بارے میں معلومات سہا کی ہیں اور ان سے اپنی مکتوں کا اظہار کیا ہے۔

مر گزری ہے سراپوں کا نقاب کسے خود کو پایا ہے سدا وشت کی پہنائی میں
 وہ جن کی سب اور شاد سے نہیں مٹی ہے ان سے کریں اٹھاک بھی تھا کبھی
 مٹن پر داز پستیوں میں کر بھر فلک یوں رفتوں سے ملی

روایت میں رہتے ہوئے صفحہ خود رشید نے بعض اشعار میں ایسا لہجہ روایت کیا ہے
 جس میں ایک جہزگی کا احساس موجود ہے۔ اس سے ان بات کا اشارہ ملتا ہے کہ وہ جدید
 شعری مدحوں پر نہ صرف نظر رکھتے ہیں بلکہ ان کے ہاں اس سے استفادے کی صورتیں بھی
 موجود ہیں۔ یہ اشعار ملاحظہ کیجئے:

بھول ہا تھا راحت گھر کا اس گھر میں پایا تھا دور

دیکھے ہیں جو یہ شام کے جاتے ہوئے سانسے کرنے کے کئی کام کھڑے آئے گے ہیں

زیر نظر مجموعے کی بعض نوزلوں میں مٹی تو صورتوں کے امکانات کو نکالنے کی سعی
 بھی ملتی ہے۔ دیگر شعری وسایں کے استعمال کے ساتھ ساتھ کالج، روایت کے استعمال
 میں بھی اس کے شکاوت ملتے ہیں۔ چھوٹی بزرگی دو نوزلوں سے چند اشعار کی مثالیں
 ملاحظہ ہوں:

کوئی کھیلے گی کلی بپ تو	آوی ہم نے اک بھری بپ تو
ہم نے بارہ قسمیں بہت دیکھا	کوئی اللہ آ پڑی بپ تو
وہ بھی کیا دن تھے کیا زمانہ تھا	وہ ہرے پاس تھا بھی بپ تو

جنوں کے کام اٹھے گے رہے ہیں	وہا پیام اٹھے گے رہے ہیں
ملے ہیں جو مہا کے واسطوں سے	انہے پیام اٹھے گے رہے ہیں
چہ از یک جا نہیں تہم بھی پہنایا	کہ اپنے پیام اٹھے گے رہے ہیں

نو (۱۰۰) نوزلوں پر مشتمل یہ مجموعہ اپنے اندر اہل ادب کی دلچسپی کے کئی پیمانے

لے ہوئے ہے اور امید ہے کہ اسے قریب سے پڑھا اور سراہا جائے گا۔

۱۰۰ - ...	قیاس
۱۰۱ - ...	قیاس
۱۰۲ - ...	قیاس
۱۰۳ - ...	قیاس
۱۰۴ - ...	قیاس
۱۰۵ - ...	قیاس
۱۰۶ - ...	قیاس
۱۰۷ - ...	قیاس
۱۰۸ - ...	قیاس
۱۰۹ - ...	قیاس
۱۱۰ - ...	قیاس
۱۱۱ - ...	قیاس
۱۱۲ - ...	قیاس
۱۱۳ - ...	قیاس
۱۱۴ - ...	قیاس
۱۱۵ - ...	قیاس
۱۱۶ - ...	قیاس
۱۱۷ - ...	قیاس
۱۱۸ - ...	قیاس
۱۱۹ - ...	قیاس
۱۲۰ - ...	قیاس
۱۲۱ - ...	قیاس
۱۲۲ - ...	قیاس
۱۲۳ - ...	قیاس
۱۲۴ - ...	قیاس
۱۲۵ - ...	قیاس
۱۲۶ - ...	قیاس
۱۲۷ - ...	قیاس
۱۲۸ - ...	قیاس
۱۲۹ - ...	قیاس
۱۳۰ - ...	قیاس
۱۳۱ - ...	قیاس
۱۳۲ - ...	قیاس
۱۳۳ - ...	قیاس
۱۳۴ - ...	قیاس
۱۳۵ - ...	قیاس
۱۳۶ - ...	قیاس
۱۳۷ - ...	قیاس
۱۳۸ - ...	قیاس
۱۳۹ - ...	قیاس
۱۴۰ - ...	قیاس
۱۴۱ - ...	قیاس
۱۴۲ - ...	قیاس
۱۴۳ - ...	قیاس
۱۴۴ - ...	قیاس
۱۴۵ - ...	قیاس
۱۴۶ - ...	قیاس
۱۴۷ - ...	قیاس
۱۴۸ - ...	قیاس
۱۴۹ - ...	قیاس
۱۵۰ - ...	قیاس

Takhliqi Adab

(ISSN 1814-9030)

Literary Journal : Annual Issue - 3



National University of Modern Languages,
Islamabad

